روح کی واپسی

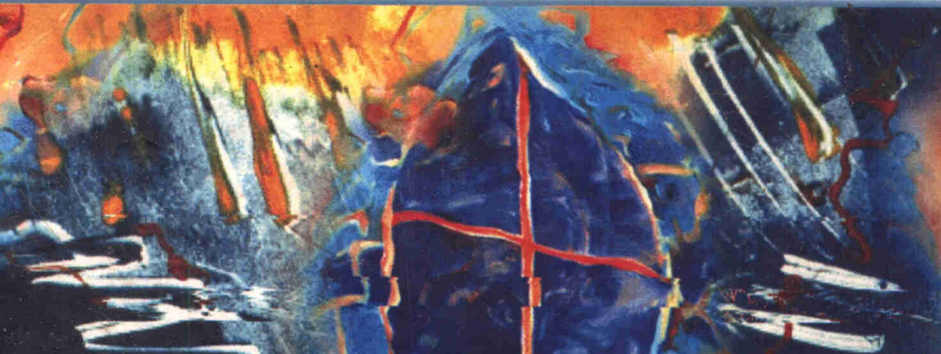

محی الدین نواب

روح کی واپسی

ایک بحری جہاز کے کیبن میں مسافروں کو روح نظر آتی تھی۔
روح کا دعویٰ تھا کہ وہ جہاز کے کپتان سے محبت کرتی ہے۔
ماضی کے ایک حادثے کا شاخسانہ جس نے جہاز کے
کپتان کو حال سے بے حال کر دیا تھا۔
ایک عجیب و غریب مگر غیر معمولی طور پر دلچسپ کہانی۔

کیپٹن عمردراز جہاز کے عرشے پر کھڑا ہوا ساحل کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ساحل پر لوگوں کا بے پناہ ہجوم تھا۔ بحری سفر پر روانہ ہونے والے مسافر اپنے اپنے عزیزوں سے رخصت ہو کر جہاز پر سوار ہو رہے تھے۔ مرد عورتیں اور بچے سبھی تھے' لیکن کیپٹن عمر دراز صرف عورتوں کو دیکھ رہا تھا۔

اب سے کچھ عرصے پہلے وہ صرف عورتوں کو دیکھتا ہی نہیں تھا۔ بلکہ ان کی تمنا بھی کرتا تھا۔ حسین عورتیں اس کی کمزوری بن جایا کرتی تھیں لیکن ایک تلخ تجربے نے اسے بہت ہی سنجیدہ بنا دیا تھا۔ جیسا کہ چور چوری سے جاتا ہے ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔ اسی طرح تلخ تجربے کے بعد اس نے عورتوں سے توبہ تو کرلی تھی لیکن کوئی حسین چہرہ نظر آجاتا تو اسے دیکھے بغیر نہیں رہ سکتا تھا بے چارہ عادت سے مجبور تھا۔

جہاز کا گانگ بج رہا تھا۔ اطلاع دے رہا تھا کہ پندرہ منٹ کے بعد جہاز کا لنگر اٹھا دیا جائے گا۔ آخری پندرہ منٹ میں عمردراز نے دو حسین چہرے دیکھے۔ ان میں سے ایک ہندوستانی چہرہ تھا۔ نیلی ساڑھی پہنے' شانے پر زلفیں بکھرائے وہ اجنتا کی مورتی لگ رہی تھی۔ دوسری ایک نوخیز بنگالی لڑکی تھی۔ عورتوں کا پہناوا اور ان کے بننے سنور نے کا انداز اسے بتا دیتا تھا کہ وہ کس علاقے سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس کی لانبی لانبی زلفیں دیکھ کر عمردراز کو کسی کی یاد آگئی۔ اس نے فوراً ہی اپنے ذہن کو جھٹک دیا۔ وہ بنگالی لڑکی آہستہ آہستہ زینہ طے کرتی ہوئی جہاز کے عرشے کی طرف آرہی تھی۔ اس کے ساڑھی پہننے کے انداز میں ایسی دلکشی تھی کہ زینے کے ہر پائیدان پر قدم رکھتے وقت اس کے بدن کے کتنے ہی زاویے نمایاں ہو جاتے تھے۔

جہاز پر آنے والے مسافر ریلنگ کے پاس آکر اپنے اپنے رشتہ داروں کو دیکھ رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ ہندوستانی عورت بھی عمردراز کے پاس آکر کھڑی ہو گئی اور ساحل کی طرف دیکھ کر اپنا ایک ہاتھ لہراتی ہوئی کسی کو خاموش اشارے سے مخاطب کرنے لگی۔ وہاں ساحل پر بہت سے ہاتھ اٹھ رہے تھے۔ پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ کون سا ہاتھ کسے

الوداع کہہ رہا ہے۔

عمرراز نے بڑی شائستگی سے سوال کیا۔ ”کیا آپ تنہا سفر کر رہی ہیں؟“

وہ عورت اچانک ہی پلٹ کر اسے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں اجنبیت تھی لیکن عمرراز کی وردی کو دیکھتے ہی اس نے قدرے نرم لہجے میں جواب دیا۔ ”جی ہاں' شاید آپ اس جہاز کے کیپٹن ہیں۔“

”جی ہاں۔ انشاء اللہ آپ ہمارے جہاز کو بہت ہی دلچسپ اور آرام دہ پائیں گی۔ یہاں تفریح کا نہایت دلچسپ انتظام ہے۔ میوزک۔ اسٹیج شو کے علاوہ یہاں فلمیں بھی دکھائی جاتی ہیں۔“

وہ مسکرائی مگر جلد ہی پلٹ کر اپنی مسکراہٹ کو عمرراز کی طرف سے ساحل کی طرف اپنے کسی رشتہ دار کے پاس منتقل کر دیا۔ عمرراز خوب سمجھتا تھا وہ اکثر سوچتا تھا کہ عورتوں کو اس کے جہاز پر آکر آخر کیا ہو جاتا ہے۔ شاید جہاز کا تفریحی ماحول یا سمندری ہوائیں ان کے جذبات کو بھڑکا دیتی ہیں کہ دوشیزہ ہوں یا شادی شدہ' سبھی کیپٹن کے سامنے آکر پگھل جاتی ہیں اس میں بہرحال اس کی شخصیت کا بھی دخل تھا۔ کچھ اس کے عہدے کا بھی رعب طاری ہو جاتا تھا۔ وہ آٹھ برس سے اس جہاز میں ملازمت کر رہا تھا۔ ان آٹھ سالوں میں جس طرح اس نے سمندر کو اچھی طرح جان لیا تھا۔ اسی طرح عورتوں کو بھی پرکھ لیا تھا۔ اس عرصہ میں ہر قسم کی عورتوں سے اس کا پالا پڑا تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ بے چاری عورتیں اس کے پلے پڑ گئی تھیں اور سب سے مزے دار بات یہ تھی کہ اپنی اپنی منزل پر پہنچنے کے بعد سارے رشتے ناطے ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتے تھے۔ بندرگاہ پر عورتیں جب جہاز سے اپنا سوٹ کیس لے کر اترتی تھیں تو ان دنوں کی یادیں بھی اپنے ساتھ لے جاتی تھیں۔ صرف ایک عورت ایسی تھی جس نے اس کے چھکے چھڑا دیے تھے۔

☆=====☆=====☆

سمندر پرسکون تھا۔ رات کی تاریکی میں جہاز اپنی منزل کی طرف بڑھتا جارہا تھا۔ وہاں مشہور و معروف یا دولت مند لوگوں کو خاص توجہ دی جاتی تھی۔ عمرراز کے فرائض میں یہ شامل تھا کہ وہ خاص لوگوں کا خاص خیال رکھے۔ کھانے پینے اور تفریحی معاملات میں ان کے ساتھ رہے اور انہیں تنہائی محسوس نہ ہونے دے۔ رات کے کھانے کے بعد جب وہ وی آئی پی کے ڈائننگ ہال میں پہنچا تو وہاں صرف تین آدمی نظر آئے۔ ایک پادری تھا

اور برما ایک تاجر تھا۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ کیپٹن عمرراز کی اطلاع کے مطابق وہاں دو آدمی کم تھے۔

پادری نے مسکرا کر کہا۔ ”کیپٹن یہ جہاز کا سفر ایسا ہی ہوتا ہے۔ جو عادی نہیں ہوتے وہ شروع شروع میں ذرا بیمار پڑ جاتے ہیں۔ اپنے کیبن سے باہر نہیں نکل سکتے۔ شاید وہ دو مسافر بھی اپنے کیبن میں پڑے ہیں۔“

وی آئی پی ڈائننگ ہال بڑی خوب صورتی سے سجایا گیا تھا۔ چاروں طرف پورٹ ہول بنے ہوئے تھے تاکہ دن کو روشنی اور رات کو تازہ ہوا ملتی رہے۔ دیواروں پر ہلکے نیلے رنگ کا ڈسٹمپر تھا۔ خوبصورت پردے اور رنگارنگ پھولوں کے گلدان رکھے ہوئے تھے۔ کھانا بھی بڑا ہی لذیذ تھا۔ سب کچھ تھا لیکن عمرراز بڑی بوریت محسوس کر رہا تھا۔ کیونکہ کوئی صاف ستھرا۔ نکھرا نکھرا سا چہرہ نظر نہیں آرہا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر وی آئی پی روم کا پردہ ذرا سا ہٹا دیا۔ دوسری طرف سیکنڈ کلاس مسافروں کا ڈائننگ تھا۔ وہاں قریب ہی ایک میز پر وہ ہندوستانی عورت کھانے میں مصروف تھی۔

یہ اتفاق ہی تھا کہ پردہ سرکاتے ہی دونوں کی نظریں ٹکرا گئیں۔ وہ اسے دیکھتے ہی مسکرائی ۔ وہ بھی جواباً مسکرایا۔ جی میں آیا کہ فوراً ہی وہاں سے اٹھ کر دوسری طرف پہنچ جائے مگر فرائض نے پر کاٹ دیے تھے۔ وہ سفر کی پہلی رات تھی اور وہ وی آئی پی مسافروں کو پہلی ہی رات اس طرح چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔

تقریباً دو گھنٹے بعد جب وی آئی پی میز خالی ہو گئی تو اس نے پلٹ کر دیکھا۔ صد افسوس کہ دوسری طرف سے وہ ہندوستانی چڑیا بھی اڑ چکی تھی۔ وہ پہلے تو جھنجھلایا پھر اس نے دل کو تسلی دی کہ اچھا ہی ہوا کہ وہ چلی گئی۔ مجھے عورتوں سے دور ہی رہنا چاہیے اور اگر دور نہ رہ سکا تو دودھ کا جلا ہوں چھاچھ پھونک پھونک کر پیوں گا۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر جہاز کے اسکیپر کے پاس گیا پھر انجینئر سے ملاقات کی۔ اسی طرح اپنے فرائض انجام دیتا ہوا اپنے کیبن میں واپس آکر سو گیا۔ بڑی گہری نیند آئی۔ بڑے سہانے خواب نظر آئے لیکن اچانک ہی وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا کیوں کہ اس کے سرہانے فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ اس نے بیزاری سے ریسیور اٹھا کر کہا۔ ”ہیلو! کیا بات ہے؟“

دوسری طرف سے ایک اسٹیوارڈ کی آواز آئی وہ کہہ رہا تھا۔ ”جناب! جہاز میں ایک مریضہ کو کسی قسم کا دورہ پڑ گیا ہے۔ وہ چیخ رہی ہے۔“

”چیخ رہی ہے تو ڈاکٹر کو بھیجو۔ یہ کام میرا نہیں ڈاکٹر کا ہے۔“

"وہ تو ٹھیک ہے جناب! ڈاکٹر صاحب اسے اٹینڈ کر چکے ہیں لیکن اس کی بوڑھی چچی آپ سے ملنا چاہتی ہے۔ وہ آپ کو بلا رہی ہے۔"

ڈیوٹی آخر ڈیوٹی ہوتی ہے۔ فرائض کی انجام دہی کے وقت سہانے خوابوں کو الوداع کہنا پڑتا ہے۔ اس نے بے بسی سے پوچھا۔ "کیا وہ وی آئی پی مسافرہ ہے؟"

"جی ہاں جناب! وہ کیبن نمبر بی سیون میں ہے۔"

کیبن نمبر بی سیون کا نام سن کر عمردراز کے ہاتھ سے ریسیور چھوٹ گیا۔ وہ چند لمحوں کے لیے ساکت رہ گیا۔ اس کے ذہن میں کوئی چیخ ابھر رہی تھی......... بی سیون بی سیون.........

وہ پچھلے چھ ماہ سے جیسے آسیب زدہ تھا۔ بس یوں ہی کیبن نمبر بی سیون کے سامنے سے گزرتے ہوئے کتراتا تھا۔ حالانکہ وہ کیبن دوسروں کے لیے آسیب زدہ نہیں تھا لیکن آج کسی کی چیخیں بتا رہی تھیں کہ کوئی خاص بات ہے۔ اندر سے ایک انجانا سا خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ رات کے دو بجے کبھی اُدھر کا رخ نہ کرتا لیکن یہ ایک ڈیوٹی تھی وہ قہراً جبراً اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

بی سیون کے سامنے آس پاس کے کیبن والے مسافر بھی جمع ہو گئے تھے۔ اسٹیوارڈ اور دوسرے لوگ انہیں واپس جا کر آرام سے سونے کے لیے کہہ رہے تھے۔ جب عمردراز وہاں پہنچا تو کیبن کے باہر صرف ایک اسٹیوارڈ اور جہاز کا ڈاکٹر نظر آیا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ لڑکی پر کس قسم کا دورہ پڑتا ہے۔ لہٰذا اسے دوا دے دی ہے۔ وہ جلد ہی سو جائے گی۔

اسی وقت کیبن کا دروازہ کھلا اور وہ بوڑھی عورت باہر آئی۔ اس نے عمردراز کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیپٹن' میری بچی بہت زیادہ دہشت زدہ ہے۔ کیا ہمیں دوسرا کیبن نہیں دیا جا سکتا؟"

عمردراز نے پوچھا۔ "اس کیبن میں کیا تکلیف ہے؟"

وہ بوڑھی عورت بنگالی زبان میں اپنا مفہوم ادا کرنے لگی۔ عمردراز سمجھ گیا کہ بڑھیا توہم پرست ہے اور اس کیبن میں اپنی بھتیجی کو رکھنا نہیں چاہتی۔ اس نے بڑھیا سے پوچھا۔ "کیا آپ کی بھتیجی سو رہی ہے؟"

بڑھیا نے جواب دیا۔ "نہیں جاگ رہی ہے۔ آؤ! تم خود آ کر اس کی حالت دیکھ لو۔ وہ بری طرح خوف زدہ ہے۔"

کیپٹن عمردراز ہچکچانے لگا۔ وہ کیبن کے اندر نہیں جانا چاہتا تھا۔ انکار کی گنجائش بھی نہیں تھی۔

بڑھیا نے آگے بڑھ کر کیبن کا دروازہ کھول دیا تھا۔ اندر روشنی نظر آ رہی تھی اور وہ باہر سے دیکھ رہا تھا۔ وہ بنگالی لڑکی ایک برتھ پر لیٹی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اس کی زلفیں اتنی لانبی اور گھنی تھیں کہ برتھ کے نیچے قالین پر پھیل گئی تھیں۔ وہ اپنے ہانپتے ہوئے سینے پر ہاتھ رکھے چھت کی طرف گھور رہی تھی۔ وہ لرزتے ہوئے قدموں سے آگے بڑھتا ہوا کیبن میں داخل ہو گیا۔

جہاز کی روانگی سے پہلے اس نے اس لڑکی کو دور سے دیکھا تھا۔ اب پہلی بار قریب سے دیکھ کر کچھ اور دیر تک دیکھنے پر مجبور ہو گیا۔ وہ ایسی ہی تھی۔ گندمی رنگ ستواں ناک' رس بھرے ہونٹ اور بڑی بڑی آنکھیں رات کی طرح کالی بھی تھیں اور دن کی طرح روشن بھی۔ بنگالی حسن ایسا ہی ہوتا ہے کہ دیکھنے والے اس کے ہجے کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔ وہ مسحور ہو رہا تھا لیکن جب اس لڑکی نے اپنے دیدے گھما کر اسے دیکھا تو وہ یک بیک سہم گیا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کے پیچھے کسی کی آنکھیں گھور رہی ہیں اور اس کے دل کو مٹھی میں لے کر جکڑ رہی ہیں۔

وہ کیپٹن کو دیکھتے ہی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ پھر بہت ہی دھیمی آواز میں بولی۔ "آمی روگی نائی......... کیپٹن! میں بیمار نہیں ہوں۔ مجھ پر دورہ نہیں پڑتا۔ میں سچ کہتی ہوں کہ یہاں عجیب عجیب سی آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔ کوئی عورت میرے کانوں کے قریب رو رہی تھی۔ سسک رہی تھی۔"

عمردراز نے اسے بے یقینی سے دیکھا۔ وہ جن بھوت اور آسیبی کہانیوں کو مضحکہ خیز سمجھتا تھا اور اس سائنسی دور میں ایسی باتیں مضحکہ خیز ہوتی ہیں۔ اس نے نرمی سے کہا۔ "آپ کچھ پڑھی لکھی نظر آتی ہیں۔ آپ کی باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کو باتیں کرنے کا سلیقہ بھی آتا ہے پھر آپ یہ کیسی بے تکی باتیں کر رہی ہیں؟"

وہ پریشان ہو کر بولی۔ "میں خود حیران ہوں۔ میں ایسی باتوں پر یقین نہیں کرتی مگر یقین جانیے میں نے خود اپنے کانوں سے کسی کو روتے اور سسکتے سنا ہے۔"

کیپٹن سر اٹھا کر چاروں طرف دیکھنے لگا کبھی دیواروں کو اور کبھی کیبن کی چھت کو۔ ایک خیال پیدا ہوا تھا کہ شاید کسی نے خفیہ طور پر ریکارڈر اور اسپیکر رکھ دیا ہے۔ کسی کی شرارت بھی ہو سکتی ہے لیکن وہاں ایسی کوئی چیز بھی نہیں پائی گئی۔

وہ جبراً مسکراتے ہوئے بولا۔"میں یہ نہیں کہوں گا کہ آپ جھوٹ کہہ رہی ہیں لیکن آپ سمجھ سکتی ہیں کہ یہ ایسی بات ہے کہ کوئی بھی ہوش منداس پر یقین نہیں کرے گا۔"

بڑھیانے ناگواری سے پوچھا۔"کیوں کیپٹن! اگر تمہیں اس کیبن میں رہنے کے لیے کہا جائے تو کیا تم یہاں کچھ وقت گزار سکو گے؟"

اس سوال پروہ سٹپٹا کررہ گیا۔ اگرچہ توہم پرست نہیں تھا۔ تاہم اس کیبن سے کتراتا تھا۔ وہاں سے گزرتے ہوئے کچھ رنگین اور سنگین باتیں یاد آجاتی تھیں۔ اب وہ بڑھیا اور اس کی بھتیجی سے اپنے ماضی کی باتیں نہیں کرسکتا تھا۔ اس لیے سمجھاتے ہوئے بولا۔"آپ یقین کریں میرے یہاں رہنے سے میری صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ رہ گئی آپ لوگوں کے یہاں رہنے کی بات تو یہاں کوئی دوسرا وی آئی پی کیبن خالی نہیں ہے۔ اگر آپ چاہیں تو سیکنڈ کلاس یا تھرڈ کلاس.........."

لڑکی نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔"کیپٹن! آمی اپنی کھانے تھاک بو۔ آمی دربل نائی۔ (میں یہیں رہوں گی۔ میں بزدل نہیں ہوں۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں)۔ میں سمجھنا چاہتی ہوں جو آوازیں میں نے سنیں وہ واقعی کسی کی آوازیں تھیں یا میری اپنی سوچ یا کوئی میرے اعتقاد کا ڈھکا چھپا وہم تھا۔"

کیپٹن نے کہا۔"آپ کی طرح آپ کا ذہن بھی خوبصورت ہے۔ آپ کا حوصلہ دیکھ کر مجھے خوشی ہو رہی ہے۔"

وہ اپنی تعریف سن کر خوش ہو گئی۔ یہ تو ہر انسان کی کمزوری ہے۔ تعریف انسان کو اس کی خوبیاں ضرور بتاتی ہے مگر اسے اندر سے کمزور بھی بنا دیتی ہے۔ پہلی بار اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں اٹھا کر کیپٹن کو دیکھا۔ کیپٹن پھر ایک مرتبہ ذرا سا سہم گیا۔ وہ آنکھیں کسی کی آنکھوں کی یاد دلا رہی تھیں۔ اس نے منہ پھیر کر کہا۔"اچھا! اب میں چلتا ہوں۔ کوئی بات ہو تو کال بیل کا بٹن دبا دینا۔ اسٹیوارڈ حاضر ہو جائے گا۔"

یہ کہہ کر وہ تیزی سے چلتا ہوا کیبن سے باہر نکل گیا۔ حالانکہ جی چاہ رہا تھا کہ ایک بار پلٹ کر اسے دیکھے مگر اسے دیکھنے سے وہ اپنی آنکھیں دکھاتی' آنکھیں جو پُراثر تھیں اور پُرخطر بھی۔

وہ تیزی سے چلتا ہوا اس کیبن سے دور ایک ریلنگ کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ وہ گہری نیند سے بیدار ہوا تھا مگر اب اس کی آنکھوں سے نیند اڑ گئی تھی۔ اس کی نگاہوں

کے سامنے اس کے تصور میں دو آنکھیں سلگ رہی تھیں۔ وہ اضطراب کے عالم میں زیرلب بڑبڑانے لگا۔"ہیلن ہیلن.......... مگر نہیں یہ سب مذاق ہے۔"

اس کی سماعت میں ہیلن چپکے چپکے بولنے لگی۔"یہ مذاق نہیں ہے۔ میں تم سے پہلے ہی کہہ چکی ہوں میں جسے چاہتی ہوں اسے ہر حال میں حاصل کرلیتی ہوں۔ میں نے تم سے کہا تھا تم واپس آؤ گے۔ میرے پاس واپس آؤ گے اور اب تم بہت جلد واپس آنے والے ہو۔"

وہ بے اختیار پلٹ کر اُدھر دیکھنے لگا جدھر سے ابھی آیا تھا۔ کیبن نمبر بی سیون نظر نہیں آرہا تھا۔ اس کے باوجود وہ دماغی آنکھوں سے دیکھ سکتا تھا۔ کیبن کے اندر ہیلن بال کھولے ہوئے بیٹھی تھی۔ بالکل اس بنگالی لڑکی کی طرح اس کے بال بھی برتھ سے نیچے لٹکتے ہوئے قالین پر پھیل جاتے تھے۔ اسے اپنی گھنی زلفوں کی چھاؤں میں چھپا لیتے تھے اور آنکھیں بھی بالکل ویسی ہی تھیں۔ اس کیبن کے اندر کبھی وہ بنگالی لڑکی نظر آتی تھی اور کبھی ہیلن آکر بیٹھ جاتی تھی۔

کہیں قرار نہیں آرہا تھا۔ وہ بے قراری سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا پھر تیزی سے چلتا ہوا اپنے کیبن میں آگیا۔ وہاں اس نے وہسکی کی بوتل نکالی اور پینے کے لیے بیٹھ گیا۔ پہلا پیگ حلق سے اتارتے ہی ذرا ہوش ٹھکانے آئے۔ وہ سوچنے لگا کہ یہ سب کیا ہے؟ ہیلن مرچکی ہے پھر چھ ماہ بعد اتنی شدت سے کیوں یاد آرہی ہے؟ ہاں شاید اس لیے کہ وہ بنگالی لڑکی ہیلن کی زلفیں اور آنکھیں چرا لائی ہے۔ مشابہت ایسی ہے کہ ہیلن کا یاد آجانا لازمی امر ہے۔

دوسرا پیگ حلق سے اتارتے وقت اس کے دماغ نے پوچھا۔"لیکن ہیلن کیبن نمبر بی سیون میں اس بنگالی لڑکی کے سامنے کیوں رو رہی ہے؟ اسے اپنا دکھڑا کیوں سنا رہی ہے؟"

اس سوال کا جواب اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ اس نے تیسرا پیگ حلق سے اتارا کہ شاید کوئی معقول وجہ سمجھ میں آجائے مگر چوتھے پیگ کے بعد تو کھوپڑی ہوا میں اڑنے لگی تھی۔ نشہ حاوی ہو رہا تھا۔ پانچویں پیگ میں وہ اونگھنے لگا پھر وہ کب اور کیسے بستر پر گر گیا۔ کسی بات کا اسے ہوش نہ رہا۔ دوسری صبح کیپٹن' بلیٹن بورڈ کے پاس کھڑا ہوا اس دن کا پروگرام پڑھ رہا تھا۔ شام کے چھ بجے فرسٹ کلاس کے مسافروں کے لیے ایک کاک ٹیل پارٹی کا انتظام کیا گیا تھا اور رات کو ایک عمدہ فلم دکھائی جانے والی تھی۔ جسے عام مسافر

بھی دیکھ سکتے تھے۔

دن بہت روشن تھا اور موسم بہت خوش گوار تھا۔ ہلکی ہلکی ہوائیں چل رہی تھیں اور سمندر کسی جھیل کی طرح پُر سکون تھا۔ بیرونی حصے کا ماحول بہت ہی خوبصورت تھا۔ عمرراز خود کو بہت تروتازہ اور ہشاش بشاش محسوس کر رہا تھا کہ اب کیبن نمبر بی سیون کے متعلق، ہیلن یا اس بنگالی لڑکی کے متعلق کچھ نہیں سوچے گا۔

لیکن انسان کے سوچنے اور فیصلہ کرنے سے تقدیر کے فیصلے نہیں بدلتے۔ اس نے بلیٹن بورڈ کے پاس سے پلٹ کر دیکھا تو وہ بنگالی بڑھیا اس کو دیکھ رہی تھی۔ اسے گھور رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ اسے کچا چبا جائے گی۔ عمرراز نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ ”محترمہ آپ خیریت سے تو ہیں؟“

وہ ذرا آگے بڑھ کر اس کے قریب آگئی۔ ”کیپٹن، مجھے سچ سچ بتادو۔ کیا اس کیبن میں کوئی عورت مر چکی ہے؟“

کیپٹن عمرراز کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔ پھر بدستور ہچکچاتے ہوئے بولا۔

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ آپ کو میری باتوں کا یقین نہیں آئے گا۔ آپ دوسروں سے معلومات حاصل کر سکتی ہیں۔ اس کیبن میں کسی کی موت واقع نہیں ہوئی ہے۔ محترمہ میں کہتا ہوں یہ سب آپ کا وہم ہے۔“

”یہ وہم نہیں حقیقت ہے۔ کل رات مونا جب بھی آنکھیں بند کرتی تھی۔ وہ عورت رونے لگتی تھی۔ آہستہ آہستہ اس سے بولتی تھی کہ اس کی روح تڑپ رہی ہے۔ وہ مرنا نہیں چاہتی تھی مگر مر گئی۔ مجھے اپنے جسم میں جگہ دو مونا۔ مجھے اپنے جسم میں جگہ دو۔ میں تمہارے وجود میں سما جانا چاہتی ہوں۔“

عمرراز نے محسوس کیا کہ اسے پسینہ آرہا ہے۔ وہ بے یقینی سے اس بڑھیا کو دیکھ رہا تھا لیکن اندر سے ایک ڈھکا چھپا یقین تھا۔ کیوں کہ ہیلن مرنا نہیں چاہتی تھی اور مر گئی تھی۔

یہاں تک وہ بڑھیا کی بات درست مان سکتا تھا لیکن یہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھا کہ ہیلن کی روح تڑپ رہی ہے اور مونا کے خوبصورت جسم میں سماجانے کی التجا کر رہی ہے۔ اس نے آہستگی سے کہا۔ ”خاتون! آپ اپنے وہم اور عقیدے کے مطابق بول رہی ہیں۔ کیا آپ نے کسی خاتون کے رونے کی آواز سنی ہے؟ یا صرف مونا ایسا کہتی ہے؟“

”میں نے نہیں سنی۔ ہاں مونا ایسا کہتی ہے اور میں جانتی ہوں کہ مونا نے آج تک کبھی مجھ سے جھوٹ نہیں کہا اور اسے جھوٹ بولنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ کیا اسے جھوٹ بولنے کے بعد.......... اس بلا سے نجات مل جائے گی؟“

”آپ کو مجھ سے شکایت ہے؟“ کیپٹن نے پوچھا۔

”مجھے تم دونوں سے شکایت ہے۔ اس کیبن سے کہ وہ کسی چڑیل کا مسکن ہے اور تم سے اس لیے شکایت ہے کہ تم مجھے توہم پرست سمجھتے ہو۔“

کیپٹن نے ذرا پیچ و تاب کھاتے ہوئے اس بڑھیا کو دیکھا اور کہا۔ ”خاتون وہ کیبن اگر کسی چڑیل کا مسکن ہے تو آپ سیکنڈ کلاس میں چلی جائیں۔ اس سے زیادہ میں آپ کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔“

یہ کہنے کے بعد وہ بڑھیا کا جواب سنے بغیر ہی تیزی سے گزر گیا۔ اس نے بظاہر اس سے پیچھا چھڑا لیا تھا لیکن اس کی باتیں دماغ میں گونج رہی تھیں۔ چھ ماہ پہلے ہیلن نے اس کیبن میں سفر کیا تھا۔ اس کا سفر چاٹگام تک پہنچ کر ختم ہو گیا تھا۔ چاٹگام سے واپسی پر وہ بی سیون خالی رہا کیوں کہ وی آئی پی کلاس کے مسافر بہت کم تھے۔ بمبئی پہنچ کر وہ جہاز مرمت کے لیے یارڈ میں جا کھڑا ہو گیا اور چھ ماہ بعد وہ جہاز مسافروں کو لے کر پھر ایک بار چاٹگام جا رہا تھا اور اس کیبن بی سیون میں جہاں ہیلن رہ چکی تھی وہاں وہ بنگال لڑکی مونا رہ رہی تھی اور اسے یہ سفر اسی کیبن میں رہ کر طے کرنا تھا۔

عمرراز کے ذہن میں ایک بات آئی اور وہ یہ کہ اسے شاید پھانسنے کی کوشش کی جارہی ہے لیکن کس طرح؟ ہیلن عیسائی تھی اور مونا بنگالی۔ دونوں کی تہذیب میں اور زبان میں، لباس میں اور مزاج میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ دونوں کا گٹھ جوڑ نا ممکن سا تھا۔ پھر یہ کہ اس کے خلاف سازش کیسے ہو سکتی تھی۔ یہ بات تو کوئی نہیں جانتا تھا کہ ہیلن کا قتل اس کے ہاتھوں سے ہو چکا ہے۔

وہ ایک دم سے سہم گیا۔ جلدی سے آس پاس دیکھنے لگا۔ جیسے کوئی اس کی سوچ کو پڑھ رہا ہو اور اسے مجرم سمجھ کر گرفت میں لینے کے لیے کہیں سے آرہا ہو۔ مگر نہیں۔ وہاں اس کے آس پاس لوگ تو ضرور تھے لیکن کوئی اس کے خیالات کو سن نہیں رہا تھا۔

وہ تیزی سے چلتا ہوا بار میں آیا۔ بار مین نے اسے دیکھتے ہی اس کی پسند کی شراب کا ایک پیگ بنا کر اس کے سامنے کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ اس وقت اسے شراب ہی کی ضرورت تھی۔ اس نے جام اٹھا کر اسے ایک ہی سانس میں اتار لیا۔ پھر دوسرے پیگ کے لیے خالی

جام کو آگے بڑھا کر وہ سوچنے لگا۔

میں خواہ مخواہ کرب اور ہیجان میں مبتلا ہو رہا ہوں۔ مجھے ذرا عقل سے کام لینا چاہیے۔ مجھے سمجھنا چاہیے کہ میرے علاوہ اس راز کو کوئی نہیں جانتا ہے۔ اس حویلی میں سناٹا تھا۔ ویرانی تھی۔ رات کا اندھیرا تھا۔ میں تھا اور وہ تھی۔ ہمیں دیکھنے والی کوئی آنکھ نہیں تھی۔ مجھے اس بات کا پورا یقین ہے کیونکہ آبادی سے میلوں دور برسات کی رات میں کوئی ہمارا تعاقب نہیں کر سکتا تھا اور نہ ہی پہنچ سکتا تھا۔ کسی نے نہیں دیکھا ہے۔ مونا یا اس کی بوڑھی چچی سازش نہیں کر رہی ہیں۔ ہاں اگر مونا کوئی خواب دیکھ رہی ہے۔ سہم رہی ہے تو اس کی وجہ کچھ اور ہو سکتی ہے۔ عورتیں بس ایسی ہی ہوتی ہیں۔

عورت تو باعث رحمت بھی ہوتی ہے اور باعث زحمت بھی۔ اس نے دوسرا جام اٹھایا تو وہ ہندستانی عورت بھرے ہوئے جام کی طرح اس کے سامنے آگئی۔ اس وقت وہ سیاہ بارڈر والی نارنجی رنگ کی ساڑھی پہنے ہوئے تھی۔ ساڑھی کے پیچھے سیاہ رنگ کی چولی تھی۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ہوتا ہے۔ مونا اسے ڈبو رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ اس ہندوستانی عورت کا سہارا نہ لیا تو یقیناً ڈوب جائے گا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "میرا نام عمردراز ہے۔"

وہ کاؤنٹر پر ٹیک لگا کر بولی۔ "اس جہاز کے کیپٹن کا نام کون نہیں جانتا۔ میں بھی جانتی ہوں۔ ہاں میرا نام 'سادھنا' ہے۔"

"سادھنا' میں جہاز کا کیپٹن ہوں۔ اس حیثیت سے میں مسافروں کے نام بھی جانتا ہوں۔"

وہ ہنستی ہوئی بولی۔ "تو ہم ایک دوسرے سے تعارف حاصل کیے بغیر ہی ایک دوسرے سے متعارف ہیں۔"

"تم سری لنکا جا رہی ہو؟"

"ہاں میں ٹرین کے ذریعے بھی جا سکتی تھی لیکن میں نے فلموں میں دیکھا ہے کہ بحری جہاز کا سفر کا بڑا ہی رومانٹک ہوتا ہے۔ میں نے سوچا چلو۔ اس سفر کا بھی تجربہ کر لیا جائے۔"

"اچھا تو یہ تجربہ کیسا ثابت ہو رہا ہے؟"

وہ سوچتی ہوئی بولی۔ "ابھی کچھ نہیں کہہ سکتی۔ شاید اس لیے کہ ابھی تجربہ شروع نہیں ہوا۔"

عمردراز نے بڑی فراخدلی سے ہنستے ہوئے کہا۔ "بہت اچھا' کیا کبھی کسی سے رومانس نہیں کیا؟"

"اوں ہونہہ! شادی تو کی ہے رومانس نہیں کیا۔"

"اچھا تو شادی ماں باپ نے کر دی ہو گی اور رومانس کی حسرت دل ہی میں رہ گئی۔"

"ہاں۔ تم کافی حد تک مجھے سمجھ رہے ہو۔" یہ کہتے ہوئے وہ شاخ گل کی طرح لچک کر دوسری طرف گھوم گئی۔ پھر اپنی ساڑھی کا آنچل درست کرتے ہوئے ایک میز کی طرف جانے لگی۔ بڑی غضب کی چال تھی۔ جسم سمندر کی لہروں کی طرح لہرا رہا تھا۔

کوئی سمندر کو اس کے منجدھار میں پہنچ کر دیکھنا چاہے تو سوچ میں پڑ جائے کہ پتہ نہیں ان لہروں کی تہہ میں کتنی گہرائی ہے۔ بس عمردراز اسی گہرائی میں سوچ رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ آگے بڑھنا چاہیے پھر خیال آیا کہ وہ رومانس کی بھوکی ہے اور اس جہاز میں دوسرے بھی کتنے ہی خوبرو نوجوان ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ رومانس کی تلاش میں بھٹکتی ہوئی وہ دوسری طرف نکل جائے۔

وہ تیسرا پیگ اٹھا کر اس کی میز کے پاس آگیا پھر ایک کرسی کھینچتے ہوئے بیٹھ کر بولا۔ "آج شام کو کاک ٹیل پارٹی ہے۔ تم آؤ گی نا۔"

وہ بولی۔ "میں نے آج تک نہیں پی ہے۔ سنا ہے کہ شراب بہت کڑوی ہوتی ہے۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "ارے نہیں۔ دل جلوں کے لیے کڑوی نہیں ہوتی اور ان کے لیے بھی جو رومانس کی تلاش میں بھٹکتے ہیں۔ میں اپنے ہاتھوں سے تمہارے لیے پیگ بناؤں گا اور اس دعوے کے ساتھ کہ تمہیں کڑوی نہیں لگے گی۔"

وہ ایک ادائے ناز سے اپنی گردن کو خم دیتے ہوئے بولی۔ "تم بہکانے کی باتیں کر رہے ہو۔"

"اگر رومانس کی ابتدا بہکنے اور بہکانے سے ہو جائے تو کوئی اعتراض ہے؟"

اس نے سر کو جھکا لیا۔ آخر ہندوستانی عورت تھی۔ شرما گئی۔ زیر لب مسکرانے لگی۔

وہ موضوع بدلتے ہوئے بولا۔ "ڈنر کے بعد آج یہاں فلم دکھائی جائے گی۔"

وہ خوش ہو کر بولی۔ "مجھے فلمیں دیکھنے کا بہت شوق ہے لیکن تم نے پلا دی تو پھر شاید مجھے خود کو بھی دیکھنے کا ہوش نہ رہے گا۔ فلم کیسے دیکھوں گی؟"

"تو پھر ایسا کرتے ہیں کہ پہلے میں تمہارے ساتھ فلم دیکھوں گا پھر تم میرے ساتھ

ہو گی۔ پھر ایک ساتھ رات کا کھانا کھائیں گے۔ ٹھیک ہے نا۔"

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ عمردراز نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "مجھے ایک ضروری کام یاد آگیا ہے۔ میں تھوڑی دیر بعد پھر تم سے ملوں گا۔"

وہ مسکراتا ہوا اس کو دیکھتا ہوا بار ریسٹورنٹ سے باہر آگیا۔ اسے یاد آگیا تھا کہ ناشتے کے وقت وی آئی پی مسافروں کو بھی اٹینڈ کرنا چاہیے۔ اس خیال سے وہ وی آئی پی ڈائننگ روم کی طرف آیا۔ یہاں وہی پادری اور وہی برما کے رہنے والے میاں بیوی بیٹھے ہوئے تھے مگر اب دو وی آئی پی مسافروں کا اضافہ ہو گیا تھا۔ ان میں سے ایک مونا تھی اور دوسری اس کی چچی۔ وہ دونوں کھانے میں اور باتیں کرنے میں مصروف تھیں۔ انہوں نے عمردراز کو نہیں دیکھا۔ عمردراز خاموشی سے ایک طرف کھڑے ہو کر انہیں دیکھنے لگا۔

وہ بڑھیا کو کیا دیکھتا مونا ہی کو دیکھتا رہ گیا۔ وہ بڑی پُرکشش لگ رہی تھی۔ اس کے حسن میں سادگی تھی۔ بڑی معصومیت تھی اور یقین نہیں آتا تھا کہ یہ لڑکی کوئی سازش کر سکتی ہے۔ "پھر وہی سازش۔" عمردراز نے سوچا کہ وہ سازش کے متعلق کیوں سوچ رہا ہے؟ کسی کو کیسے معلوم ہو گا کہ ہیلن کے ساتھ اس کے تعلقات تھے۔ اس کے اور ہیلن کے تعلقات کا علم صرف ایک اسٹیوارڈ کو تھا۔ اس نے یہ بات بہت ہی راز میں رکھی تھی کہ ایک چرس اسمگل کرنے والی لڑکی سے اس کے تعلقات کا علم کسی کو نہ ہو۔ پتہ نہیں وہ کب تک یہی سوچتا رہا۔ اچانک مونا نے اسے دیکھ لیا۔ اس کے ساتھ ہی دوسروں کی نگاہیں بھی عمردراز کی طرف اٹھ گئیں۔

پادری نے کہا۔ "کم آن کیپٹن! مونا ہم لوگوں کو پچھلی رات کا واقعہ سنا رہی ہے کیا تم سننا پسند کرو گے؟"

کیپٹن آہستہ آہستہ چلتا ہوا ان کے قریب ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ کرسی مونا کے مقابل تھی۔ ان کے درمیان ایک لابنی سی میز تھی۔ "فادر! میں ایسی باتوں پر یقین نہیں کرتا۔" اس نے مونا کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "بھلا یہ بھی کوئی یقین کرنے کی بات ہے کہ کوئی نظر نہ آتا ہو اور اس کی آواز سنائی دے رہی ہو۔"

پادری نے کہا۔ "مائی سن۔ میں روحانیت کا پرچار کرتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ میں کل کے واقعہ کو ایک من گھڑت کہانی نہیں سمجھ سکتا۔ روحیں ہوتی ہیں اور روحیں بے قرار ہوں تو وہ بھٹکتی بھی ہیں۔ ایسا ممکن ہے کیپٹن ایسا ممکن ہے۔ بے چاری مونا پر جو کچھ بھی گزری۔ اس کو وہ سمجھتی ہے یا پھر میں سمجھتا ہوں۔ تم سائنسی ترقی کی عینک لگا کر ہر بات

کو سمجھنے کی کوشش نہ کرو۔ سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا۔"

برمی عورت نے کہا۔ "فادر! میں روحانیت کی قائل ہوں۔ ایک بار خود میں نے اپنی آنکھ سے اپنی ساس کی روح کو دیکھا تھا کیا بتاؤں.........." وہ فوراً ہی چپ ہو گئی کیونکہ اس کا شوہر اسے گھور کر دیکھ رہا تھا۔ وہ بولا۔ "تم زیادہ زبان نہ چلایا کرو۔ جب میری ماں زندہ تھی۔ اس وقت بھی تم اسے چڑیل کہتی تھیں۔ اس کی زندگی میں اسے خوابوں میں دیکھ دیکھ کر ڈرتی تھیں۔ دنیا کی ہر عورت اپنی ساس سے زندگی میں بھی اور مرنے کے بعد بھی خوف زدہ رہتی ہے۔"

پادری نے کہا۔ "بہو ہو یا ساس سبھی کی روحیں ہوتی ہیں۔ کیپٹن! یہ مونا بہت زیادہ دہشت زدہ ہے۔ میں نے اسے ایک آفر دی ہے۔ میں تمہیں بھی بتا رہا ہوں اور وہ یہ ہے کہ میں اپنا کیبن مونا کو دے دوں گا اور میں اس کیبن میں رات گزاروں گا اور وہ روحانی عمل کروں گا کہ کوئی خبیث روح ہو گی تو وہ اس کیبن سے بھاگ جائے گی اور پھر کبھی نہیں آئے گی۔ یہ میرا دعویٰ ہے۔ کیوں مونا تم راضی ہو نا؟"

مونا جھجکتی ہوئی آہستہ آہستہ نظریں اٹھا کر عمردراز کو دیکھنے لگی۔ ہائے کیسی غضب کی آنکھیں تھیں۔ سیدھی آکر دل میں اترتی تھیں۔ وہ ہچکچاتی ہوئی بولی۔ "آں۔ ہاں۔ فادر میں ایک رات کے لیے آپ کے کیبن میں چلی جاؤں گی۔ آپ خود ہی میرے کیبن میں رہ کر دیکھیں اور فیصلہ کریں کہ میری باتیں کہاں تک درست ہیں؟"

عمردراز یہاں سے اٹھ جانا چاہتا تھا۔ مگر پتہ نہیں سامنے والی میں کیا بات تھی کہ اٹھ نہ سکا اور بیٹھا رہا۔ عجیب بات تھی۔ وہ مونا سے گھبراتا بھی تھا اور سامنے بیٹھ کر اسے دیکھنے کی خواہش بھی ہوتی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں اپنی اس عجیب سی خواہش کا تجزیہ کیا۔ اسے سادھنا یاد آگئی۔ سادھنا میں غیر معمولی کشش تھی اور اس کی اداؤں میں خاموش بلاوا تھا۔ مونا میں ایسی کوئی بات نہ تھی۔ اس کی معصومیت اور سادگی اس کے دیکھنے کا انداز۔ اس کی گفتگو کا لہجہ ایسا تھا۔ بس دل کھنچا جاتا تھا۔ مونا ثابت کر رہی تھی کہ مرد کے دل میں جگہ بنانے کے لیے صرف جنسی کشش رکھنا ضروری نہیں ہے۔ سادگی بھی گرفتار کر لیتی ہے۔

وہ اچانک اٹھ کر کھڑی ہو گئی پھر پادری وغیرہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "آپ لوگ مائنڈ نہ کریں۔ میں تنہائی میں کیپٹن سے باتیں کرنا چاہتی ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے عمردراز کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ عمردراز نے نظریں اٹھا کر جب اس کے سوال کو پڑھا تو

وہ چپ چاپ ڈائننگ ہال سے باہر چلی گئی۔ وہ بھی چپ چاپ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دوسروں پر ایک معذرت کی نگاہ ڈالی۔ پھر وہاں سے باہر چلا آیا۔ مونا ایک طرف جا رہی تھی۔ جیسے جذبے کچے دھاگوں سے باندھ لیتے ہیں۔ اسی طرح وہ بندھا ہوا اس کے پیچھے پیچھے جانے لگا۔ وہ ایک ڈیک چیئر پر بیٹھ گئی۔ عمر دراز بھی پاس آکر اس کے برابر والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ مونا کا سر جھکا ہوا تھا۔ اس کی خاموشی سے پتہ چلتا تھا کہ وہ سمندر کی لہروں کی طرح خاموش اور پُرسکون ہے لیکن اندر طوفان مچل رہے ہیں۔ آخر وہ آہستگی سے بولی۔ "کیپٹن! پچھلی رات آپ نے میرے فیصلے کی تعریف کی تھی لیکن میں اس فیصلے پر قائم نہ رہ سکی۔ میں کیا بیان کروں۔ جس طرح میں روحانیت کی قائل نہ تھی۔ اسی آپ بھی نہیں ہیں لیکن اب میں قائل ہو چکی ہوں۔"

وہ تھوڑی دیر کے لئے چپ ہو گئی۔ کیپٹن نے کہا۔ "آگے بولو۔ یہ نہ سمجھو کہ میں تمہاری بات کا یقین کر لوں گا.......... کوئی ضروری نہیں ہے کہ دنیا والے تمہاری ہر بات پر آمنا وصد قنا کہیں لیکن میں اس کیبن کے متعلق ضرور سنوں گا۔ مجھے بتاؤ کہ کل رات میرے جانے کے بعد کیا تم نے پھر وہ آوازیں سنی تھیں۔"

"ہاں' آپ کے جانے کے بعد میں نے ڈاکٹر کی دی ہوئی دوا کھائی۔ میں چاہتی تھی کہ سو جاؤں اور وہ دوا مجھے سلا سکتی تھی لیکن پھر اس آواز نے مجھے جگا دیا۔"

وہ یک بیک ہولے ہولے لرزنے لگی اور لرزتی ہوئی آواز میں بولنے لگی۔ "وہ میرے جسم پر قبضہ کرنا چاہتی ہے۔ وہ مجھ سے دھیرے دھیرے میرے کانوں میں سرگوشی کر رہی تھی۔ کہہ رہی تھی کہ مجھے اپنے جسم میں سما جانے دو۔ میں اس کے لئے بھٹک رہی ہوں۔ وہ مجھ سے روٹھ کر چلا گیا ہے۔ میں اسے منانا چاہتی ہوں۔ اسے اپنے پاس واپس بلانا چاہتی ہوں۔ لڑکی میری بات مان لو۔ میری بات مان لو۔ مجھے اپنے جسم میں تھوڑی سی جگہ دے دو۔"

وہ ایک دم اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ "تم بکواس کرتی ہو.......... تم.......... تم یا تو پاگل ہو یا مجھے جان بوجھ کر کسی پریشانی میں مبتلا کرنا چاہتی ہو۔ میں تمہیں سمجھا رہا ہوں۔ آئندہ کبھی ایسی بے تکی باتیں میرے سامنے نہ کرنا۔"

یہ کہتے ہی وہ تیزی سے پلٹ کر اس سے نظریں ملائے بغیر وہاں سے جانے لگا۔ جاتے وقت اسے یوں لگ رہا تھا جیسے مونا اسے دیکھ رہی ہے۔ اس کی نگاہیں چبھ رہی ہیں۔ وہ جلدی سے ایک کوریڈور میں مڑ گیا۔

☆======☆======☆

شام کو کاک ٹیل پارٹی تھی۔

چھ ماہ پہلے ایسی ہی ایک کاک ٹیل پارٹی میں اس نے ہیلن کو دیکھا تھا۔ وہ چند پیوں کے درمیان بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا سنہری لباس تنگ بھی تھا اور مختصر بھی۔ لباس ایسا تھا کہ جسم کی رنگت نکھر آئی تھی۔ وہ یوں تو دیکھنے میں شہد کی طرح میٹھی لگ رہی تھی لیکن شراب جیسی کڑوی چیز کو حلق سے اتار رہی تھی اور شاید چرس کا سگریٹ بھی پھونک رہی تھی۔ باتوں کے درمیان خمار آلود انداز میں ہنسنے کا انداز بھی بہت خوب تھا۔ عمر دراز نے اسے دور سے دیکھا تھا۔ وہ بڑی ہی پُرکشش لگی اور ساتھ ہی ساتھ خطرناک بھی محسوس ہوئی۔ کیپٹن اس کے قریب نہیں گیا۔ تھوڑی دیر بعد آرکسٹرا بجنے لگا۔ وہ اپنے ساتھی کے ساتھ اٹھ کر ڈانس فلور پر آ گئی۔ پھر یکے بعد دیگرے کئی آدمیوں کے ساتھ رقص کرنے لگی۔ وہ ساتھی بدلتی رہی ایک کا ساتھ چھوڑ کر دوسرے کا ساتھ نبھاتی رہی۔ آخر تنہا رہ گئی۔ کیپٹن پھر بھی اس کے قریب نہیں گیا۔

وہ بار کاؤنٹر کے پاس بیٹھ ہوا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ ہیلن نے اس دوران کئی بار اس کی طرف دیکھا ہے۔ یہ اس کی خوش فہمی بھی ہو سکتی تھی اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ہیلن نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے اس کی طرف دیکھ لیا ہو۔ بہر حال دوسرے دن وہ لنچ کے لیے ڈائننگ ہال میں گیا تو ہیلن وہاں تنہا بیٹھی ہوئی کچھ بور ہوتی نظر آ رہی تھی۔ اس نے کیپٹن کو دیکھتے ہی مسکرا کر ہیلو کہا۔ کیپٹن عمر دراز کے لیے اتنا ہی سہارا کافی تھا۔ وہ تیر کی طرح اس کی میز پر پہنچ گیا۔ وہ بولا۔ "تم اس جہاز کے کیپٹن ہو تمہاری وردی بتا رہی ہے۔ کیا تم ہمیشہ وردی میں رہتے ہو؟"

وہ بہت بولتی تھی۔ ایک بولتا ہے تو دوسرا سنتا ہے۔ وہ سن نہیں رہا تھا۔ اسے بولتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ وہ بڑی پیاری پیاری باتیں کرتی تھی مگر بہکی بہکی سی باتیں کرتی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ چرس کی عادی تھی۔ وہ ہر چیز سے خفا نظر آتی تھی۔ اس نے کہا۔ "وولڈ شائر میں ہماری جائیداد ہے۔ ایک محل نما عمارت ہے۔ "گلین ٹاور" پوری میوزیم لگتی ہے۔ میں انڈیا میں پیدا ہوئی تھی بچپن یورپ میں گزار ہے۔ اب پھر جوانی ہندوستان میں گزار رہی ہوں۔ یہ جو بڑا سا زمرد میری انگلی میں پڑا ہے۔ یہ کبھی کسی مہاراجہ نے میری ماں کو دیا تھا۔"

وہ تھکے تھکے لہجے میں بولتی تھی۔ اس لیے وہ بڑی تھکی تھکی نظر آتی تھی۔ اس نے

کہا۔ "یہاں ہندوستان میں میری صحت ٹھیک نہیں رہتی۔ مجھے بخار بخار سا لگتا ہے۔ اب بھی بخارا سا ہے۔ مجھے چھو کر دیکھ لو۔"

یہ کہتے ہی وہ کھسک کر قریب آ گئی۔ حالانکہ وہ صرف اپنا ہاتھ بڑھا سکتی تھی۔ عمردراز نے ہاتھ بڑھا کر اس کو چھو لیا۔ پتہ نہیں واقعی اس کو بخار تھا یا جوانی کی حرارت تھی مگر اس کی جلد کی نرمی اور گرمی اب تک اسے یاد تھی۔ وہ اب بھی اسے چاہتا تھا مگر افسوس وہ مرچکی تھی اور اپنے پیچھے اپنی ڈراونی یادیں چھوڑ گئی تھی۔

کاش وہ پہلے ہی عقل سے کام لیتا اور یہ سمجھ سکتا کہ ایک ہپی لڑکی اتنی تیزی سے اس کے قریب کیوں آتی جارہی ہے مگر کچھ اس کی ہوس پرستی اور کچھ ہیلن کی قربت نے اسے سوچنے سمجھنے کا موقع نہیں دیا۔ وہ سات دن کا سفر تھا۔ ان سات دنوں میں کیپٹن عمردراز نے زیادہ وقت ہیلن کے کیبن میں گزارا۔ جیسے ہپی نشے کے عادی ہو جاتے ہیں اسی طرح عمردراز ان سات دنوں میں ہیلن کا عادی ہو گیا تھا۔

ساتویں دن جب وہ جہاز چاٹگام کے قریب پہنچنے لگا تو ہیلن نے اس کی گردن میں باہیں ڈال کر کہا۔ "اس ملازمت سے تمہیں کیا خاک آمدنی ہوتی ہو گی۔ جان من میرے ساتھ کام کرو۔ ہم دولت سے کھیلیں گے۔"

عمردراز نے تعجب سے پوچھا۔ "تم کیا کام کرتی ہو؟"

وہ اس کے قریب تھی ذرا اور قریب ہو کر بولی۔ "چرس۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ "مجھ سے پہلے جو کیپٹن تھا اسے ملازمت سے برطرف کردیا گیا ہے۔ صرف اس لیے کہ اس کی نگرانی میں اسمگلنگ ہوتی تھی۔ اگر میں نے بھی یہی کیا تو اس ملازمت سے جاؤں گا پھر یہ کہ اسمگلنگ میرے مزاج کے خلاف ہے۔ یہاں مجھے کھانا۔ کپڑا' شراب اور شباب سب کچھ مل جاتا ہے۔ اس سے زیادہ کا لالچ بھی نہیں ہے۔"

"وہ بولی۔ "تم دولت کی خاطر نہ سہی میری خاطر ایسا کرو گے؟"

"یہی بات میں تم سے کہتا ہوں۔ تم دولت کی خاطر اسمگلنگ نہ کرو۔ میری خاطر یہ دھندا چھوڑ دو۔"

وہ مسکرا کر اسے دیکھنے لگی۔ پھر قربان ہو جانے والی اداؤں سے اس کے قریب سے قریب تر ہو کر بولی۔ "تم کیا سمجھتے ہو کہ میں تمہاری خاطر یہ دھندا نہیں چھوڑ سکتی۔ میں خود غرض نہیں ہوں۔ تمہارے لیے اس دنیا کو چھوڑ سکتی ہوں۔ آؤ تم میرے لیے یہ

ملازمت چھوڑ دو۔ وہاں چاٹگام میں میری ایک بہت بڑی کوٹھی ہے۔ بنک بیلنس ہے۔ ہر طرح کا عیش و آرام ہے۔ تمہیں کبھی کسی ملازمت کی ضرورت نہیں پیش آئے گی۔ ہم دونوں اپنی ایک نئی دنیا بسائیں گے۔ بولو منظور ہے۔"

عمردراز الجھن میں گرفتار ہو گیا۔ وہ اپنی محبت کا واسطہ دے کر اسے ملازمت چھوڑنے کے لئے کہہ رہی تھی۔ محبت کا دعویٰ دونوں کو تھا۔ مگر اس دعویٰ میں ہیلن کا پلہ بھاری تھا۔ کیونکہ عمردراز ملازمت نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "ہیلن تم خواہ مخواہ مجھے الجھن میں مبتلا کر رہی ہو۔ تم نہیں جانتیں کہ یہ جگہ مجھے کتنی پسند ہے۔ یہاں آئے دن دنیا کی بڑی بڑی ہستیوں سے ملاقاتیں ہوتی رہتی ہیں۔ تعلقات بڑھتے ہیں۔ عزت بڑھتی ہے اور پھر اس کھلے سمندر کی آزاد فضاؤں میں جو خوشی میں محسوس کرتا ہوں شاید کہیں بھی شہری زندگی میں یہ خوشی مجھے نہ مل سکے گی۔"

وہ بولی۔ "میں بھی اپنی خوشیوں کا حوالہ دے کر اتنی لمبی چوڑی تقریر کر سکتی ہوں لیکن میں ایسا نہیں کروں گی۔ میں سمجھ گئی تم مطلب کے بندے ہو۔ مجھ سے محبت کے جھوٹے وعدے کرتے رہے۔ دیکھو چرس کی اسمگلنگ اتنی بری نہیں ہے جتنی کہ ہوس کی اسمگلنگ۔ تم نے اپنی ہوس کو میری ذات کی طرف اسمگل کیا۔ تمہارے جیسے اسمگلر کسی لڑکی کو معصوم نہیں رہنے دیتے۔ بولو! ہم دونوں میں سے کون بڑا مجرم ہے؟ اگر تم ہو تو شرافت کا دعویٰ نہ کرو میرا ساتھ دو پھر مجھے گرفتار کرا دو۔ میں تمہارے ہاتھوں سے تباہ ہونا چاہتی ہوں۔ تمہیں صاف صاف بتا دیتی ہوں کہ اس وقت بھی چرس کے ایک بڑے ذخیرے کے ساتھ سفر کر رہی ہوں۔"

عمردراز نے چونک کر اسے دیکھا۔ پھر پوچھا۔ "مال کہاں ہے؟"

وہ مسکرا کر بولی۔ "مجھے گرفتار کراؤ گے؟"

"نہیں اس بار نظرانداز کر دوں گا مگر آئندہ میرے جہاز کی بلیک لسٹ میں تمہارا نام رہے گا۔"

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "میں تو مذاق کر رہی تھی۔ یقین نہ ہو تو میری تلاشی لے لو۔ پورے جہاز کا کونہ کونہ چھان مارو مگر تمہیں چرس کہیں نظر نہ آئے گی۔"

"تو پھر تم اتنی دیر سے بکواس کر رہی تھیں۔"

"میں نے بکواس کرنے کے لئے یہ سفر نہیں کیا ہے۔ ہاں زندگی میں یہ پہلی بکواس تھی کہ تمہاری محبت کے دام میں الجھ کر رہ گئی ہوں۔ اس دوران کتنی بار دل کو سمجھایا کہ

تمہیں دل سے نکال دوں مگر یہ دل کم بخت اپنے بس میں نہیں ہے۔"

"تم باتیں نہ بناؤ مال کی بات کرو۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ مال کو نہیں روکوں گا۔"

"میں نے کہہ جو دیا اگر تم تلاش کر سکو تو اسے بحری پولیس کے حوالے کر دو۔ اور میرا دعویٰ ہے کہ تم اس جہاز کے کیپٹن ہو کر بھی اس مال تک نہیں پہنچ سکتے۔"

عمر دراز اسے گہری نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ سچ مچ ہیلن کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ان چھ دنوں میں اس نے ہیلن سے بہت کچھ پایا تھا۔ اس کا تقاضا یہ تھا کہ وہ ہیلن کو کوئی نقصان نہ پہنچائے۔ اس نے اس موضوع کو نظرانداز کر دیا۔ کیبن کا ماحول سنگین ہو گیا تھا۔ رنگین بنانے کے لئے اس نے اسے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔

لیکن وہ ناراض ہو کر اس کی گرفت سے نکل گئی۔ منہ پھلا کر بولی۔ "تم مطلب پرست ہو۔ اپنے ارمانوں کو بہت یاد رکھتے ہو۔ میری کوئی بات نہیں مانتے۔ میں تم سے نہیں بولوں گی۔"

یہ کہہ کر وہ غصے سے پاؤں پٹختی ہوئی کیبن سے باہر چلی گئی۔ اسے یقین تھا کہ عمر دراز اس کے پیچھے آئے گا۔ بے شک وہ اسے بہت زیادہ چاہنے لگا تھا۔ مگر وہ چاہت ایک عیاش آدمی کی تھی جو دل کو نہیں جسم کو چاہتا ہے۔ عمر دراز نے اسے بھول جانے کی کوشش کی۔ جیسا کہ وہ اس سے پہلے کتنی ہی دوست عورتوں کو بھول چکا تھا۔

جہاز چاٹگام کی بندرگاہ پر لنگرانداز ہو گیا۔ عمر دراز الوداعی ملاقات کے لئے ہیلن کے پاس آیا۔ وہ اداس اداس تھی۔ عمر دراز کو دیکھ کر ناراضگی کا اظہار کرنے لگی۔ شکایتیں کرنے لگی اس کی بے وفائی کے طعنے دینے لگی۔ وہ چپ چاپ سنتا رہا۔ ہیلن نے جاتے جاتے کہا۔ "میں نے سنا ہے کہ یہ جہاز یہاں سے دو گھنٹے بعد جائے گا؟ کیا یہ دو گھنٹے تم میرے ساتھ شہر میں نہیں گزار سکتے؟ میں دل سے مجبور ہو کر کہہ رہی ہوں۔"

عمر دراز نے مجبوری کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "سوری ہیلن یہ دو گھنٹے ہماری بڑی مصروفیت کے ہوتے ہیں۔ ہمیں جہاز کی چیکنگ کرنی ہوتی ہے۔ میں ڈیوٹی چھوڑ کر تمہارے ساتھ نہیں جا سکوں گا۔ اگر تقدیر کو ملاقات منظور ہوئی تو ہم ضرور ملیں گے۔ ورنہ۔ اوکے۔ سوفار۔" ہیلن بوجھل قدموں سے رخصت ہونے لگی۔ جاتے جاتے اس نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ ساحلی برتھ پر پہنچنے کے بعد وہ دیر تک وہاں کھڑی رہی اور جہاز کی ریلنگ کے پاس کھڑے ہوئے کیپٹن کو پکارتی ہوئی نظروں سے دیکھتی رہی۔

کیپٹن عمر دراز اپنے دل کو سمجھاتا رہا کہ یہ سب عورتوں کے چونچلے ہیں۔ یہ اپنی ان اداؤں سے اپنی محبت کا گہرا تاثر چھوڑنا چاہتی ہے اور میں تاثرات سے عاری انسان ہوں۔

ہیلن چلی گئی اور اس کے جانے کے بعد عمر دراز کو اپنی خالی آغوش کا احساس ہوا۔ وہ اچانک ہی خود کو خالی خالی سا محسوس کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد جہاز کے پائلٹ انجینئر نے اسے بلایا۔ وہ انجن روم میں پہنچا تو پتہ چلا کہ جہاز میں کچھ خرابی پیدا ہو گئی ہے۔ اسے درست کر کے واپس لے جانے میں کم از کم بارہ گھنٹے لگیں گے یعنی دوسری صبح جہاز یہاں سے روانہ ہو گا۔

عمر دراز کو یوں لگا جیسے ہیلن کی پکارتی ہوئی نظروں کی دعائیں قبول ہو گئی ہیں۔ اس نے پائلٹ انجینئر سے کہا۔ "اچھی بات ہے اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھے شہر جانے کی اجازت دیں۔ میں کچھ شاپنگ کرنا چاہتا ہوں۔ یوں بھی یہاں میرا کوئی کام نہیں ہے۔"

وہ اجازت لے کر اپنے کیبن میں آیا۔ اپنی برساتی اٹھائی فیلٹ ہیٹ پہنی اور پھر اس کے بعد تیزی سے چلتا ہوا جہاز کی سیڑھیاں اترتا ہوا ساحل پر پہنچ گیا۔

عمر دراز کی یہ عادت تھی کہ جس سے عشق کرتا تھا اس کا نام اور پتہ ضرور لکھ لیتا تھا۔ بظاہر یہ تسلی دینے کے لئے کہ وہ انہیں یاد رکھے گا اور وقت ملا تو وہ اس پتے پر آ کر ضرور ملاقات کرے گا۔ ہیلن کا بھی پتہ اس نے نوٹ کیا تھا۔ لہٰذا اسے اس کی رہائش گاہ تک پہنچنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ وہ ایک چھوٹا سا کاٹیج نما مکان تھا۔ اس نے کال بیل کے بٹن کو دبایا۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والی ہیلن تھی۔ اسے دیکھتے ہی وہ خوشی سے کھل گئی۔ دوڑ کر اس سے لپٹ گئی اور جذباتی انداز میں بولنے لگی۔ "میں یہی چاہتی تھی کہ کوئی مجھے اتنا چاہے کہ میری طرف کھنچا چلا آئے۔ مجھے معلوم تھا کہ تم واپس آؤ گے اور تم واپس آ گئے ہو۔"

عمر دراز اس کے ساتھ کاٹیج میں چلا گیا۔ دروازہ بند ہو گیا۔ وہ دروازہ ایک گھنٹے تک بند رہا۔ اس دوران وہ ساری دنیا کو بھول گئے۔ صرف ایک دوسرے کو یاد کرنے لگے۔ ایک گھنٹے بعد ہیلن نے کہا۔ "میں لباس بدل کر آتی ہوں پھر ہم فلم دیکھنے جائیں گے۔ اس کے بعد ایک اچھے سے ہوٹل میں کھانا کھائیں گے۔" وہ سمجھ رہی تھی کہ کیپٹن نے اس کی خاطر جہاز کی ملازمت چھوڑ دی ہے۔ کیپٹن نے کہا۔ "نہیں ہیلن مجھے واپس جانا ہے۔"

ہیلن ایک دم گم صم ہو کر اس کا منہ تکنے لگی۔ پھر ناراض ہو کر بولی۔ "اب تک تم

خاموش رہے۔ تاکہ مجھے فریب دے کر مجھ سے کھیلتے رہو اور جب یہ کھیل ختم ہو جائے تو اپنے واپس جانے کی داستان سناؤ۔ میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔"

"ضد نہ کرو۔ میں تمہیں چاہتا ہوں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ میں تمہارے پاس چلا آیا ہوں۔ جب کبھی میرا جہاز ادھر آئے گا۔ میں تمہارے پاس ضرور چلا آیا کروں گا۔ ہاں! تم نے یہ نہیں بتایا کہ وہ مال تم نے کہاں پر چھپایا تھا؟"

"تمہیں میرے دھندے سے کوئی سروکار نہیں۔ پھر تم مال کے متعلق کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"تجسس ہے اس لئے پوچھ رہا ہوں۔ پھر یہ کہ میں جہاز کا کیپٹن ہوں۔ مجھے یہ معلوم ہونا چاہئے کہ آخر یہ اسمگلنگ میری لاعلمی میں کیسے ہو گئی۔"

ہیلن لاپروائی سے منہ پھیر کر اپنی خواب گاہ کی طرف جانے لگی۔ عمرداراز نے کہا۔ "ٹھہرو۔ پہلے میری بات کا جواب دو پھر چلی جانا۔ میرے پاس وقت نہیں ہے۔ مجھے ابھی واپس جانا ہے۔"

وہ خواب گاہ کے دروازے کے پاس رک گئی۔ پلٹ کر بولی۔ "میرا دل توڑنے والے یہ کیسے توقع کرتے ہو کہ میں تمہارے سوالوں کا معقول جواب دوں گی۔" یہ کہتے ہی وہ اندر گئی پھر دروازے کو ایک جھٹکے سے بند کر لیا۔ عمرداراز نے آگے بڑھ کر دروازے کو کھولنا چاہا تو وہ اندر سے لاک ہو چکا تھا۔ اس نے آواز دی لیکن اسے کوئی جواب نہیں ملا۔ وہ جھنجلا کر شراب کے کیبنٹ کے پاس آگیا۔ پھر وہاں سے بوتل اور گلاس نکال کر اپنے لیے پیگ بنانے لگا۔

پہلا پیگ ختم کرنے کے بعد اس نے پھر ہیلن کو آواز دی۔ اسے کمرے سے باہر آنے کے لیے کہا۔ مگر وہ بدستور خاموش رہی۔ اس کی خاموشی نے تجسس کو اور بڑھا دیا۔ وہ دوسرا پیگ حلق سے اتارنے لگا۔ پھر تیسرے پیگ کی باری آئی۔ اس نے چیخ کر کہا۔ "باہر آجاؤ۔ میں کہتا ہوں باہر آجاؤ۔ مجھے زیادہ نہ الجھاؤ۔ میں تم سے معلوم کر کے رہوں گا۔ میرے پاس ابھی تھوڑا وقت ہے۔ میں تمہارے ساتھ وقت گزاروں گا میری شرط یہی ہے کہ مجھے اس مال کی اسمگلنگ کے متعلق بتاؤ؟"

اس نے تیسرا پیگ بھی حلق سے اتار لیا۔ اب نشہ سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ کیونکہ اس سے پہلے بھی وہ ہیلن کے ساتھ کافی پی چکا تھا۔ اس نے خالی جام کو دروازے پر دے مارا۔ شیشے کا جام ایک چھناکے سے چکنا چور ہو گیا۔ اس جام نے جیسے اپنی ٹوٹی ہوئی آواز

سے کھل جا سم سم کہہ دیا ہو۔ اسی وقت دروازہ کھل گیا۔

وہ چونکا دینے والے انداز میں دروازے کے پاس کھڑی ہوئی تھی۔ اس کا رنگ ڈھنگ ہی بدل گیا تھا۔ وہ مغل شہزادیوں جیسا لباس پہنے ہوئے تھی۔ چست پاجامہ اور پشواز پر دوپٹہ اوڑھنے کے انداز میں بڑی مشرقیت تھی۔ وہ مغربی حسن مشرقی لباس میں ایسا جاذب نظر ہو گیا تھا کہ عمرداراز کھنچتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔ اسے سر سے پیر تک دیکھنے لگا۔ وہ بڑی سنجیدہ اور باوقار لگ رہی تھی۔

عمرداراز نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو وہ کترا کر دوسری جانب نکل گئی۔ بیرونی دروازے کی طرف آہستہ آہستہ بڑھتے ہوئے بولی۔ "میں تمہیں مجبور نہیں کروں گی۔ یہ آگ ایک طرف لگی ہوئی ہے۔ میں ہی اس آگ میں جل رہی ہوں۔ کوئی بات نہیں۔ چلو میں اپنی کار میں تمہیں بندرگاہ تک پہنچا دوں گی۔"

کیپٹن اس کی بے رخی برتنے والی سنجیدگی سے متاثر ہو گیا۔ چپ چاپ اپنی برساتی اور فیلٹ ہیٹ اٹھا کر اس کے پیچھے چلنے لگا۔ وہ کاٹیج سے باہر آئے۔ باہر ایک بوڑھا ملازم برآمدے میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہاں قدرے تاریکی تھی اور کیپٹن نے فیلٹ ہیٹ پہن رکھی تھی۔ اس نے ملازم کو دیکھا۔ شاید ملازم اس کو نہ دیکھ سکا۔ وہ ہیلن کے ساتھ چلتا ہوا اس کی کار میں آ کر بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ کار ایک پختہ سڑک پر بھاگی جا رہی تھی۔ کیپٹن نے یہ نہیں دیکھا کہ کار کدھر جا رہی ہے۔ کیونکہ اسے خود اپنا ہوش نہیں تھا کہ وہ کس رو میں بہتا جا رہا ہے۔ سامنے ہیلن کا بے پناہ حسن تھا۔ اس کی مشرقیت تھی اور پھر نشہ کھوپڑی کے اندر چیخ رہا تھا۔ ایسے میں وہ ہیلن کے متعلق ہی سوچ سکتا تھا۔ اپنی کسی انجانی منزل کی اسے پروا نہیں تھی۔ اس کے دماغ سے یہ تجسس بھی نکل گیا تھا کہ چرس کا ذخیرہ کس طرح اس کے جہاز میں رکھ کر لایا گیا ہے۔

پھر کیپٹن کو احساس ہوا کہ گاڑی کچی اور ناہموار سڑک پر سے گزر رہی ہے۔ وہ شہر سے بہت دور چلے آئے تھے۔ چاروں طرف جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ کار ایک حویلی کے سامنے پہنچ گئی۔ ہیلن نے ڈیش بورڈ کے خانے سے ایک چابی نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔ "ذرا کار سے اتر کو لوہے کے بڑے پھاٹک کو کھول دو۔ ہم کار اندر لے جائیں گے۔"

"تم مجھے کہاں لے آئی ہو؟ یہ حویلی کس کی ہے؟"

"میری ہے۔ اس لیے یہاں لے آئی ہوں۔ تم نے کہا تھا نا تمہارے پاس ابھی تھوڑا سا وقت ہے اور تم یہ وقت میرے ساتھ گزار سکتے ہو۔"

وہ جس روپ میں اس کے سامنے موجود تھی۔ اس روپ سنگھار کے لیے وہ تھوڑا سا وقت نکال سکتا تھا۔ وہ چپ چاپ کار سے اتر کر بڑے سے پھاٹک کے پاس گیا پھر اس کے زنگ آلود تالے کو چابی سے کھول دیا۔ پھاٹک کے دونوں بازو اندر کی طرف کھلتے چلے گئے۔ وہ دوبارہ کار میں آکر بیٹھ گیا پھر کار حویلی کے احاطے کے اندر رینگنے لگی۔

تھوڑی دیر پہلے موسلا دھار بارش ہو چکی تھی۔ اب بھی آسمان کہہ رہا تھا کہ صرف گرجنے والا نہیں ہے، برسنے والا بھی ہے۔ وہ حویلی تقریباً سو سال پرانی ہو گی۔ کبھی اس کے سبزہ زاروں پر مستی میں آنے والے مور رقص کرتے ہوں گے مگر اب وہاں چاروں طرف قبرستان کا سا سناٹا تھا۔ حویلی کے بیرونی دروازے کے پاس کار رک گئی۔ ہیلن نے کار سے اترتے ہوئے کہا۔

"میں تمہیں اس حویلی کی سیر کراؤں گی، یہ ہزاروں گز کے رقبے میں پھیلی ہوئی ہے۔ اندر کمرے ہی کمرے ہیں۔ بالکل عجائب گھر کی طرح ہے۔"

عمر دراز نے کار سے باہر نکل کر اس کے ساتھ حویلی کے دروازے پر پہنچتے ہوئے کہا۔ "یہ حویلی میں پھر کبھی دیکھ لوں گا۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ میں بیک وقت تمہارے اور تمہاری حویلی کے ساتھ گزاروں۔"

ہیلن نے ہنستے کھلکھلاتے ہوئے دروازے کو کھول دیا۔ اندر گہری تاریکی تھی اور حویلی مسلسل بند رہنے کی وجہ سے وہاں عجیب ناگوار سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ عمر دراز نے دیا سلائی نکال کر ایک تیلی جلائی۔ اس کی روشنی میں حویلی کا بڑا سا ہال نما کمرہ دور تک نظر آنے لگا۔ وہ کمرہ پوری طرح واضح نہیں تھا۔ اس کا تفصیلی جائزہ لینے کے لیے کافی روشنی کی ضرورت تھی۔ ہیلن آگے بڑھ گئی۔ وہ جانتی تھی کہ کون سی چیز کہاں رکھی ہوئی ہے۔ تھوڑی سی دیر میں جب عمر دراز ماچس کی تیسری تیلی سلگا رہا تھا۔ تو وہ ایک سہ شاخہ شمعدان لے آئی۔ جس میں تین بڑی بڑی موم بتیاں لگی ہوئی تھیں۔ ان موم بتیوں کو روشن کر دیا گیا۔

ہیلن اسے مختلف کمروں میں لے گئی اور گائیڈ کی نقل اتارتے ہوئے مختلف تصویروں، چاندی کے برتنوں اور دیگر چیزوں کے متعلق ساری تفصیلات بتانے لگی۔ کیپٹن سمجھ رہا تھا کہ وہ یہ حرکت صرف اس کا وقت ضائع کرنے کے لئے کر رہی ہے۔ اس نے

کئی بار ہیلن کی طرف ہاتھ بڑھایا تاکہ اپنی مرادوں تک پہنچے لیکن وہ بار بار کترا گئی۔ آخر وہ تنگ آکر بولا۔ "اب واپس چلو۔"

وہ ہنستی ہوئی بولی۔ "نہیں میں تمہیں مایوس نہیں کروں گی۔ چلو اوپر چلتے ہیں۔ خواب گاہ اوپر ہے۔" یہ کہہ کر وہ اسے ایک اور کمرے میں لے گئی۔ اس کمرے کے بعد ایک زینہ اوپری منزل پر جاتا تھا لیکن جس کمرے میں وہ پہنچے اس دیکھتے ہی عمر دراز ایک دم سے ٹھٹک گیا۔ کمرے میں انسانی ہڈیوں کے کٹ پیس رکھے ہوئے تھے۔ دو مختلف طاقوں پر دو انسانی کھوپڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ عورتوں کے سر سے کاٹے ہوئے لانبے بال مختلف ہینگروں پر لٹکے ہوئے تھے۔ ایک مُردہ سانپ بھی نظر آ رہا تھا، مٹی کے چھوٹے چھوٹے پتلے ایک طاق میں ایک قطار میں رکھے ہوئے تھے اور ان کے قریب شیطان کا ایک ننگا مجسمہ دانت نکالے ہنس رہا تھا۔ یہ سب کچھ دیکھ کر کیپٹن کو پسینہ آگیا اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "یہ سب کیا ہے؟"

وہ ہنستی ہوئی بولی۔ "یہ سب میری ماں کی نشانیاں ہیں، وہ وچ ڈاکٹر تھی۔ جادو کے ذریعے مریضوں کا علاج کرتی تھی۔ آؤ ہم اوپر چلیں۔"

وہ کیپٹن کا ہاتھ پکڑ کر کمرے سے باہر دوسری راہداری میں آگئی، اس راہداری سے ایک زینہ اوپر کی طرف گیا ہوا تھا زینے کی ریلنگ کے نچلے حصے پر ایک بارہ سنگے کا سر رکھا ہوا تھا۔ اس کے سینگ اِدھر اُدھر پھیلے ہوئے تھے۔ شمع دان کی روشنی بارہ سنگے تک نہیں پہنچ رہی تھی، وہ شمع دان ہیلن کی آڑ میں تھی۔ کیپٹن بارہ سنگے کے ان سینگوں کو نہ دیکھ سکا اس کے ساتھ چلتا ہوا اوپر کی طرف جانے لگا۔

ہیلن نے کہا۔ "ہم یہاں رہا کریں گے، یہ جگہ بہت ہی خوبصورت ہے، تمہیں تو پسند نہیں ہو گی؟"

"میں کہہ چکا ہو کہ واپس جانے کے لئے آیا ہوں۔ یہاں رہنے کے لئے نہیں۔"

وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ "صاف کیوں نہیں کہتے کہ جہاز میں اپنی ایک جنت بسالی ہے، وہاں اپنے کیبن میں ایک حرم آباد کرتے رہتے ہو، میں اب تمہارے لئے پرانی ہو چکی ہوں۔"

عمر دراز نے اوپر پہنچ کر کہا۔ "دیکھو جھگڑے کی باتیں نہ کرو، تمہارے کہنے سے میں اتنی دور چلا آیا، ناراضگی ختم کرو اور میرے پاس آجاؤ۔"

وہ پیچھے ہٹ کر بولی۔ "نہیں، پہلے وعدہ کرو کہ اب یہاں سے نہیں جاؤ گے۔"

"مجھے کیوں پریشان کر رہی ہو۔ اگر تم مجھے زبردستی روکنا چاہتی ہو تو میں ابھی یہاں سے واپس چلا جاؤں گا' تم اپنی کار میں نہیں لے جاؤ گی تو پیدل چلا جاؤں گا۔"

وہ ہنستی ہوئی بولی۔"تم مرد عجیب ہوتے ہو' کسی کے حسن و شباب میں کھو کر یہ نہیں دیکھتے کہ جنت میں جا رہے ہو یا جہنم میں؟ بہرحال میں تمہیں جہنم میں نہیں لے جاؤں گی لیکن یہ بتا دو کہ کار کا فیول میٹر نہیں دیکھا اگر دیکھ لیتے تو تمہیں معلوم ہوتا کہ کار میں پٹرول برائے نام رہ گیا ہے۔"

عمر دراز اس چالاکی پر بری طرح جھلا گیا' ایک الٹا ہاتھ اس کے منہ پر رسید کرتے ہوئے بولا۔"تم نے مجھے بے وقوف بنایا ہے یہاں لا کر میرا مذاق اڑایا ہے' بتاؤ اب میں کیسے واپس جاؤں؟"

وہ مار کھا کر ہنسنے لگی کیونکہ وہ جیت رہی تھی۔ عمر دراز نے غصے سے کہا۔"تم کیا سمجھتی ہو میں یہاں سے پیدل واپس نہیں جا سکوں گا۔ خواہ سینکڑوں میل تک چلنا پڑے لیکن میں صبح تک چلتے چلتے اپنے جہاز تک پہنچ جاؤں گا۔"

یہ کہتے ہی وہ جانے کے لئے پلٹ گیا' ہیلن شمع دان کو نیچے رکھ کر اس سے لپٹ گئی۔"میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔"

وہ خود کو چھڑانے لگا۔"دور ہٹ جاؤ۔ اب میں تمہیں چھونا بھی گوارہ نہیں کرتا۔ تم کہتی ہو کہ میں نے محبت کا فریب دیا ہے لیکن تم مجھے فریب دے کر یہاں لائی ہو۔"

اس نے اپنی گردن سے اس کی باہوں کو الگ کرتے ہوئے زور سے دھکا دیا۔ وہ ایک دم سے پیچھے گئی' زینے کے اوپری سرے پر لڑکھڑائی پھر اپنا توازن قائم نہ رکھ سکی۔ حویلی کے سناٹے میں اس کی ایک دل ہلا دینے والی چیخ سنائی دے رہی تھی۔ عمر دراز ایک دم بوکھلا گیا وہ اسے اس حد تک مارنا نہیں چاہتا تھا اس نے جلدی سے شمع دان اٹھائی اس کے ساتھ ہی اسے زینے کے نچلے حصے تک کا منظر نظر آ گیا۔ سیڑھیوں پر لڑھکتے رہنے کے باعث بارہ سنگے کا سر نیچے گر پڑا تھا اور وہ ان سینگوں کے درمیان جا کر الجھ گئی تھی۔ وہ تیزی سے زینے طے کرتا ہوا ہیلن کے قریب پہنچا پھر ایک دم سے سہم گیا۔ بارہ سنگے کا ایک سینگ اس کی پشت کی جانب پیوست ہو کر اوپر سینے کی طرف نکل آیا تھا اور وہ نوکیلا سینگ اس کے لہو سے تربتر تھا۔ ہیلن کے دیدے پھیل گئے تھے۔ وہ اٹک اٹک کر بہت مشکل سے سانس لیتی ہوئی بولی۔"میں........ نہیں........ جانے دوں گی۔ تم جاؤ گے تو ضرور واپس آؤ گے۔ میں........ کہتی ہوں........ تمہیں میرے پاس واپس آنا

پڑے گا بہتر ہے........ نہ جاؤ........ نہ........ نہ........"

یہ کہتے کہتے اس کی سانس اکھڑ گئی۔ اس نے حسرت بھری نظروں سے اسے دیکھا پھر اس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔

باہر خوفناک آواز میں بادل گرج رہے تھے' اندر ان کی گرجتی ہوئی آواز گونج رہی تھی۔ در و دیوار لرز رہے تھے۔ کیپٹن پیچھے ہٹ کر دیوار سے لگ گیا' اس کے گھٹنے کانپ رہے تھے' اس کے ہاتھ سے شمع دان گرنے ہی والی تھی۔ وہ کمزور دل کا آدمی نہ تھا لیکن یہ خوف سر ابھار رہا تھا کہ اگر یہاں کسی کی آنکھ دیکھتی ہو تو پھر وہ ہیلن کا قاتل کہلائے گا۔

وہ سہمی ہوئی نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگا' موم بتی کی روشنی سے اسے جہاں تک دکھائی دیا کوئی اسے نظر نہیں آیا اور اسے یقین تھا کہ جب وہ ہیلن کے ساتھ اس حویلی میں داخل ہوا تھا تو وہاں کوئی تیسرا نہیں تھا' دروازہ انہوں نے خود کھولا تھا اور اندر کسی کی موجودگی کا امکان نہیں تھا۔ وہاں سے بھاگ جانے میں ہی بھلائی تھی' وہ اپنے شانے پر رکھی ہوئی برساتی کو سنبھالتا ہوا تیزی سے چلتا ہوا کمرے میں پہنچا' اس کمرے میں رکھی ہوئی دو انسانی کھوپڑیاں اپنی اندھی اور گہری آنکھوں سے اسے گھور رہی تھیں۔ شیطان کا مجسمہ دانت نکالے اس کی حالتِ زار پر ہنس رہا تھا۔ وہ دوڑتا ہوا اس کمرے سے نکل گیا پھر کتنے ہی کمروں کو عبور کرتا ہوا وہ حویلی سے باہر آ گیا۔ باہر پہنچتے ہی ہوا کا تیز جھونکا ایسا آیا کہ شمع دان کی بتیاں بجھ گئیں۔ اس نے شمع دان کو حویلی کے اندر پھینک دیا۔ بارش زور و شور سے جاری تھی' تیز ہوائیں چیخ رہی تھیں۔ آسمان پر بجلیاں رہ رہ کر ادھر سے ادھر ناچتی' تھرکتی جا رہی تھیں۔ اس نے جلدی سے اپنی برساتی پہنی اس کے بٹن لگائے' فلیٹ ہیٹ کو سر پر اچھی طرح جمایا پھر اس کے بعد تیزی سے اس حویلی کے احاطے کو عبور کرنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ اسے کسی نے نہیں دیکھا ہے لیکن حویلی کے ایک جھروکے سے دو زندہ آنکھیں اسے گھور رہی تھیں۔ وہ آنکھیں خاموش تھیں اور ایک قاتل کے فرار ہونے کا تماشا خاموشی سے دیکھ رہی تھیں۔

وہ کبھی تیزی سے چل رہا تھا اور کبھی دوڑ رہا تھا۔ جب دوڑتے دوڑتے تھک جاتا تو پھر چلنے لگتا۔ اس کے پاؤں کیچڑ اور پانی میں ڈوب رہے تھے۔ جوتے اور پتلون کے پائنچے کیچڑ آلود ہو کر ایسے ہو گئے تھے جیسے قانون کی بیڑیاں پڑ گئی ہوں۔ چلنا دشوار ہو رہا تھا لیکن تقدیر کے کوڑے اس کی پیٹھ پر برس رہے تھے اور اسے آگے کی طرف دھکیلتے جا رہے تھے۔ وہ اپنی زندگی کے لئے آگے اور آگے اپنی چھوڑی ہوئی منزل کی طرف چلتا جا رہا تھا۔

بارش تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ بنگال کی برسات ایسی ہی ہوتی ہے۔ کبھی زندہ عورت کی طرح سر پر برستی ہے۔ کبھی مُردہ عورت کی طرح چڑیل بن کر پیچھا پکڑ لیتی ہے۔ وہ مسلسل تین گھنٹے تک چلتا رہا۔ ویران راستے پر ایسی تیز بارش میں کوئی راہ گیر یا کوئی گاڑی گزرتی ہوئی نظر نہیں آ رہی تھی۔ چوتھے گھنٹے کے بعد دور سے کسی گاڑی کی روشنی دکھائی دی۔ وہ رک گیا۔ سڑک کے بیچ آ کر کھڑا ہو گیا پھر دونوں ہاتھ اٹھا کر چیخنے لگا۔

آنے والی گاڑی میں اس کے انجانے دشمن بھی ہو سکتے تھے اور ایسے لوگ بھی ہو سکتے تھے جو ویرانے میں مسافروں کو لوٹ لیا کرتے ہیں۔ تھوڑی سی دیر میں ایک بڑا سا ٹرک اس کے سامنے آ کر رک گیا۔ اس نے ٹرک ڈرائیور کو الٹی سیدھی داستان سنائی کہ وہ یہاں کس طرح آ کر پھنسا ہے۔ ٹرک ڈرائیور نے بڑی انسانیت کا ثبوت دیا۔ اسے اپنے کلینر کے ساتھ بٹھالیا۔ پھر وہ گاڑی آگے بڑھ گئی۔ اس طرح وہ صبح ہونے سے پہلے ہی اپنے جہاز تک پہنچ گیا۔ اس اطمینان کے ساتھ کہ اسے کسی نے حویلی کی طرف جاتے ہوئے اور واپس آتے ہوئے نہیں دیکھا ہے۔ ٹرک ڈرائیور اور کلینر کی بات دوسری تھی ۔ وہ اتنے عرصے بعد اب اسے پہچان نہیں سکتے تھے۔ برسات کی اندھیری رات میں انہوں نے عمر دراز کا چہرہ پوری وضاحت کے ساتھ نہیں دیکھا ہو گا۔

☆======☆======☆

عمر دراز ماضی کی یادوں سے واپس آ گیا۔ وہ بہت دیر سے ریلنگ کے پاس کھڑا سمندر کو تک رہا تھا اور ہیلن کے متعلق سوچ رہا تھا کہ ہیلن کی روح مونا کو پریشان کر رہی ہے۔ یا مونا ہیلن کی آلہ کار بن کر اسے یہاں پریشان کرنے کے لئے آ گئی ہے۔

وہ ریلنگ کے پاس سے پلٹ گیا۔ پلٹنے کے بعد نگاہوں کے سامنے ذرا دور کیبن نمبر بی سیون نظر آ رہا تھا۔ اس کا دروازہ بند تھا لیکن دماغی آنکھیں پھر اس کے دروازے کے پیچھے ہیلن کو روتے اور فریاد کرتے دیکھ رہی تھیں۔ کیونکہ ابھی ابھی ماضی کی یادیں تازہ ہوئی تھیں۔ اس لیے اب وہ بال کھولے ہوئے رونے والی فریاد کرنے والی ہیلن بارہ سنگے کے سینگوں کے درمیان چاروں شانے چت پڑی ہوئی تھی اور اس کے سینے سے لہو ابل رہا تھا۔

اس نے ذہن کو جھٹک کر سوچا۔ وہ مر چکی ہے اور اس مرنے والی کے ساتھ کسی نے اسے اس رات حویلی نہیں دیکھا تھا۔ وہ فیلٹ ہیٹ پہنے ہوئے تھا اور برساتی کے کالروں کو اوپر چڑھائے ہوئے تھا۔ تقریباً اس کا نصف چہرہ چھپا ہوا تھا۔ ہیلن کا ملازم بھی

اسے چہرے سے نہیں پہچان سکا ہو گا۔ جب وہ حویلی پہنچے تو وہاں بھی کوئی تیسری ہستی موجود نہیں تھی۔ واپسی میں صرف ٹرک ڈرائیور اور کلینر اسے پہچان سکتے تھے۔ مگر چھ ماہ کے عرصے میں پتہ نہیں وہ ٹرک ڈرائیور اور کلینر کہاں ہوں گے۔ اس اندھیری رات میں ایک بھٹکنے والے مسافر کو شاید کبھی نہیں پہچان سکیں گے۔

بالفرض محال قانون اگر ہیلن کے قاتل کی تلاش میں تھا تو عمر دراز کو کیسے پہنچان سکتا تھا۔ جب کہ کوئی چشم دید گواہ بھی موجود نہیں تھا اور جہاز سے اتر کر چاٹگام شہر کی طرف جاتے وقت بھی کسی کو یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ ہیلن سے ملنے کے لیے جا رہا ہے۔

وہ کیبن نمبر بی سیون کی طرف دیکھنے لگا اگر قانون اس کا پیچھا نہیں کر رہا تھا تو یہی بات سمجھ میں آتی تھی کہ ہیلن کی روح اسے واپس بلا رہی ہے۔ اس نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ واپس آئے گا اور ضرور واپس آئے گا اور اسے واپس لانے کے لیے ہیلن کی روح مونا کو واسطہ بنا کر جال بچھا رہی تھی اور یہ جال کھینچتے کھینچتے حویلی کی طرف پہنچایا جانے والا تھا۔

وہ اپنی دو انگلیوں سے اپنی پیشانی رگڑنے لگا تھا۔ پریشانی یہ تھی کہ جہاز آہستہ آہستہ سمندر کی چھاتی پر رینگتا ہوا چاٹگام کی طرف جا رہا تھا۔ اسی شہر کی طرف جہاں سے میلوں دور وہ حویلی تھی۔ اگر اس کے بس میں ہوتا تو جہاز کا رخ موڑ دیتا یا پھر سری لنکا پہنچ کر اپنا سفر ملتوی کر دیتا لیکن وہ محض ایک مسافر نہیں تھا۔ جہاز کا کیپٹن تھا اور دوسرے مسافروں کو ان کی آخری منزل پر پہنچانا اس کا فرض تھا اور وہ دوران سفر نہ تو فرائض سے سبکدوش ہو سکتا تھا اور نہ ہی استعفا پیش کر سکتا تھا۔ اس کا سر دکھنے لگا۔ اسے وہسکی کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ ان حالات میں شراب ہی سہارا دیتی ہے۔ تھکے ہوئے ذہن کو سکون پہنچاتی ہے۔ یہ کسی ڈاکٹر کا نسخہ نہیں ہے۔ بس شرابیوں کا اپنا خیال ہے۔ بہر حال وہ وہاں سے تیز قدم بڑھاتا ہوا اس ہال میں پہنچا جہاں کاک ٹیل پارٹی کا انتظام کیا گیا تھا۔ سادھنا بہت دیر سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی آگے بڑھتے ہوئے بولی۔

"اوہ کیپٹن! تم کہاں رہ گئے تھے۔ میں یہاں بور ہو رہی ہوں۔ ایک تو پینے سے ڈرتی ہوں۔ دوسرے یہ کہ یہاں میرا کوئی شناسا نہیں ہے۔" سادھنا نے غضب کی ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ جیسے شرابی شراب کی بوتل کی گردن کو پکڑتا ہے' اسی طرح عمر دراز نے اس کی کمر کو تھام لیا۔ ایسی ہی نازک سی پتلی کمر تھی۔ وہ بڑی ہی میٹھی ناراضگی سے بولی۔

"شریر کہیں کے' میں ہندوستانی عورت ہوں' انگریز نہیں کہ بھری محفل میں تمہاری اس بے باکی پر اعتراض نہ کروں۔ چلو الگ ہو جاؤ۔"

وہ الگ ہوگیا پھر اس کا ہاتھ تھام کر اس میز کی جانب بڑھنے لگا جہاں مختلف اقسام کی وہسکی کی بوتلیں اور برف کے کیوبس بھی رکھے ہوئے تھے۔ وہ اپنے لیے کاک ٹیل بنانے لگا۔ سادھنا حیرانی سے بولی۔

"تم اتنی شراب کو ایک گلاس میں ڈال کر پی رہے ہو کیا تم بہکو گے نہیں؟"

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔"یوں تو تمہیں دیکھ کر ہی بہک رہا ہوں۔ ویسے پینے کے بعد شاید سنبھل جاؤں۔"

اس نے بظاہر سادھنا کو خوش کرنے کے لیے ایسا کہا تھا لیکن وہ سادھنا کی طرف سے نہیں، ہیلن کی یادوں کی طرف سے سنبھلنا چاہتا تھا اور سمجھنا چاہتا تھا کہ وہ مرنے کے بعد کیبن نمبر الیون میں پھر کیسے زندہ ہوگئی ہے اور اپنی زندگی کا ثبوت دینے کے لیے مونا کی زبان سے کیسے بول رہی ہے۔ کیا ان باتوں پر یقین کیا جا سکتا ہے۔

وہ الجھنوں میں مبتلا ہو سکتا تھا لیکن یقین نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے اس نے گھونٹ گھونٹ پینا شروع کیا پھر پینے کی رفتار بڑھنے لگی۔ دن کے وقت سادھنا کے ساتھ یہ پروگرام طے ہوا تھا کہ وہ کاک ٹیل پارٹی میں بہت کم پئیں گے۔ اس کے بعد وہ لوگ فلم دیکھیں گے پھر کیبن میں آنے کے بعد سادھنا کو تھوڑی سی پلائے گا۔ اس کے بعد وہ ڈنر کھانے کے لیے ہال میں جائیں گے لیکن اب وہ سب کچھ بھول گیا تھا۔ صرف ہیلن کو نہیں بھول سکا تھا۔ اسے بھلانے کے لیے گھونٹ پر گھونٹ چڑھا رہا تھا۔

ڈوبنے والا سہارا چاہتا ہے۔ وہ کبھی بوتلوں کی طرف بھاگ رہا تھا کبھی سادھنا کی طرف اور سادھنا برائے نام مزاحمت کر رہی تھی۔ ایک بار عمر دراز نے اسے پینے کے لیے مجبور کیا۔ اس نے کبھی پی نہیں تھی۔ پہلا پیگ پیتے ہی وہ بہکنے لگی یا پھر بہکنے کا بہانہ چاہتی تھی۔ اس لیے پینے پر راضی ہوگئی تھی۔

شراب میں یہ خاصیت ہے کہ وہ شرم کو دھو ڈالتی ہے۔ پہلے وہ بدک رہی تھی پھر سہارا لینے کے بہانے بار بار کیپٹن پر گرنے لگی۔ اس پارٹی میں انگریز مردوں اور عورتوں کی تعداد زیادہ تھی اور وہ عورتیں اپنی تہذیب کے مطابق پینے پلانے کی عادی تھیں۔ سادھنا کو بہکتے دیکھ کر سب کے سب ہنسنے لگے۔ عمر دراز اسے سہارا دے کر باہر لے جانے لگا لیکن وہ نشے میں ایسی نڈھال ہوگئی تھی کہ قدم بڑھانا بھول گئی تھی۔ اس کے پاؤں نہیں اٹھ رہے تھے۔ وہ سادھنا کو کھینچتا ہوا کسی طرح دروازے تک لایا۔ پھر اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ مجبوری تھی لہٰذا اسے دونوں بازوؤں میں اٹھا لیا۔ پہلے تو وہ اپنے ہی بوجھ سے

لڑکھڑانے لگا تھا پھر سادھنا کے بوجھ سے لڑکھڑانے لگا۔ ہال میں قہقہے بلند ہو رہے تھے۔ وہ دونوں اچھی خاصی تفریح بن گئے تھے۔ ایک تماشہ بن کر لوگوں کو ہنسا رہے تھے۔ وہ کسی طرح ہال سے باہر آگیا۔ باہر چاند نکل آیا تھا۔ سمندر کی گود میں چاندنی مسکرا رہی تھی اور اس کے بازوؤں میں سادھنا بڑبڑا رہی تھی۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولا۔

"چپ رہو۔ نہیں تو میں سمندر میں تمہیں پھینک دوں گا۔"

وہ لڑکھڑا کر سادھنا کو لیے گر پڑا۔ وہ دونوں فرش پر ریلنگ کے قریب ہی گرے تھے۔ اگر وہ سادھنا کو ذرا سا لڑھکا دیتا تو وہ لڑھکتی ہوئی ریلنگ تک پہنچ جاتی اور اگر اسے ذرا سا اچھال دیتا تو وہ سمندر میں پہنچ جاتی۔ وہ بولی۔

"میرا سر گھوم رہا ہے۔ یہ جہاز گھوم رہا ہے۔"

وہ بولا۔" تمہارا باپ گھوم رہا ہے۔ تم نے پہلی بار پی ہے۔ اس لیے تم نہیں جانتیں۔ اِدھر دیکھو۔ اُدھر دیکھو۔ آگے دیکھو۔ پیچھے دیکھو۔ ساری دنیا ساکت ہے صرف ہیلن گھوم رہی ہے۔"

اتنے میں دو اسٹیوارڈ وہاں آئے وہ سہارا دے کر اپنے کیپٹن کو اٹھانے لگے۔"سر آپ اپنے کیبن میں چلے جائیں۔"

وہ ان کے ہاتھ جھٹک کر کھڑا ہوگیا پھر بولا۔"سہارے کی مجھے نہیں اس عورت کو ضرورت ہے۔ اسے اس کے کیبن میں پہنچا دو۔"

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا اور ریلنگ کا سہارا لے کر کھڑا ہوگیا۔ عادی پینے والوں کو مدہوشی کی حالت میں بھی ہوش رہتا ہے۔ وہ نشے میں آس پاس کے ماحول کو کسی قدر سمجھتے ہیں۔ بالکل ہی دماغ سے باہر نہیں ہو جاتے۔ صرف عادت سے مجبور ہو کر مستی بھری مدہوشی کی نمائش کرتے ہیں۔ لہٰذا اسے یہ سوچ کر ندامت سی ہو رہی تھی کہ اس کے ماتحتوں نے ایک عورت کے ساتھ اسے نشے کی حالت میں گرتے پڑتے دیکھ لیا ہے۔

وہ ریلنگ کا سہارا لیتا ہوا آگے بڑھنے لگا تاکہ لڑکھڑاتی ہوئی چال دوسروں کو محسوس نہ ہو۔ وہ اب اپنی مدہوشی کو چھپا رہا تھا۔ خود کو ہوش مند ثابت کرنے کے لیے اکڑ کر چل رہا تھا لیکن آگے جا کر ریلنگ کے سہارے کو چھوڑنا پڑا۔ کیوں کہ اپنے کیبن کی طرف جانے کے لیے راستہ دوسرا تھا۔

وہ ریلنگ کو چھوڑ کر اسکیپر روم کی طرف قدم جما جما کر چلنے لگا۔ جیسے کوئی بچہ پہلی بار چلنا سیکھ رہا ہو۔ خود کو ہوش مند ثابت کرنے کی دھن میں وہ بڑا مضحکہ خیز نظر آرہا تھا۔

اسکیپر روم کے پاس سے گزرنے کے بعد وہ دیوار کا سہارا لیتا ہوا اپنے کیبن کے دروازے کے سامنے پہنچ گیا پھر اس نے جیب سے چابی نکال کر دروازے کے کی ہول میں ڈالنے کی کوشش کی۔ چابی نشے کی حالت میں اِدھر سے اُدھر ہو رہی تھی۔ اچانک ہی بند دروازے کے پیچھے اپنے کیبن میں اسے کچھ آوازیں سنائی دیں۔ پتہ نہیں وہ واقعی آواز آئی تھی یا وہ نشے کی حالت میں ایسا سوچ رہا تھا۔

بڑی کوششوں کے بعد چابی اپنی صحیح جگہ لگ گئی۔ وہ اب بھی یہ سوچ رہا تھا کہ دروازہ مقفل ہے پھر بھلا اندر کون ہو سکتا ہے۔ اس نے اپنی چابی کو کی ہول میں گھمایا تو سمجھ میں نہیں آیا کہ پہلے ہی اس چابی کو کی ہول میں گھما چکا تھا یا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ اس نے ہینڈل پر دباؤ ڈالا تو واقعی وہ دروازہ کھل گیا۔

وہ کیبن کی بتی بجھا کر گیا تھا لیکن اس وقت لائٹ آن تھی۔ کیبن کے اندر روشنی میں کھلے ہوئے دروازے سے ذرا دور مونا کھڑی ہوئی تھی۔ وہی لانبی لانبی زلفیں بکھرائے ہوئے بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے اسے تک رہی تھی۔ وہ اپنی آنکھیں مل مل کر دیکھنے لگا۔ وہ خواب نہیں تھا۔ نشے کا نظارہ نہیں تھا۔ حقیقتاً وہ اس کے سامنے موجود تھی۔ "تم............ یہ تم............؟"

"ہاں۔ میں ہوں' بہت دیر سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔"

وہ کیبن کے اندر داخل ہوتے وقت ذرا سا لڑکھڑایا۔ پھر سنبھل گیا۔ اسے خیال آیا کہ مونا کے سامنے خود کو مدہوش نہیں ثابت کرنا چاہیے۔ وہ دیوار کا سہارا لے کر بولا۔ "یہ کیبن مقفل تھا۔ تم اندر کیسے آگئیں؟"

"میں جب یہاں آئی تو دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میرا مطلب ہے دروازہ تو بند تھا لیکن جب میں نے ہینڈل کو پکڑا تو یہ دروازہ کھل گیا۔"

"تم جھوٹ بولتی ہو۔"

"پتہ نہیں کیوں آپ میری ہر بات کو جھوٹ سمجھتے ہیں۔ میں نے اپنے کیبن کا واقعہ سنایا تو آپ نے یقین نہیں کیا۔ مجھے جھوٹی مکار۔ فریبی نہ جانے کیا کیا سمجھنے لگے۔ آپ نے مجھے بری طرح ڈانٹا بھی تھا۔ اب یہاں دروازہ کھلا ہوا تھا اور میں آکر انتظار کرنے لگی تو یہ بھی آپ کو جھوٹ لگ رہا ہے۔ آخر آپ دنیا میں کسی کو سچا سمجھتے ہیں یا نہیں؟"

وہ سر گھما کر دروازے کو دیکھنے لگا۔ اسے یاد آیا جب وہ کیبن سے نکل کر جا رہا تھا تو

اس وقت وہ ہیلن کی یادوں میں بری طرح الجھا ہوا تھا۔ اس نے دروازہ بند کیا تھا ممکن ہے اس وقت کی ہول میں چابی گھمانا بھول گیا ہو۔ ایسا ہو سکتا تھا' ہر بات میں کسی کو جھوٹا کہنا مناسب نہیں ہے۔ اس نے دوبارہ سر کو گھما کر مونا کی جانب دیکھا۔ وہ ایک سچائی کی طرح اس کے سامنے جلوہ گر تھی۔ اسے یاد آیا کہ اس وقت اسے سادھنا کے ساتھ اس کے کیبن میں جانا تھا' وقت اس کے ساتھ گزارنا تھا مگر یہ جو وقت ہوتا ہے یہ اپنے بہاؤ میں کہیں سے کہیں پہنچا دیتا ہے اور وہ مونا کے سامنے پہنچ گیا تھا۔ مونا کو دیکھ کر نشے میں کمی آگئی تھی' شاید اس لئے کہ مونا کو دیکھ کر ہیلن یاد آگئی تھی اور ہیلن ایسی تھی کہ وہ صرف ہوش نہیں اڑاتی تھی نشے کو بھی پانی پانی کر دیتی تھی۔ اس نے سخت لہجے میں پوچھا۔ "تم ہیلن کو جانتی ہو؟"

وہ حیرانی سے بڑی بڑی آنکھیں دکھاتی ہوئی بولی۔ "کون ہیلن؟"

"معصوم نہ بنو' میں اچھی طرح سمجھ رہا ہوں' تم یہاں تنہا نہیں ہو۔ تمہارے ساتھ ضرور سی آئی اے والے ہیں اور تم ان کے اشارے پر مجھے پھانسنے کے لئے ڈرامہ کھیل رہی ہو۔"

اس کے معصوم چہرے سے پریشانی ظاہر ہو رہی تھی' شاید وہ ان الزامات کو سمجھنا چاہتی تھی جو اس پر عائد کئے جا رہے تھے۔ وہ بے بسی سے بولی۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ میں لالچی نہیں ہوں' سوسائٹی گرل نہیں ہوں کہ آپ کو پھانسنے کے لئے کوئی جال پھینکوں گی اور ....اور یہ سی آئی اے والے کیا ہوتے ہیں؟ آپ وضاحت کریں گے؟"

عمر دراز کو اپنی حماقت کا احساس ہوا' وہ نشہ کی حالت میں ایسی باتیں کر چکا تھا جن سے اس کے کسی جرم کی نشاندہی ہو سکتی تھی' وہ جلد ہی اپنے طور پر سنبھلتے ہوئے بولا۔ "میں شاید نشے میں ہوں پتہ نہیں کیسی الٹی سیدھی باتیں کہہ گیا' دراصل میں تم سے ایک بہت اہم سوال کرنا چاہتا ہوں کیا تم پوری سچائی سے جواب دو گی؟"

وہ ایک قدم آگے بڑھ کر بولی۔ "یہ میری سب سے بڑی خواہش ہے کہ آپ مجھے جھوٹی لڑکی نہ سمجھیں' میں پہلے بھی سچ بولتی رہی ہوں اور اب بھی سچ بولوں گی' آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

اس نے پوچھا۔ "کیا تم سٹیج یا فلمی فنکارہ ہو؟"

"ہاں میں سٹیج پر جاتی ہوں' کام کرتی ہوں اور اکثر ہیروئن کا رول ادا کرتی ہوں۔"

"تم نے کسی ڈرامے میں ایک دہشت زدہ لڑکی کا رول ادا کیا ہو گا؟"

وہ اثبات میں سر ہلا کر بولی۔ "ہاں میں نے ایک ایسی لڑکی کا رول ادا کیا ہے جسے......" وہ کہتے کہتے رک گئی پھر تعجب سے بولی۔ "ان سوالوں کا کیا مطلب ہے؟"

"مونا میں سوال کر رہا ہوں تم جواب دو' ہاں تو تم نے ایک دہشت زدہ لڑکی کا رول ادا کیا تھا؟"

"جی ہاں ' اس ڈرامہ کی کہانی کچھ یوں تھی کہ میری بوڑھی ماں کو بدمعاشوں نے اغوا کرلیا تھا پھر وہ میری مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بولے کہ اگر میں اپنی ماں کی واپسی چاہتی ہوں اور اسے زندہ و سلامت دیکھنا چاہتی ہوں تو مجھے اس ڈرامہ کے ہیرو سے محبت کرنی ہو گی۔ میں ڈرامے کے اس سین میں ایسا کرنے سے ہچکچاتی رہی۔ دوسرے سین میں اس ہیرو سے ملنا ہوا تو میں آپ ہی آپ اس کی محبت میں گرفتار ہو گئی' وہ اتنا خوبرو اور اتنا سمارٹ لگ رہا تھا کہ میں بے اختیار بدمعاشوں کے طریقہ کار پر عمل کرتی چلی گئی۔"

"میں خوبرو اور سمارٹ نہیں ہوں؟"

اس نے جھجکتی اور شرماتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا پھر اس کی نظریں جھک گئیں' یہ ایسی ادا تھی کہ اس سے دل کا بھید کھل گیا۔ وہ آگے بڑھ کر لڑکھڑایا تو سہارے کے لئے مونا پر جھک گیا۔ اگر اس کا سہارا نہ لیتا تو شاید گر پڑتا' مونا بھی اچانک ہی اس کا سہارا نہ بن سکی تھی وہ بھی گرنے والی تھی مگر دونوں نے ایک دوسرے کو سنبھال لیا پھر عمر دراز نے پوچھا۔ "اب بھی بتادو کہ میں تمہارے کس ڈرامے کا ہیرو ہوں؟"

وہ سانسوں کی ہلچل میں بولی۔ "میں نہیں جانتی کہ مجھے کیا ہو گیا ہے' مجھے آپ کی طرف جھکنا نہیں چاہئے۔ یہ بہت برا ہوا' مجھے جانے دیجئے۔"

مونا نے جذبے کی ہلچل میں خود کو اتنی تیزی سے چھڑایا کہ عمر دراز سنبھل نہ سکا' برتھ پر گر پڑا۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی کیبن کے باہر چلی گئی' عمر دراز نے اسے آواز دی۔

"ہیلن...... ہیلن......"

پھر وہ گڑبڑا گیا۔ اسے مونا کو آواز دینا چاہئے تھی مگر وہ نشے کی حالت میں ہیلن کو پکار رہا تھا۔ یہ اس کی دماغی کمزوری تھی کہ ہیلن اس کے حواس پر چھا گئی تھی۔ اس کے لاشعور میں یہ بات تھی کہ وہاں آنے والی مونا نہیں ہیلن تھی۔

وہ برتھ پر سے اٹھ کر بیٹھ گیا' وہ چاہتا تھا کہ جانے والی کے پیچھے جائے پھر اسے

خیال آیا کہ کیبن سے باہر جا کر قدم جما جما کر چلنا ہو گا۔ اپنے نشے اور لڑکھڑاہٹ کو چھپانا ہو گا اور یہ بڑی مضحکہ خیز بات ہوتی۔ اس کا سر چکرا رہا تھا۔ وہ خود سمجھ رہا تھا کہ کیبن سے نکل کر زیادہ دور نہیں جا سکے گا بہرحال وہ تھک ہار کر دوبارہ برتھ پر لیٹ گیا۔

☆======☆======☆

دوسرے دن اس کی آنکھ کھلی تو اس کا دماغ بوجھل بوجھل سا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ نیند کی حالت میں ہیلن کو پکارتا رہا ہو اور کیبن میں ہیلن کو آتے جاتے دیکھتا رہا ہو۔

وہ پریشان ہو کر اٹھ گیا' باتھ روم میں چلا گیا۔ غسل وغیرہ کرنے اور لباس تبدیل کرنے کے دوران وہ سوچتا رہا کہ وہ مونا سے ملے گا اور اس سے باتیں کرے گا۔ اسے اچھی طرح یاد آرہا تھا کہ وہی اس کے کمرے میں آئی تھی' وہ کوئی سپنا یا نشے کا ردعمل نہیں تھا۔ مونا کی وہ باتیں یاد آ رہی تھیں کہ اس نے ایک کہانی میں دہشت زدہ لڑکی کا رول ادا کیا تھا اور بدمعاشوں کے اشارے پر ایک خوبرو نوجوان سے محبت کی ابتدا کی تھی۔

وہ سنجیدگی سے سوچنے لگا کیا ایک ڈرامائی محبت کی ابتدا ہو چکی ہے۔ جو کچھ ہوا اس سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ مونا محبت کی ابتدا سے گھبرائی ہوئی تھی اس لئے بھاگ گئی تھی۔ اس نے مونا سے جو سوال کیا تھا اس کا جواب ادھورا رہ گیا تھا وہ اس جواب کی تکمیل کے لئے کیبن سے باہر آگیا۔

باہر سمندر پر دور تک کہر پھیلی ہوئی تھی' جہاز کے اندر بھی کہر کی دھند چھائی ہوئی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا مونا کے کیبن کے دروازے کے سامنے آیا' اس دروازے پر ایک تختی لگی ہوئی تھی۔ "دستک نہ دو۔"

جہاز کے سفر کے دوران عموماً ایسا ہوتا ہے' مسافر سونے سے پہلے اپنے کیبن کے دروازے پر دستک نہ دو کی تختی لگا دیتے ہیں پھر صبح وہ جب تک اس تختی کو خود ہٹا نہیں دیتے اس وقت تک کوئی بیرا' اسٹیوارڈ ان دروازوں پر دستک نہیں دیتا کیونکہ وہ سوتے رہتے ہیں۔ کیپٹن عمر دراز نے دستک دینا مناسب نہیں سمجھا' وہاں سے پلٹ کر ڈائننگ ہال میں آگیا وہاں بیٹھ کر کافی کی چسکیاں لینے لگا۔ اتنے میں...... وی آئی پی کا پادری آگیا' اس نے کیپٹن کو دیکھ کر اس کی میز پر آ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کیپٹن بڑی عجیب بات ہے' ویسے میں اتنا متعجب نہیں ہوں کیونکہ تم روحانیت کے قائل نہیں ہو اس لئے میں سوچ رہا ہوں کہ تم سے کیا کہوں؟"

عمر دراز نے قدرے ناگواری سے پوچھا۔ "کیا آپ نے کسی روح کو دیکھا ہے؟"

پادری نے سنجیدگی سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ہاں' میں نے کل مونا سے وعدہ کیا تھا کہ اسے اپنے کیبن میں جگہ دوں گا اور خود اس کے کیبن میں رات گزاروں گا۔ میں ابھی مونا کے کیبن میں رات گزار کر آ رہا ہوں۔"

عمر دراز اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔ جب وہ مونا کے کیبن کے سامنے گیا تھا تو اس دروازے پر "دستک نہ دو" کی تختی مونا نے نہیں پادری نے لٹکائی تھی اور اب وہ اس کے کیبن سے آ کر وہی بکواس کرنے والا تھا جو پہلے مونا کر چکی تھی۔ وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ "اب آپ مجھے بتائیں گے کہ رات پھر آپ نے کیبن میں کسی عورت کے رونے کی آواز سنی ہے اور وہ بال کھولے ہوئے نظر آئی تھی اور آپ سے فرمائش کرنے لگی کہ اسے اپنے جسم میں جگہ دے دیں تاکہ وہ انسانی روپ میں اپنے محبوب تک پہنچ سکے۔"

پادری نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "نہیں میرے بیٹے 'تم مجھے طعنے دے رہے ہو۔ میں نے یہ سب کچھ نہیں دیکھا جو کچھ مونا نے تمہیں بتایا ہے۔ میں نے وہاں ایسی کوئی بات نہیں دیکھی مگر وہاں میں رات بھر گہری نیند نہ سو کا' اضطراب کی حالت میں شاید کروٹیں بدلتا رہا۔ سوتا رہا اور جاگتا رہا' مجھے اچھی طرح یاد نہیں لیکن شاید وہ خواب ہی تھا۔"

"اچھا تو آپ نے خواب میں اس مرنے والی کو دیکھا تھا؟"

پادری نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ہاں شاید وہ مرنے والی ہی تھی۔ میں اسے نہیں پہچانتا' لیکن ایک بہت بڑا مکان تھا جیسے گرجا گھر ہوتا ہے وہاں ایک عورت سہ شاخہ شمع دان لئے میرے ساتھ زینے پر چڑھ رہی تھی.........."

عمر دراز کے ذہن کو ایک دم سے جھٹکا لگا' وہ کرسی پر ایک دم سے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ پادری کہہ رہا تھا۔ "میرے ساتھ.......... زینے پر چڑھنے والی بہت اداس اور بہت ہی غمزدہ تھی۔ مجھ سے التجا کر رہی تھی کہ میں اتنے بڑے مکان کا کوئی دوسرا کمرہ اپنی رہائش کے لئے منتخب کر لوں مگر وہ کیبن چھوڑ دوں۔ مجھے اس کیبن میں نہیں رہنا چاہئے۔"

کیپٹن عمر دراز بری طرح اضطراب میں مبتلا ہو گیا تھا' میز کے نیچے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ رہا تھا' اسے یوں لگ رہا تھا جیسے چاروں طرف اسے قانون کی نظریں گھور رہی ہیں اور وہ ان نظروں کے حصار کو توڑ کر بھاگ جانا چاہتا تھا۔ پادری نے کہا۔ "کیپٹن

تمہارے چہرے سے یوں لگتا ہے جیسے تمہیں میرے اوپر بہت غصہ آ رہا ہے حالانکہ میں نے تمہیں کوئی گالی نہیں دی ہے' تمہاری شان میں کوئی گستاخی نہیں کی ہے۔ ایک بات جسے میں سچ سمجھتا ہوں اور جسے میں نے اپنی سوئی ہوئی آنکھوں سے دیکھا ہے جسے ہم خواب کہتے ہیں' وہی میں تمہیں سنا رہا ہوں۔ میں تمہیں روحانیت کا قائل نہیں کر سکوں گا مگر پلیز تم مجھے ایسے نہ دیکھو۔"

عمر دراز نے اپنے چہرے سے ظاہر ہونے والے تاثرات میں تبدیلی کرتے ہوئے کہا۔ "فادر مجھے تشویش ہے کہ مونا کے بیانات اور آپ کا یہ خواب ہمارے جہاز کے کیبن نمبر بی سیون کو دوسروں کے لئے آسیب زدہ بنا دے گا' ہمارے جہاز کی بدنامی ہو گی کوئی مسافر اس کیبن میں رہنا پسند نہیں کرے گا۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ ایسے خواب کسی اور کو نہ سنائیں۔"

"میں روحانیت کا پرچار کرتا ہوں اگر اس سے تمہارے جہاز کو نقصان پہنچتا ہے تو میں یہاں خاموش رہوں گا لیکن اپنی ڈائری میں خواب کا ذکر ضرور کروں گا۔ ویسے تمہاری خاطر مونا کو بھی یہ خواب نہیں سناؤں گا' میں ذرا الجھ گیا ہوں کہ ایسے وقت مجھے کیا کرنا چاہئے کیونکہ خواب میں ایک شمع دان لے کر چلنے والی عورت مجھ سے التجا کرتی رہی تھی کہ میں اس کیبن سے چلا جاؤں۔ اب اگر میں کیبن چھوڑ کر جاتا ہوں اور واپس اپنے کیبن میں اپنا سفر جاری رکھتا ہوں تو مونا کو پھر اپنے کیبن میں واپس آنا ہو گا' وہ لڑکی پھر گھبرائے گی۔"

پادری اپنی رو میں بولتا جا رہا تھا' عمر دراز اپنے تصور میں گم تھا۔ اس کے تصور میں تیز ہوائیں چل رہی تھیں' موسلادھار بارش ہو رہی تھی اور حویلی کے اندھیرے میں وہ اپنے ہاتھ میں شمع دان لئے اس کے ساتھ زینے پر چڑھی آ رہی تھی۔ وہ پریشان ہو کر سوچ رہا تھا کہ وہی زینہ' وہی سہ شاخہ شمع دان اور ایک عورت کا ایک مرد کے ساتھ زینے پر چڑھنے والا منظر' یہ سب کچھ پادری کے سامنے کیسے آ گیا؟ کیا یہ پادری بھی اس کے خلاف ہونے والی سازش میں ملوث ہے؟

وہ نظریں اٹھا کر پادری کو ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔ ایسے وقت اسے وہ کمرہ یاد آیا جہاں شیطان کا بے لباس مجسمہ رکھا ہوا تھا اور ایسے ایسے بھیانک چہرے تھے جنہیں جادوگر اپنے کالے عمل کے دوران استعمال کرتے ہیں۔ ایک طرف پادری کی روحانیت تھی دوسری طرف حویلی کا شیطانی کمرہ جادوئی عمل کی طرف اشارہ کرتا تھا پھر عمر دراز

کے اپنے شبہات تھے کہ قانون اس کے پیچھے پڑ گیا ہے اور اسے قتل کے الزام میں پھانسنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور یہ سارا چکر اسی مقصد کے لئے چلایا جا رہا ہے۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "فادر میں آپ کا شکرگزار ہوں کہ آپ مونا کو یہ خواب نہیں سنائیں گے۔ آپ اسے تسلی دیں کہ کیبن نمبر لی سیون میں اب آوازیں نہیں سنائی دیں گی وہ وہاں آرام سے رہ سکتی ہے۔"

یہ کہہ کر وہ وہاں سے چلتا ہوا پھر کیبنوں کی طرف جانے لگا' اسے مونا کی تلاش تھی۔ دماغ میں کئی طرح کے سوالات پک رہے تھے اور کسی بھی سوال کا معقول جواب نہیں مل رہا تھا۔

وہ پادری کے کیبن کے سامنے آیا۔ مونا اپنی چچی کے ساتھ اسی کیبن میں تھی۔ اس کی چچی بیمار ہو گئی تھی ایک ڈاکٹر آکر اس کا معائنہ کر رہا تھا۔ مونا نے کیپٹن کو دیکھتے ہی نظریں جھکا لیں' اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اسے رات کی وہ باتیں یاد آ گئی تھیں وہ کچھ شرما بھی رہی تھی۔ کیپٹن نے اس کی چچی کی مزاج پرسی کی پھر انہیں بتایا کہ وہ فادر سے مل کر آ رہا ہے اور فادر نے کہا ہے کہ کیبن نمبر لی سیون میں کسی کی آواز سنائی نہیں دیتی ہے وہ محض وہم تھا' اب وہ چچی بھتیجی اپنے کیبن میں واپس چلی جائیں تو بہتر ہو گا۔

یہ سنتے ہی اس کی چچی نے ناگواری سے کہا۔ "اب ہم اسی کیبن میں رہیں گے' اس کیبن میں سے کبھی نہیں جائیں گے۔"

کیپٹن نے کہا۔ "یہ جہاز کے اصول کے خلاف ہے' یہاں جس کے نام پر جو کیبن مخصوص ہوتا ہے وہ اسی میں رہ کر سفر کرتا ہے۔ آپ ہمارے لئے مشکلات پیدا نہ کریں۔"

مونا نے بدستور نظریں جھکائے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے ہم آپ کے لئے مصیبت نہیں بنیں گے' ہم اسی کیبن میں چلے جائیں گے۔"

اس کی چچی اسے گھور کر دیکھنے لگی' اس نے کہا۔ "آنٹی میں وہاں اس کیبن میں ضرور جاؤں گی خواہ مجھ پر جو بھی مصیبتیں نازل ہوں میں ان کا ذکر عمر دراز کیپٹن کے سامنے نہیں کروں گی' میں کسی کے لئے پریشانی کا سبب نہیں بننا چاہتی۔"

عمر دراز اسے گہری نظروں سے دیکھنے لگا' اسے دیکھ کر کوئی بھی کہہ سکتا تھا کہ یہ حسینہ جھوٹ بولنے کے لئے نہیں گلے لگانے کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ پچھلی رات وہ عمر دراز کے گلے لگ کر فوراً ہی اس کے کیبن سے بھاگ گئی تھی۔ وہ بولا۔ "مونا میں تم سے

کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں' باہر انتظار کروں گا۔"

یہ کہہ کر وہ جانے لگا' مونا نے کہا۔ "سوری کیپٹن' ضروری باتیں ان سے کی جاتی ہیں جن کی باتوں میں وزن ہوتا ہے' میں شروع ہی سے آپ کے لئے جھوٹی اور فریبی ہوں۔ اب تو فادر نے بھی تصدیق کر دی ہے کہ اس کیبن میں کچھ نہیں ہے' کسی قسم کی آوازیں نہیں آتی ہیں۔ یہ سب میرا وہم ہے یا میرا جھوٹ ہے' اس کے بعد باتیں کرنے کے لئے کیا رہ جاتا ہے۔ میری آنٹی کی طبیعت ٹھیک نہیں میں کسی سے نہیں مل سکوں گی۔"

عمر دراز نے اسے ایسے دیکھا جیسے وہ آسمان ہو گئی ہو' ہاتھوں کی پہنچ سے دور چلی گئی ہو۔ مونا کے انکار نے اس کی اہمیت بڑھا دی تھی جیسا کہ اکثر ہوتا ہے لڑکیاں بے رخی دکھا کر' ذرا کترا کر اپنی قدر و قیمت بڑھا لیتی ہیں۔ وہ وہاں سے سر جھکا کر چلا آیا۔

پھر مونا تمام دن نظر نہیں آئی' وہ بھی اس سے کتراتا رہا۔ اپنے فرائض کی ادائیگی کے دوران اپنی الجھنوں کو سلجھانے کی کوششیں کرتا رہا۔ اس سلسلہ میں تین نکتے قابل غور تھے۔ ایک تو یہ کہ فادر روحانیت کی بات کر رہا تھا' ہیلن کی طرف سے جادوئی عمل کا شبہ تھا اور تیسری اہم بات جو اس کے دل کو لگتی تھی وہ یہ تھی کہ قانون کی نظر نے اسے تاڑ لیا ہے اور اسے گرفت میں لینے کے لئے جال بچھایا جا رہا ہے۔

اگرچہ وہ قاتل نہیں تھا' ہیلن کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا وہ محض حادثہ تھا۔ اس نے جان بوجھ کر اسے قتل نہیں کیا تھا اور نہ ہی وہ کبھی ایسا بھیانک جرم کر سکتا تھا۔ وہ کبھی تو یہ سوچ کر مطمئن ہو جاتا تھا کہ اس ناکردہ جرم کا کوئی چشم دید گواہ نہیں ہے۔ کوئی اس کے خلاف الزام عائد نہیں کر سکتا پھر کبھی یہ سوچ کر پریشان ہو جاتا تھا کہ اگر اس رات حویلی میں اس کی موجودگی ثابت ہو گئی تو پھر کوئی اسے قتل کے الزام سے بچا نہیں سکے گا۔ وہاں اس کے اور ہیلن کے سوا کوئی تیسرا موجود نہیں تھا اگر وہ قتل ہوئی تھی تو کیپٹن کے ہاتھوں قتل ہوئی تھی یہ الزام اس پر ثابت ہو جاتا۔

دوپہر کو سادھنا سے ملاقات ہوئی ۔وہ جھینپ کر بولی۔ "کل رات مجھے نشہ ہو گیا تھا' میں نے سنا ہے میری وجہ سے تمہیں بڑی پریشانی ہوئی تھی۔"

"کوئی بات نہیں' تمہیں پینے کی عادت نہیں اس لئے ایسا ہو گیا۔"

"پھر کیا پروگرام ہے کیپٹن' ویسے میں آج نہیں پیوں گی' سارا پروگرام چوپٹ ہو کر رہ جاتا ہے۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔' آج شام کو کوئی نہ کوئی پروگرام بنالیا جائے گا۔ میں ذرا مصروف ہوں' انجن روم کی طرف جارہا ہوں مائنڈ نہ کرنا۔"

شراب اور شباب دل کو بہلاتے ہیں' وقتی طور پر دماغ سے الجھنوں کو بھلا دیتے ہیں لیکن الجھنیں دور نہیں کر سکتے۔ یہی سوچ کر عمر دراز سادھنا سے کترا کر انجن روم کی طرف چلا گیا حالانکہ وہاں کوئی کام نہیں تھا۔

وہ دن بھی گزر گیا' رات آگئی۔ اسے اطلاع مل گئی تھی کہ مونا اپنی چچی کے ساتھ کیبن نمبر لی سیون میں واپس آگئی ہے۔ عمر دراز کی بے چینی بڑھ گئی تھی وہ سوچ رہا تھا کہ آج پھر ہنگامہ ہو گا۔ فادر نے تو مونا کو تسلی دے دی تھی لیکن وہ جانتے تھے کہ کیبن نمبر لی سیون میں کوئی گڑبڑ ہے۔ عمر دراز کے نقطۂ نظر سے گڑبڑ تھی اور فادر اور مونا کے نقطۂ نظر سے وہاں کوئی مظلوم عورت روتی اور فریاد کرتی تھی۔

اس نے رات کے کھانے سے پہلے تھوڑی سی پی' آج وہ ہوش میں رہنا چاہتا تھا۔ پینے اور کھانے کے بعد وہ ٹہلنے کے لئے عرشے پر آگیا وہاں آنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ وہ سادھنا سے کترانا چاہتا تھا اسے پتہ چل گیا تھا کہ وہ اسے تلاش کر رہی ہے اور اس نے اپنے اسٹیوارڈ کی زبانی یہ کہلا بھیجا تھا کہ کیپٹن آج بہت مصروف رہے گا کیونکہ جہاز ٹھیک چار بجے سری لنکا پہنچنے والا ہے۔

رات کے گیارہ بجے تک اس نے کیبن نمبر لی سیون کے تین چکر لگائے۔ اس کی بے چینی اسے بار بار ادھر لے جا رہی تھی تیسرے چکر میں کیبن نمبر لی سیون کے دروازے کو کھلا دیکھا۔ وہ وہاں رک گیا۔ اس کے جی میں آیا کہ وہ مونا کو آواز دے لیکن وہاں خاموشی تھی۔ پھر مونا نے کہہ دیا تھا کہ اب اس سے بات نہیں کرے گی' اسے خود مخاطب کرنا اچھا نہیں لگا۔ وہ پلٹ کر واپس جانے لگا تب اس نے مونا کو ریلنگ کے پاس کھڑے دیکھا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا ریلنگ کے پاس آگیا۔ اس نے دیکھا کہ مونا آہٹ سنتے ہی اپنی ساڑھی کے آنچل سے اپنی آنکھیں پونچھنے لگی تھی' وہ رو رہی تھی۔

وہ ذرا قریب آکر بولا۔ "مونا کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں۔" اس نے مختصر سا جواب دیا۔

عمر دراز نے اس کے شانے پر بڑی محبت سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "میری طرف دیکھو۔"

وہ چند لمحوں تک سر جھکائے کھڑی رہی پھر اس نے آہستہ آہستہ سر کو اٹھایا' اس کی جانب دیکھا۔ بڑی بڑی کالی کالی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگنے کے بعد غضب ڈھا رہی تھیں' سیدھی دل میں اتر رہی تھیں۔ عمر دراز نے نرمی سے پوچھا۔ "کیا تم نے پھر وہی آوازیں سنی تھیں؟"

وہ اچانک ہی دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر پھر رونے لگی' عمر دراز کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔ پھر سوچ کر بولا۔ "مونا' اب مجھے یقین ہو گیا ہے۔ پہلے میں ان باتوں کو نہیں مانتا تھا لیکن تمہارے آنسوؤں نے سمجھا دیا ہے کہ تم پر کیا گزر رہی ہے اور میری بے یقینی نے تمہارا دل کس طرح توڑ دیا ہے' میں یقین کرتا ہوں مونا کہ تم سچ کہہ رہی ہو۔"

اس نے اپنے چہرے پر سے ہاتھ ہٹا کر بے یقینی سے اسے دیکھا' گلاب سے چہرے پر آنسوؤں کی شبنم بکھری ہوئی تھی' وہ سانولا اور سلونا مکھڑا اس لمحے ایک خوبصورت شعر کی تشریح پیش کر رہا تھا۔ عمر دراز پھڑکتے ہوئے دل سے بولا۔ "ہاں مونا' میں نے تم پر اعتبار نہ کر کے بڑا ظلم کیا ہے' میں نادم ہوں۔"

اس نے مونا کے دونوں ہاتھوں کو تھام لیا' وہ سہمی ہوئی چڑیا کی طرح کانپ رہی تھی۔ دھیرے سے لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ "میرا آپ سے کوئی رشتہ نہیں ہے مگر پتہ نہیں میں کیوں چاہتی ہوں کہ میرا سچ ہو یا جھوٹ آپ آنکھیں بند کر کے اس پر یقین کر لیں' میں نہیں جانتی کہ میں ایسا کیوں چاہتی ہوں؟"

عمر دراز نے آس پاس دیکھا' کوئی نظر نہیں آ رہا تھا اس نے بڑے پیار سے اسے اپنے قریب سمیٹ لیا۔ وہ کسمسانے لگی' اس نے دھیرے سے کہا۔ "تم چاہتی ہو کہ میں تم پر بھروسہ کروں اور تم چاہتی ہو کہ تمہیں میرے اور تمہارے رشتے کا پتہ چلے تو آؤ میں ایک رشتہ کی ابتدا کر رہا ہوں تم میرا ساتھ دو۔"

اس کی کسمساہٹ ختم ہو گئی' جیسے وہ فیصلہ کر رہی ہو۔ اتنی دیر میں عمر دراز نے اسے اپنی آغوش میں سمیٹ کر اچھی طرح سمجھ لیا کہ وہ صرف نوخیز ہی نہیں زرخیز بھی ہے۔ ایسی ہے کہ ہیلن کی یادوں کو بھی اس کے دماغ سے مٹا سکتی ہے۔ وہ بڑی آہستگی سے الگ ہو کر بولی۔ "مجھے بھوک لگ رہی ہے' میں چاہتی ہوں کہ رات کا زیادہ سے زیادہ حصہ کیبن میں گزاروں۔"

"کیوں' کیا اب بھی مجھے نہیں بتاؤ گی۔ اب تو میں تمہاری باتوں کا یقین کروں گا۔"

"بتاؤں گی' چلیے پہلے ہم ڈائننگ ہال میں چلیں۔"

وہ دونوں ڈائننگ ہال کی طرف جانے لگے۔ راستے میں اس نے کہا۔"آپ مجھ پر بھروسہ کر رہے ہیں اس لئے میں کہتی ہوں۔ وہ مجھے پریشان کر رہی تھی اسی لئے میں کیبن سے نکل کر ریلنگ کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔"

وہ ذرا سا چپ ہوئی پھر آہستگی سے بولی۔"فادر نے صاف کہہ دیا ہے کہ وہ کیبن آسیب زدہ نہیں ہے' آپ پہلے ہی مجھے جھوٹی اور مکار سمجھتے تھے۔ فادر نے اس کی تصدیق کر دی ہے مگر میں جانتی ہوں وہ نامعلوم بلا کس طرح میرے پیچھے پڑ گئی ہے' اب بھی وہ آوازیں مجھے پریشان کر رہی تھیں تو میں کیبن سے نکل کر ریلنگ کے پاس آ گئی۔ میرا دکھڑا سننے والا' میری سچائی کو سمجھنے والا کوئی نہیں تھا اس لئے مجھے بے اختیار رونا آ رہا تھا۔"

وہ دونوں ڈائننگ ہال میں داخل ہو گئے ایک میز کے اطراف آمنے سامنے بیٹھنے کے بعد عمر دراز نے کھانے کا آرڈر دیا پھر مونا کے آنسوؤں سے دھلے ہوئے شفاف چہرے کو دیکھتے ہوئے سوچنے لگا کہ وہ کس طرح اس لڑکی کی پریشانیاں دور کر سکتا ہے۔ اس وقت مونا نے سر اٹھا کر کہا۔"ایک بات بولوں' آپ........ آپ آج کی رات میرے کیبن میں رہ کر تجربہ کریں شاید میرے ساتھ آپ کو بھی وہ آواز سنائی دے۔"

وہ ذرا سا بوکھلا گیا۔ وہ کبھی اس کیبن میں جانے کے متعلق سوچتا ہی نہیں تھا۔ مونا نے اچانک ہی دعوت دی تھی۔ اس نے ٹالنے کے انداز میں کہا۔"میں اس کیبن میں جاؤں گا تو صبح آ کر تم سے کہوں گا کہ وہاں کوئی آواز سنائی نہیں دی تھی پھر کیا تم یقین کرو گی؟"

"ہاں یقین کرنے کی ایک ہی صورت ہے کہ میں آپ کے ساتھ اس کیبن میں بیٹھی رہوں گی' ہم انتظار کریں گے کہ وہ کب اور کیسے مجھ سے یا آپ سے رابطہ قائم کرتی ہے۔"

وہ کشمکش میں مبتلا ہو گیا' وہ کیبن ایک طرح سے عذابِ جان تھا اور دوسری طرح سے راحت جان کیونکہ وہاں مونا کی قربت ملنے والی تھی۔ اس نے مونا کو دیکھا اسے دیکھنے کے بعد چھونے کو جی چاہتا تھا' چھونے کے بعد شاید مرنے کو جی چاہے۔ عشق کسی نہ کسی طرح مارتا ہے' کبھی ہیلن کی جفاؤں سے اور کبھی مونا کی اداؤں سے۔

جو کچھ نگاہوں کے سامنے ہوتا ہے اسی کا زور چلتا ہے اس کے دل نے زور دیا کہ

اسے مونا کے ساتھ کیبن میں وقت گزارنا چاہئے' شاید مونا توہم پرستی کا شکار ہو اور وہ اس کے وہم کو دور کر دے گا۔ یہ فیصلہ کرتے وقت وہ بھول گیا تھا کہ ہیلن کی ماں وچ ڈاکٹر تھی اور وہ حویلی میں شیطانی مجسمہ اور ان انسانی کھوپڑیوں کو دیکھ چکا تھا جن کا تعلق کالے جادو سے ہوتا ہے۔ پھر وہ مونا کی قربت حاصل کرنے کی دھن میں یہ بھی بھول گیا تھا کہ فادر نے وہی منظر اپنے خواب میں دیکھا ہے۔ وہی زینہ' وہی سہ شاخہ شمع دان' وہی عورت جو ایک مرد کے ساتھ زینے پر چڑھتی ہوئی اوپر جا رہی تھی۔ یہ سب مماثلت' اس کے ماضی سے یہ مطابقت کوئی معنی رکھتی تھی اور وہ مونا کے آگے سارے معنی کھو چکا تھا۔

مونا نے کہا۔"آپ کیا سوچ رہے ہیں؟ یوں بھی آپ جہاز کے کیپٹن ہیں۔ یہ آپ کے فرائض میں شامل ہے کہ کسی کیبن میں کسی مسافر کو شکایت ہو تو آپ بہ نفس نفیس وہاں کا جائزہ لیں اور ان کی شکایات دور کریں۔"

وہ مسکرا کر بولا۔"میرے فرائض مجھے یاد نہ دلاؤ۔ اس جہاز کا کیپٹن سمجھ کر اس کیبن میں آنے کے لئے نہ کہو۔ ہاں اپنا سمجھ کر کہو گی تو میں تمہارے ساتھ وہاں ضرور جاؤں گا۔"

مونا نے مسکرا کر سر کو جھکا لیا۔ اتنے میں کھانا آ گیا' اس نے عمر دراز کو کھانے کے لئے کہا مگر وہ کھا چکا تھا اس لئے وہ تنہا آہستہ آہستہ کھانے لگی۔ کھانے کے دوران اس نے بتایا کہ چچی فادر کے کیبن میں رہے گی' کیپٹن کو اطمینان ہوا کیونکہ بڑھیا اس سے خار کھاتی تھی۔ جب وہ ڈائننگ ہال سے اٹھے تو رات کے بارہ بج رہے تھے۔

انہوں نے عرشے پر تھوڑا سا وقت گزارا' وہاں جہاز کے اسکیپر نے عمر دراز کو بتایا کہ جہاز جس رفتار سے چل رہا ہے اس کے مطابق ٹھیک ساڑھے چار بجے سری لنکا کی بندرگاہ تک پہنچ جائیں گے۔ اسکیپر سے باتیں کرنے کے بعد وہ مونا کے ساتھ اس کیبن کے سامنے پہنچ گیا۔ مونا نے دروازہ کھولا۔ اسی وقت جہاز کے گھڑیال نے ایک کا گھنٹہ بجایا۔

کیبن کے اندر قدم رکھتے ہی چھ ماہ پہلے کی وہ رات عمر دراز کو یاد آ گئی۔ ٹھیک ایک بجا تھا اور جہاز ساڑھے چار بجے سری لنکا پہنچنے والا تھا اور ایسے ہی وقت ہیلن اسے اپنے کیبن میں لے آئی تھی۔ اسی کیبن نمبرلی سیون میں اس نے ہیلن کے ساتھ تین گھنٹے گزارے تھے۔ آج بھی ٹھیک وہی وقت تھا۔ وہی کیبن تھا اور ویسی ہی ایک خوبصورت اور نوجوان لڑکی اس کے ساتھ تھی۔

اس نے کیبن کو بغور دیکھا کوئی عجیب سی بات نظر نہیں آ رہی تھی۔ ایک عام سا

کیبن تھا جیسے کہ دوسرے ہوتے ہیں۔ بس مونا نے اسے پُراسرار بنا دیا تھا۔ وہ اس حسین ساتھی کو دیکھ کر مسکراتا ہوا ایک برتھ پر بیٹھ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ مونا اس کے پاس آکر بیٹھ جائے گی لیکن وہ کوئی سوسائٹی گرل نہیں تھی۔ ایک شرمیلی سی لڑکی تھی۔ اتنی آسانی سے بے تکلفی کو پسند نہیں کر سکتی تھی۔ وہ سامنے والی برتھ پر بیٹھ گئی۔

عمرداراز عورتوں کے قریب آنے کے بہت سے گُر جانتا تھا لیکن مونا ایسی تھی کہ اس پر وہ بازاری ہتھکنڈے استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے سوچتا ہی رہ گیا کہ کیسے اس بوریت کو دور کیا جائے؟ اور برتھ کا درمیانی فاصلہ کیسے طے کیا جائے؟ اس نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ "مونا شاید تم نہیں جانتیں کہ میں ذرا پینے کا عادی ہوں۔ اگر ابھی پینے کا موقع نہ ملا تو یہاں زیادہ دیر تک نہیں بیٹھ سکوں گا۔"

وہ سر اٹھا کر بولی۔ "میں جانتی ہوں۔ کل رات بھی تو آپ پیے ہوئے تھے۔ میں نے برا نہیں منایا۔ آپ ضرور شوق فرمائیں۔"

اس کی طرف سے اجازت ملتے ہی اس نے فوراً کال بیل کا بٹن دبا کر ویٹر کو طلب کیا۔ اسے وہسکی کا آرڈر دیا۔ پندرہ منٹ بعد ایک ٹرے میں بوتل اور شیشے کے گلاس آگئے اور وہ شروع ہو گیا۔ اس کا خیال تھا کہ پینے کے بعد ذرا جرأت پیدا ہو جاتی ہے۔ کم از کم اتنی جرأت کہ وہ اپنے سامنے والی کا ہاتھ پکڑ سکے۔

پہلا پیگ ختم کرنے کے بعد وہ اپنی تنہائی کی داستان سنانے لگا۔ اس نے بتایا کہ وہ آٹھ برس سے اس جہاز میں تنہا زندگی گزار رہا ہے۔ اس نے شادی نہیں اور نہ ہی کسی عورت سے دوستی کی۔ دوسرے پیگ میں اس نے کہا۔ "مونا تم پہلی لڑکی ہو جس سے میں متاثر ہوا ہوں اور جس کے ساتھ میں اس کیبن میں تنہا بیٹھا ہوا ہوں۔ تم نے مجھ پر جادو کر دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ بنگال کا جادو شاید تم سے ہی شروع ہوتا ہے۔"

ایسی کون عورت ہے جو اپنی تعریف سن کر نہیں پگھلتی۔ کچھ عورتیں ہوتی ہیں۔ جو پتھر کی طرح بہت دیر سے ریزہ ریزہ ہوتی ہیں۔ مونا شرما رہی تھی اور بار بار اپنی ساڑھی کے آنچل کو درست کر رہی تھی۔ عمرداراز نے سوچا تیر نشانے پر بیٹھ گیا ہے۔ اب سے آگے بڑھنا چاہیے پھر اس نے سوچا ابھی ہلکا سرور ہے تھوڑا سا اور ہو جائے یہ سوچ کر اس نے تیسرا پیگ بنایا۔

تیسرے پیگ کے بعد اس نے مونا کو دیکھا تو وہ اپنا سر تھام کر کسی الجھن میں مبتلا ہو گئی تھی۔ آگے پیچھے بہت آہستہ آہستہ جھوم رہی تھی۔ پھر وہ بہت دھیمی آواز میں بو

لگی۔ "نہیں نہیں میرا پیچھا چھوڑ دو میں تمہیں اپنے جسم میں جگہ نہیں دوں گی۔"

عمرداراز کے ہاتھ سے جام چھوٹتے چھوٹتے رہ گیا۔ وہ پریشان ہو کر اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھنے لگا۔ وہ اب جنونی انداز میں زور زور سے جھومنے لگی۔ عمرداراز نے جام کو ٹرے پر رکھتے ہوئے اسے آواز دی۔ "مونا! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ تم وہ آوازیں سن رہی ہو؟" مونا کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔ وہ نڈھال ہو کر برتھ کی پشت سے ٹیک لگا کر نیم دراز سی ہو گئی۔ اس کی حالت سے پتہ چل رہا تھا کہ اس کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے ہیں۔

عمرداراز اپنی جگہ سے اٹھ کر ذرا ٹھہر ٹھہر کر اس کی طرف بڑھا پھر اس نے مونا کے ہاتھ کو تھام کر اسے ذرا سا ہلایا۔ "مونا مجھے جواب دو۔"

وہ بے حس و حرکت پڑی ہوئی تھی۔ عمرداراز اس کی قریب بیٹھ گیا۔ اس کے دونوں بازوؤں کو تھام کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ اپنے سینے سے لگا کر اس کے سر کو اپنے شانے پر رکھ کر اس کے گال کو تھپتھپانے لگا۔ اسے آوازیں دینے لگا۔ وہ چپ تھی۔ عمرداراز اس کے دل کی تیز دھڑکنوں کو اپنے سینے پر محسوس کر رہا تھا اور اپنے دماغ میں پیدا ہونے والی سنسناہٹ کو سمجھ رہا تھا۔ عجیب سی سنسنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ایسے وقت کیا کرنا چاہیے۔ کیا کسی ڈاکٹر کو بلانا چاہیے مگر اس لمحے اس کی کمزوری غالب آرہی تھی۔ ایک جوان جسم اس کے ساتھ لگا ہوا تھا اور اسے اپنی خاموشی سے سمجھا رہا تھا کہ اس کیبن میں کسی تیسرے کو نہیں آنا چاہیے۔

ایسے ہی وقت مونا کے لب آہستہ سے ہلے۔ وہ کان لگا کر اسے سننے لگا۔ مونا آنکھیں بند کیے ہوئے آہستگی سے بول رہی تھی۔ "میں.......... میں مونا ہوں۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی عمرداراز ایک دم سے بدحواس ہو گیا' کیونکہ دوسرے ہی لمحے اسے ہیلن کی آواز سنائی دی۔ مونا کے ہلتے ہوئے لبوں سے وہ بول رہی تھی۔ "نہیں مونا.......... نہیں.......... میں ہیلن ہوں.......... بولو.......... میں ہیلن ہوں.......... مونا تم سو رہی ہو.......... تم گہری نیند سو رہی ہو.......... جب تک میرا محبوب میرے کیبن میں مہمان رہے گا تم سوتی رہو گی اور میں جاگتی رہوں گی.........."

دل تو بے آواز دھڑکتا ہے مگر عمرداراز کی دھڑکنیں زور زور سے بج رہی تھیں جیسے خطرے کی گھنٹی بجتی ہے۔ وہ ہیلن کی آواز کو اور اس کے لہجے کو اچھی طرح پہچانتا تھا کیونکہ اس کے ساتھ کئی راتیں گزار چکا تھا' اس سے گھنٹوں باتیں کرتا رہا تھا' اس کی

باتیں سنتا رہا تھا۔ وہ ہیلن کے لب و لہجے کو ہزاروں میں پہچان سکتا تھا اور اس وقت بلاشبہ مونا گم ہو گئی تھی اور اس کے ہلتے ہوئے لبوں سے اور اس کی لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے ہیلن واضح طور پر بول رہی تھی۔

اس کے جی میں آیا کہ وہ مونا کے جسم کو برتھ پر ڈال کر وہاں سے چلا جائے اور ڈاکٹر کو بھیج دے۔ وہ جانا ہی چاہتا تھا کہ مرمریں بانہیں اس کی گردن کا پھندہ بن گئیں حالانکہ خوبصورت بانہوں کو گلے کا ہار کہا جاتا ہے لیکن ہار اور پھندے میں وہی فرق ہوتا ہے جو فرق مونا اور ہیلن کے درمیان تھا۔

وہ قہقہے لگانے لگی' بالکل ہیلن کی ہنسی کی آواز تھی۔ بلاشبہ وچ ڈاکٹر کی بیٹی شیطان کے مجسموں کو پوجنے والی ہیلن کالے جادو کا تماشا دکھا رہی تھی۔ مونا کے بدن میں سانس لے رہی تھی' مونا کی آواز میں ہنس رہی تھی اور مونا کی آواز اور لہجے میں بول رہی تھی۔

"کیپٹن........ کیپٹن........ میری جان میں نے اس کیبن میں بھی اور حویلی میں بھی کہا تھا کہ مجھ سے دور نہ بھاگو' واپس آ جاؤ۔ تم واپس آ جاؤ گے' دیکھ لو کہ اب میرے پاس آ گئے ہو' کیا یہ میری محبت کی انتہا نہیں ہے؟"

دو پیگ کا نشہ ہرن ہو گیا تھا' وہ پورے ہوش و حواس میں رہ کر ہیلن کو پہچان رہا تھا پھر بھی وہ انجان بنتے ہوئے بولا۔ "مونا یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تم کیسی اجنبی آواز میں بول رہی ہو' ہوش میں آؤ۔"

مونا کے چہرے پر غصے کے آثار پیدا ہوئے' جیسے ہیلن کو غصہ آتا تھا ویسے ہی وہ بولی۔ "تم میری آواز کو اجنبی کہہ رہے ہو' کیوں اجنبی کہہ رہے ہو۔ تم اپنی ہیلن کی آواز کو' اس کی اداؤں کو کبھی نہیں بھول سکتے۔"

اس نے ہیلن کی طرح پل میں غصہ دکھایا اور پل میں خوشامد پر اتر آئی۔ ایک دم سے نرم لہجے میں بولی۔ "میرے پیارے مجھے پہچان لو' میں تمہارے گلے لگ رہی ہوں مجھے تم گلے لگا لو' میری روح کو سکون پہنچاؤ۔ تم نے میرے جسم کو نابود کر دیا میں پھر بھی تمہاری دشمن نہیں ہوں تم سے پیار کا حق مانگنے آئی ہوں مجھے میرا حق دے دو میرے محبوب۔"

وہ بے بسی سے بولا۔ "تم کیا چاہتی ہو؟"

"صرف یہ کہ تم جس طرح جسمانی طور پر میرے قریب آئے تھے اسی طرح ذہنی طور پر بھی میرے قریب آ جاؤ۔ میں چھ ماہ سے تمہارے لئے تڑپ رہی ہوں۔ میرا عمل

حویلی اور اس کیبن تک محدود ہے' میں انتظار کر رہی تھی کہ کب یہ جہاز چلے گا اور کب کوئی عورت اس کیبن میں آئے تو میں اس کے ذریعے تم تک پہنچ جاؤں گی۔ آج کتنے عرصے بعد میری یہ خواہش پوری ہوئی اب تو مجھے قبول کر لو۔"

اس کی بانہیں اب تک گلے کا ہار بنی ہوئی تھیں' وہ الجھن میں تھا کہ مونا اور ہیلن بیک وقت اس کے سینے سے لگی دھڑک رہی تھیں' جسم مونا کا تھا اور روح ہیلن کی تھی وہ اس کے چہرے پر جھکتا ہوا بولا۔ "میں ہار گیا' تم جیت گئیں' ہیلن مجھے اپنی صفائی پیش کرنے دو۔ میں نے تمہیں دانستہ ہلاک نہیں کیا تھا' میں نے تمہیں صرف ایک طمانچہ مارا تھا مجھے کیا معلوم تھا کہ تم لڑکھڑاتی ہوئی زینہ کی طرف جا گرو گی۔"

مونا نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا' پھر ہیلن نے کہا۔ "گزری ہوئی ان باتوں کو نہ دہراؤ' تنہائی کے یہ قیمتی لمحات تلخی بڑھانے کے لئے نہیں بلکہ ازسرنو پیار کی ابتدا کے لئے ہیں۔"

وہ ہیلن کے چہرے پر جھک گیا۔ مونا کسمسانے لگی کیونکہ وہ فطرتاً شرمیلی تھی۔ پھر وہ پگھل گئی کیونکہ ہیلن کو جلد ہی پگھلنا آتا تھا۔ کیبن خاموش تھا' صرف جذبوں کی ہلچل اور سانسوں کی سرگوشیاں رہ گئی تھیں۔ وہ ایک تیر تھا دو شکار تھے' اگر یہ کہاوت درست ہے تو وہ ایک تیر سے دو شکار کر رہا تھا۔

پھر بہت سا وقت گزر گیا' تین بج چکے تھے۔ اب وہ مونا کی آنکھوں سے رو رہی تھی اور ہیلن کی آواز میں التجا کر رہی تھی۔ "وعدہ کرو کہ اب مجھے کبھی چھوڑ کر نہیں جاؤ گے' میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکوں گی۔"

وہ اس کو دلاسے دیتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھ کر شراب کی ٹرے کے پاس آیا' وہاں جام میں تیسرا پیگ رکھا ہوا تھا۔ وہ جام کو اٹھاتے ہوئے بولا۔ "مجھ سے بھول ہوئی ہے کہ میں تمہیں حویلی میں چھوڑ آیا تھا اب ایسی غلطی نہیں کروں گا' آؤ پینے میں میرا ساتھ دو۔"

"نہیں میں شراب نہیں پیوں گی۔"

"کیوں؟ تم تو پہلے بھی میرے ساتھ پی چکی ہو۔"

"ہاں' جب میں خود اپنے جسم میں تھی تو میں نے ہر طرح تمہارا ساتھ دیا۔ اب اگر پیوں گی تو صبح مونا جب بیدار ہو گی اور نشہ اترنے پر جب بوجھل سا اثر اس پر ہو گا تو وہ بے چاری پریشان ہو جائے گی۔ وہ تو نہیں جانتی ہے کہ میں اس کے جسم کے ساتھ تمہارے پاس رہ کر کیسا وقت گزار چکی ہوں' صبح جب وہ اٹھے گی تو پہلے کی طرح معصوم

ہو گی۔ میں نے اس کا جسم حاصل کیا ہے اس کا مجھ پر احسان ہے میں اور زیادہ اسے پریشان نہیں کرنا چاہتی۔"

وہ ایک گھونٹ پینے کے بعد تائید میں سر ہلا کر بولا۔"ہاں اگر مونا کچھ نہ سمجھے تو بہتر ہے۔"

"میں چاہتی ہوں کہ جب تک مونا اس کیبن میں رہ کر سفر کرتی رہے میں اس کے ذریعے تم سے ملتی رہوں۔"

"پھر اس کے بعد کیا ہو گا؟"

"یہی میں تم سے پوچھنا چاہتی ہوں' کیا تم یہ سفر ختم کرنے کے بعد اس حویلی میں نہیں آؤ گے؟ میری خاطر۔"

وہ ذرا سا ہچکچایا' پھر بولا۔"حویلی میں کیوں؟ کیا ہم کہیں دوسری جگہ نہیں مل سکتے؟"

وہ بولی۔"میں تم سے کہہ چکی ہوں کہ میرا عمل حویلی اور اس کیبن تک محدود ہے۔ تم جس کو پسند کرو اس کیبن میں لے آؤ یا اس کے ساتھ اس حویلی میں آ جاؤ۔ اس کے جسم میں سما کر تمہاری آغوش میں پہنچ جاؤں گی۔"

وہ شراب کے گھونٹ حلق سے اتارنے کے بہانے سوچنے لگا۔

ہیلن بول رہی تھی۔"میں تمہیں حویلی میں آنے کے لئے اس لئے کہہ رہی ہوں کہ چاٹگام کی بندرگاہ میں تمہارا جہاز کم از کم بارہ گھنٹے ضرور کھڑا رہے گا' ان بارہ گھنٹے کے دوران اس کیبن میں کوئی مسافر عورت نہیں آئے گی۔ بہتر صورت یہی ہے کہ تم یہ وقت حویلی میں آ کر گزارو۔ دیکھو اب میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی' تم نہیں آؤ گے تو میں رونے لگوں گی۔" وہ مونا کے پاس آ کر بیٹھ گیا' پھر اسے اپنے بازو میں سمیٹ کر ہیلن سے بولا۔"پہلے تو تم نہیں روتی تھیں' اپنی ضد منوانے کے لئے ضد کرتی رہتی تھیں۔"

"اب تمہاری بے رخی نے مجھے سمجھا دیا ہے کہ میں اپنی ضد اور غصے سے نہیں صرف پیار ہی سے تمہیں جیت سکتی ہوں۔"

عمر دراز کو اپنی جیت کا احساس ہوا' اس نے سوچا کہ عورت بھی عجب چیز ہے۔ ساری زندگی اسے سمجھاتے رہو کبھی بھی اپنے مرد کی بات نہیں مانتی۔ مرنے کے بعد اس کی سمجھ میں ساری باتیں آ جاتی ہیں۔ عشق تو یوں بھی دلچسپ ہوتا ہے اس کے عشق میں مزید دلچسپیاں پیدا ہو گئی تھیں کہ مرنے والی دوسری زندگی پا کر اپنی محبت کی تجدید کر رہی تھی اور وہ اس دلچسپی کو بھول نہیں سکتا تھا۔ اس پر فخر کر سکتا تھا اور سب سے بڑی بات یہ

کہ اس کے دماغ سے یہ بہت بڑا بوجھ اتر گیا تھا کہ وہ اب کسی کا قاتل نہیں تھا اور احساس جرم مٹ چکا تھا۔

وہ اپنی رسٹ واچ میں وقت دیکھتے ہوئے بولا۔"تین بج کر چالیس منٹ ہو چکے ہیں' ہم ایک گھنٹے میں سری لنکا پہنچنے والے ہیں۔ اب مجھے اپنے فرائض کی ادائیگی کے لئے جانا ہو گا۔ میں صبح تم سے ملوں گا۔"

"نہیں عمر دراز' صبح تم مجھ سے نہیں مونا سے ملو گے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم اسے آج کی رات کوئی بات نہ بتاؤ صرف رسمی طور پر اس سے دوستی نبھاتے رہو۔ کل رات گیارہ بجے تم اس کیبن میں آ جانا' اس وقت تک میں مونا کے جسم پر قبضہ کر لوں گی اور دروازہ کھول کر انتظار کروں گی۔"

وہ جانے کے لئے وہاں سے اٹھ گیا' ہیلن مونا کے جسم میں چلتی ہوئی اس کے ساتھ دروازے تک آئی پھر اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر اسے رخصت کرنے لگی۔ پہلے بھی ہیلن اسی طرح اسے رخصت کرتی تھی' بالکل وہی انداز تھا۔ یعنی ادائیں وہی تھیں نام بدل گیا تھا' شراب وہی تھی جام بدل گیا تھا۔

☆======☆======☆

وہ اپنے کیبن میں واپس آ گیا۔ چار بج چکے تھے' سری لنکا کا ساحل نظر آ رہا تھا۔ اس نے جلدی سے غسل کیا پھر اپنا سوٹ کیس کھول کر دوسرا لباس بدلنے لگا۔ لباس بدلنے کے دوران وہ مونا اور ہیلن کے متعلق سوچتا جا رہا تھا اور یہ بھی محسوس کرتا جا رہا تھا کہ اس کے کیبن کا سامان کچھ اِدھر اُدھر ہو گیا ہے۔

اس نے اپنے کیبن میں صفائی کرنے والے اسٹیوارڈ کو سمجھا دیا تھا کہ جو چیز جہاں رکھی ہوئی ہے اسے وہیں رکھا جائے۔ برتھ کے اوپر جو چادر بچھی رہتی ہے اس کا اگلا سرا برتھ کے نیچے فرش پر لٹکتا رہتا تھا اس طرح برتھ کے نیچے چادر کے پیچھے وہ اپنا سوٹ کیس وغیرہ چھپا کر رکھتا تھا۔ وہ اپنے کیبن کو ایک خواب گاہ کی طرح سجا بنا کر رکھتا تھا اسی لئے سوٹ کیس' جوتے اور چپل وغیرہ برتھ کے نیچے چھپا دیا کرتا تھا تاکہ کیبن کی خوبصورتی میں فرق نہ آئے۔

اس وقت عمر دراز غیر شعوری طور پر ایک ہی وقت میں کتنی ہی باتیں سوچتا جا رہا تھا۔ کبھی اپنے کیبن کے متعلق' کبھی مونا اور ہیلن کے متعلق۔ اس کے دماغ میں خیالات گڈمڈ ہو رہے تھے۔ ویسے اس سچائی سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جو حسن نگاہوں کے

سامنے ہوتا ہے اسی کا زور چلتا ہے۔ مونا رات کے گیارہ بجے سے صبح چار بجے تک اپنے حسن و شباب کے جلوؤں کے ساتھ اس کے ساتھ رہی' اس کا تاثر اس کے دل و دماغ میں تھا۔ وہ ہیلن کا شکر گزار تھا کہ اس نے اس کے دل سے جرم کے احساس کو مٹا دیا تھا اسے قتل کے الزام سے بری کر دیا تھا لیکن جہاں تک متاثر ہونے کا سوال تھا اس کے دل پر مونا کا سکہ چل رہا تھا۔

تقریباً دو سو مسافر سری لنکا کی بندرگاہ پر اتر گئے۔ ان میں فادر بھی تھا' اس نے رخصتی مصافحہ کرتے ہوئے عمر دراز کو دعائیں دیں کہ خدا اسے شر سے محفوظ رکھے اور کیبن نمبر الیون کے آسیب سے بچائے۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ "فادر آپ کی دعائیں قبول ہو چکی ہیں' کیبن نمبر الیون کے آسیب سے میری اچھی خاصی دوستی ہو گئی ہے آپ پریشان نہ ہوں۔"

"پھر تو اسے آسیب نہیں کہنا چاہئے' وہ کوئی نیک روح ہے میں نے خواب میں دیکھا تھا وہ بہت مظلوم لگ رہی تھی' اگر تمہاری دوستی اس کی مظلومیت کو دور کر سکتی ہے تو یہ بڑا نیک کام ہو گا' اچھا خدا حافظ۔"

یہ کہہ کر فادر سیڑھیاں اترتا ہوا نیچے ساحل کی طرف جانے لگا۔ صبح کے چھ بج رہے تھے جہاز دو گھنٹے بعد وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اب اس کی منزل چاٹگام تھی۔ چار دن اور چار راتوں کا سفر تھا' عمر دراز حساب لگا رہا تھا کہ مونا اور ہیلن کے ساتھ یہاں چار راتیں گزارے گا۔ تقدیر نے اس کے لئے عجیب سچویشن پیدا کی تھی۔ وہاں اس کے پہلو میں مونا کا وجود ہوتا تھا مگر وہ نہیں ہوتی تھی۔ ہیلن کا وجود نہیں ہوتا تھا اور وہ موجود رہتی تھی۔

وہ کیبن جو اسے دہشت زدہ کرتا تھا اب اسے حسرت زدہ بنا رہا تھا' ہر لمحہ وہاں جانے کی حسرت ہوتی تھی۔ ان دلچسپیوں میں وہ سادھنا کو بالکل ہی بھلا چکا تھا۔ جب وہ فادر کو جہاز سے رخصت کر رہا تھا تو اس وقت سادھنا نظر نہیں آئی تھی' وہ شاید بہت پہلے ہی جہاز سے اتر گئی تھی۔

دن کے دس بجے تک کیبن نمبر الیون کے دروازے پر "دستک نہ دیں" کی تختی لٹکتی رہی' ظاہر تھا کہ رات بھر کی جاگی ہوئی مونا اپنی نیند پوری کر رہی تھی۔ کیپٹن کو سونے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ اب وہ اپنی نیند پوری کر سکتا تھا لیکن وہ چاہتا تھا کہ سونے سے پہلے ایک بار مونا کو دیکھ لے۔ وہ مونا کے چہرے سے گزری ہوئی رات کا ردعمل پڑھنا

چاہتا تھا۔

ایک بجے لنچ کے وقت مونا سے ملاقات ہو گئی۔ وہ وی آئی پی ڈائننگ روم کی ایک میز پر موجود تھی' وہ اس کے سامنے میز کی دوسری طرف آ کر بیٹھ گیا۔ مونا نے کہا۔ "آج میں بہت دیر تک سوتی رہی۔ آنکھ کھلی تو پہلے آپ کو تلاش کیا معلوم ہوا کہ آپ ریڈیو روم میں مصروف ہیں۔ میں یہ جاننے کے لئے بے تاب ہوں کہ کل میں کب اور کیسے سو گئی تھی جب کہ آپ میرے سامنے موجود تھے۔ آپ ہی مجھے بتا سکتے ہیں۔"

کیپٹن نے پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ پچھلی رات کے متعلق اسے کس قسم کی باتیں کرنی ہوں گی۔ اس نے جواب دیا۔ "ہاں' جب میں دوسرا پیگ بنا رہا تھا کہ اچانک ہی تم پر دورہ پڑنے لگا' میں نے تمہیں سنبھالنے کی کوشش کی۔ تمہارے پاس آیا تو پھر وہی آواز مجھے سنائی دی جس کا تم ذکر کرتی آئی ہو۔"

مونا ایک دم سے خوش ہو کر بولی۔ "کیا یہ سچ ہے آپ نے وہ آوازیں سنی ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ اب آپ کو میری سچائی کا پورا یقین ہو گیا ہے۔"

"وہ تو میں اس کیبن میں جانے سے پہلے ہی تم پر بھروسہ کرنے لگا تھا۔ بہرحال تم یا تو بے ہوش ہو گئی تھیں یا گہری نیند میں ڈوب گئی تھیں۔ وہ پتہ نہیں کون تھی کہ تمہارے ہونٹوں اور تمہاری زبان سے بول رہی تھی۔ مجھ سے کہہ رہی تھی کہ میں اس کیبن سے چلا جاؤں وہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی۔ کیا اس نے میرے جانے کے بعد تمہیں پریشان کیا تھا؟"

"میں یہ نہیں جانتی کہ آپ وہاں سے کب گئے تھے لیکن میں نے بڑا عجیب سا خواب دیکھا ہے۔" وہ کہتے کہتے ہچکچانے لگی۔ اپنی کرسی پر بے چینی سے پہلو بدلنے لگی۔ عمر دراز نے پوچھا۔ "تم پھر پریشان نظر آ رہی ہو۔ مجھے بتاؤ اس نے تمہیں کل بھی پریشان کیا تھا؟"

وہ تھوڑی دیر چپ رہی پھر ذرا ہچکچاتے ہوئے بولنے لگی۔ "میں......... میں کیا بتاؤں۔ میں نے کل بہت ہی برا خواب دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ میری عزت محفوظ نہیں رہی کوئی میرے قریب تھا اور وہ آواز کہہ رہی تھی کہ یہ تمہارا محبوب ہے اور تم اس کی امانت ہو۔ اب تک جو امانت سنبھال رکھی ہے وہ اپنے محبوب کے حوالے کر دو اور پھر اور پھر میں نہیں بتا سکتی' میں کچھ بھی نہیں بتا سکتی.........."

اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرے کو ڈھانپ لیا۔ اس کے ہاتھ ہولے ہولے کانپ

رہے تھے۔ عمر دراز نے سوچا کہ شاید رو رہی ہے لیکن وہ گہری گہری سانسیں لے رہی تھی جیسے خواب میں آنے والے کے لئے آہیں بھر رہی ہو۔ وہ آہستگی سے بولا۔ "مونا چہرے پر سے ہاتھ ہٹا لو' یہاں ڈائننگ ہال میں آنے والے کیا سوچیں گے۔" اس نے چہرے سے ہاتھوں کو ہٹا لیا۔ اس کی آنکھیں ذرا سی بھیگی ہوئی تھیں جیسے نین کنول شبنم سے بھیگ رہے ہوں۔ پھر وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ "میں اسے بھول نہیں سکتی' وہ جو میرے خوابوں میں آیا تھا۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں واقعی اس کی امانت ہوں اور میں اس کی امانت کو ہمیشہ محفوظ رکھوں گی اور اس کا انتظار کروں گی۔"

عمر دراز نے پوچھا۔ "میرا خیال ہے خواب میں آنے والا وہ خوش نصیب تمہاری یادداشت میں محفوظ ہو گا۔"

مونا نے نظریں جھکا لیں' اس نے میز پر جھک کر سرگوشی میں پوچھا۔ "کیسا ہے وہ؟"

مونا کی پلکیں اٹھیں پھر جھک گئیں' پھر وہ جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور کچھ کہے سنے بغیر تیزی سے چلتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ اس لمحے عمر دراز کے ضمیر نے اسے ملامت کی کہ وہ ایک معصوم لڑکی کے انجانے پن میں اس کی امانت میں خیانت کر رہا ہے۔ یہ درست تھا کہ وہ فطرتاً عاشق مزاج تھا لیکن اس نے کبھی کسی لڑکی کی مرضی کے خلاف اس پر ہاتھ نہیں اٹھایا تھا۔ جب دونوں طرف برابر کی آگ لگتی تھی وہ آگ بجھانے کا اہتمام کرتا تھا لیکن وہاں تو قصہ ہی اور تھا اس کی اور ہیلن کی آگ کے درمیان بے چاری مونا بے خبر جل رہی تھی۔ اس کے جی میں آیا کہ وہ اس لڑکی کو سب کچھ بتا دے مگر کس منہ سے بتائے۔ سچ کہتے وقت شرم آئے گی کہ اس کی اجازت کے بغیر اسے لوٹ لیا۔ لٹیرا کوئی ہو' کیسا بھی ہو وہ جس گھر کو لوٹ چکا ہو اس گھر کے دروازے پر جا کر کبھی اعتراف جرم نہیں کرے گا' عمر دراز بھی اعتراف کرنے کی جرأت نہ کر سکا۔

ویسے مونا اس کے دل و دماغ پر نقش ہو رہی تھی۔ وہ کیبن نمبر بی سیون ہیلن کے نام سے منسوب تھا۔ پچھلی رات وہ ہیلن کے کیبن میں گیا تھا لیکن مونا کے گھر کے دروازے سے گزر کر آیا تھا اب اسی گھر کا راستہ اس کی سوچ سے گزرتا تھا۔ وہ تمام دن اپنے فرائض انجام دینے کے دوران اس کے متعلق سوچتا رہا۔ سری لنکا سے کچھ نئے مسافر جہاز میں سوار ہوئے تھے وہ وقت گزارنے کے لئے ان کے ساتھ ہی باتیں کرتا رہا۔ بڑے انتظار کے بعد شام ہوئی' پھر بڑی بے چینیوں کے بعد رات کے گیارہ بجے اور وہ کیبن نمبر بی سیون کے دروازے پر پہنچ گیا۔

اس نے دروازے پر دستک دی' دوسری طرف بھی بڑی بے چینی سے انتظار ہو رہا تھا۔ اس لئے فوراً ہی دروازہ کھل گیا۔ کھلے ہوئے دروازے کے پاس مونا کھڑی تھی' اس کی بڑی بڑی اور طلسماتی آنکھوں میں بلا کی سنجیدگی تھی اور آنے والے کے لئے بے پناہ استقبالیہ پیار تھا۔ پھر وہ بولی تو عمر دراز کو ہوش آ گیا کیونکہ اس کے سامنے ہیلن بول رہی تھی۔

"میرے عمر دراز تمہیں میری عمر لگ جائے' اندر آ جاؤ۔"

اس نے اندر آ کر دروازے کی چٹخنی چڑھاتے ہوئے کہا۔ "پتہ نہیں مجھے کیا ہو گیا ہے' میں تمام دن بے چین رہا۔ اب تک وقت گزارنا مشکل ہو گیا تھا۔"

ہیلن خوش ہو کر بولی۔ "عورت کو یہ سن کر خوشی ہوتی ہے کہ اس کا محبوب اس سے ملنے کے لئے بے چین رہتا ہے۔"

یہ تو عمر دراز کا دل ہی جانتا تھا کہ وہ اس سے ملنے کے لئے بے چین رہا یا مونا سے۔ نگاہوں کے سامنے سر سے پیر تک مونا کھڑی تھی اور وہ مونا کے لئے ہی آیا تھا۔ اس لئے وہ مونا کی سانسوں کے قریب آ گیا۔

وہ بدن مونا کی شرم سے تھرتھرا رہا تھا مگر ہیلن کی بے باکی بول رہی تھی۔ "کیا بات ہے عمر؟ کیا مونا تمہیں زیادہ پسند آ گئی ہے؟"

"تم یہ سوال کیوں کر رہی ہو؟"

وہ بولی۔ "میں نے تم سے کہا تھا کہ تم جس لڑکی کے ساتھ اس کیبن میں یا حویلی میں آؤ گے میں اس کا جسم حاصل کر لوں گی۔ اس طرح تمہاری حرم سرا میں آنے والی لڑکیاں بدل جائیں گی مگر تم نے مونا کو دوسرا کیبن نہیں دیا' یہاں اور بھی دوشیزائیں تھیں' تم ان میں سے کسی کو بھی یہ کیبن دے سکتے ہو؟"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ "ہاں' میں تم سے بحث نہیں کروں گا۔ مجھے یہ لڑکی بہت پسند ہے' پتہ نہیں مجھے کیا ہو گیا ہے میں آج تک کبھی کسی لڑکی سے اس قدر متاثر نہیں ہوا۔"

وہ اسے گہری ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھتی ہوئی بولی۔ "عمر دراز تم میری توہین کر رہے ہو' تمہاری باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم مجھے نہیں مونا کو چاہتے ہو۔"

"ہیلن یہ بات نہیں ہے میں تم کو کیسے سمجھاؤں۔ جو چیز سامنے ہوتی ہے اسی سے آدمی پیار کرتا ہے' تم کہاں ہو کہ میں تم سے پیار کروں؟"

"میں تمہارے پاس ہوں' تم سے باتیں کر رہی ہوں۔"

"تمہاری باتیں سر آنکھوں پر مگر صرف انہیں کان سنتے ہیں اور بس.........."

"تمہارے سامنے صرف آواز ہی نہیں ہے میرے جذبات بھی ہیں لیکن تم جذبات کی قدر کرنا نہیں جانتے' صرف جسم کے پجاری ہو؟"

وہ بحث نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے بات ٹالنے کے لئے کہا۔ "کیا چھ ماہ پہلے کی طرح پھر جھگڑا کرنا چاہتی ہو؟"

وہ ایک سرد آہ بھر کر رہ گئی۔ "نہیں اس جھگڑے کے نتیجے میں' میں نے اپنا وجود کھو دیا اب ایسی غلطی نہیں کروں گی۔ ٹھیک ہے تم مونا کی تعریفیں کرو' میرے نصیب میں محرومیاں ہیں۔"

ایک عورت کے سامنے دوسری عورت کی تعریف نہیں کرنی چاہئے۔ عمردراز یہ غلطی کر بیٹھا تھا' اس نے مونا کے جسم کو اپنے بازوؤں میں بھرپور انداز میں سمیٹتے ہوئے کہا۔ "ہیلن میں نے مونا کی اس لئے تعریف کی ہے کہ میں اسے پسند کرنے لگا ہوں لیکن پسند تو کسی بھی چیز کو کیا جا سکتا ہے۔ سچ بات یہ ہے کہ محبت کسی ایک سے ہوتی ہے' مونا میری پسند ہے اور تم میری محبت ہو۔"

ہیلن کو اپنی محبت کا یقین دلانے کے لئے اسے بڑے پاپڑ بیلنے پڑے۔ بڑی مشکلوں سے الفاظ کی ہیرا پھیری کے بعد آخر اس نے ہیلن کو منا ہی لیا۔ رات کالی اور بے نور پرچھائیوں کا نام ہے' عورت کے قرب سے یہ روشن اور حسین ہوتی ہے۔ عورت مان جائے تو رات کا مان بھی بڑھ جاتا ہے۔

رات کے تین بجے جب وہ کیبن سے واپس جانے لگا تو ہیلن نے اس کے گلے میں باہیں ڈال کر کہا۔ "وعدہ کرو کہ دن کے وقت مونا سے نہیں ملو گے' ڈر لگتا ہے کہ تم اسی کے ہو کر کہیں نہ رہ جاؤ۔"

عمردراز نے ہنستے ہوئے کہا۔ "مونا ایک جسم کا نام ہے اور محبت جسم سے نہیں روح سے کی جاتی ہے اور تم مونا کے جسم کے اندر سمائی ہوئی وہ روح ہو جس سے میں محبت کرتا ہوں۔ اگر دن کے وقت کبھی مونا کی طرف گیا بھی تو میرے دماغ میں یہی بات ہو گی کہ میں ہیلن کی طرف بڑھ رہا ہوں۔"

پھر وہ باتیں بناتا رہا' اسے تسلیاں دیتا رہا پھر بڑے پیار سے دوسری رات کا وعدہ کر کے رخصت ہو گیا۔

ان دو راتوں میں اسے اچھی طرح احساس ہو گیا کہ اس کی تڑپ اور آرزو مونا ہے۔ وہ کیبن نمبر بی سیون کے حرم میں جاتا ہے' مونا کی زلفوں کے سائے میں مونا کو ڈھونڈتا رہتا ہے لیکن ہیلن کی منحوس آواز سنائی دیتی رہتی ہے۔ وہ منحوس ہی تھی کیونکہ محبت کالے جادو کی کالی زبان سے نہیں ہوتی وہ دھڑکتے دل کی زبان ہوتی ہے اور اس کا دل اب صرف مونا کے لئے دھڑکنے لگا تھا اور وہ اپنے مزاج کے خلاف اپنی فطرت کے خلاف یہ سمجھ رہا تھا کہ مونا کے بغیر اب نہیں رہ سکے گا۔ شاید یہی وہ لڑکی ہے جس کے لئے وہ اب تک تنہا زندگی گزار رہا تھا جہاز کے سفر میں کتنی ہی ہم سفر آتی رہیں اور جاتی رہیں لیکن یہ شاید زندگی کی ہم سفر بننے کے لئے اس کی زندگی میں آ گئی تھی۔

☆======☆======☆

اس روز وہ ڈائننگ ہال میں گیا تو مونا اکیلی نہیں تھی۔ ایک جوان آدمی اس کے قریب میز کے دوسری طرف بیٹھا ہوا تھا۔ وہ دونوں میز پر جھکے ہوئے دھیرے دھیرے باتیں کر رہے تھے۔ کیپٹن عمردراز کو دیکھتے ہی وہ دونوں جلدی سے سیدھے بیٹھ گئے۔ کیپٹن کو یوں لگا جیسے اس کی قیمتی پونجی کسی دوسرے کی جیب میں جا رہی ہو۔ وہ جوان آدمی کیپٹن کی طرح خوبرو اور بہت زیادہ سمارٹ نہیں تھا لیکن جوانی گدھوں پر بھی آتی ہے اس لئے وہ جوانی کی عمر میں قابل قبول لگ رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار کیپٹن نے حسد ور قابت کے جذبات محسوس کئے۔

وہ شخص عمردراز کو دیکھتے ہی فوراً اٹھ کھڑا ہوا' مونا سے بولا۔ "اچھا......... میں .... میں چلتا ہوں۔"

مونا طنزیہ انداز میں بولی۔ "ایسی جلدی بھی کیا ہے مسٹر۔ آپ تو کیپٹن کو دیکھ کر یوں بھاگ رہے ہیں جیسے طوفان کے آتے ہی مکھیاں اڑ جاتی ہیں۔"

وہ کوئی جواب دیئے بغیر منہ پھیر کر تیزی سے چلتا ہوا وی آئی پی ڈائننگ ہال سے باہر چلا گیا۔ عمردراز نے اس کی جگہ آ کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ "یہ کون تھا' میرا خیال ہے کہ یہ نیا مسافر ہے سری لنکا سے جہاز پر سوار ہوا ہے۔"

"ہاں' مجھ سے یہی کہہ رہا تھا۔ اپنا نام ظاہر بیگ بتا رہا تھا' اسے آپ سے کوئی دشمنی ہے۔ ابھی یہ آپ کے خلاف بول رہا تھا۔"

عمردراز کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں' اس نے ڈائننگ ہال کے دروازے کی طرف دیکھا جہاں سے وہ گزر کر گیا تھا۔ پھر وہ پرخیال انداز میں بولا۔ "بھلا اسے مجھ سے کیا دشمنی

ہو سکتی ہے؟"

"پتہ نہیں بس یونہی الٹی سیدھی باتیں کر رہا تھا کہ آپ ایک عیاش آدمی ہیں اور مجھے آپ سے دور رہنا چاہیے۔"

وہ پھر سوچتی ہوئی نظروں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ اچانک اسے یاد آیا کہ وہ ظاہر بیگ کو پہلے بھی اس جہاز میں دیکھ چکا ہے.......... پہلے.......... بہت پہلے۔ چھ ماہ پہلے۔ جب ہیلن اس جہاز پر تھی۔ اس کے دماغ میں سنسناہٹ ہونے لگی۔ وہ ظاہر بیگ ہیلن کی اسمگلنگ پارٹی کا کوئی آدمی بھی ہو سکتا تھا۔

مونا کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ پوچھ رہی تھی۔"آپ کیا سوچ رہے ہیں۔ میں آپ کو برا نہیں سمجھتی۔ وہی کہہ رہا تھا۔"

وہ چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ اسے دیکھتے ہی پریشانیاں گم ہو گئیں۔ پیار آ گیا۔ آہ! وہ سوتی تھی تو اسے مل جاتی تھی اور وہ جاگتی تھی تو اس کی آغوش سے دور کھسک جاتی تھی۔ اس کے سونے اور جاگنے کے درمیان کتنے رنگین اور سنگین لمحات گذر جاتے تھے۔ وہ بے چاری ان لمحات سے بے خبر تھی اس لیے اس کی لاعلمی پر بڑا پیار آتا تھا۔

عمردراز ذرا میز پر جھکتے ہوئے بولا۔"مونا میں بہت خوش ہوں کہ تم مجھے برا نہیں سمجھتیں۔ کیا اس قابل سمجھتی ہو کہ ہم ایک دوسرے کے دوست بن کر رہیں۔"

اس نے نظریں جھکالیں پھر آہستگی سے بولی۔"دوستی کی ایک حد ہوتی ہے۔ میں اس حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔"

عمردراز نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا کر میز پر رکھے ہوئے مونا کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ پھر بولا۔"میں ساری عمر دوستی نبھانا چاہتا ہوں۔"

مونا کا ہاتھ لرز رہا تھا۔ اس نے آہستگی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور کہا۔"آپ .... آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ دیکھئے ناں۔ آپ مجھے نہیں جانتے۔ میں آپ کو نہیں جانتی۔ ایک مختصر سے سفر میں تھوڑی سی جان پہچان کو سامنے رکھ کر ساری زندگی کا سودا نہیں کیا جاسکتا۔"

عمردراز سمجھ گیا کہ وہ بہت ذہین لڑکی ہے۔ اپنے اصولوں کے خول میں بند رہتی ہے۔ شاید وہ کبھی اسے اتنی آسانی سے حاصل نہ کر سکتا جتنی آسانی سے ہیلن کی روح نے اسے اس کے پاس پہنچا دیا تھا۔

مگر اس لمحے احساس ہوا کہ وہ مونا کو پا کر بھی نہ پاسکا کیوں کہ عورت صرف اپنے

جسم سے نہیں ملتی جب تک وہ اپنے خیالات کو' اپنی آرزوؤں کو اور اپنے جذبوں کو دل کی دھڑکنوں میں سجا کر پیش نہ کرے۔ اس وقت وہ ایک لاش ہوتی ہے۔ جسے ایک مرد۔ ایک مردار کھانے والے گدھ کی طرح نوچ کھسوٹ کر رہ جاتا ہے مگر پیار کی وہ حرارت' وہ لذت نہیں پا سکتا جو باہمی سمجھوتے سے حاصل ہوتی ہے۔

اس نے سوچا کہ وہ مونا کو شریک حیات بنانے کے متعلق کیوں سوچ رہا ہے۔ جب تک ہیلن اس سے رابطہ قائم کرتی رہے گی۔ وہ مونا کو اپنا نہیں سکے گا کیونکہ جہاز کی ملازمت وہ چھوڑ نہیں سکتا اور جب وہ جہاز میں رہے گا تو اس کا تعلق کیبن نمبر بی سیون سے بھی رہے گا اور بی سیون میں جب کوئی مسافر عورت جائے گی تو ہیلن اس کے ذریعے کیپٹن تک پھر پہنچے گی۔

اس نے مونا کو حسرت بھری نظروں سے دیکھا۔ اسے شریک حیات بنانے کے لیے لازمی تھا کہ وہ اسے لے کر اس کیبن اور حویلی سے کہیں بہت دور چلا جائے لیکن وہ اتنی دلچسپ ملازمت چھوڑ کر عشق کے صحرا میں بھوکا پیاسا بھٹکنا نہیں چاہتا تھا۔

وہ اچانک پریشان ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ آخر کیا بات ہے۔ وہ اس لڑکی کے متعلق اتنی سنجیدگی سے کیوں سوچ رہا ہے؟ کیوں اسے شریک حیات بنانا چاہتا ہے؟ یہ سچ مچ بنگال کا جادو ہے اگر وہ اس کے قریب رہے گا تو اس طرح سحرزدہ ہوتا رہے گا۔

وہ کام کا بہانہ کر کے فوراً ہی وہاں سے اٹھ گیا۔ یوں بھی اسے ظاہر بیگ یاد آ رہا تھا اور اس کے دماغ میں کانٹے کی طرح چبھ رہا تھا۔ مونا سے رخصت ہو کر سیدھا پرسرروم میں پہنچا۔ وہاں مسافروں کا تمام ریکارڈ موجود ہوتا تھا۔ اس نے وہاں کے انچارج سے پوچھا۔"کیا ظاہر بیگ نام کا جو مسافر اس جہاز میں ہے اس کے متعلق آپ یہ بتا سکتے ہیں کہ چھ ماہ پہلے بھی وہ اس جہاز میں سفر کر چکا ہے۔"

"کیپٹن آپ تو جانتے ہی ہیں کہ بمبئی پہنچنے کے بعد ہم جہاز کے مسافروں کا تمام ریکارڈ ساحلی دفتر میں منتقل کر دیتے ہیں۔ اگر آپ میری یادداشت کا امتحان لے رہے ہیں تو میں کہوں گا کہ ظاہر بیگ دوسری بار ہمارے جہاز میں سفر کر رہا ہے۔"

عمردراز پرسرروم سے واپس آ گیا۔ ظاہر بیگ بری طرح اس کے ذہن پر چھا گیا تھا۔ اس کا خیال تھا بلکہ یقین تھا کہ ظاہر بیگ ہیلن کے ساتھیوں میں سے ہے۔ اب چونکہ ہیلن سے دوستی ہو گئی تھی۔ اس لیے اب ظاہر بیگ سے ایسا تو کوئی خطرہ نظر نہیں آ رہا تھا بس یہی بات سمجھ میں آ رہی تھی کہ وہ رقابت کے باعث مونا کو اس سے دور کر دینا چاہتا

ہے۔ شاید وہ مونا کو چاہتا ہو۔

مونا کی اہمیت اور بڑھ گئی۔ ایسی دلنواز محبوبہ کے لیے کوئی رقیب پیدا ہو جائے تو محبوبہ کی قدر وقیمت میں بہت اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ مونا کو شریک حیات بنانے کے متعلق نہیں سوچے گا۔ اس سے ذرا دور ہی رہے گا مگر چاٹگام پہنچے پر وہ بے اختیار بلا ارادہ آپ ہی آپ اس کے قریب سے قریب تر ہو گیا۔ جسم کی قربت اتنی اہمیت نہیں رکھتی جتنی کہ ذہنی قربت اور ہم آہنگی انسان کو دیوانہ بنا دیتی ہے۔ وہ سچ مچ اس کا دیوانہ ہو گیا تھا۔

چاٹگام کی بندرگاہ پر جہاز لنگر انداز ہو گیا۔ وہ مونا سے اتنی جلدی جدا نہیں ہونا چاہتا تھا۔ جب اس کے جانے کا وقت ہوا تو اس کا دل اس کے ساتھ جانے کے لیے مچلنے لگا۔ یوں بھی ہیلن نے اس سے بارہا کہا تھا کہ وہ مونا کو لے کر حویلی آئے۔ دوسری طرف مونا نے کہا۔ "اگر آپ آج رات کا کھانا میرے ساتھ کھانا پسند کریں تو میرا گھر حاضر ہے۔ میں ساحل پر پہنچ کر آپ کا انتظار کروں گی۔"

یہ کہہ کر اس نے بڑی محبت اور التجا آمیز نظروں سے اسے دیکھا۔ سرجھکا کر سیڑھیاں اترتے ہوئے ساحل کی طرف چلی گئی۔ عمردراز نے اسی وقت ایک رات کی چھٹی لی۔ اپنے کیبن میں جاکر اپنا ہیٹ پہنا۔ برساتی اٹھائی پھر وہاں سے ساحل کی طرف جانے لگا۔

برساتی اس نے اس لیے ساتھ رکھ لی کہ آسمان کالا ہو رہا تھا۔ بنگال میں بارش بے موسم ہوتی رہتی ہے۔ اس کا کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا۔ جب وہ ساحل پر پہنچا تو مونا نے بتایا کہ اس کی چچی پہلے ہی چلی گئی ہے اور اس کے انتظار میں اب تک وہاں کھڑی ہوئی ہے۔ اس نے ٹیکسی ریزرو کرلی تھی۔ وہ دونوں اس ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ پھر وہ ٹیکسی وہاں سے چل پڑی۔

اس وقت عمردراز سوچ رہا تھا کہ وہ کدھر جا رہا ہے۔ ہیلن کی طرف یا مونا کے گھر؟ اس نے سوچا اگر وہ مونا کے گھر جائے گا اور صبح اپنے جہاز میں واپس آئے گا تو وہاں نئے مسافروں کی آمد شروع ہو جائے گی پھر اس کیبن نمبر سیون میں جو عورت جائے گی۔ وہ ہیلن کا شکار ہو گی اور ہیلن اس کے ذریعے عمردراز سے شکایت کرے گی کہ وہ چاٹگام پہنچنے کے بعد اس کی حویلی میں کیوں نہیں آیا تھا؟

اچانک بارش شروع ہو گئی۔ وہ دونوں اپنی طرف کی کھڑکی کے شیشے چڑھانے لگے۔

تب عمردراز نے دیکھا کہ وہ ٹیکسی شہر سے باہر نکل آئی ہے۔ اس نے پوچھا۔ "مونا تمہارا گھر کہاں ہے؟"

وہ بولی۔ "میں چاٹگام اور رانگا مائی کے درمیانی علاقے میں رہتی ہوں۔ یہاں سے دو گھنٹے کا سفر ہے۔"

وہ ونڈاسکرین کے پار دیکھنے لگا۔ اگر بارش زور کی نہ ہوتی تو شاید وہ حویلی جانے والے راستے کو پہچان لیتا۔ ٹیکسی تیزی سے فاصلہ طے کرتی جا رہی تھی۔ انجانی منزل کی طرف بڑھتی جا رہی تھی پھر بہت دیر بعد ایک کچے راستے پر مڑ گئی۔

عمردراز کو وہ کچا راستہ یاد آگیا جو حویلی کے سامنے سے گزرتا تھا۔ اس نے مونا کو دیکھا۔ مونا پریشان ہو کر ڈرائیور سے پوچھ رہی تھی۔ "یہ تم کس راستے سے جا رہے ہو؟"

ڈرائیور نے جواب دیا۔ "وہ پکا راستہ آگے جاکر ٹوٹ گیا ہے۔ پچھلے ہفتے بہت زور کا سیلاب آیا تھا۔ راستے کو توڑتا ہوا ایک ندی کی طرح وہاں سے وہ سیلاب گزرا تو وہاں اب اس راستے کی مرمت ہو رہی ہے۔ ہم یہاں سے گھوم کر آگے اچھے راستے پر پہنچ جائیں گے۔"

کچا راستہ پانی اور کیچڑ کی وجہ سے گزرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ پھر بھی وہ بڑی مہارت سے ڈرائیو کرتا ہوا اس راستے سے گاڑی کو گزار رہا تھا۔ عمردراز کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ اس نے سہارے کے لیے مونا کا ہاتھ تھام لیا جیسے ہیلن کی طرف ڈوبنے سے خود کو بچانا چاہتا ہو۔ پھر آہستگی سے بولا۔ "مونا اس کچے راستے پر پہلے کبھی آئی ہو؟"

اس نے انکار میں سرہلاتے ہوئے کہا۔ "یہ راستہ میرے لیے نیا ہے۔"

"یہاں آگے ایک حویلی ہے۔ میں پہلے بھی یہاں آچکا ہوں۔ کیا تم تھوڑی دیر کے لیے اس حویلی میں چلنا پسند کرو گی۔"

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ "وہ کس کی حویلی ہے۔ آپ وہاں کب آئے تھے' کیوں آئے تھے؟" وہ جواب دینے کے بجائے سامنے ونڈاسکرین کے پار دیکھنے لگا۔ اب بارش کی دھند میں وہ حویلی دھندلی سی نظر آرہی تھی۔ مونا اس کے جواب دینے سے پہلے ہی بولی۔ "نا۔ بابا۔ مجھے تو ایسے ویرانے میں کسی کے ہاں جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ وہاں کون رہتا ہے؟"

عمردراز نے دل ہی دل میں سوچا۔ "آہ۔ میں تمہیں کیا بتاؤں۔ اس حویلی کے اندر

تم رہتی ہو اور تمہارے اندر ہیلن رہتی ہے۔ یہ کیا چکر ہے۔ نہ میں سمجھتا ہوں۔ نہ تم سمجھ سکوگی۔ ہاں! اگر تم میری شریک حیات بن جاؤ۔ تو پھر میں اس حویلی میں نہیں جاؤں گا۔ دراصل میں تمہیں حاصل کرنے کے لیے ہیلن کے پاس جانا چاہتا ہوں۔"

یہ سب کچھ وہ سوچتا رہا لیکن مونا سے کچھ نہ کہہ سکا۔ فیصلہ کرتا رہا کہ یہ بات مونا کو بتانا چاہیے یا نہیں۔ اس کے فیصلہ کرنے کے دوران ہی وہ حویلی بالکل سامنے آگئی۔ اس وقت ٹیکسی کو ایک زور کا جھٹکا لگا پھر گھرر گھرر کی آوازیں آنے لگیں۔ ڈرائیور گاڑی کو آگے بڑھانا چاہتا تھا لیکن پچھلا پہیہ کیچڑ میں دھنس کر گھومتا جارہا تھا۔

عمرراز کے دل نے پورے یقین سے کہا کہ ہیلن نے اس کا راستہ روک دیا ہے۔

ڈرائیور نے تھوڑی دیر کوشش کرنے کے بعد سر گھما کر کہا۔"صاحب بڑی مشکل ہے۔ گاڑی آگے نہیں بڑھے گی۔ اسے دھکا دینا ہوگا یا پھر یہ سامنے والی حویلی ہے۔ یہاں سے کسی کو بلاؤ۔ وہ ہماری مدد کرے گا۔"

اب اس مسئلے پر بحث کرنا یا تنہا گاڑی کو دھکا لگا کر آگے بڑھانے کی کوشش کرنا فضول تھا۔ صاف طور پر سمجھ میں آرہا تھا کہ اس علاقے میں ہیلن کا کالا عمل اپنا کام دکھا رہا تھا۔ اب اسے ہیلن کو خواہش کے مطابق اس حویلی میں ضرور جانا چاہیے۔ وہ دروازہ کھول کر باہر آگیا پھر مونا کی طرف ہاتھ بڑھا کر بولا۔"آؤ ہم اس حویلی میں جائیں گے۔"

وہ ذرا ہچکچائی پھر ایک مرد کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو دیکھ کر جیسے اسے بہت بڑا سہارا سمجھ کر اس نے ہاتھ کو تھام لیا اور گاڑی سے اتر کر بارش میں بھیگتی ہوئی اس کے ساتھ لوہے کے پھاٹک تک آئی۔ وہ آہنی گیٹ اسی طرح کھلا ہوا تھا جیسے وہ چھ ماہ پہلے کھلا چھوڑ کر گیا تھا۔

دونوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ احاطے کے اندر سے گزرتے ہوئے بارش سے بچنے کے لیے وہ تیزی سے حویلی کی طرف بڑھتے جارہے تھے۔ وہاں بیرونی دروازے کے پاس ہیلن کی وہی کار کھڑی ہوئی تھی۔ جس میں وہ چھ ماہ پہلے ہیلن کے ساتھ آیا تھا۔ اس گاڑی کے پہیوں سے ہوا نکل چکی تھی۔ اوپر گاڑی کے چاروں طرف گرد جمی ہوئی تھی اور اندر بھی سوکھے پتے پڑے ہوئے تھے۔ چھ ماہ میں کار کی یہ حالت ہوگئی تھی۔ وہ مونا کا ہاتھ تھام کر حویلی کے برآمدے میں پہنچ گیا۔

حویلی کا بیرونی دروازہ بھی اسی طرح کھلا ہوا تھا جیسے وہ چھ ماہ پہلے کھول کر گیا تھا۔ وہ دروازہ اتنا بڑا اور وزنی تھا کہ موسمی ہوائیں بھی اسے دوبارہ نہ بند کر سکی تھیں۔ اندر گہری

تاریکی تھی۔ مونا نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔"یہاں تو کوئی بھی نظر نہیں آتا۔"

وہ عمرراز کے بازو سے چپک گئی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے چپکے ہوئے حویلی کے دروازے سے دو قدم اندر آئے پھر وہ بولا۔"میں ماچس کی تیلی روشن کرتا ہوں۔ یہاں قریب ہی ایک شمعدان فرش پر پڑی ہوگی۔ ذرا اسے اٹھالو۔"

یہ کہہ کر اس نے جیب سے دیا سلائی نکالی پھر اس کی ایک تیلی روشن کی۔ وہ حویلی ذرا دور تک روشن ہوگئی۔ وہاں گرد و غبار سے اٹا ہوا سامان اور میلی دیواریں ویسی ہی تھیں جیسا کہ وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ دروازے سے نکلنے کے بعد اس نے شمعدان کو اندر پھینک دیا تھا۔ ٹھیک اس کی یادداشت کے مطابق وہ شمعدان ذرا آگے پڑی ہوئی تھی۔ اس میں موم بتیاں بھی لگی ہوئی تھیں۔ مونا اسے اٹھانے کے لیے آگے بڑھ گئی۔

اسی وقت تیلی بجھ گئی۔ کیونکہ ہوا کے جھونکے باہر سے آرہے تھے۔ اس نے دوسری تیلی نکالی پھر اسے جلانے لگا۔ تیلی روشن ہوئی پھر ہوا کے جھونکے سے بجھ گئی۔ تاریکی میں مونا کی آواز سنائی دی۔"مجھے ڈر لگ رہا ہے آپ جلدی سے تیلی روشن کریں۔"

اس نے تیسری بار تیلی روشن کی اور اسے ہوا کی زد سے بچاتے ہوئے آہستہ آہستہ بڑھتے ہوئے مونا کے قریب آیا۔ وہ شمعدان پر دوزانو ہو کر جھکی ہوئی تھی۔ جیسے شمعدان کو اٹھاتے اٹھاتے اپنی جگہ تھم کر رہ گئی ہو۔ اس نے کہا۔"مونا لاؤ شمعدان مجھے دے دو۔"

مگر مونا خاموش رہی۔ کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے ہاتھ آگے بڑھا کر اسے ہولے سے جھنجوڑا۔ ہاتھ لگاتے ہی وہ ایک طرف فرش پر ڈھلک گئی۔

سائیں سائیں۔ ہوا زور و شور سے ماتم کرتی ہوئی حویلی کے اندر داخل ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے لئے وہ شمعدان کو روشن کرنا بھول گیا۔ مونا کو ٹٹولتا ہوا اس پر جھک کر اسے آوازیں دینے لگا۔"مونا......... مونا"......... وہ اسے ہولے ہولے جھنجوڑ رہا تھا پھر اس نے اسے دونوں شانوں سے پکڑ کر اپنی طرف اٹھایا۔

اسی وقت مونا نے جیسے گہری سانس لی۔ جیسے ہائے کہا ہو پھر اس ہائے کے ساتھ ہیلن کی آواز سنائی دی۔"عمر......... عمر......... مر......... مر......... مر........."

حویلی کے ویران سناٹے میں وہ سرگوشی گونج رہی تھی۔ جیسے جونک چمٹ جاتی ہے

اور جیسے موت پلٹ کر آجاتی ہے۔ ویسے ہی ہیلن واپس آگئی تھی اور اس کے گلے میں باہیں ڈال کر لپٹ گئی تھی۔ اسے پیار سے آوازیں دے رہی تھی۔ گمان ہوتا تھا حویلی کی تاریکی بول رہی ہے۔

"اٹھو عمردراز! شمعدان روشن کرو۔ آج میں یہاں جشن مناؤں گی۔ اس حویلی میں چراغاں کرو۔ آؤ اٹھو۔"

وہ ہیلن کو تھامے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر اس نے جھک کر شمعدان اٹھائی۔ اسے ہیلن کی طرف بڑھایا پھر ماچس کی تیلی روشن کی۔

تاریکی چھٹنے لگی وہ شمعدان کو تھامے ہوئے اس کے سامنے کھڑی تھی۔ سر سے پیر تک مونا تھی اور اپنی آواز اور لہجے کے اعتبار سے ہیلن اس کے سامنے موجود تھی۔ وہ بڑا سا ہال اب دور تک روشن ہو گیا تھا۔ مونا نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ہیلن نے اس سے کہا۔ "آؤ ہم خواب گاہ میں چلیں گے۔"

وہ جیسے سحرزدہ ہو کر رہ گیا تھا۔ اس نے مونا کے ہاتھ سے شمعدان لی پھر دوسرے ہاتھ سے اس کا ہاتھ تھام کر آگے بڑھنے لگا۔ اس کے ساتھ مونا چل رہی تھی اور ہیلن بول رہی تھی۔ "عمردراز! میں اچھی طرح سمجھ گئی ہوں کہ تم ہرجائی ہو۔ اگر وہ ٹیکسی میرے دروازے کے سامنے آکر بیکار نہ ہو جاتی تو تم کبھی ادھر نہ آتے۔ تمہیں میری محبت نہیں تمہاری مجبوریاں یہاں لائی ہیں۔"

عمردراز ہچکچانے لگا۔ وہ کسی حد تک درست کہہ رہی تھی۔ اس نے کہا۔ "تم غلط سمجھ رہی ہو۔ میں تم سے اور صرف تم سے ملنے کے لیے مونا کو یہاں لے کر آیا ہوں۔"

"تم باتیں بنانا خوب جانتے ہو۔ مگر میں تمہاری باتوں میں نہیں آؤں گی۔"

وہ باتیں کرتے ہوئے مختلف کمروں اور راہداریوں سے گزرتے ہوئے اس کمرے میں آگئے جہاں شیطان کا ننگا مجسمہ رکھا ہوا تھا۔ انسانی ہڈیوں کے کٹ پیس۔ انسانی کھوپڑیاں اور مٹی کے پتلے اور کالے جادو کے عمل میں آنے والی ایسی ہی بے شمار اور ہیبت ناک چیزیں وہاں رکھی ہوئی تھیں۔

ہیلن نے کہا۔ "اگر یہ کمرہ نہ ہوتا تو میں کبھی دوبارہ تمہیں حاصل نہ کر سکتی۔ اب میں دوبارہ تمہیں پانے کے بعد کبھی تمہیں کھونا نہیں چاہتی۔ تم اب ہمیشہ یہاں رہو گے۔"

وہ باتیں کرتے ہوئے اس کمرے سے باہر آگئے۔ عمردراز کہنا چاہتا تھا کہ وہ پھر جھگڑا کرنے والی باتیں شروع کر رہی ہے۔ جبکہ وہ چھ ماہ پہلے بھی یہ کہہ چکا تھا کہ وہ اس حویلی

میں اس کے ساتھ نہیں رہے گا لیکن کچھ کہنے سے پہلے ہی وہاں وہ زینہ نظر آیا جس پر چڑھتے ہوئے وہ اوپری خواب گاہ کی طرف گئے تھے۔ اس زینے کے نچلے سرے کا ہیبت ناک منظر دیکھ کر عمردراز کے ہاتھ میں شمعدان کانپنے لگا۔ وہ بارہ سنگا اسی طرح نیچے فرش پر پڑا ہوا تھا اور ایک انسانی ہڈیوں کا ڈھانچہ اس کے سینگوں کے درمیان الجھا ہوا تھا اور بارہ سنگے کا ایک سینگ اس ڈھانچے کی پشت سے پیوست ہونے کے بعد سامنے سینے کی طرف سے اس کی نوک نکل گئی تھی۔ بالکل ایسے ہی جیسے ہیلن کے ساتھ چھ ماہ پہلے ہوا تھا۔

ہیلن ایک سرد آہ بھر کر بولی۔ "دیکھو عمردراز! یہ میں ہوں۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئی ہوں۔ میرا گوشت میرا پوست۔ میری خوبصورتی۔ میرا لباس۔ سب کچھ وقت کی انگلیوں نے نوچ ڈالا ہے۔ میں مونا کا جسم ادھار لے کر تم سے بول رہی ہوں اور وہاں ڈھانچے کی صورت میں پڑی ہوئی ہوں۔"

عمردراز کو اب پسینہ آرہا تھا۔ وہ آگے بڑھنا نہیں چاہتا تھا لیکن اس کا ہاتھ مونا کے ہاتھ میں تھا اور ہیلن اس ہاتھ کو کھینچتی ہوئی زینے کی طرف لے جا رہی تھی پھر وہ زینے کے ایک پائیدان پر چڑھتے ہوئے بولی۔ "مجھے اس انجام تک کس نے پہنچایا؟ تم نے۔ عمردراز تم نے مجھے بے موت مار دیا۔"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "میں شرمندہ ہوں۔"

"شرمندگی سے کچھ نہیں ہوتا۔ تم تسلیم کرو کہ تم نے مجھے قتل کیا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تمہیں تمہارے جرم کا احساس ہو۔ احساس ہو گا تو ندامت ہو گی۔ ندامت ہو گی تو تم اس کی تلافی میں میرے ساتھ رہنا پسند کرو گے۔"

وہ زینے پر چڑھے جا رہے تھے۔ شمع کی روشنی اوپر اور اوپر جا رہی تھی نیچے اور نیچے تاریکی پھیلتی جا رہی تھی۔ زینے کے اوپری حصے پر پہنچ کر عمردراز نے کہا۔ "دیکھو جو کچھ ہوا وہ محض ایک حادثہ تھا۔ میں اس حادثے پر شرمندہ ہوں لیکن یہ کیسے تسلیم کر لوں کہ میں نے جان بوجھ کر تمہیں قتل کیا تھا۔ نہیں ہیلن! میں تمہارا دشمن نہیں تھا۔ میں نے تمہیں چاہا تھا۔ تمہاری ضد اور زبردستی نے اس حادثے کو جنم دیا۔"

مونا نے شمعدان کو ذرا دور فرش پر رکھ دیا۔ پھر وہ اس کے قریب آئی۔ اس کے بعد ہیلن اس کے گلے میں باہیں ڈال کر بولنے لگی۔ "تم ضدی ہو۔ یہاں تم اس لیے آئے ہو کہ تمہیں مجھ سے نہیں مونا کے اس جسم سے پیار ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ تمہارا جادو اس بھولی بھالی لڑکی پر نہیں چلے گا اس لئے تم میرے ذریعے اسے حاصل کرنے کے لیے اسے

یہاں لئے آئے ہو۔"

"تم غلط سمجھ رہی ہو۔ میں نے یہاں آنے کا وعدہ کیا تھا۔ اس وعدے کو نبھایا ہے۔ اب تم کہہ رہی ہو تو میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ ہاں! مجھے مونا سے پیار ہے۔ میں اسے چاہتا ہوں اور تم سے اسی شرط پر ملتا رہوں گا کہ تم مونا کے جسم میں رہ کر مجھ سے ملاقات کرو گی۔"

ہیلن نے دانت پیس کر اسے دیکھا جیسے اسے غصہ آرہا ہو پھر اس نے کہا۔ "تم مونا کو چاہتے ہو۔ تم میری توہین کر رہے ہو۔ اب میں کبھی تمہیں یہاں سے نہیں جانے دوں گی۔ میں یہاں کسی دوسری لڑکی کو بلاؤں گی اور اس کے جسم میں رہ کر تم سے ملوں گی اور مونا کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دوں گی۔"

عمردراز نے اپنی گردن سے اس کی بانہوں کو علیحدہ کر دیا پھر دونوں ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر بولا۔ "میں تمہیں ایسا کرنے کا موقع نہیں دوں گا۔"

وہ غصے سے چیخ کر بولی۔ "تمہیں اپنے جرم کا اعتراف کرنا ہوگا۔ میں کہتی ہوں تم خود کو قاتل تسلیم کرو......... ورنہ۔ ورنہ میں مونا کو ابھی ختم کر دوں گی۔"

عمردراز کو اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ اسے مونا کو یہاں لے کر نہیں آنا چاہیے تھا۔ وہ غصے میں آپے سے باہر ہوگیا اور یہ بھول گیا کہ وہ ہاتھ اٹھائے گا تو مار ہیلن کو نہیں پڑے گی۔ مونا کے جسم کو چوٹ پہنچے گی۔ اس نے جنون کی حالت میں ایک الٹا ہاتھ اس کے منہ پر رسید کر دیا۔ ہیلن کی چیخ سنائی دی۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی پیچھے گئی۔ دوسرے لفظوں میں مونا کا جسم لڑکھڑایا۔ وہ زینے کے اوپری سرے پر اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی پھر وہ گر پڑی۔ زینے کی پستی میں غروب ہوتے ہی اس کی چیخیں سنائی دیں۔

عمردراز ایک دم سے لرز گیا کیوں کہ ہیلن کے بجائے مونا کی چیخیں سنائی دی تھیں۔ اسے یوں لگا تھا جیسے وہ خود موت کی پستی کی طرف لڑھکتا جارہا ہو۔ وہ فوراً ہی پلٹ کر شمعدان کی طرف گیا۔ فرش پر جھک کر اسے اٹھایا پھر وہ تیزی سے بڑھتا ہوا زینے کے اوپری سرے پر پہنچ گیا۔ زینے کی پستی میں نیم تاریکی تھی۔ کچھ اچھی طرح نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ جلدی جلدی نیچے اترتا ہوا نصف زینہ طے کر کے ایک دم سے ٹھٹک گیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ بالکل وہی چھ ماہ پہلے والا منظر اس کی نگاہوں کے سامنے تھا لیکن اب ان سینگوں کے درمیان ہیلن نہیں مونا کا جسم الجھا ہوا تھا اور اس بارہ سنگھے کا ایک سینگ مونا کی پشت میں پیوست ہونے کے بعد سامنے اس کی نوک سینے کی طرف نکل

آئی تھی۔

عمردراز کے حلق سے بے ہنگم سی کراہیں نکلنے لگی تھیں۔ جیسے وہ سینگ اس کے دل میں کھب گیا ہو۔ تکلیف مونا کو پہنچ رہی ہو گی مگر درد اس کے دل و دماغ سے اٹھ رہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا دماغ درد کی شدت سے پھٹ جائے گا۔ وہ مونا کے قریب جاتے ہوئے جنونی انداز میں چیخنے لگا۔ "میں قاتل ہوں۔ میں نے مونا کو قتل کیا ہے۔ مونا میں تمہارا قاتل ہوں۔ مجھے جینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ ہاں میں اقرار کرتا ہوں کہ چھ ماہ پہلے میں نے ہیلن کو بھی اسی طرح زینے سے گرا کر ہلاک کیا تھا اور آج میں نے تمہیں بھی اسی طرح ہلاک کر دیا۔"

مونا دیدے پھیلائے اسے یوں دیکھ رہی تھی جیسے وہ اس کا آخری دیدار ہو اس کا سینہ لہو سے بھیگ گیا تھا۔ اس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ وہ کچھ بولنا چاہتی تھی۔ عمردراز اس کے قریب دوزانو ہو گیا۔ اس کے ہاتھ سے شمعدان چھوٹ کر فرش پر گر گئی اور اس کے ساتھ ہی اس کی تینوں موم بتیاں بجھ گئیں۔

اندھیرے میں مونا کی سسکتی ہوئی سی آواز سنائی دی۔ "عمر......... میں......... میں........." اور بس۔ اس کے بعد مونا کا جسم ایک دم سے ڈھیلا پڑ گیا۔ وہ اسے چھو رہا تھا۔ ٹٹول رہا تھا اور ہذیانی انداز میں چیخ رہا تھا۔ "میں عیاش ہوں........."

حویلی کے سناٹے میں اس کی آواز زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑاتی ہوئی اِدھر اُدھر ہو رہی تھی۔ "میں عیاش ہوں......... ہوں......... ہوں......... ہوں........."

وہ بازگشت میں برابر چیخ رہا تھا۔ "میں عورتوں کے جسم سے کھلونوں کی طرح کھیلتا رہا۔ جب جی بھر گیا۔ انہیں توڑ ڈالا میں نے ہیلن کو بھی ہمیشہ کے لیے توڑ ڈالا۔ اسے ہلاک کر ڈالا۔ بے شک میں ہیلن سے اکتا گیا تھا لیکن مونا میں تمہارا قاتل ہوں۔ میں تمہیں مارنا نہیں چاہتا تھا۔ میں اپنی سزا آپ پاؤں گا۔ میں زندہ نہیں رہوں گا۔ مونا میں زندہ نہیں رہوں گا۔"

اندھیرا گھور اندھیرا۔ موت دو حسین کھلونوں کی موت' انجام بھیانک اور عبرت ناک انجام۔ اب وہ اپنے ہاتھوں سے خود اپنے انجام تک پہنچنا چاہتا تھا۔ اس نے مونا کے ہاتھ کو تھام لیا پھر بارہ سنگھے کے سینگ پر جھک کر اس کی نوک پر اپنے سینے کو رکھ لیا۔ وہ اس سینگ کو اپنے وجود میں اتار لینا چاہتا تھا۔ اسی وقت اس شیطانی کمرے سے روشنی جھلکنے لگی۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ روشنی تھی اور وہ روشنی اس کی طرف

آرہی تھی۔

اس گہری تاریکی میں ایک موم بتی کی لو آہستہ آہستہ سلگتی ہوئی قدم قدم آگے بڑھتی جارہی تھی۔ وہ موم بتی بلندی پر تھی۔ پھر وہ روشنی نیچے آنے لگی۔ نیچے انسانی قد کی بلندی پر پہنچ کر وہ تھم گئی پھر اس موم بتی کے پیچھے ہیلن کا چہرہ نظر آیا۔

اس نے سرخ رنگ کی نائٹی پہنی ہوئی تھی۔ باریک نائٹی کے پیچھے اس کے گورے بدن کی چاندنی جھلملا رہی تھی۔ شانے پر سنہری زلفیں بکھری ہوئی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ نائٹی لہو میں ڈوبی ہوئی ہے۔ عمر دراز کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ وہ جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر آنکھیں ملتے ہوئے اس نے پوچھا۔"تم .... تم ہیلن ہو؟"

حویلی کی تاریکی اور خاموشی میں ہیلن کی دھیمی دھیمی آواز گونجنے لگی۔" ہاں میں ہیلن ہوں۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ نہیں ہوں۔ موت اتنی آسانی سے مجھ پر غالب نہیں آسکتی۔ مجھے دیکھو۔ یہ بھرا بھرا بدن تمہیں تو خوب یاد ہو گا۔ تم مجھ سے پیچھا چھڑا کر گئے تھے اور میں نے دعویٰ کیا تھا کہ تم واپس آؤ گے اور آج میں نے تمہیں واپس بلا لیا ہے۔"

عمر دراز کو اب تک اپنی آنکھوں پر اور اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا پھر اس شیطانی کمرے سے اور زیادہ روشنیاں جھلکنے لگیں۔ ایک سہ شاخہ شمعدان وہاں سے چلی آرہی تھی۔ جب وہ قریب آئی تو عمر دراز پھر ایک بار چونک پڑا۔ اس شمعدان کو اٹھانے والا وہ پادری تھا جو سری لنکا میں اپنا سفر ملتوی کر چکا تھا۔ وہ مسکرا کر بولا۔"مائی سن' مجھے حیرانی سے نہ دیکھو۔ میں سری لنکا سے خشکی کے راستے ٹرین کے ذریعے تم سے پہلے پہنچ گیا ہوں۔"

پادری کے پیچھے دو ہٹے کٹے جوان آکر کھڑے ہو گئے تھے۔ عمر دراز نے پریشانی سے پوچھا۔"یہ .... یہ کیا ڈرامہ ہے؟"

ہیلن نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔"یہ اب بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آیا۔ تم اس رات مجھ سے پیچھا چھڑانا چاہتے تھے۔ تمہارا بس چلتا تو تم مجھے قتل کر کے یہاں سے چلے جاتے لیکن قتل کرنا تمہارے مزاج کے خلاف تھا۔ جب میں خود ہی قتل ہو گئی۔ یہاں آکر سینگوں کے درمیان الجھ گئی تو تم گھبرا گئے تمہیں اپنے پھنسنے کا یقین ہو گیا۔ تم نے سوچ لیا کہ اگر یہاں زیادہ دیر ٹھہرو گے تو میرے قاتل کہلاؤ گے اور یہاں سے فرار ہو جاؤ گے تو کوئی تمہیں قاتل ثابت نہیں کر سکے گا کیونکہ ہمارے علاوہ اور کوئی تیسرا آدمی یہاں موجود نہیں تھا۔ اس لیے جب میں نے سینگوں کے درمیان دم توڑ دیا تو تم نے مجھے وہاں سے

اٹھانے کی زحمت گوارا نہیں کی اور میری لاش کو یوں ہی گلنے سڑنے کے لیے چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمہیں مجھ سے کتنی شدید نفرت تھی۔"

عمر دراز نے گہری سنجیدگی سے سر گھما کر مونا کی لاش کو دیکھا۔ پھر کہا۔"یہ کیسے ممکن ہے اس روز بارہ سنگے کا ایک سینگ تمہارے سینے کے آر پار ہو گیا تھا اور تمہارے سینے پر تمہارا لہو پھیلا ہوا تھا۔ تم نے میرے سامنے دم توڑا تھا پھر یہ کیسے ممکن ہے؟ کیا مجھ سے فراڈ کیا جا رہا ہے؟"

پادری نے آہستہ سے آواز دی۔"مونا۔ اب اٹھ جاؤ۔ ناٹک ختم ہو رہا ہے۔"

عمر دراز نے چونک کر بارہ سنگے کی طرف دیکھا۔ مونا آہستہ آہستہ اٹھ رہی تھی۔ اپنے سینے پر رکھے ہوئے بارہ سنگے کے ایک سینگ کو اس نے اٹھا کر وہاں رکھا جہاں وہ پیٹھ کے بل لیٹی ہوئی تھی۔ جیسے شیشی کا پیچ والا ڈھکنا بند کیا جاتا ہے۔ اسی طرح مونا نے سینگ کو وہاں رکھ کر پیچ دار ڈھکنے کی طرح اسے وہاں لگا دیا۔ بارہ سنگے کا سینگ جو پہلے الگ تھا۔ وہ اپنی جگہ آکر جم گیا تھا۔

عمر دراز غصے سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مونا کی حرکتوں کو دیکھ رہا تھا۔ ساری باتیں اس کی سمجھ میں آگئی تھیں۔ سینگ کے اس خول میں سرخ رنگ یا کسی جانور کا لہو تھا جسے چھ ماہ پہلے ہیلن نے اور اس رات مونا نے یوں رکھ لیا تھا کہ وہ سرخ رنگ یا لہو ان کے کپڑوں پر پھیلتا جا رہا تھا اور شمعدان کی روشنی میں دیکھنے سے یوں لگتا تھا جیسے وہ ایک سینگ پیٹھ کی جانب سے پیوست ہو کر سینے کی طرف نکل آیا ہے۔

وہ پہلی بار مونا کو نفرت سے دیکھتے ہوئے بولا۔"میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اتنے معصوم چہرے کے پیچھے اتنی مکاریاں چھپی ہوں گی۔"

ہیلن نے پھر ایک قہقہہ لگا کر کہا۔"ہاں۔ میں نے سوچ سمجھ کر مونا کا انتخاب کیا تھا۔ میں جانتی تھی کہ یہ حسین ہے۔ تم اس کے جال میں ضرور پھنسو گے۔ یہ معصوم ہے۔ تم اس کی معصومیت کے پیش نظر کبھی کسی سازش کے متعلق شبہ نہیں کرو گے پھر سب سے اہم بات یہ ہے کہ مونا ایک اسٹیج فنکارہ ہے۔ آواز بدلنے اور کسی کے لہجے کی نقالی کرنے میں اسے خاص مہارت ہے۔ کیبن نمبر سیون میں تم دیکھ چکے ہو گے کہ اس نے آسیب زدہ لڑکی کا رول ادا کرنے کے لیے کس طرح میری آواز اور لہجے کی نقل پیش کی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میری آواز اور لہجے کی نقالی میں کہیں اس سے لغزش ہوئی ہو لیکن تمہارے جیسا شراب کے نشے میں نیم مدہوش رہنے والا آدمی ذرا ذرا سی خامیوں کو نہیں پکڑ سکتا

تھا۔"

وہ ہولے سے مسکرایا۔ عمر دراز کے ذہن سے اچانک ہی جیسے سارا بوجھ اتر گیا۔ ساری پریشانیاں دور ہو گئیں۔ کیونکہ وہ نہ تو اب ہیلن کا قاتل تھا اور نہ مونا کا۔ کوئی آسیبی اور جادوئی چکر نہیں تھا۔ وہ ہر الزام سے بری تھا۔ اس نے نفرت سے ایک بار مونا کو دوسری بار ہیلن کو دیکھا پھر کہا۔ "مجھے اس تماشے کا مطلب سمجھاؤ۔ آخر تم چاہتی کیا ہو؟"

وہ اپنی شمعدان ایک نوجوان کے ہاتھوں میں دیتی ہوئی بولی۔ "میں تمہیں چاہتی ہوں۔ میں نے تم سے کہہ دیا تھا کہ میں تمہیں ساری عمر اپنے ساتھ اس حویلی میں رکھوں گی۔ تم میرے کاروبار میں میرا ساتھ دو یا نہ دو لیکن جیون ساتھی بن کر رہو گے۔ اسی لیے میں نے تمہیں یہاں بلایا ہے۔"

"تم بکواس کرتی ہو۔ میں یہاں سے جاؤں گا اور تمہارے یہ تینوں چمچے میرا راستہ نہیں روک سکیں گے۔"

اس کی بات سنتے ہی ایک نوجوان نے اپنی جیب سے ریوالور نکال لیا۔ پادری نے کہا۔ "اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ذرا وہ ٹیپ ریکارڈر آن کر کے کیپٹن کو اس کی آواز سنا دو۔"

ایک نوجوان اس شیطانی کمرے میں واپس گیا پھر تھوڑی دیر بعد حویلی کے سناٹے میں کیپٹن عمر دراز کی آواز گونجنے لگی۔ یہ وہی آوازیں تھیں جو تھوڑی دیر پہلے ہذیانی انداز میں اس کے حلق سے نکل رہی تھیں۔

عمر دراز سر اٹھائے اپنا اعتراف جرم سن رہا تھا۔ اس کا مکمل بیان تھا کہ اس نے کس طرح چھ ماہ پہلے ہیلن کو ہلاک کیا تھا اور ٹھیک اسی طرح اس نے آج مونا کو ہلاک کیا ہے۔

وہ ٹیپ چلنے کے بعد بند ہو گیا۔ اس کے بعد ہیلن نے کہا۔ "تم نے اپنا اعتراف جرم سن لیا اگر تم میرا ساتھ نہیں دو گے تو میں اور مونا ایسی جگہ روپوش ہو جائیں گی کہ قانون کی نظریں ہمیں تلاش نہیں کر سکیں گی اور قانون کے محافظ یہی سمجھیں گے کہ تم نے ہمیں ہلاک کرنے کے بعد ہماری لاشیں چھپا دی ہیں۔"

"عمر دراز نے پوچھا۔ "اگر میں تم سے دوستی کر لوں تب کیا ہو گا؟"

"تب بھی میں روپوش ہی رہوں گی۔ کبھی کبھی اچانک ہی تم سے مل لیا کروں گی۔ اس وعدے کے ساتھ کہ تمہارے جہاز کی حرم سرا نت نئی لڑکیوں سے آباد رہے گی اور وہ لڑکیاں میں سپلائی کروں گی۔ بس ایک دوستی شرط ہے۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا۔ تم مجھ سے محبت کا دعویٰ کرتی ہو پھر مجھ سے روپوش رہ کر کبھی کبھی مل لیا کرو گی۔ میری حرم سرا کو دوسری لڑکیوں سے سجایا کرو گی پھر یہ کیسی محبت ہے۔ یہ سب ایک ناٹک ہے۔ کیا تم مجھے سچ بات نہیں بتاؤ گی؟"

"بتادوں گی۔ جب کبھی مناسب سمجھا تو بتادوں گی۔"

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ عمر دراز اسے گھور کر دیکھتا رہا پھر اس خاموشی میں مونا کی آواز ابھرنے لگی۔ وہ بولی۔ "میں بتاتی ہوں۔ ہیلن سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس نے مجھے کرائے پر حاصل کیا ہے۔ میرا اسٹیج ڈرامہ اس نے ایک بار دیکھا تھا۔ میری اداکاری اور میرے بولنے کا انداز اسے پسند آیا۔ اس نے دس ہزار میں مجھ سے سودا کیا تھا۔ سودا یہ تھا کہ بمبئی سے تمہارے جہاز پر سوار ہوں گی اور وہی کروں گی جو اب تک کرتی آئی ہوں۔ یعنی میری مونا کی حیثیت رہے اور کیبن میں رات کے وقت ہیلن بھی بن جایا کروں گی۔ صرف اس کے لیے مجھے دس ہزار روپے دیے گئے۔ یہاں تمہیں لانے کی کوئی شرط نہیں تھی۔ ہیلن کا اور اس بہروپیے پادری کا خیال تھا کہ تم خود ہی ان حالات سے متاثر ہو کر یہاں چلے آؤ گے۔ نہیں آتے تو تمہیں لانے کے انتظامات کر دیے گئے تھے۔ مثلاً وہ ٹیکسی ڈرائیور ان کا ہی آدمی ہے۔ اس نے جان بوجھ کر گڑھے میں کار کے ایک پہیے کو پھنسا دیا تھا۔"

ہیلن نے چیخ کر کہا۔ "مونا۔ کیا تمہاری شامت آگئی ہے۔"

مونا زینے کے ایک پائیدان پر بیٹھتی ہوئی بولی۔ "پتہ نہیں کس کی شامت آنے والی ہے۔ ہیلن تم نے مجھے سمجھنے میں غلطی کی۔ تمہیں یہ سوچنا چاہیے تھا کہ اگر میں اپنی اداکاری سے دوسروں کی نقالی سے فائدہ اٹھانا چاہتی تو اب تک مجرموں کی طرح زندگی گزارتی رہتی۔ ایک اسٹیج کی اداکارہ نہ بنتی۔ جب تم نے مجھ سے دس ہزار روپے میں یہ معاملہ طے کیا اور بمبئی جانے کے لیے کہا تو سب سے پہلے میں نے قانون کے محافظوں سے رابطہ قائم کیا۔ انہیں ساری ہسٹری بتا دی کہ تم اس جہاز میں میرے ذریعے کس قسم کا ڈرامہ پلے کرنا چاہتی ہو۔"

اب ہیلن اور پادری اور وہ دونوں نوجوان ایک دم سے محتاط ہو کر اور متعجب ہو کر مونا کو بے یقینی سے گھور رہے تھے۔ وہ بولی۔ "میں نے قانون کا ساتھ دیا مگر اپنا بہت کچھ گنوا دیا۔"

یہ کہہ کر اس نے عمر دراز کو دیکھا پھر وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگی۔

روتے روتے بولنے لگی۔ "کیپٹن جب میں نے تم سے دو چار ملاقاتیں کیں تو میرے دل نے کہا۔ میں تمہاری ہو چکی ہوں۔ میں تم سے بچنا چاہتی تھی۔ کترانا چاہتی تھی مگر ہیلن نے ڈرامے کے جو سین تیار کیے تھے ۔ اس کے مطابق مجھے تم سے تنہائی میں ملنا بھی ضروری تھا۔ تمہیں یاد ہو گا کہ جب جہاز سری لنکا کے قریب پہنچ رہا تھا تو رات کے ٹھیک ایک بجے تمہیں اپنے کیبن میں لے گئی تھی۔" وہ سوچ رہا تھا اور مونا بول رہی تھی ۔

"کیپٹن۔ یہ ہیلن کیبن نمبر لی سیون میں آپ سے ناٹک کھیلتی تھی۔ تاکہ آپ اپنے کیبن سے غیر حاضر رہیں کیونکہ آپ کے کیبن کی برتھ کے نیچے وہ مال چھپا کر رکھا جاتا تھا۔"

عمردراز نے چونک کر ہیلن کو دیکھا۔ ہیلن نے ایک بار کہا تھا۔ "کیپٹن! تم سارا جہاز چھان مارو لیکن تمہیں وہ مال نہیں ملے گا۔"

اب بات سمجھ میں آگئی تھی۔ یہ دعویٰ اس نے اس لیے کیا تھا کہ بحری جہاز میں اچانک ہی سرپرائز چیکنگ ہوتی تھی۔ لوگوں کا سامان چیک کیا جاتا تھا کہ کہیں اسمگلنگ نہ ہو رہی ہو۔ ہیلن نے وہ مال کیپٹن کے کیبن میں اس کی برتھ کے نیچے چھپا کر رکھا تھا اور سری لنکا پہنچنے سے پہلے وہ مال اس وقت کیبن سے نکال لیا جاتا تھا جب وہ کیبن نمبر لی سیون میں عیاشی میں مصروف ہوتا تھا۔

ہیلن نے غصے سے کہا۔ "بول لو مونا بول لو اس کے بعد تم بولنے کے لئے زندہ نہیں رہو گی۔"

مونا لاپروائی سے بولی۔ "کیپٹن' چاٹگام پہنچنے سے پہلے بھی یہی ہوتا رہا۔ آپ میرے ساتھ کیبن میں رہے۔ چھ ماہ پہلے ہیلن کے ساتھ بھی کیبن میں رہے۔ اس وقت بھی بقیہ مال کیبن سے نکال لیا گیا۔ یہ اچھی طرح جانتی تھی کہ آپ کیبن کا سامان ادھر سے ادھر اٹھا کر نہیں رکھتے ہیں۔ آپ کے اسٹیوارڈ آپ کے خاص ملازم ہیں۔ انہیں ہیلن نے خرید رکھا ہے۔ وہی تمام مال وہاں چھپاتے ہیں اور وہاں سے نکال کر بندرگاہ پر پہنچا دیتے ہیں۔"

بھروپے پادری نے دانت پیس کر کہا۔ "اگر ہمیں معلوم ہوتا کہ تم قانون کا ساتھ دینے کے لیے یہ ڈرامہ کھیل رہی ہو تو ہم تمہیں سمندر میں پھینک دیتے۔"

مونا روتے ہوئے بولی۔ "اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ اس ڈرامے کے دوران میں اپنی شرم و حیا کھودوں گی تو میں اس تماشے سے باز آجاتی لیکن میں مجبور ہو گئی تھی۔ قانون

کے محافظوں میں وہاں جو جاسوس تھا۔ وہ ہمیں سمجھاتا تھا کہ ہم اسمگلنگ کرنے والے بہت بڑے گروہ تک پہنچنے والے ہیں۔ تم ہر قیمت پر قانون کا ساتھ دو۔ خدا تمہارا ساتھ دے گا۔"

یہ کہہ کر اس نے آنسو بھری آنکھوں سے عمردراز کو دیکھا پھر آہستگی سے کہا۔ "ہاں میں نے خدا کے بھروسے پر اپنے آپ کو تمہارے حوالے کر دیا تھا کیپٹن۔ آج تک کوئی مجھے ہاتھ نہ لگا سکا مگر اس مین تمہارا قصور بھی نہیں ہے۔ تم بھی کبھی مجھے ہاتھ نہیں لگا سکتے تھے۔ مگر میرا دل ہار گیا تھا۔"

یہ کہہ کر وہ پھر ساڑھی کے آنچل میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ وہ کوئی ڈرامہ نہیں تھا۔ پیار کی سچی اداتھی بے چاری نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنا سب کچھ ہار دیا تھا۔ عمردراز نے اسے بڑی محبت سے دیکھا پھر اس کے قریب آکر زینے کے پائیدان پر بیٹھنے کے بعد اس کے ہاتھ کو تھام کر بولا۔ "مونا تم نے مجھے جیت لیا ہے۔ تم نے کچھ نہیں کھویا۔ تم میری ہو۔ میں تمہیں ساری زندگی کے لیے اپناؤں گا۔"

ہیلن کا قہقہہ سنائی دیا وہ بولی۔ "بڑے سچے عاشق بن رہے ہو۔ کیا خیال ہے کیپٹن کیا مجھے ٹھکرا کر زندہ رہنے کی توقع کر رہے ہو؟"

عمردراز کے جواب دینے سے پہلے ہی اس نے ایک نوجوان سے کہا۔ "ڈیوڈ! اٹھاؤ ریوالور اور کیپٹن کے سامنے مونا کو گولی کا نشانہ بناؤ۔ سارا عشق یہیں لہو میں ڈھل کر رہ جائے گا۔"

اس جوان نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے ریوالور نکال لیا۔ عمردراز نے فوراً ہی دونوں بازو پھیلا کر مونا کو اپنے قریب سمیٹ لیا۔ اسی وقت ٹھائیں سے گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ چند ساعت کے لیے پھر سناٹا چھا گیا۔ حویلی میں صرف فائرنگ کی آواز گونج رہ گئی تھی۔ پھر عمردراز نے پلٹ کر دیکھا تو ریوالو چلانے والا اپنے بازو کو پکڑ کر فرش کی طرف جھک رہا تھا اور اس شیطانی کمرے کے دروازے پر طاہر بیگ کھڑا ہوا نظر آرہا تھا۔

اب دور تک قدموں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ طاہر بیگ نے گرجتی ہوئی آواز میں کہا۔ "کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ حویلی کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا ہے اور مونا مجھے افسوس ہے کہ یہاں تک پہنچنے میں مجھے ذرا دیر ہو گئی۔ جس ٹیکسی میں تم کیپٹن کے ساتھ آئی ہو' اس کی ڈگی میں چرس کا ذخیرہ آیا ہے۔ وہ لوگ حویلی کے پچھلے دروازے سے وہ مال اندر پہنچا رہے تھے۔ یہ تمام معلومات حاصل کرنا بہت ضروری تھا۔ بہرحال میں

نے وہ تہہ خانہ دریافت کر لیا ہے جہاں اسمگل ہونے والا مال چھپا کر رکھا جاتا ہے۔"

ہیلن اور اس کے ساتھی گم صم کھڑے ہوئے تھے۔ اتنی دیر میں چار فوجی آ گئے۔ وہ ہیلن کے ساتھیوں کی جامہ تلاشی لے رہے تھے۔ کیپٹن نے مونا کے قریب جھک کر کہا۔ "اچھا تو بے چارے ظاہر بیگ کو تم میرا رقیب بنا رہی تھیں۔ وہ میری شکایتیں کر رہا تھا۔ کیوں؟"

مونا کے لبوں پر ہلکا سا تبسم آیا۔ اس نے نظریں جھکا لیں۔ عمر دراز نے اس کے کانوں میں سرگوشی کی۔ "مونا تم بہت اچھی ہو۔ تم نے میرے جینے کا ڈھنگ بدل دیا ہے۔ اب تم ہی میرے جینے اور مرنے تک ساتھ رہو گی۔ منظور ہے نا؟"

مونا نے اپنا سر اس کے سینے پر رکھ دیا۔

☆======☆======☆

آگ کا پجاری

ایک شعلہ صفت لڑکی کا قصہ جو جلتی ہوئی آگ کی مانند تھی۔
ایک دیوانے کی دیوانگی کا قصہ جو آگ کا پروانہ تھا۔
آگ نہیں جانتی تھی کہ پروانہ اس تک کیسے پہنچے گا لیکن
پروانہ جانتا تھا کہ اسے آگ تک کیسے پہنچنا ہے۔

وہ دونوں اتنی تیزی سے بھاگ رہے تھے جیسے پیچھے پیچھے موت اور آگے آگے زندگی بھاگتی ہے۔

قدموں کی مسلسل دھمک سے جنگل کی خاموشی مجروح ہو رہی تھی۔ وہ کچھ اس انداز سے بھاگ رہے تھے کہ عورت کا ہاتھ مرد کے ہاتھ میں تھا۔ مرد ایک ہی رفتار سے جنونی انداز میں بھاگ رہا تھا۔ عورت اس کے پیچھے کھنچی جا رہی تھی۔ اس میں دوڑنے کی تو کیا' چلنے کی بھی سکت نہیں رہی تھی۔ ہر قدم پر گر پڑنے کو جی چاہتا تھا۔ گرنے کے بعد ہی ذرا سانس لینے اور تازہ دم ہونے کا موقع مل سکتا تھا لیکن وہ بھی جبراً ایسے بھاگ رہی تھی جیسے پیچھے سے کوئی چابک رسید کر رہا ہو۔

اس وقت دوپہر ڈھل رہی تھی۔ اونچے نیچے گھنے درختوں کے سائے میں ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ مگر مسلسل بھاگنے کی وجہ سے ان کے بدن گرمی سے پھنک رہے تھے' پسینہ چوٹی سے ایڑی تک بہہ رہا تھا۔ قد آدم جھاڑیوں کے درمیان سے گزرتے وقت ان کی رفتار میں قدرے کمی آ گئی۔ عورت سوچ رہی تھی کہ شاید وہاں ذرا دیر رکنے کا موقع مل جائے گا مگر وہ ایک ہاتھ سے جھاڑیوں کو ہٹاتے ہوئے' راستہ بناتے ہوئے گزرتا جا رہا تھا۔ بے ترتیبی سے پھیلی ہوئی جڑیں کبھی کبھی پھندے کی طرح ان کے قدموں سے الجھ جاتی تھیں۔ وہ گرتے تھے' سنبھلتے تھے' پھر اٹھ کر دوڑنے لگتے تھے۔

ایک جگہ وہ ایسی گری کہ اپنے ساتھی کا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اتنا ہی موقع غنیمت تھا۔ بعض اوقات ٹھوکر کھا کر گرنے سے بھی آرام آتا ہے۔ وہ دونوں ہاتھ زمین پر ٹیک کر اوندھی پڑی رہی۔ اس کے ساتھی نے پلٹ کر کہا۔

"روزینہ! ہمت نہ ہارو۔ اٹھو' ہم سرحد کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ بس تھوڑی دور اور.........."

وہ ایک گھوڑی کی طرح منہ کھولے بری طرح ہانپ رہی تھی۔ ویسے وہ اتنی حسین تھی کہ اس کے لئے گھوڑی کی مثال پیش کرنا کسی طرح مناسب نہیں تھی لیکن وہ اپنی

نزاکت اور سارے عشوے طرازیاں بھول کر بے ڈھنگے پن سے ہانپ رہی تھی' کانپ رہی تھی اور بار بار اِدھر سے اُدھر سر ہلاتی ہوئی ایک گھوڑی کی مثال پیش کر رہی تھی۔

اس کے ساتھی نے جھک کر اس کے گداز بازوؤں کو تھام لیا۔

"آؤ۔ اٹھو۔ دیر نہ کرو۔"

وہ نفی میں سر ہلا کر نہیں نہیں کی گردان کرنے لگی۔

"نہیں بابر۔ نہیں۔ میں۔ میں ایک قدم بھی نہیں چل سکتی۔ ذرا دیر رک جاؤ۔ پلیز!"

"یہ مت بھولو کہ موت ہمارا پیچھا کر رہی ہے.........."

یہ کہتے ہوئے بابر نے اسے ایک جھٹکے سے اٹھا کر کھڑا کر دیا۔ وہ کراہتی ہوئی اس کے سینے سے لگ گئی۔ پھر اس کے سہارے لڑکھڑاتی ہوئی چلنے لگی۔

اس کے بلاؤز اور اسکرٹ میں جا بجا شکنیں پڑ گئی تھیں' بال بکھر گئے تھے اور چہرہ دھواں دھواں سا ہو رہا تھا۔ اسے اپنی موجودہ حالت پر رونا آ رہا تھا کہ صبح تک وہ کیا تھی اور اب کیا بن گئی ہے۔

صبح تک وہ ملکۂ حسن تھی۔

اس نے کبھی کسی مقابلۂ حسن میں حصہ نہیں لیا تھا۔ اس کے باوجود اپنے شہر کے اونچے طبقے میں سب سے حسین عورت سمجھی جاتی تھی۔ حسین بھی اور سنگین بھی۔ دل والے اور دولت والے اس کے لئے جان و مال کی بازی لگاتے تھے۔ اس کے عشق میں کوئی ہار کر پچھتاتا تھا اور کوئی جیت کر پچھتاتا تھا۔ جیت کر اس لئے پچھتاتا تھا کہ ایسے وقت بھی وہ ایک بے لگام گھوڑی کی مثال پیش کرتی تھی۔ چند ایک جیالے ایسے تھے جنہوں نے بڑی مشکلوں سے اسے کچھ عرصے کے لئے قابو میں رکھا تھا۔ پھر وہ بدک کر آزاد ہو گئی تھی۔ وہ گنتی کی ان چند عورتوں میں سے تھی جو مردوں کے لئے چیلنج بن جاتی ہیں۔

اب سے پہلے تین نوجوان اس کے ساتھ اسی طرح زندگی سے موت کی طرف دوڑتے چلے گئے تھے۔ بابر ان کے انجام سے واقف تھا۔ اس کے باوجود وہ اس عورت کے ساتھ دوڑتا جا رہا تھا۔

مرد اسی لئے مرد کہلاتے ہیں کہ وہ موت سے کھیلتے ہیں۔ اگر وہ موت عورت کے روپ میں آئے تو یہ کھیل اور زیادہ دلچسپ ہو جاتا ہے۔ وہ بابر کی بغل میں دبی ہوئی ساتھ ساتھ دوڑتی جا رہی تھی۔ قدم قدم پر دونوں کے جسم ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے۔

روزینہ کے بھرے بھرے بدن کی دلکشی اور جاذبیت کہہ رہی تھی کہ دوڑو۔ میرے لئے دوڑتے رہو۔ اس وقت تک دوڑتے رہو' جب تک کہ میری ایک ٹھوکر تمہارے لئے موت کا پیغام نہ بن جائے۔

بابر کمزور اور بزدل نہیں تھا کہ کسی عورت کی ٹھوکر برداشت کر لیتا۔ وہ چھ فٹ کا قوی ہیکل جوان تھا۔ وہ دلیر بھی تھا اور ضدی بھی' جو چیز اسے پسند آتی' اسے چھین کر حاصل کر لیتا تھا اور روزینہ کو اس کا یہی انداز پسند تھا۔ اگر بابر اسے چھین کر نہ لاتا تو وہ کبھی اس کے ساتھ نہ آتی۔

اب تک کا تجربہ یہی بتا رہا تھا کہ وہ دل و جان سے بابر کی ہو گئی ہے۔ اب اس کے بازوؤں میں پگھل جاتی ہے۔ اس کی سفاکی سے گھبرا کر اس کے قدموں میں گر جاتی ہے۔ اب وہ بے لگام نہیں ہو سکتی۔ ہمیشہ اس کی مٹھی میں رہے گی۔ بابر اسی لئے اسے کشاں کشاں ایسی منزل کی طرف لے جا رہا تھا جہاں روزینہ اس کے رحم و کرم پر ہوتی اور ان کے درمیان کوئی رقیب نہ آتا۔

وہ اپنے طور پر تمام احتیاطی تدابیر پر عمل کر رہا تھا۔ ہر انسان موت سے دور رہنے کی تدبیریں کرتا ہی رہتا ہے اور یہ بھول جاتا ہے کہ موت ہمیشہ ساتھ ساتھ چلتی ہے

روزینہ اس کے ساتھ چل رہی تھی۔

جھاڑیوں سے گزر کر وہ کھلی جگہ میں آ گئے۔ ان کے سامنے چند قدموں کے فاصلے پر ایک دریا بہہ رہا تھا۔ وہ دریا دو ملکوں کے درمیان ایک سرحدی لائن کی طرح کھنچا ہوا تھا۔ اس پار ایک گھنا جنگل تھا' جو تقریباً پچیس میل کے رقبے میں پھیلا ہوا تھا۔ پانی کو دیکھتے ہی روزینہ کی پیاس بڑھ گئی' حلق سوکھنے لگا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی دریا کی طرف بڑھنے لگی۔ بابر بھی اس کے ساتھ چل رہا تھا۔ ساحل پر پہنچتے ہی وہ ٹھٹک کر دور سے آنے والی آواز کو سننے لگی۔

کسی کار یا جیپ کار کی آواز تھی۔ پتہ نہیں وہ آواز کتنی دیر سے ان کا پیچھا کر رہی تھی۔ جھاڑیوں کی سرسراہٹ میں وہ سن نہیں سکے تھے۔ بابر نے اس کے بازو مضبوطی سے تھام کر کہا۔

"پولیس............ بھاگو یہاں سے............"

وہ اسے کھینچتا ہوا دریا میں اتر گیا۔ روزینہ کو فیصلہ کرنے کا موقع ہی نہ ملا کہ کس طرف بھاگنا چاہئے۔ پیچھے پولیس تھی' آگے دریا تھا۔ نہ وہ پولیس کی حراست میں جانا چاہتی

تھی اور نہ دریا میں ڈوبنے کا حوصلہ تھا۔ اس کا ایک بازو بابر کی مٹھی میں جکڑا ہوا تھا اور وہ قہراً و جبراً پانی میں اتر آئی تھی۔ لہروں کے بہاؤ میں توازن برقرار رکھنا اور قدم بڑھاتے رہنا محال تھا۔ بار بار اس کے قدم اکھڑتے تھے اور ہر بار بابر اسے سنبھال لیتا تھا۔

"مجھے ڈر لگتا ہے بابر۔ آگے گہرائی ہے' مجھے تیرنا نہیں آتا ہے' میں ڈوب جاؤں گی۔"

"میں تمہارے ساتھ ہوں اور تمہارے ڈوبنے کا تماشا نہیں دیکھوں گا۔ تمہیں اس پانی سے تو کیا' آگ اور خون کے دریا سے بھی صحیح سلامت نکال لے جاؤں گا۔"

وہ چند لمحوں کے لئے رک گئے اور پیچھے پلٹ کر دیکھنے لگے۔ دور جھاڑیوں کے پیچھے جیپ کار کے انجن کی ہلکی ہلکی غراہٹ سنائی دے رہی تھی۔ وہ دونوں پلٹ کر اور تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔

آگے منجدھار میں زیادہ گہرائی نہیں تھی۔ بابر کی کمر تک پانی تھا۔ روزینہ اپنے قد کے لحاظ سے کمر سے اوپر تک ڈوبی ہوئی تھی۔ لہریں سینے کے زرخیز ابھاروں کے سائے میں بہہ رہی تھی۔ جسم میں بلا کی گرمی تھی۔ اس کے برعکس لہریں ٹھنڈی تھیں۔ یہ لہریں پہاڑوں کی برف سے پگھل کر آئی تھیں' اس لئے سرد تھیں۔ مگر وہ زیادہ سے زیادہ درجہ حرارت بتانے والا جسم کہاں سے آیا تھا؟

روزینہ کا وہ جسم بہت دور سے............ آتش فشاں کے لاوے سے بن کر آیا تھا۔ اس کی ماں اپنی جوانی میں کسی مغربی ملک سے اسمگل کر کے کسی شیخ کی حرم سرا میں لائی گئی تھی۔ ایک سرد ملک کی انگریز عورت کو پہلی بار ریگستانی حرم سرا کی گرمی سے سابقہ پڑا تھا۔ بہرحال عورت خود کو ہر ماحول کے مطابق ڈھال لیتی ہے۔ دو برس کے بعد حرم سرا میں مال کی نئی کھیپ آئی تو اسمگلر نے اسے سلاجیت کھانے والے ایک عیاش کے حوالے کر دیا۔ وہ ایک ملک سے دوسرے ملک۔ دوسرے سے تیسرے ملک گھومتی رہی۔ گاہک اور عاشق بدلتے رہے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ دولت جمع کرتی رہی۔ نت نئے تجربات کا زہر پیتی رہی۔ وہ زہر اس کے دماغ کی تجوری میں جمع ہوتا رہا۔ کُشتے' معجون اور سلاجیت کا لاوا جسم کی تہہ میں پکتا رہا۔ پھر ایک دن زبردست زلزلہ آیا۔ زمین پھٹنے لگی۔ آتش فشاں پہاڑ کے دہانے سے آگ برسنے لگی۔ وہ آگ کیا تھی؟............ وہ آتش رنگ تھی۔ وہ آتش مزاج تھی۔

وہ آتش کا پرکالہ تھی............ وہ روزینہ تھی۔

جو اسے چھو کر اپنی آخری سانس تک پہنچ گئے تھے۔ وہ اس دنیا سے جاتے جاتے یہ

بیان دے گئے تھے کہ وہ جو گوشت پوست کی عورت ہے۔ وہ خاکی نہیں آتشی مخلوق ہے۔ جو آگ وہ اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے' اسے بجھانا اگر ناممکن نہیں تو محال ضرور ہے۔

اور دریا کی سرد لہریں اس آگ کو چھو کر گزر رہی تھیں اور وہ آگ کا پجاری بابر اپنی پوجا کے لئے......... اس کے ساتھ جا رہا تھا۔

دوسرے کنارے پر پہنچ کر وہ دوڑتا ہوا اور اسے کھینچتا ہوا گھنی جھاڑیوں کے پیچھے چلا گیا۔ اس وقت دور سے فائرنگ کی آواز گونجتی ہوئی اس کنارے سے اس کنارے تک آئی۔ بابر نے کہا۔

"تم یہاں بیٹھی رہو۔ اٹھنا نہیں۔ ورنہ وہ ہمیں دیکھ لیں گے۔"

اس میں اب اٹھنے کا حوصلہ نہیں تھا وہ گھاس پر چت لیٹی گہری گہری سانسیں لے رہی تھی۔ سانسوں کی آمدورفت سے جسم کے نشیب و فراز' مدوجزر کی طرح لہرا رہے تھے۔ بابر نے کن انکھیوں سے مسکرا کر اسے دیکھا۔ پھر پلٹ کر سامنے کی جھاڑیوں کو ذرا سا ہٹا کر دور کہیں دیکھتے ہوئے بولا۔

"ایک انسپکٹر ہے اور پانچ سپاہی۔ سب اِدھر اُدھر ہمیں تلاش کر رہے ہیں۔ وہ بیچارے مجبور ہیں۔ اگر انہوں نے ہمیں دیکھ بھی لیا تو ہتھکڑیاں لے کر یہاں نہیں آ سکتے۔ کیونکہ اب ہم دوسرے ملک کی زمین پر قدم رکھ چکے ہیں........."

وہ تھوڑی دیر تک وہاں کھڑا کنٹری کرتا رہا۔ پھر روزینہ کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ اتنی طویل بھاگ دوڑ کے بعد ذرا بیٹھ کر اور لیٹ کر ستانے کا موقع ملا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں' جنگل کی ہریالی اور مٹی کی سوندھی مہک بڑی بھلی لگ رہی تھی اور ان سب کے پیش منظر میں پسینے میں مہکتی اور شعلے کی طرح لپکتی حسینہ نگاہوں کو للچا رہی تھی۔ وہ ذرا قریب ہو کر اس پر جھک گیا۔

"دور ہٹو۔" وہ ہولے سے جھڑک کر بولی۔

"کیا؟ تم مجھے حکم دے رہی ہو؟" وہ غرایا۔ وہ بھی غرا کر دیکھنے لگی۔ نگاہوں کا عجیب تصادم تھا۔ وہ کچھ دیر پہلے کی کمزور حسینہ نظر نہیں آ رہی تھی......... اور وہ کمزور کب تھی؟ وہ تو محض وقتی طور پر پریشان ہو گئی تھی۔ پولیس' قانون' جیل اور پھانسی کے پھندے سے بچنے کے لئے وہ جتنی دیر تک اور جتنی دور تک دوڑتی آئی تھی' کوئی دوسری عورت اتنی مستعدی اور تواتر سے نہیں دوڑ سکتی تھی۔ ویسے عورت دوڑتی کب ہے؟ وہ تو دو قدم چل کر ہی تھک جاتی ہے اور روزینہ تھی کہ تھکن کے باوجود دوڑتی رہی تھی

اور ثابت کرتی رہی تھی کہ وہ کیسی ٹھوس اور ارادے کی پکی ہے اور ایک مرد کے قدم سے قدم ملا کر قانون کو بہت پیچھے چھوڑ آئی ہے۔

بابر کسی کی غراہٹ کو برداشت کرنے والا جوان نہیں تھا۔ اس نے روزینہ کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر ایک جھٹکے سے اٹھاتے ہوئے اسے اپنے قریب کر لیا۔ اس کے حلق سے ایک کراہ نکلی۔ اس کا ہاتھ بھی بابر کے سر تک پہنچا۔ پھر اس نے بھی اس کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ لیا اور تلملا کر بولی۔

"بابر۔ اس وقت مجھے عورت بنانے کی کوشش نہ کرو۔ ہم دونوں خسارے میں رہیں گے۔ پولیس والے ہم سے زیادہ دور نہیں ہیں۔ چھوڑ دو مجھے۔ میں حکم نہیں دیتی' التجا کرتی ہوں۔ پلیز۔"

بابر نرم پڑ گیا۔ دونوں کی مٹھیاں ڈھیلی پڑ گئیں۔ روزینہ ذرا دور جا کر پھر گھاس پر لیٹ گئی۔ بابر اسے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ واقعی اسے پتھر سے عورت بنانے کے لئے بڑی جدوجہد کرنی پڑتی ہے' اور یہ جدوجہد کرنے اور آپس میں جھگڑنے کا وقت نہیں ہے۔

ایسے وقت اسے بہت پہلے کی روزینہ یاد آ گئی۔ پہلی بار اس نے ایک سوشل گیدرنگ میں اسے دیکھا تھا۔ وہ بہت ہی معصوم نظر آئی تھی۔ اس نے خالص مشرقی انداز میں دوپٹے کو سر سے اوڑھا ہوا تھا۔ اسے بعد میں پتہ چلا کہ وہ ایک عیسائی لڑکی ہے۔ بعد میں یہ بھید کھلا کہ وہ اپنے اندر ہزاروں ہنگامے چھپائے رکھتی ہے۔

پہلا ہنگامہ ایک کروڑ پتی سیٹھ کے نوجوان لڑکے سے شروع ہوا۔ نوجوان کا وہ پہلا عشق تھا۔ اس نے روزینہ کے نام ایک کوٹھی لکھ دی۔ اس کے اکاؤنٹ میں ایک لاکھ روپے کا اضافہ کر دیا اور اس سے شادی کر لی۔

سہاگ رات کو کیا ہوا؟ یہ اس وقت کوئی نہ جان سکا۔ ملازم کا بیان ہے کہ اس کا نوجوان مالک رات کو دوبار دلہن کے کمرے سے باہر آیا۔ وہ پسینے سے شرابور تھا' کچھ پریشان تھا' کچھ اس کے چہرے سے ندامت کا بھی اظہار ہو رہا تھا۔ تیسری بار وہ دلہن کے کمرے میں گیا اور جب باہر آیا تو پہلے سے زیادہ پریشان تھا۔ وہ سیدھا اپنے اسٹڈی روم میں گیا' ریوالور نکال کر اسے لوڈ کیا۔ پھر رائٹنگ پیڈ کھول کر اس میں لکھا۔

"میں آگ سے نہیں کھیل سکتا اور ناکام کھلاڑی کی طرح زندہ بھی نہیں رہ سکتا۔ اس لئے خودکشی کر رہا ہوں........."

اور اس نے خودکشی کر لی۔

اس کے والدین نے الزام لگایا کہ ان کا بیٹا روزینہ کی وجہ سے مارا گیا ہے لیکن قانون کے زمرے میں کوئی ایسی دفعہ نہیں تھی جس کے تحت روزینہ کو حراست میں لیا جاتا۔ وہ کنواری بیوی پھر دوستوں کی محفل میں بیٹھنے کے لئے آزاد ہو گئی۔

اس کے دولتمند دوستوں کی فہرست طویل تھی۔ اس فہرست میں بابر کا بھی نام تھا لیکن اس سے پہلے کہ بابر اپنی صلاحیتیں آزماتا' روزینہ کو ایک ہیوی ویٹ باکسر جیت کر لے گیا۔

ایک ہفتے تک وہ غائب رہا۔ شاید ہنی مون منانے گیا تھا لیکن روزینہ کے طلبگار مطمئن تھے کہ وہ جلد ہی واپس آئے گا۔ کیونکہ اگلے ہفتے ایک غیر ملکی باکسر سے اس کا مقابلہ تھا۔ دسویں دن وہ واپس آگیا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک ایسی مسکراہٹ تھی جیسے اس نے ایک بہت بڑی بازی جیت لی ہو لیکن اس کی آنکھوں سے پریشانی نمایاں تھی۔ کسی نے کہہ بھی دیا کہ وہ پریشان ہے اور دوستوں سے اپنی پریشانی چھپا رہا ہے۔ کسی نے کہا کہ اب اس میں پہلے جیسی زندہ دلی نہیں ہے۔ اس کا چہرہ بھی زرد پڑ گیا ہے۔ وہ تمام ریمارکس کو خوبصورتی سے ٹال گیا۔ دو دن کے بعد لاکھوں تماشائی اس کا مقابلہ دیکھنے اسٹیڈیم میں آئے۔ سب جانتے تھے اور مانتے تھے کہ وہ ایک ناقابل شکست باکسر ہے۔ مگر افسوس۔ پہلے ہی راؤنڈ میں ایسا گرا کہ اسے اسٹریچر پر لاد کر فرسٹ ایڈ کیبن میں پہنچانا پڑا۔ ڈاکٹر نے اس کی حالت تشویشناک بتائی تو اسے ہسپتال پہنچایا گیا۔ تمام رات وہ موت و زیست کے درمیان اِدھر سے اُدھر ہوتا رہا۔ صبح اس کے چہرے پر زندگی کے آثار ایسے نظر آئے جیسے شمع بجھنے سے پہلے آخری بار پوری طرح بھڑک کر روشن ہوتی ہے۔ ذرا دیر کے لئے اس کی زبان کھلی تو اس نے کہا۔

"وہ۔ وہ آتشی مخلوق ہے۔ میں پہلے راؤنڈ میں نہیں گرا۔ وہ جانتی ہے' کتنے راؤنڈ کے بعد گر رہا ہوں....."

پھر وہ ہمیشہ کے لئے قبر کی گود میں گر گیا۔

کروڑ پتی سیٹھ کا بیٹا اور ہیوی ویٹ باکسر دونوں ہی مرتے وقت روزینہ کے متعلق کچھ نہ کچھ کہہ گئے تھے۔ وہ پہلے محض حسین تھی۔ اب پُراسرار بن گئی تھی۔ اسے چاہنے والے اس کی ذات سے اور زیادہ دلچسپی لینے لگے۔ پولیس بھی دو مرنے والوں کے بیانات کی روشنی میں روزینہ کے متعلق کچھ سوچ رہی تھی' کچھ شبہ کر رہی تھی۔ شبہ یہ کہ وہ اپنے چاہنے والوں کو اپنے رویئے سے یا اپنی کسی حرکت سے یا مختلف نامعلوم ذرائع سے

دماغی مریض بنا دیتی ہے۔

پولیس انسپکٹر نے اس سے چند ایسے سوالات کئے تھے کہ وہ پریشان ہو گئی تھی۔ اس کے پاس ایک ہی جواب تھا کہ اس نے کسی کو قتل نہیں کیا۔ کسی کو مرنے کے لئے نہیں کہا۔ اگر ایک خودکشی کر لے اور دوسرا اپنی کمزوری کے سبب مقابلے میں مارا جائے تو وہ مجرمہ کیسے بن جائے گی؟

اس نے پولیس انسپکٹر کو کسی طرح ٹال دیا تھا۔ ویسے یہ سمجھ گئی تھی کہ اس پر شبہ کیا جا رہا ہے۔ آئندہ اس کی وجہ سے کوئی موت کے منہ میں گیا تو پولیس اس کے خلاف سختی سے کارروائی کرے گی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اب خوب سوچ سمجھ کر اپنے لئے ایک جیون ساتھی کا انتخاب کرے گی۔ وہ حقیقتاً کوئی جرم نہیں کر رہی تھی۔ صدق دل سے یہ چاہتی تھی کہ اس کی پسند کا ایک ساتھی مل جائے۔ اس کی پسند سب سے جدا تھی۔ اسے ایسے محبوب کی تلاش نہیں تھی جو سینے پر ہاتھ رکھ کر ٹھنڈی آہیں بھرتا ہو۔ اس کا آئیڈیل ایسا تھا جو حسن کی خیرات نہیں مانگتا بلکہ چھین لیتا ہے۔ ایک درندے کی طرح ظلم کرتا ہے۔ پھر اس ظلم کے سائے میں محبت کرتا ہے۔ اس کی یہ پسند اس نفسیات کی غمازی کرتی تھی کہ وہ زن کیسی شعلہ زن ہے اور کتنی اذیت پسند ہے۔

پھر اس کی نظر انتخاب بابر پر آ کر ٹھہری۔ چھ فٹ کا قوی ہیکل' ضدی اور پاگل۔ کسی بات پر اڑ جائے تو اسے منوا کر ہی رہے۔ فولادی بازو' چٹانی جسم' پتلے سفاک ہونٹوں پر ہلکی سی زہریلی مسکراہٹ' چیتے کی سی خونخوار آنکھیں' ہاتھوں کے پنجے اتنے بڑے' اتنے مضبوط کہ کوئی شکنجے میں آ جائے تو تڑپتا ہی رہ جائے۔ وہ پڑھا لکھا نہایت ہی شریف قسم کا غنڈہ تھا۔ شہر کے تمام غنڈے اسے بادشاہ کہتے تھے۔ وہ بادشاہ مجبوروں کے کام آتا تھا۔ شریف بہو بیٹیوں کی عزت کرتا تھا اور اونچی سوسائٹی میں ہمیشہ لمبے ہاتھ مارتا تھا۔ اگر کوئی دولت مند اپنے کسی دشمن سے پیچھا چھڑانا چاہتا تو وہ بابر کی خدمات حاصل کیا کرتا تھا۔ اکثر بیس پچیس ہزار میں ایک قتل کا سودا ہو جاتا تھا۔

روزینہ کو ایسے ہی قاتل کی ضرورت تھی جو کبھی کبھی اسے تڑپا تڑپا کر قتل کرتا رہے ایک ستم گر تھا.......... دوسری کو ستمگر کی تلاش تھی۔ اس لئے جلد ہی وہ ایک دوسرے سے ٹکرا گئے۔

ایک ماہ کے عرصے میں یہ ثابت ہو گیا کہ دونوں کا انتخاب درست تھا۔ دونوں ہی ایک دوسرے سے ایک طویل جنگ لڑنے اور اس جنگ کے سائے میں محبت کرنے کے

لئے اس دنیا میں پیدا ہوئے تھے۔

دوسرے ماہ پولیس نے ایک قتل کے سلسلے میں اسے گرفتار کرلیا۔ حالانکہ اس نے قتل نہیں کیا تھا۔ روزینہ کا جادو ایسے سرچڑھ کر بول رہا تھا کہ اسے کسی سے سودا کرنے اور کسی کو قتل کرنے کی فرصت ہی نہیں مل رہی تھی مگر دشمنوں نے جھوٹی گواہی دی تھی کہ وہ جائے واردات پر دیکھا گیا ہے۔

بابر کے دولتمند سرپرستوں نے اسے ضمانت پر رہا کرانے کی کوششیں کیں مگر کسی کی ضمانت منظور نہیں کی گئی۔ وہ چھ ماہ کے لئے روزینہ سے دور ہو گیا۔ چھ ماہ کے دوران دوسری پیشی میں اس کی بیگناہی ثابت ہو گئی اور وہ رہا کر دیا گیا۔ اس عرصے میں اسے پتہ چلا تھا کہ روزینہ آج کل ایک لمبے تڑنگے نیگرو کے ساتھ دیکھی جا رہی ہے۔ نیگرو کسی جہاز کا سیکنڈ آفیسر ہے۔ بابر پہلے تو غصے سے پیچ و تاب کھاتا رہا اور سوچتا رہا کہ وہ صرف نیگرو کو ہی نہیں' اس کے ساتھ روزینہ کو بھی قتل کر دے گا۔

پھر رفتہ رفتہ اس کا غصہ سرد پڑ گیا۔ دل نے کہا۔ وہ روزینہ کو قتل نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد ایسی جاندار محبوبہ ڈھونڈنے سے نہیں ملے گی' جو ہمیشہ اس کے ظلم کے سائے میں محبت کرے۔ وہ اب بھی اس سے محبت کرے گی۔ بس گڑبڑ یہ ہو گئی تھی کہ وہ چھ ماہ کے لئے دور ہو گیا تھا اور وہ شعلہ بدن اپنی فطرت سے مجبور ہو کر بے لگام ہو گئی تھی۔

دنیا میں پیار کرنے والی وفادار عورتوں کی کمی نہیں ہے لیکن جو عورت چیلنج بن جائے کہ وہ ایک مرد کی محکوم ہو کر نہیں رہ سکتی ہے تو ایسے میں ایک ضدی مرد کو بھی وہ چیلنج قبول کرنا پڑتا ہے۔

بابر نے فیصلہ کیا کہ وہ کیسے قابو میں نہیں رہے گی؟ میں اسے لگام دے کر رکھوں گا۔ اس نے اپنے دو خاص ماتحتوں کو بتایا کہ وہ کم از کم ایک سال کے لئے روزینہ کو لے کر انسانی آبادی سے دور کہیں چلا جائے گا۔ ایسی جگہ کے لئے پڑوسی ملک کا سرحدی جنگل نہایت موزوں تھا۔ پچیس میل کے رقبے میں پھیلا ہوا یہ جنگل ایسا تھا جہاں سے شاذو نادر ہی کسی انسان کا گزر ہوتا تھا۔ اب وہاں دو ہی انسان سکونت اختیار کریں گے۔ وہ اور روزینہ۔ روزینہ سال بھر میں اس کے تیز و تند مزاج اور طوفانی محبت کی ایسی عادی ہو جائے گی' ایسی تابعدار بن جائے گی کہ پھر کسی دوسرے کا تصور بھی نہیں کرے گی۔ ایک بے زبان اور بے عقل جانور مالک کی ٹھوکروں میں رہ کر وفادار بن جاتا ہے تو پھر روزینہ کیسے وفاداری نہیں سیکھے گی۔

آج کا انسان اپنے قول و فعل سے ہزاروں برس پرانی تہذیب کو دہراتا رہتا ہے۔ لوگ آج بھی اپنی پسند کی چیز ایک دوسرے سے چھینتے جھپٹتے رہتے ہیں۔ ہزار صدیاں پہلے بھی یہی کرتے تھے اور آج۔ آج بھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ شہروں اور آبادیوں سے بیزار ہو کر اپنے آباؤ اجداد کی طرح جنگلوں اور پہاڑوں میں زندگی گزارنے چلے جاتے ہیں۔

اس نے اپنے ماتحتوں کو سمجھایا کہ کھانے پینے' پہننے اوڑھنے کا تمام سامان دو دن کے اندر اس جنگل کے پہلے ٹیلے پر پہنچ جانا چاہئے۔ تیسرے دن وہ ساحل سے دور ایک جزیرے پر گیا جہاں روزینہ نیگرو کے ساتھ پکنک کے لئے گئی تھی۔ ان کی لانچ ساحل پر موجود تھی۔ بابر وہاں کشتی پر گیا تھا۔ اس نے ملاح کو پیسے دے کر کشتی واپس کر دی۔ روزینہ اسے دیکھ کر نیگرو سے دور ہو گئی اور بڑی بے نیازی سے چلتی ہوئی ایک پتھر پر جا کر بیٹھ گئی۔ اس کا یہ انداز بتا رہا تھا کہ وہ محض طاقت کے زیر اثر رہنے والی لونڈی ہے۔ ان میں سے جو زور آور ہو گا' اسے چھین کر لے جائے گا۔

پھر وہ دونوں ایک دوسرے کو غرا کر دیکھنے لگے۔ ایک اسے اپنے ساتھ افریقہ لے جانا چاہتا تھا' دوسرا اسے چھین کر ایک جنگل میں آباد ہونا چاہتا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے۔ تاج کے لئے نہیں' تخت کے لئے نہیں' زر کے لئے نہیں' زمین کے لئے نہیں۔ ایک زن کے لئے جو لاکھوں میں ایک تھی اور ایک وحشی مزاج مرد کے لئے اس دنیا کو جنت بنا دیتی تھی۔

وہ اپنی اپنی جنت تک پہنچنے کے لئے ایک دوسرے پر تابڑ توڑ حملے کرتے رہے۔ آدھے گھنٹے کے بعد نیگرو سست پڑنے لگا۔ حملہ کرنے کی بجائے مدافعت کی کوششیں کرنے لگا۔ ویسے وہ بھی ضدی تھا یا غیرتمند تھا۔ ایک عورت کی موجودگی میں شکست قبول کرنا نہیں چاہتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے نصف گھنٹے میں وہ بے دم ہو کر گر پڑا۔ بابر نے جیب سے دستانے نکال کر پہن لئے۔ پھر اس پر حاوی ہو کر اس کا گلا دبوچنے لگا۔ روزینہ دوڑتی ہوئی اس کے پاس آئی اور اسے جھنجھوڑتی ہوئی کہنے لگی۔

"چھوڑ دو بابر! اسے چھوڑ دو۔ فیصلہ ہو چکا ہے۔ میں کسی شکست خوردہ بزدل کی صورت بھی دیکھنا گوارا نہیں کرتی۔ تم نے مجھے چھین لیا ہے۔ میں تمہاری ہوں۔"

"میری بن کر رہنے سے پہلے یہ بھی دیکھ لو کہ میں اپنے راستے کے پتھر کس طرح ہٹاتا ہوں۔ کسی دن تمہارا بھی یہی انجام ہو گا.........."

پھر وہ اٹھ کر کھڑا ہوا تو نیگرو ٹھنڈا ہو چکا تھا۔

نیگرو کی لانچ میں واپسی ہوئی۔ راستے میں بابر نے کہا۔

"اس جزیرے پر میری موجودگی ثابت نہیں ہو سکے گی۔ جہاز کے عملے نے تمہیں نیگرو کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھا ہو گا۔ پولیس پہلے ہی تم پر شبہ کرتی ہے۔ یہ تیسرے عاشق کی موت تمہیں قانونی شکنجے میں لے جائے گی۔"

پولیس۔ قانون۔ جیل۔ پھانسی کا پھندا۔ روزینہ بری طرح بوکھلا گئی۔ اب بابر ہی اس کی حفاظت کر سکتا تھا۔ اس نے خود کو اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ وہ لانچ سے ساحل پر آئے۔ وہاں بابر کی کار موجود تھی' جسے چھوڑ کر وہ کشتی کے ذریعے جزیرے تک گیا تھا۔ وہ کار میں بیٹھ کر کوٹھی کی طرف جانے لگے۔ پولیس کو واردات کی اطلاع اتنی جلدی نہیں مل سکتی تھی۔ مگر بابر ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت روزینہ کو اس حد تک دہشت زدہ کرنا چاہتا تھا کہ وہ فرار ہونے کے لئے اس کے ساتھ جنگل تک دوڑتی چلی جائے۔ بابر کے ایک ساتھی نے روزینہ کی کوٹھی میں خود کو پولیس انسپکٹر ظاہر کر کے فون کیا تھا۔ روزینہ وہاں پہنچی تو ملازمہ نے بتایا کہ پولیس اسے پوچھ رہی ہے۔ وہ حیرت سے بولی۔

"اتنی جلدی پولیس کو کیسے پتہ چل گیا؟"

بابر نے جواب دیا۔ "آئی بی ڈیپارٹمنٹ کے ذرائع بہت وسیع ہیں۔ انہیں ہم تم نہیں سمجھ سکتے۔ اگر تم جیل کی سلاخوں کے پیچھے اپنا کیریئر بنانا چاہتی ہو تو یہاں پولیس کا سامنا کرنے کے لئے رک جاؤ۔"

"نہیں۔" اس نے گھبرا کر کہا۔ "میں جیل میں تو کیا' جنت میں بھی تنہا نہیں رہ سکتی۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ مجھے یہاں سے کہیں دور لے چلو۔ دور' جہاں میں قانون کی گرفت میں نہ آ سکوں۔"

بابر نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور اسے لیتا ہوا پھر کار میں آ کر بیٹھ گیا۔ وہ تمام راستے روزینہ کو جیل کی سختیاں اور پھانسی کی کربناک موت کے بارے میں بتاتا رہا اور اسے دہشت زدہ کرتا رہا۔ سرحدی چوکی کے قریب پہنچ کر پٹرول ختم ہو گیا۔ وہ دونوں کار سے اتر آئے اور جنگل کا راستہ اختیار کر کے دریا کی طرف بھاگنے لگے۔

دریا کے قریب انہیں پولیس کار کی آواز سنائی دی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ پولیس نہیں تھی۔ بابر کے ساتھی تھے اور بابر روزینہ کو خطرے کا احساس دلاتا جا رہا تھا کہ پولیس ان کا پیچھا کر رہی ہے۔ دوسرے کنارے پر پہنچ کر اس نے جھاڑیوں کے پیچھے سے کنٹری کی

تھی کہ ایک پولیس انسپکٹر اور پانچ سپاہی انہیں تلاش کر رہے ہیں۔ وہ تھکی ہوئی گھاس پر پڑی تھی اور یقین کر رہی تھی کہ بابر کہہ رہا ہے تو وہ پولیس کے ہی آدمی ہوں گے۔

☆======☆======☆

اب وہ وقت گزر چکا تھا۔ بابر کے ساتھی اس بے لگام حسینہ کو اچھی طرح دہشت زدہ کرنے کے بعد واپس چلے گئے تھے۔ اب اس میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ اپنی تباہی کے لئے وہاں سے واپس جاتی۔ اس نے گھاس پر لیٹے ہی لیٹے کروٹ بدل کر پوچھا۔

"ہم اپنے ملک کے قانون سے بچ کر آ گئے ہیں۔ مگر اس اجنبی ملک میں ہمارا گزارہ کیسے ہو گا؟"

بابر نے جواب دیا۔ "جب ایک مرد ساتھ ہو تو عورت کو فکر نہیں کرنی چاہئے۔ تم کیا سمجھتی ہو کہ میں تمہاری طرح اندھا دھند بھاگتا چلا آیا ہوں۔ نہیں۔ میں نے پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ قتل کرنے کے بعد مجھے اس جنگل میں پناہ لینا ہے۔ اس لئے میرے آدمیوں نے پہلے ہی ہماری ضرورتوں کا ہر سامان یہاں پہنچا دیا ہے۔ یہاں پناہ لینے کے بعد ایک تمہاری کمی محسوس ہوتی۔ یہی سوچ کر میں تمہیں بھی لے آیا ہوں۔"

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور تیور بدل کر بولی۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے جان بوجھ کر مجھے قتل کے کیس میں ملوث کیا ہے؟"

"ہاں۔ عورت طاقت سے زیر ہوتی ہے اور عقل سے قابو میں آتی ہے۔ اب تم پولیس کی حراست میں جانے کے لئے یہاں سے واپسی کی جرأت نہ کرو گی۔"

وہ مٹھیاں بھینچ کر تلملاتی ہوئی بولی۔ "کیا تم چاہتے ہو کہ میں ساری زندگی اس جنگل میں گزار دوں؟"

"ساری زندگی نہیں۔ صرف اس وقت تک تم اس جنگل میں رہو گی جب تک کہ تم ایک ہی مرد کی وفادار بن کر رہنے کی عادی نہیں بن جاؤ گی۔"

وہ جلدی سے آگے بڑھی اور اس کی گردن میں بانہیں ڈال کر بولی۔ "میں تمہاری ہوں' سدا تمہاری رہوں گی۔ مجھے اس جنگل میں نہ رکھو' بابر۔ کسی بڑے شہر میں لے چلو۔ میں انسانوں میں رہنے کی عادی ہوں۔ میں قسم کھاتی ہوں' تمہارے سوا کسی کا منہ نہیں دیکھوں گی۔ ہمیشہ تمہاری وفادار بن کر رہوں گی۔"

"روزینہ! وفادار عورت وہی کرتی ہے جو اس کا محبوب کہتا ہے لہٰذا میں کہتا ہوں کہ تمہیں میری مرضی کے مطابق یہاں رہنا ہے اور تمہیں بلا حیل و حجت میری بات مان لینا

چاہیئے۔ چلو اٹھو۔ ہمیں رات کی تاریکی پھیلنے سے پہلے اپنی پناہ گاہ تک پہنچنا ہے۔"

وہ چپ چاپ اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور اس کے پیچھے چلتی ہوئی اسے غصے سے دیکھتی رہی۔ آس پاس درختوں کے سائے پھیل رہے تھے۔ تمام دن دانوں کی تلاش میں بھٹکنے والے پرندے اپنے آشیانوں میں واپس آ رہے تھے۔ شہر کے ہنگاموں سے آنے والی روزینہ کو جنگل کی خاموشی میں ایسا سکون مل رہا تھا جو پہلے کبھی میسر نہیں ہوا تھا۔ مگر وہ محض اس بات پر جھلا رہی تھی کہ بابر اسے قیدی بنا کر لے آیا تھا اور وہ ایک نہ معلوم مدت کے لئے انسانی آبادیوں سے دور ہو گئی تھی۔

وہ دونوں اونچی نیچی پگڈنڈی سے گزر رہے تھے۔ پہاڑیوں کا سلسلہ شروع ہوتے ہی بابر نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا۔

"وہ دیکھو۔ وہ جو ٹیلا نظر آ رہا ہے' اس میں ایک چھوٹا سا غار ہے۔ ہم وہیں پناہ لیں گے۔"

"یہاں سے شہر کتنی دور ہے؟"

"پچیس میل تک جنگل پھیلا ہوا ہے۔ اس کے بعد چھوٹی چھوٹی بستیاں ہیں۔ میں کئی برس پہلے ادھر گیا تھا۔ تم بھی تنہا اس جنگل سے گزر سکو تو مجھے چھوڑ کر بھاگ جانا۔"

وہ جھلا کر بولی۔ "بکواس مت کرو۔ میں بھاگنے کے لئے نہیں پوچھ رہی ہوں۔"

وہ جواباً قہقہے لگانے لگا۔

تھوڑی دیر بعد وہ غار کے دہانے تک پہنچ گئے۔ دہانہ بہت چھوٹا تھا۔ ایک وقت میں ایک آدمی ہی وہاں سے گزر سکتا تھا۔ بابر کے ساتھیوں نے ایک بھاری پتھر سے اس کے دہانے کو بند کر دیا تھا تاکہ کوئی جنگلی جانور سامان کو نقصان نہ پہنچا سکے۔ بابر آگے بڑھ کر اس پتھر کو ہٹانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے دو ساتھیوں نے نہ جانے کتنا زور صرف کرنے کے بعد اسے دہانے پر لا کر رکھا تھا۔ ویسے جہاں تک زور آوری کا تعلق تھا' بابر چار آدمیوں کا ایک آدمی تھا۔ یعنی ہارس پاور کے حساب سے اس میں چار مین پاور کی قوت تھی۔ اس نے ذرا سی کوشش کے بعد اسے ایک طرف ہٹا دیا۔

یک بیک روزینہ کا غصہ ڈھل گیا۔ وہ اپنے دیو صفت محبوب کو بڑے پیار سے دیکھ رہی تھی۔

"آؤ اندر چلیں!" اس نے اوپری جیب سے ماچس کی ڈبیہ نکالی۔ پھر ایک تیلی سلگانے کے بعد جھکتا ہوا غار کے اندر داخل ہو گیا۔ روزینہ بھی اس کے پیچھے چلی آئی۔ غار

اندر سے ایک بڑے کمرے کی طرح وسیع تھا۔ ان کے سامنے بہت سا سامان بکھرا پڑا تھا۔ سوٹ کیس' لکڑی کی بند پیٹیاں' بیٹھنے کے لئے دو فولڈنگ چیئر' ایک درمیانی میز' سونے کے لئے دو فولڈنگ بیڈ اسٹینڈ اور خیمہ نصب کرنے کا تمام سامان وہاں موجود تھا۔ بابر نے روزینہ کو دیا سلائی دے کر کہا۔

"تم روشنی کرتی رہو' میں موم بتی تلاش کرتا ہوں۔"

وہ یکے بعد دیگرے لکڑی کی پیٹیاں کھولنے لگا۔ دو پیٹیوں میں اتنا راشن تھا کہ دو آدمی تین ماہ تک گزارہ کر سکتے تھے۔ دوسری پیٹیوں میں موم بتیاں' درجنوں ماچس' سگرٹوں کے کئی کارٹن' شراب کی بوتلیں اور سربند ڈبوں میں اتنی خوراک موجود تھی کہ ان سے پیٹ بھر کر چار ماہ اور گزارے جا سکتے تھے۔ بابر نے اپنے ساتھیوں سے کہہ دیا تھا کہ وہ چھ ماہ کے بعد دریا کے پار آئے گا اور اگلے چھ ماہ کے لئے ضروری سامان ان سے لے جائے گا۔

دو گھنٹے کی محنت کے بعد دونوں نے اس غار کو ایک کمرے کی طرح سجا دیا۔ غار کے دہانے سے ٹھنڈی تازہ ہوائیں آ رہی تھیں جن کی وجہ سے گھٹن کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ بابر ایک داؤ لے کر باہر گیا اور تھوڑی دیر بعد ایک درخت کی سوکھی ٹہنیاں کاٹ کر لے آیا تاکہ غار کے سامنے تمام رات الاؤ روشن رہے اور کوئی جنگلی جانور آگ کے قریب نہ آئے۔

آگ روشن کرنے کے بعد وہ اندر آ گیا۔ روزینہ نے وہسکی کی بوتل کھول لی تھی۔ بابر اس کے قریب آ کر کرسی پر بیٹھ گیا اور اپنا جام اٹھا لیا۔ روزینہ نے جام سے جام ٹکرا کر ایک گھونٹ پینے کے بعد کہا۔

"میں سمجھ گئی۔ تم اس ویرانے میں مجھے اس لئے لائے ہو کہ کسی رقیب سے پالا نہ پڑے۔ بزدل کہیں کے.........."

"ابھی سے طعنے اور گالیاں شروع نہ کرو۔ پہلے مجھے اچھی طرح پی لینے دو' پھر میں تمہارا مزاج پوچھوں گا۔"

وہ ایک پیگ حلق میں انڈیلنے کے بعد بولی۔

"اونہہ! کیا تم سمجھتے ہو کہ اس جنگل میں کوئی دوسرا نہیں آ سکتا؟"

"آ سکتا ہے۔ آنے دو۔ اگر اس نے تم سے دلچسپی لی تو وہ بھی تمہارے نیگرو عاشق کے انجام کو پہنچے گا۔"

تھوڑی دیر کے لئے خاموشی چھا گئی۔

باہر رات کی تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ جنگل کی ہریالی اور اونچے درخت اندھیرے میں چھپ گئے تھے۔ صرف غار کے سامنے الاؤ کی روشنی ذرا دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ ذرا دیر کے بعد اندر سے آوازیں آنے لگیں۔ پہلے وہ آوازیں دھیمی دھیمی تھیں پھر ان میں تیزی اور جھلاہٹ آتی چلی گئی۔

وہ گالیاں بک رہی تھی۔ گالیاں اور طعنے.......... للکارنے کا انداز تھا۔

طمانچے۔ گھونسے۔ ٹھوکریں۔ چیخیں۔ آہیں۔ کراہیں..........

جنگل کی خاموشی لرزنے لگی۔

غار کی صدائیں گونجتی ہوئی‘ پھڑپھڑاتی ہوئی باہر آ رہی تھیں۔

ایک ہنگامہ تھا۔ عجب طوفان بدتمیزی تھا جیسے دو وحشی انسان غار کے زمانے واپس آ گئے ہوں۔

ایک طویل جنگ تھی جو ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ ایسے جارحانہ حملے گونج تھی اور ایسی مدافع چیخیں تھیں کہ جنہیں سن کر تہذیب کو پسینہ آ جاتا۔

پھر رفتہ رفتہ آوازیں مدھم پڑنے لگیں۔

اب کبھی خاموشی چھا جاتی تھی اور کبھی دردناک سسکیاں سنائی دیتی تھیں۔

پھر سسکیوں میں بھٹکتی ہوئی سرگوشی سنائی دی۔

"بابر! میرے جسم و جان کے مالک! ہائے‘ تم کتنے اچھے ہو۔ میں تم سے کبھی وفائی نہیں کروں گی.........."

دوسری آواز بھٹکتی ہوئی آئی۔

"میری جان! میں بھی تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ تم آگ ہو اور میں پروا کی طرح جلنے پر مجبور ہوں.........."

اس کے بعد چپ سی لگ گئی۔

بہت دیر ہو گئی۔ کوئی آواز سنائی نہیں دی۔ شاید وہ تھک کر گہری نیند سو گئے تھے پھر نہ جانے کتنا وقت گزر گیا۔ ایک آواز جاگنے لگی۔

"دھپ۔ دھپ۔ دھپ.........." جیسے کوئی بھاری قدموں سے چل رہا ہو۔

مگر وہ آواز غار کے اندر نہیں تھی۔ باہر گھاس پر وہ قدم بے ڈھنگے سُروں میں رہے تھے۔

الاؤ کی آگ سے دور کوئی تاریکی میں بھٹک رہا تھا۔

کون تھا وہ؟ دوست تھا یا دشمن؟ انسان تھا یا حیوان؟

وہ حیوان کی طرح آگ سے دور تھا۔ انسان کی طرح دو پاؤں سے چل رہا تھا۔ تاریکی۔ گہری تاریکی بتانا نہیں چاہتی تھی کہ وہ کون ہے۔

صبح وہ بیدار ہوئی تو بدن کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ مگر ذہن پر رات کا خمار چھایا ہوا تھا اور ہونٹوں پر تبسم کھل رہا تھا۔ وہ ایک بھرپور انگڑائی لے کر اٹھ گئی۔ بابر سرد الاؤ کی آگ تازہ کر کے چائے بنا رہا تھا۔ اس نے روزینہ کو دیکھ کر کہا۔

"چائے پی کر ہم جنگل کی سیر کریں گے۔ یہاں ایک آدھ میل کے فاصلے پر ٹھنڈے پانی کا چشمہ ہے۔ وہاں جا کر ہمیں غسل کرنا چاہئے۔"

وہ دو پیالوں میں چائے انڈیلنے لگا۔ روزینہ نے قریب آ کر ایک پیالی اٹھا لی اور چائے کی ایک چسکی لے کر جنگل کی ہریالی کو دیکھتے ہوئے بولی۔ "آہ۔ کتنی خوبصورت جگہ ہے یہ۔ جی چاہتا ہے‘ ساری زندگی یہیں گزار دوں۔ اب مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔"

وہ مسکرا کر چائے پینے لگا۔

"تم نے شہری زندگی گزار لی۔ اب یہ بھی دیکھ لو کہ جنگل میں منگل کس طرح منایا جاتا ہے۔"

"ہاں۔ آج میں جنگل کی سیر کروں گی۔ تمہارے لئے کل سے کھانا پکایا کروں گی۔ ٹھیک ہے نا؟"

"بالکل ٹھیک۔"

چائے پینے کے بعد انہوں نے اپنا اپنا لباس سوٹ کیس سے نکال لیا۔ ایک تھیلے کے اندر ڈبوں میں پیک کیا ہوا کھانا رکھا۔ روزینہ نے آئینہ اور کنگھی رکھ لی۔ بابر نے احتیاطاً ریوالور لوڈ کر لیا۔ پھر باہر آ کر اس نے بڑے سے پتھر کو ہٹا کر غار کا منہ بند کر دیا اور چشمے کی طرف چل پڑے۔

دو میل کی دوری پر وہ چشمہ تھا۔ اس کا صاف و شفاف پانی ایک نہر کی صورت میں درختوں کے درمیان بہتا ہوا‘ جنگل کے سینے پر جھلملاتا ہوا دور تک چلا گیا تھا۔ وہ دونوں لباس اتار کر پانی میں چلے آئے۔ وہاں دریا کی گہرائی اور لہروں کا تیز بہاؤ نہیں تھا اس لئے روزینہ بیباکی سے تیر رہی تھی۔ کبھی اس پر پانی کے چھینٹے اڑا رہی تھی اور کبھی ہنستی

کھلکھلاتی ہوئی اس سے دور بھاگ رہی تھی۔

پھر بابر اسے پکڑنے کے لئے اس کا پیچھا کرنے لگا۔ دونوں آگے پیچھے تیرتے ہوئے بہت دور نکل گئے۔ آخر وہ ہار مان کر اس کی گرفت میں آ گئی۔ بہت دیر کے بعد جب وہ واپس آئے تو روزینہ نے کنارے کی جانب دیکھ کر حیرت سے کہا۔

"ہمارا سامان کہاں ہے؟"

بابر نے چونک کر دیکھا۔ کنارے رکھے ہوئے کپڑے' سامان سے بھرا ہوا تھیلا اور اس کا ریوالور ہولسٹر سمیت غائب تھا۔ اس نے روزینہ کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "آؤ۔ ہم آگے بڑھ کر دیکھتے ہیں۔ اگر یہاں کوئی اجنبی ہے تو اسے یہ شرارت بڑی مہنگی پڑے گی۔"

روزینہ نے اپنا ہاتھ چھڑا کر کہا۔ "یقیناً کوئی ہمیں چھپ کر دیکھ رہا ہے۔ میں پانی سے باہر کیسے جا سکتی ہوں۔ پہلے میرے کپڑے لے کر آؤ۔"

وہ پانی سے نکل کر کنارے آ گیا۔ دور ایک جھاڑی کے پاس ان کا لباس اِدھر اُدھر پڑا ہوا نظر آ رہا تھا۔ وہ دوڑتا ہوا اس طرف جانے لگا۔ روزینہ نے چیخ کر کہا۔

"بابر! مجھے چھوڑ کر کہاں جا رہے ہو؟ کسی کی تلاش میں نہ جاؤ۔ میں تنہا نہیں رہوں گی۔"

وہ خوف کے مارے پانی سے نکل آئی۔ بابر ہنستا ہوا اس کی طرف آ رہا تھا۔ اس نے لباس کو اس کی طرف اچھال کر کہا۔

"یہ کسی بندر کی شرارت ہے' تم تو ذرا سی بات پر گھبرا جاتی ہو۔"

وہ لباس پہنتی ہوئی بولی۔ "نہیں بابر۔ یہاں ضرور کوئی ہے۔ بندر تمہارا ریوالور کیوں لے جائے گا؟"

وہ ذرا دیر کے لئے ریوالور کو بھول گیا تھا۔ روزینہ کی بات سن کر پریشانی سے دور دور تک دیکھنے لگا۔ پھر اس نے زور سے چیخ کر کہا۔

"یہاں کون ہے؟ جو کوئی بھی ہے سامنے آ جائے............"

روزینہ نے کہا۔ "پہلے کپڑے تو پہن لو' پھر کسی کو سامنے بلانا۔ ویسے ریوالور لے جانے والا کوئی دوست نہیں ہو سکتا۔ اب ہمیں محتاط رہنا چاہئے۔"

اس نے کپڑے پہنتے ہوئے کہا۔ "کوئی پیچھے سے بے خبری میں حملہ کرے تو میں مجبور ہوں' ورنہ سامنے آ کر للکارنے والا مجھ سے بچ کر نہیں جا سکے گا۔ مجھے صرف اس بات کی پریشانی ہے کہ ریوالور ہاتھ سے نکل گیا ہے۔"

کپڑے پہننے کے بعد وہ دونوں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ روزینہ کو ہر درخت اور جھاڑی کے پیچھے کوئی چھپا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ بابر سر اٹھا کر درختوں کی شاخوں کو دیکھتا جا رہا تھا۔ وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ کوئی بندر شرارت سے وہ ہولسٹر اٹھا کر کسی درخت پر جا بیٹھا ہے۔

تھوڑی دور جانے پر انہیں آئینہ' کنگھی اور کھانے کا سامان مل گیا۔ بابر نے کہا۔ "یہ کسی جانور کی حرکت ہے۔ دیکھ لینا آگے کسی جگہ ریوالور بھی پڑا ہوا ہو گا۔"

انہوں نے سامان اٹھا لیا اور ریوالور کی تلاش میں آگے جانے لگے۔

ہولسٹر ایک اونچے درخت کی ایک شاخ سے لٹکا ہوا تھا لیکن وہ نیچے سے دیکھنے پر نظر نہیں آ رہا تھا۔ آس پاس کی شاخوں اور پتوں کے درمیان چھپ گیا تھا۔ وہ دونوں اس درخت کے نیچے سے بھی گزرتے چلے گئے۔

وہ نہر کے کنارے کنارے چل رہے تھے۔ نہر جہاں مڑتی' وہ بھی مڑ جاتے تھے۔ بابر کو قدرے اطمینان تھا کہ دوسرے سامان کی طرح کہیں نہ کہیں ریوالور بھی مل جائے گا۔ روزینہ کا خوف بھی قدرے کم ہو گیا تھا۔ وہ بھی یہی سوچ رہی تھی کہ یہ تمام حرکتیں کسی جانور کی ہیں۔

وہ ایک اور گھنے درخت کے نیچے سے گزر گئے۔ اس درخت کی بلندی پر بڑے بڑے پتوں کے پیچھے دو انسانی آنکھیں انہیں بڑی توجہ سے گھور گھور کر دیکھ رہی تھیں۔ درخت کی بلندی سے دور پستی کی جانب وہ دونوں بہت چھوٹے چھوٹے سے نظر آ رہے تھے۔ اگر وہ سر اٹھا کر اوپر دیکھنا چاہتے تب بھی اس چھپے ہوئے اجنبی کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔

بہت دور جانے کے بعد روزینہ نے کہا۔ "وہ جانور تمہارا ریوالور لے کر نہ جانے کس طرف گیا ہے۔ ہم یونہی نہر کے کنارے چلے جا رہے ہیں۔"

"ہم واپسی میں دوسرا راستہ اختیار کریں گے۔" بابر نے کہا۔

"مجھے بھوک لگ رہی ہے۔"

بابر نے ہنستے ہوئے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ سامان لے جانے والے بے زبان جانور کو بھی تم سے خاص ہمدردی ہے۔ اسی لئے کھانے کا سامان چھوڑ گیا ہے۔ تھوڑی دور اور چلو پھر اطمینان سے بیٹھ کر کھائیں گے۔"

وہ باتیں کرتے ہوئے تقریباً دو فرلانگ اور آگے چلے گئے۔ روزینہ نے کہا۔ "بس

یہاں بیٹھ جاؤ' صبح ایک پیالی چائے پی تھی۔ بہت زور کی بھوک لگ رہی ہے۔"

وہ تھیلے کو سامنے رکھ کر بیٹھ گئے۔ بابر جیب سے چاقو نکال کر ٹین کے ڈبے کے ڈھکنے کو کاٹنے لگا۔ روزینہ پلاسٹک کا مگ لے کر نہر پر گئی اور پینے کے لئے پانی لے آئی۔

پھر دونوں کھانے لگے۔ کھانے کے دوران اچانک ہی درختوں کی پتیاں شور مچانے لگیں۔ شاخیں زور زور سے ہلنے لگیں۔ وہ دونوں اس طرف دیکھ رہے تھے۔ درختوں کے جھنڈ میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ کبھی اس درخت میں اور کبھی اس درخت میں ہلچل سی مچ رہی تھی۔ قیاساً یہی کہا جا سکتا تھا کہ کوئی بندر ہے جو ایک درخت سے دوسرے درخت پر چھلانگیں لگا رہا ہے۔ بابر نے کہا۔

"یقیناً وہ بندر ہی ہے۔ ہمیں ان ہی درختوں کی طرف جانا چاہئے۔ وہ ہولسٹر اسی کے پاس ہو گا۔"

یہ کہہ کر وہ پانی پینے لگا۔ روزینہ نے کہا۔

"وہ درختوں پر چھلانگیں لگاتا جائے گا۔ ہم کہاں تک اس کا پیچھا کریں گے؟"

"جہاں تک ہو سکے پیچھا کرنا ہی ہو گا۔ وہ ریوالور ہم دونوں کی حفاظت کے لئے ضروری ہے۔"

وہ پانی لانے کے لئے نہر کی طرف چلا گیا۔

پلاسٹک کے مگ میں پانی بھرتے وقت اس کی نظریں دور کنارے کنارے چلی گئیں۔ تقریباً دو سو گز کے فاصلے پر لوہے کا ایک پائپ نظر آ رہا تھا۔ جو نہر کے پانی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کا دوسرا سرا خشکی کی طرف نہ جانے کہاں تک چلا گیا تھا۔

اس ویران جنگل میں پائپ کی موجودگی بتا رہی تھی کہ وہاں کچھ اور لوگ بھی آباد ہیں اور اس پائپ کے ذریعے کہیں دور تک پانی لے جاتے ہیں۔ بابر نے یہ بات روزینہ کو بتائی۔ پھر وہ اپنا سامان اٹھا کر پائپ کے قریب آ گئے۔ وہ زمین کے اندر ہی اندر کہیں دور تک گیا تھا۔ وہ دونوں اندازے سے ایک طرف بڑھنے لگے۔ اونچی نیچی زمین کے باعث وہ پائپ کہیں کہیں ابھر آتا تھا اور پھر زمین کے اندر چھپ جاتا تھا۔ روزینہ نے کہا۔

"میں پہلے ہی کہتی تھی کہ کوئی اجنبی ریوالور لے گیا ہے مگر تم کسی بندر کے متعلق سوچ رہے تھے۔"

بابر کے ماتھے پر سوچ کی گہری شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ اس نے کہا۔ "اب تو میں بھی سوچ رہا ہوں کہ وہ کس قسم کے لوگ ہوں گے جو اس ویرانے میں آ کر آباد ہو گئے

ہیں۔"

"مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔" روزینہ سچ مچ سہمی ہوئی تھی۔

بابر نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ "جب تک میری سانس چلتی رہے گی تمہیں کوئی ہاتھ بھی نہیں لگا سکے گا۔"

"بابر! نہ جانے وہ تعداد میں کتنے ہیں مگر وہ چالاک ہیں۔ ریوالور لے جا کر تمہیں نہتا کر چکے ہیں۔"

وہ چلتے چلتے رک گئے۔ دور نشیب میں ایک چھوٹا سا کاٹج نظر آ رہا تھا۔ اس کی دیواریں چوڑی اور مضبوط شہتیروں سے کھڑی کی گئی تھیں اور چھت زنگ خوردہ ٹین سے منڈھی ہوئی تھی۔ کھڑکیاں اور دروازے کھلے ہوئے تھے۔ کاٹج کے قریب ہی نہر سے پانی حاصل کرنے کے لئے ایک ہینڈ پمپ لگایا گیا تھا۔

وہ دونوں ایک درخت کی آڑ لئے کاٹج کی جانب دیکھ رہے تھے۔ انہیں توقع تھی کہ کوئی کاٹج سے باہر آئے گا یا اس کے آس پاس دکھائی دے گا۔ مگر بہت دیر ہو گئی' وہاں سے نہ تو کسی انسان کی آواز سنائی دے رہی تھی نہ ہی زندگی کے دوسرے آثار نظر آ رہے تھے۔ بابر نے کہا۔

"تم اس جھاڑی کے پیچھے چھپ جاؤ۔ وہاں جو بھی ہو گا میں اسے باہر نکلنے پر مجبور کر دوں گا۔"

وہ دوڑتی ہوئی جھاڑی کے پیچھے چلی گئی۔ بابر نے ایک بڑا سا پتھر اٹھا کر اسے اپنی ہتھیلی پر تولا اور اسے پوری قوت سے کاٹج کی چھت پر پھینک دیا۔ پتھر زنگ خوردہ ٹین پر آ کر گرا اور "ٹھن ٹھنا ٹھن" کی آواز پیدا کرتا ہوا اور لڑھکتا ہوا کاٹج کے سامنے زمین پر آ گیا۔

اندر سے کوئی آواز نہیں آئی۔ کسی نے نہیں پوچھا کہ کون شریر پتھر پھینک رہا ہے۔

بابر نے جھاڑی کے پاس آ کر روزینہ سے کہا۔ "کاٹج خالی ہے۔ اگر کوئی رہتا بھی ہے تو اس وقت وہاں موجود نہیں ہے۔ آؤ ہم وہاں چل کر دیکھیں۔ ہو سکتا ہے کہ ہمیں اپنی حفاظت کے لئے وہاں سے کوئی ہتھیار دستیاب ہو جائے۔"

وہ روزینہ کا ہاتھ پکڑ کر کاٹج کی طرف بڑھنے لگا۔

قریب پہنچنے پر انہیں کسی نے نہیں للکارا کہ وہ پرائے کاٹج میں کیوں جا رہے ہیں۔ دروازے پر پہنچ کر وہ کوئی آہٹ سننے کے لئے ذرا رکے پھر بے دھڑک اندر چلے گئے۔

وہ ایک ہی کمرے کا کاٹج تھا۔ ایک طرف پلنگ بچھا ہوا تھا۔ کمرے کے وسط میں میز

اور کرسیاں الٹی ہوئی تھیں۔ ایک بڑی سی الماری دیوار سے دور ہٹی ہوئی تھی۔ دیوار کھونٹی پر کچھ کپڑے ٹنگے ہوئے تھے۔ وہاں ہر چیز پر گرد کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ کمرہ یو اجڑا ہوا تھا جیسے برسوں سے خالی پڑا ہو۔ روزینہ نے کہا۔

"کمرے کی حالت بتا رہی ہے کہ یہ برسوں سے ویران پڑا ہوا ہے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔"

وہ چھت کے نیچے بنی ہوئی مچان کو دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ اچھل کر مچان کے تختے کو پکڑ لٹک گیا اور دونوں ہاتھوں کے بل اوپر اٹھ کر دیکھنے لگا۔

"کیا ہے؟" روزینہ نے پوچھا۔

وہ نیچے آگیا اور ہاتھ سے گرد جھاڑتے ہوئے بولا۔ "سڑے ہوئے آلو' پیاز چھلکے اور کھانے پینے کا بہت سا سامان ہے۔ مگر ضائع ہو چکا ہے۔"

وہ باتیں کرتا ہوا پلنگ کے قریب آیا۔ اس پر بچھی ہوئی چادر پر شکنیں پڑی ہو تھیں۔ گرد اور کیچڑ بھی نظر آ رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی گرد اور کیچڑ بھرے پاؤ لے کر بستر پر سو جاتا ہے۔ بابر نے ذرا جھک کر دیکھا۔ چادر پر بھورے رنگ کے بال بکھر ہوئے نظر آ رہے تھے۔

اس کے توجہ دلانے پر روزینہ بھی غور سے دیکھنے لگی۔

"یہ انسانی جسم کے بال نہیں ہیں۔ بندروں کے جسم پر بھورے رنگ کے بال ہو ہیں۔"

وہ دونوں حیرانی سے ایک دوسرے کو تکنے لگے۔

"کیا یہ آرام دہ بستر کسی بندر کا ہے؟"

ذہن میں بہت سے سوالات ابھرنے لگے۔ درختوں پر چھلانگیں لگانے والا بندر تھا نظر نہیں آیا۔ ریوالور لے جانے والا بھی بندر ہی ہو سکتا ہے مگر۔ کیا اس کاٹیج میں رہ والا بندر ہی ہے۔

اسی وقت کاٹیج کے باہر دائیں طرف سے ایسی آواز آئی جیسے کوئی گھاس پر بھار بھاری قدم رکھتا ہوا چل رہا ہو۔

"دھپ۔ دھپ۔ دھپ........"

پھر ایک غراہٹ سنائی دی۔ کوئی انسان ہی غرا رہا تھا لیکن غرانے کے انداز درندگی تھی۔

بابر تیزی سے پلٹ کر دروازے کی طرف گیا اور اسے اندر سے بند کر دیا۔ پھر چیخ کر بولا۔ "کون ہے؟"

اس کی آواز میں کوئی بندر کی طرح خوخیاتے ہوئے اوپر کی طرف اچھلا۔ روزینہ اسی وقت کھڑکی بند کرنے جا رہی تھی۔ اچانک ہی وہ حلق کے بل چیختی ہوئی کئی قدم پیچھے چلی گئی۔ اچھل کر چھت پر جانے والے کے دو پاؤں نظر آئے تھے۔ پھر ٹین کی چھت پر اس کے قدموں سے دھماکے ہونے لگے۔ وہ دونوں سر اٹھائے چھت کی طرف دیکھ رہے تھے۔ چند لمحوں بعد چھت پر ہونے والا شور ختم ہو گیا اور قریب کے درخت کی پتیاں شور مچانے لگیں۔ اس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ چھت پر سے چھلانگ لگا کر درخت پر چلا گیا ہے۔

بابر نے تشویش کا اظہار کیا۔

"پتہ نہیں وہ کون ہے۔ جس طرح اچھل کر وہ چھت پر اور درخت پر گیا ہے۔ اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بندر یا بڑی ذات کا بن مانس ہے۔"

"نہیں!" روزینہ دہشت سے چیخ کر بولی۔ "وہ بندر نہیں ہے' آدمی ہے۔ میں نے اس کے دو پاؤں دیکھے ہیں۔ وہ بالکل انسانوں جیسے تھے اور اور اس کے پیروں میں بالکل ویسے ہی بھورے بال تھے جیسے یہاں چادر پر پڑے ہوئے ہیں۔"

بابر اسے حیرانی اور بے یقینی سے دیکھنے لگا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "میں نے ایسا انسان آج تک نہیں دیکھا جس کے جسم پر اتنے بڑے بڑے بھورے بال ہوں۔ جو ایک ہی چھلانگ میں چھت پر اور درختوں پر پہنچ جاتا ہو۔ وہ کون ہے؟ آدمی ہے؟ بندر ہے؟ بھوت ہے؟ یا آسیب ہے؟ آخر وہ کون ہے؟ ہم کہاں آ کر پھنس گئے ہیں بابر؟"

وہ دوڑتی ہوئی اس کے سینے سے آ کر لگ گئی۔

"بابر! یہاں سے کسی طرح نکلو' ورنہ وہ پھر آئے گا۔"

بابر اسے لیتا ہوا کھڑکی کے پاس آیا اور اسے بند کرتا ہوا بولا۔

"تم اتنا ڈرتی کیوں ہو؟ ذرا سوچو روزینہ۔ وہ ہم سے خوفزدہ ہے' اسی لئے بھاگ گیا ہے ورنہ اس کھلی ہوئی کھڑکی سے ضرور ہمیں نقصان پہنچانے آ جاتا۔ وہ نہر سے یہاں تک ہمارے سامنے نہیں آیا ہے۔ یہاں میرے آواز دینے پر وہ فوراً ہی اچھل کر چھت پر چلا گیا۔ تم خود ہی سوچو کیا ایسا بزدل آدمی یا جانور ہمارے لئے خطرناک ہو سکتا ہے؟ کبھی نہیں' اور میں تو کہتا ہوں' وہ آدمی نہیں ہے۔ تمہاری آنکھیں دھوکہ کھا گئی ہیں۔ اگر وہ آدمی ہوتا تو ہمارا ہی ریوالور لے کر ہمارے سامنے تن کر کھڑا ہو جاتا۔ یا دھمکی دینے کے

لئے باہر سے ایک آدھ فائر کرتا............"

روزینہ اس کی باتوں سے قائل ہو گئی کہ آنکھیں کبھی کبھی دھوکا بھی کھا جاتی ہیں۔ اس نے کہا۔ "وہ جو کوئی بھی ہے یہاں سے نکل چلو۔"

"ہاں۔ ہم چلیں گے۔ مگر میں تنہا باہر جا کر دیکھوں گا کہ وہ اس وقت کہاں ہے۔"

"خالی ہاتھ نہ جاؤ بابر۔ یہاں کوئی لکڑی یا ہتھیار تلاش کرو۔ اپنے بچاؤ کے لئے تمہیں کوئی چیز مل جائے گی۔"

اس کا مشورہ مناسب تھا۔ وہ اِدھر سے اُدھر کمرے میں کوئی ہتھیار تلاش کرنے لگا لیکن دشمن سے نمٹنے والی کوئی چیز وہاں موجود نہیں تھی۔ روزینہ نے پوچھا۔

"وہ الماری دیوار سے اتنی دور کیوں ہٹا کر رکھی گئی ہے؟ اس کے پیچھے تمہیں کچھ مل سکتا ہے۔"

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا الماری کے پاس گیا۔ پھر ٹھٹک کر حیرانی سے اس کے پیچھے زمین کی طرف گھورنے لگا۔

"کیا ہے؟ تم رک کیوں گئے؟"

وہ دوڑتی ہوئی اس کے پاس آئی۔ پھر اس کی آنکھیں بھی حیرت سے پھیل گئیں۔ الماری کے پیچھے زمین کی تہہ میں ایک زینہ دکھائی دے رہا تھا۔ تہہ خانہ زیادہ گہرائی میں نہیں تھا۔ دن کی روشنی کسی قدر وہاں تک پہنچ رہی تھی۔

روزینہ نے اس کے بازو کو مضبوطی سے تھام کر کہا۔

"یہاں کوئی چھپا ہو گا الماری ہٹا کر اس راستے کو بند کر دو۔"

"نہیں!" اس نے جواب دیا۔ "اس کمرے کی حالت بتا رہی ہے کہ یہاں کوئی انسان نہیں رہتا۔ تم یہاں ٹھہرو' میں اندر جا کر دیکھتا ہوں۔"

"نہیں۔ میں یہاں اکیلی نہیں رہوں گی۔ نہ جانے یہ کیسی جگہ ہے۔ ہم کس مصیبت میں آ کر پھنس گئے ہیں۔ اب مجھے مرنا ہو گا تو تمہارے ساتھ ہی مروں گی۔"

"تو پھر آؤ میرے ساتھ!"

وہ ماچس کی ڈبیہ جیب سے نکال کر زینہ سے اترنے لگا۔ روزینہ اس کے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ دن کا اجالا اس تہہ خانے میں دم توڑ رہا تھا۔ مٹی مٹی سی روشنی میں ایک لانبی مستطیل میز نظر آ رہی تھی۔ جس پر موٹی موٹی کتابیں بکھری پڑی تھیں۔ بابر آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ وہ چاروں طرف محتاط نظروں سے دیکھتا جا رہا تھا۔ روزینہ اس کے بازو

سے لگی ہوئی تھی۔ اس تہہ خانے کی حالت سے بھی ظاہر تھا کہ وہ برسوں سے ویران پڑا ہوا ہے۔

دیواروں سے لگے ہوئے لکڑی کے شیلف پر چھوٹی بڑی بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔ ان میں سے کچھ خالی تھیں' کچھ بھری ہوئی تھیں۔ میز پر ادویات کے اوزان کے لئے ایک چھوٹا سا پیتل کا ترازو' ایک اسٹو' شیشے کی نلکیاں اور سرجری کے کچھ آلات رکھے ہوئے تھے۔ قریب ہی ایک ادھ جلی موم بتی پڑی ہوئی تھی۔

بابر نے اسے روشن کرنے کے بعد میز پر رکھ دیا۔

"یہ سب کچھ دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ یہاں کوئی ڈاکٹر یا کوئی سائنسدان رہا کرتا تھا۔"

"رہتا ہو گا۔" وہ بیزاری سے بولی۔ "یہاں سے واپس چلو۔"

"نہیں روزینہ۔ اب اس کاٹج کا کوئی مالک نہیں ہے میں سوچ رہا ہوں کہ ہمیں اس غار میں رہنے کی بجائے یہاں آرام سے رہنا چاہئے۔"

"تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟ کیا یہ جگہ ہمارے رہنے کے قابل ہے؟ یہاں تو وہ بندر آیا کرتا ہے۔"

"وہ اس لئے آتا ہے کہ یہاں انسان نہیں رہتے۔ جب ہم یہاں رہیں گے تو وہ ادھر کا رخ نہیں کرے گا۔ یہ ہمارے لئے سب سے محفوظ جگہ ہے۔"

"لیکن بابر! یہ تو سوچو کہ یہ کاٹج ویران کیوں ہو گیا ہے۔ ہمیں معلوم ہونا چاہئے کہ اس کا مالک کون ہے اور اُسے چھوڑ کر کہاں چلا گیا ہے؟"

"معلوم ہو سکتا ہے۔" بابر نے کتابوں کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "تعلیم یافتہ لوگ خصوصاً ڈاکٹر وغیرہ اپنے تجربات لکھتے رہتے ہیں۔ آؤ یہاں کوئی ایسی کتاب' ڈائری یا نوٹ بک تلاش کرو' جس کے ذریعے اس گمنام ڈاکٹر کے متعلق کچھ معلوم ہو سکے۔"

روزینہ موم بتی اٹھا کر کتابوں کے ایک ریک کے پاس آ گئی اور تمام کتابیں الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ بابر کو میز پر پڑی ہوئی کتابوں میں کچھ نہ ملا تو وہ بھی روزینہ کے پاس آ گیا۔ پندرہ منٹ کی تلاش کے بعد ایک ڈائری اور چار چھوٹی نوٹ بکس ہاتھ آ گئیں۔ بابر نے کہا۔

"چلو۔ اوپر چل کر انہیں پڑھتے ہیں۔ یہاں بہت زیادہ گھٹن ہے۔"

اس نے موم بتی بجھا کر میز پر رکھ دی۔ پھر وہ دونوں زینے طے کرتے ہوئے اوپر آ گئے۔ بابر نے اس سے ڈائری لے لی اور ایک الٹی ہوئی کرسی کو سیدھی کر کے بیٹھ گیا۔

ڈائری کھولتے ہی ایک تصویر اس کی گود میں آگری۔ روزینہ نے اسے اٹھا کر دیکھا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر کا شخص تھا۔ نہ جانے کون تھا۔ ڈائری پڑھنے کے بعد ہی معلوم ہو سکتا تھا۔

ڈائری کے پہلے صفحے پر نام اور پتے کی جگہ لکھا تھا۔

ڈاکٹر جان ڈیرک' ماہر نباتات و ادویات۔ بوٹانیکل ریسرچ انسٹیٹیوٹ کولم پور۔"

روزینہ کرسی کھینچ کر اس کے قریب بیٹھ گئی۔ ڈائری کے دوسرے تمام صفحات پر ہاتھ سے لکھی ہوئی تاریخیں درج تھیں۔ وہ ترتیب سے پڑھنے لگے۔

"14 جون 1975"

میں ملازمت سے استعفا دے کر اپنے کاٹج میں آگیا ہوں۔ دو سال پہلے میں نے سرکار سے اجازت لے کر یہ کاٹج اور لیبارٹری بنوائی تھی تاکہ جنگل کی تنہائی اور سکون میں کچھ اہم تجربات کر سکوں۔ حکومت میری خدمات کو سراہتی ہے اور میری ہر خواہش کا احترام کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس جنگل میں' خصوصاً میرے کاٹج کے آس پاس سے کسی کو گزرنے کی اجازت نہیں ہے۔ میں چار ماہ یا چھ ماہ کے بعد خود ہی کولم پور جا کر اپنے تجربات کی رپورٹ پیش کر دیتا ہوں۔

یہ تو خیر سرکاری خدمات کی باتیں ہیں۔ ویسے اس تنہائی کے پیچھے میرا اپنا ایک مقصد ہے۔ میں طبی نقطہ نظر سے ایک ایسی عجیب و غریب تھیوری کو عملی طور سے پیش کر رہا ہوں۔ یعنی ایک ایسی دوا تیار کر چکا ہوں جس کے استعمال کے بعد دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی حیرت انگیز طور پر کم ہو جائے گی۔

ڈارون کا فلسفہ ہے کہ انسان پہلے بندر تھا۔ ہزاروں سال پہلے مختلف ادوار میں بندر اپنی جسمانی تبدیلیوں سے گزرتے ہوئے یا دوسرے لفظوں میں ترقی کرتے ہوئے موجودہ انسان کے روپ میں آیا ہے۔

اس فلسفے کے پیش نظر میں نے اپنی ایک تھیوری پر کام کیا ہے۔ میری تھیوری کے مطابق آج کا انسان ہزاروں سال پیچھے اپنے ماضی کی طرف جا سکتا ہے۔ یعنی وہ دوبارہ آدمی سے رفتہ رفتہ بندر بن سکتا ہے.........."

بابر اور روزینہ پڑھتے پڑھتے بے اختیار چھت کی جانب دیکھنے لگے۔ چھت پر کوئی نہیں تھا لیکن انہیں بندر کا خیال آگیا تھا۔ وہ پھر ڈائری پر جھک گئے۔ جہاں سے سلسلہ ٹوٹا تھا وہاں سے پڑھنے لگے۔

"میری یہ تھیوری ناقابل عمل نظر آتی ہے لیکن میں ایک چھوٹا سا تجربہ کر چکا ہوں۔

اب اسے کسی انسان پر آزمانا چاہتا ہوں۔ ایک ہفتے بعد میں کولم پور جاؤں گا اور وہاں سے کسی ناکارہ اور زندگی سے اکتائے ہوئے آدمی کو اس تجربے کے لئے پکڑ لاؤں گا۔

بظاہر یہ ظالمانہ تجربہ ہے لیکن انسان کی فلاح و بہبود کے لئے نہایت ضروری ہے۔ خاندانی منصوبہ بندی کے ذریعہ کتنے ہی ذہین ڈاکٹروں' سائنسدانوں اور قابل انسانوں کو پیدا ہونے سے پہلے ہی ختم کر دیا جاتا ہے۔ میری تھیوری کے مطابق ہر انسان کو پیدا ہونے کا حق ہے۔ پیدا ہونے' جوان ہونے اور اپنے گن دکھانے کے بعد فیصلہ کرنا چاہئے کہ کتنے قابل انسان ہیں جنہیں جینے کا حق ہے اور کتنے ناکارے ہیں جو زمین کا بوجھ بنے ہوئے ہیں اور مہنگائی بڑھا رہے ہیں۔ یہ جتنے چور' بدمعاش' خونی' قاتل' بے روزگار' بے ہنر' بے مقصد لوگ ہیں انہیں آدمی سے بندر بنا کر جنگلوں میں چھوڑ دینا چاہئے۔

آنے والی ذہین نسل ڈارون کو بھول جائے گی اور میری تصویر کو پھولوں کے ہار پہنایا کرے گی.........."

بابر نے دوسرا ورق الٹ دیا۔

"11 جون 1975"

میں نے اس دوا کا نام "انسانی منصوبہ بندی" رکھا ہے اچھا نام ہے۔ چند لفظوں میں میرے مقصد کی وضاحت ہو جاتی ہے میں نے بوتل پر اس نام کا لیبل لگا دیا ہے۔ یہ سرخ رنگ کی دوا ہے چکھنے میں میٹھی ہے۔ ہلکی سی کڑواہٹ بھی ہے۔ بہت زیادہ مٹھاس میں بھی ہلکی سی کڑواہٹ ہوتی ہے۔ میں جس شکار کو پھانس کر لاؤں گا اس کے فرشتوں کو بھی پتہ نہیں چلے گا کہ وہ دوا پی رہا ہے یا شربت؟

اس دوا کے جزئیات میں نے ایک نوٹ بک میں درج کر دیئے ہیں۔ کچھ جڑی بوٹیاں' بندروں کی من پسند غذاؤں کے وٹامن' بندروں کے غدود اور ان کے جوہر خاص جس سے بندروں کی نسل بڑھتی ہے۔ ان تمام چیزوں کو کیمیائی تجربات سے گزر کر یہ دوا تیار کی ہے۔

کل صبح میں اپنے شکار کی تلاش میں کولم پور جاؤں گا.........."

15 جون 1975

ایک جاسوسی کہانیاں لکھنے والا پھنس گیا ہے۔ اپنی ایک زیر تحریر کہانی کے سلسلے میں مجھ سے پوچھنے آیا تھا کہ کس طرح دھتورے کو کیمیائی مراحل سے مائع میں تبدیل کیا جاتا ہے۔ میں اسے مہمان بنا کر لے آیا ہوں۔ اس کے سامنے عملی تجربہ کر کے دکھاؤں گا کہ

دھتورے کا بیج کس طرح مائع میں تبدیل ہوتا ہے۔ یہ کمبخت جاسوسی کہانیاں لکھنے والے بھی زمین کا بوجھ ہوتے ہیں۔ فضول کہانیاں لکھ کر لوگوں کا وقت برباد کرتے ہیں۔ انہیں سب سے پہلے بندر بنانا چاہئے اور وہ کچھ بندر ہی کی خصلت رکھنے والا مصنف ہے۔ کبھی چین سے ایک جگہ نہیں بیٹھتا ہے۔ کبھی باہر جاتا ہے۔ کبھی کالج میں آتا ہے اور کبھی لیبارٹری میں آکر تمام دواؤں کے نام پوچھ کر نوٹ بک میں لکھتا ہے تاکہ کسی کہانی میں کام آسکیں۔

☆=====☆=====☆

ابھی میں نے اسے کہا کہ سوتے وقت کھڑکی کی طرف سرہانا کرے تاکہ سر میں ٹھنڈی ہوا لگتی رہے' لیکن کھڑکی کی طرف پاؤں رکھ کر سو رہا ہے۔ کہتا ہے کہ سوتے وقت کھڑکیاں اور دروازے نگاہوں کے سامنے رہیں تو بہتر ہے۔ آنے جانے والوں پر نظر رہتی ہے۔ کمبخت کہانیاں لکھتے لکھتے خیالی جاسوس بن رہا ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ ہر انسان کو محتاط رہنا چاہئے۔ میں بھی محتاط ہوں۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ کل اسے رخصت کرتے وقت شربت کا ایک گلاس پیش کروں گا۔ شربت یعنی وہی انسانی منصوبہ بندی کی دوا۔ مگر اب میں سمجھ گیا ہوں کہ شربت کا صرف ایک گلاس ہو گا تو وہ مجھ پر شبہ کر سکتا ہے۔ میں دو گلاس بناؤں گا۔ شربت انار اپنے لئے اور شربت انسانی منصوبہ بندی اس کے لئے۔ کل صبح............"

چوتھا صفحہ سامنے تھا۔

"16 جون 1975"

آج میں بہت خوش ہوں۔ صبح اس کے سامنے دھتورے کے بیج کو مائع میں تبدیل کیا تھا۔ دوپہر کو اسے رخصت کرنے سے پہلے میں نے دو گلاس شربت میز پر لا کر رکھ دیئے۔ ہم دونوں آمنے سامنے بیٹھ کر پیتے رہے۔ میرے ہاتھ میں شربت انار تھا اور وہ اپنے آباؤ اجداد کی طرف لوٹنے کے لئے میرے تجربے کو شربت سمجھ کر پی رہا تھا۔

پھر وہ مصافحہ کر کے رخصت ہو گیا۔ میں نے اس کا پتہ نوٹ کر لیا ہے۔ وقتاً فوقتاً اس پتے پر جا کر اسے دیکھتا رہوں گا۔ میرے اندازے کے مطابق دو چار روز میں ہی اس کے جسم میں نمایاں تبدیلی ہو گی کچھ روز بعد ہی وہ اچھلتا کودتا جنگل میں آئے گا اور درختوں کی شاخوں میں کرتب دکھاتا رہے گا............"

بابر اور روزینہ ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ انہیں پھر وہ بندر یاد آگیا جو چھت پر اور درختوں پر دھما چوکڑی کرتا رہا تھا۔

پھر وہ پڑھنے لگے۔

"18 جون 1975"

کل مجھے سخت بخار تھا۔ دوا کھائی تو کچھ افاقہ ہوا۔ مگر اب تک بدن کا جوڑ جوڑ دکھ رہا ہے۔ کمزوری نام کو نہیں ہے۔ ایک عجیب توانائی سی محسوس ہو رہی ہے لیکن دل گھبرا رہا ہے۔ کچھ لکھنے پڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ کل سہی..........."

پھر چھ دن بعد ساتویں دن کی تاریخ تھی۔

"25 جون 1975ء"

آہ۔ میں تباہ ہو گیا۔ برباد ہو گیا۔ میرے جسم پر بھورے رنگ کے بال اگ رہے ہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ انسانی منصوبہ بندی کی دوا وہ الو کا پٹھا پی کر گیا ہے اس کا اثر مجھ پر کیوں ہو رہا ہے؟

ضرور کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے مگر کیسے؟ میں تو پورے ہوش و حواس میں تھا۔ یہ درست ہے کہ شربت کا رنگ ایک تھا۔ گلاس بھی ایک جیسے تھے لیکن پھر بھی مجھ سے غلطی نہیں ہوئی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ انسانی منصوبہ بندی کا گلاس میرے دائیں ہاتھ میں تھا۔ مہمان کے آگے کوئی بھی چیز دائیں ہاتھ سے بڑھائی جاتی ہے۔ لہٰذا میں نے دائیں ہاتھ کا گلاس اس کے سامنے رکھ دیا۔ اور بائیں ہاتھ کا گلاس اپنے سامنے رکھ لیا۔

ہاں۔ یاد آیا۔ اسی وقت کچھ گڑبڑ ہو گئی تھی۔ اس بنے دوا کی ایک چسکی لے کر کہا تھا کہ میٹھا کم ہے۔ میں چینی لانے کپ بورڈ کی طرف گیا۔ زیادہ دور نہیں۔ صرف پانچ قدم کے فاصلے پر گیا۔ شوگرپاٹ لے کر واپس آیا تو دونوں گلاس اپنی اپنی جگہ رکھے ہوئے تھے۔ مگر اب میں سمجھ گیا ہوں۔ اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔ وہ بندر کی خصلت رکھنے والا مصنف جو سوتے وقت سرہانہ اِدھر سے اُدھر کرتا تھا۔ اس نے پیتے وقت بھی گلاس اِدھر سے اُدھر کر دیا تھا۔

میں یہ نہیں کہتا کہ اسے شبہ ہو گیا تھا۔ نہیں۔ اگر ذرا بھی شبہ ہوتا تو اس کے تیور بدل جاتے۔ وہ میری مہمان نوازی پر لعنت بھیج کر شربت پئے بغیر چلا جاتا۔ نہیں، وہ میری نیت سے واقف نہیں تھا بلکہ اپنی عادت سے مجبور تھا۔ جاسوسی کہانیاں لکھتے لکھتے اتنا محتاط ہو گیا تھا کہ ہر چیز کو استعمال کرنے سے پہلے اِدھر اُدھر اس کی جگہ بدل دیتا تھا۔ سؤر۔ کمینہ۔ بندر کی اولاد۔ آہ! میں اپنے آباؤ اجداد کی طرف واپس جا رہا ہوں۔ کاش کہ میں سنجیدگی سے اس کمبخت کی عادات پر غور کرتا۔ اسے خیالی کہانیوں کی دنیا میں رہنے والا احمق نہ سمجھتا۔ اس کمبخت کو پتہ نہیں ہے کہ وہ لاعلمی میں نادانستگی میں میرا تجربہ مجھ پر

ہی آزما کر چلا گیا ہے۔

بہرحال میں مایوس نہیں ہوں۔ ابھی ایک امید کی کرن باقی ہے۔ میں کتابیں کھنگال رہا ہوں۔ اس دوا کا توڑ معلوم کر رہا ہوں۔ مجھے امید ہے مجھے یقین ہے کہ کل تک اس دشمن دوا کی تاثیر کو پانی کر دوں گا..........."

ایک ورق اور الٹ گیا۔

"2 جولائی 1975"

کوئی امید بر نہیں آتی۔ کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ تمام تدبیریں ناکام ہو گئی ہیں۔ شاید اس لئے کہ اب میرا دماغ کام نہیں کر رہا ہے اب کوئی چیز اچھی طرح یاد نہیں رہتی۔ دواؤں کے نام بھولتا جا رہا ہوں۔ صرف جسم ہی نہیں، دماغ بھی بندر کا ہو رہا ہے۔ بیٹھے بیٹھے بار بار قلابازیاں کھانے کو جی چاہتا ہے۔ کچھ روز بعد وہی ہو گا جو بندر کا دماغ بولے گا۔ ہاں بولنے پر یاد آیا کہ میری زبان میں لکنت پیدا ہو گئی ہے بڑی مشکلوں سے کچھ بول سکتا ہوں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ میری قوت گویائی ختم ہو جائے گی۔ میں کہاں جاؤں؟ کیا کروں؟ اپنے علاج کے لئے شہر نہیں جا سکتا۔ اپنی ہیئت پر آپ شرم آتی ہے۔ میں اتنا عظیم اور قابل پرستش ڈاکٹر جس کی تصویر کو آئندہ نسلیں پھولوں کا ہار پہنانے والی تھیں اب اسے بندر سمجھ کر پتھر ماریں گی۔ آہ! میں انسانوں کی دنیا سے جا رہا ہوں..........."

اس کے بعد ڈائری کے تمام صفحات سادے تھے۔ شاید اس کا دماغ کام کرنے سے معذور ہو گیا تھا۔ بابر اور روزینہ کو کچھ دیر کے لئے چپ سی لگ گئی۔ پھر وہ بولی۔

"بیچارہ!"

"تم اسے بیچارہ کہتی ہو؟ اس نے دوسروں کے لئے گڑھا کھودا اور خود اس میں گر گیا۔"

"پھر بھی افسوس ہوتا ہے۔ اتنا قابل ڈاکٹر بندر بن گیا۔ مجھے تو یقین نہیں آیا۔"

"مجھے یقین ہے۔ وہ ڈاکٹر جان ڈیرک ہی تھا جو کچھ دیر پہلے چھت پر کود رہا تھا۔"

"تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ ڈاکٹر جان تھا؟"

"کیا تم بھول گئیں۔ اس بستر پر اس کے جسم کے کچھ بال بکھرے پڑے ہیں۔ یہ اسی کا بستر ہے۔ وہ بندر بننے کے بعد بھی اپنے بستر پر آ کر سوتا ہے۔"

"یہ کیسی مضحکہ خیز بات ہے کہ ایک اچھا خاصا آدمی بندر بن گیا ہے۔ میں اسے دیکھوں گی باہر۔ اسے دیکھنے کے بعد ہی مجھے یقین آئے گا۔" بابر نے مسکرا کر پوچھا۔

"کیوں؟ اب اس سے ڈر نہیں لگے گا؟"

"تمہارے کہنے کے مطابق اگر وہ ڈاکٹر جان ہے تو پھر اس سے ڈرنا کیسا؟ اگر وہ دوسروں پر ظلم کرتا تو ظالم کہلاتا۔ مگر اب تو وہ مظلوم ہے۔"

وہ ڈائری میز پر رکھ کر کھڑا ہو گیا۔

"اچھا آؤ۔ باہر چل کر دیکھتے ہیں۔ میرا خیال ہے وہ کہیں چلا گیا ہے۔ یہاں ہوتا تو پھر دھما چوکڑی مچاتا۔"

دروازہ کھول کر وہ دونوں باہر آ گئے۔ سب سے پہلے انہوں نے اس درخت کی جانب دیکھا جہاں وہ چھت پر سے کود کر گیا تھا۔ وہ وہاں نہیں تھا۔ کاٹج کے بائیں طرف اس کے خوخیانے کی آواز آئی انہوں نے گھوم کر دیکھا۔ وہ ایک درخت کی شاخ سے الٹا لٹکا ہوا تھا۔ انہیں دیکھتے ہی وہ جھولتا ہوا دوسری شاخ پر گیا۔ پھر دھم سے زمین پر آیا اور ایک قلابازی کھانے کے بعد سیدھا کھڑا ہو گیا۔

وہ دونوں حیرت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس عجیب الخلقت انسان کو دیکھ رہے تھے۔ جو انسان بھی تھا اور بندر بھی۔ بندر دو ٹانگوں پر سیدھے کھڑے نہیں ہو سکتے۔ مگر وہ کھڑا ہوا تھا۔ انسان کے جسم پر بندروں کی طرح بھورے بال نہیں ہوتے۔ مگر اس کا جسم بالوں سے بھرا ہوا تھا۔ بندر قد آور نہیں ہوتے۔ مگر وہ قد اور جسامت کے لحاظ سے گوریلا دکھائی دیتا تھا۔ بندر کی طرح اس کا منہ ذرا آگے کو نکل آیا تھا۔ ناک چپٹی ہو گئی تھی لیکن آنکھیں انسانوں کی طرح تھیں۔ صرف ذرا سی سکڑ گئی تھیں۔

چہرے کی تبدیلی کے باوجود وہ اس تصویر سے مشابہت رکھتا تھا جو ڈائری سے برآمد ہوئی تھی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ ڈاکٹر جان ڈیرک ہی ہے۔ روزینہ اسے پہلی ہی نظر میں پہچان گئی تھی اور اب اسے دوسری بار چور نظروں سے دیکھ رہی تھی کیونکہ وہ الف برہنہ تھا۔

"نان سنس!" وہ بولی۔ "کیا یہ کپڑے پہننا بھی بھول گیا ہے؟"

بابر نے ہنستے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے اپنی طرف بلایا۔ اس نے بھی بلانے کے انداز میں ہاتھ ہلا کر بابر کی نقل کی۔ پھر ایک قلابازی کھا کر چاروں ہاتھ پاؤں پٹکتا ہوا' ٹھیک بندروں کے انداز میں چلتا ہوا ان کے قریب آنے لگا۔

روزینہ بابر کے پیچھے چلی آئی۔

"مجھے ڈر لگتا ہے۔ دیکھو کیسے دانت نکال رہا ہے۔ کہیں یہ کاٹے گا تو نہیں؟"

"گھبراؤ نہیں۔ یہ تمہیں ہاتھ بھی نہیں لگائے گا۔"

وہ ان کے سامنے دس قدم کے فاصلے پر آ کر رک گیا اور اکڑوں بیٹھ کر اپنی گردن کھجانے لگا۔

"ہیلو ڈاکٹر!" بابر نے اسے مخاطب کیا۔ "کیا تم ہماری باتیں سمجھ سکتے ہو؟"

وہ سر کھجاتے ہوئے گردن ٹیڑھی کر کے روزینہ کو دیکھنے لگا۔ بابر کا سوال اس کے پلے نہیں پڑا تھا۔ وہ روزینہ کو دیکھ کر دانت نکال رہا تھا اور اوپر سے نیچے سر ہلا رہا تھا۔

"یہ مجھے دیکھ کر دانت کیوں نکال رہا ہے؟"

"مسکرا رہا ہے!" بابر نے تسلی دی۔

روزینہ بھی اخلاقاً مسکرانے لگی۔ اسے مسکراتے دیکھ کر ڈاکٹر نے خوشی سے قلقاری ماری' گھاس پر لوٹ کر چند قدم آگے آیا پھر اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ ٹھیک بابر کے سامنے۔ جیسے دوست مصافحہ کے لئے یا دو دشمن مقابلے کے لئے آمنے سامنے آ جاتے ہیں۔ وہ دونوں قد اور جسامت میں برابر تھے۔ دونوں ہی ہاتھ پاؤں سے مضبوط تھے۔ دو پہاڑی چٹانوں کی طرح زمین پر جمے ہوئے تھے اور آسمان کی طرف اٹھے ہوئے تھے۔

روزینہ ان دونوں چٹانوں کو باری باری دیکھ رہی تھی۔

بابر نے کہا۔ "دوست! یہ کاٹج تمہارے کام کا نہ رہا۔ تمہیں درختوں میں رہنا چاہئے اب ہم یہاں آ کر رہیں گے۔"

"کھی' کھی' کھی' کھی........." اس نے دانت نکال کر ایک بار کاٹج کی طرف دیکھا۔ پھر الٹی قلابازی کھا کر چاروں ہاتھ پاؤں زمین پر ٹیک دیئے اور وہاں سے اچھلتا ہوا دور جانے لگا۔ کچھ دور جانے کے بعد اس نے پلٹ کر دیکھا اور ایک ہاتھ ہلا ہلا کر انہیں اپنی طرف بلانے لگا۔

"وہ ہمیں بلا رہا ہے۔" روزینہ نے کہا۔

بابر خاموشی سے اس کی حرکتیں دیکھ رہا تھا۔ وہ پھر واپس ہوا اور ہاتھ کے اشارے سے انہیں بلاتے ہوئے دوبارہ پلٹ کر جانے لگا۔

بابر نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"آؤ دیکھیں۔ وہ کہاں لے جانا چاہتا ہے۔"

"ہم اس کے پیچھے کہاں بھٹکتے رہیں گے؟" روزینہ نے پوچھا۔

"بھٹکنے کا اندیشہ ہو گا تو ہم واپس آ جائیں گے۔"

ڈاکٹر اچھلتا کودتا جا رہا تھا۔ اسے پیچھے سے دیکھنے پر پہلی بار روزینہ نے توجہ دی تو اسے ڈاکٹر کے پیچھے ایک بالشت بھر کی دم نظر آئی۔ اس نے حیرت سے کہا۔

"دیکھو بابر! اس کی دم نکل آئی ہے۔"

بابر نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ ابھی یہ دم کافی لمبی ہو گی۔ اس کی ڈائری میں جو تاریخ درج ہے۔ اس کے حساب سے اس نے ایک ماہ پہلے شربت انسانی منصوبہ بندی نوش کیا تھا۔ اس ایک ماہ میں یہ جسمانی لحاظ سے آدھا انسان رہ گیا ہے۔ باقی آدھا جسم اور تمام خصلتیں بندر کی ہیں۔ آگے چل کر نہ جانے یہ بندر کی طرح جھک جائے گا یا گوریلے کی طرح سیدھا کھڑا رہ جائے گا۔"

"بابر کیا ہم اسے دوبارہ مکمل انسان نہیں بنا سکتے؟"

"بنا سکتے تھے۔ اگر ہم ڈاکٹر ہوتے.........."

"ڈاکٹر ہونا ضروری نہیں ہے۔ ایک پیدائشی جانور انسان کی صحبت میں رہ کر انسانی عادتیں سیکھ سکتا ہے۔ ایک طوطا بھی انسان کی طرح بولنے لگتا ہے۔ ڈاکٹر پیدائشی انسان ہے۔ کیا یہ دوبارہ بولنا نہیں سیکھ سکتا؟"

"شاید سیکھ جائے۔ ہمیں نے یہاں رہنا ہے۔ ہم اسے عادات و اطوار کے لحاظ سے انسان بنانے کی کوشش کریں گے۔"

وہ چلتے چلتے گھنے درختوں کے جھنڈ میں پہنچ کر رک گئے اور حیرت سے ایک ایک چیز کو دیکھنے لگے۔ لکڑی کی پیٹیاں' سوٹ کیس' فولڈنگ پلنگ اور کرسیاں اور وہ تمام سامان جو وہ غار میں چھوڑ کر آئے تھے۔ ان کی نظروں کے سامنے بکھرا پڑا تھا۔ ڈاکٹر اِدھر سے اُدھر قلابازیاں کھا رہا تھا۔ کبھی لکڑی کی کسی پیٹی پر بیٹھ رہا تھا اور کبھی پلنگ پر لوٹ رہا تھا اور اپنے سینے پر ہاتھ مار مار کر بتا رہا تھا کہ یہ تمام سامان وہ اٹھا کر لایا ہے۔

"تعجب ہے۔" روزینہ نے کہا۔ "اسے کیسے معلوم ہوا کہ ہمارا سامان وہاں رکھا ہوا تھا؟"

بابر نے جواب دیا۔

"اس کی حرکتوں سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نہر سے نہیں بلکہ غار سے ہمارا پیچھا کرتا رہا ہے۔"

"بابر! اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں ابھی سوچنے سمجھنے کی کچھ صلاحیتیں ہیں۔ یہ

تمام سامان یہاں لا کر یہ کہنا چاہتا ہے کہ ہمیں کاٹیج میں رہنا چاہئے۔"

"ہاں۔ مگر اتنا سمجھ دار بھی نہیں ہے۔ انسانی دماغ کے ساتھ بندر کا دماغ بھی کام کرتا ہے۔ وہ دیکھو۔ اتنا بھاری پتھر بھی اٹھا لایا جس سے ہم غار کے دہانے کو بند کرتے تھے۔ یہ حماقت ہے یا نہیں؟"

وہ تعجب سے اس وزنی پتھر کو دیکھنے لگی۔ جسے بابر پوری قوت صرف کرتے ہوئے سرکایا کرتا تھا۔ غار وہاں سے تقریباً دو ڈھائی میل کے فاصلے پر ہو گا۔ کیا اتنی دور سے وہ پتھر کو لڑھکا کر لایا ہے؟ لیکن وہ تو اتنا بڑا اور اتنا بھاری ہے کہ اسے لڑھکاتے وقت بھی اچھے اچھوں کو پسینہ آ جاتا۔

"ڈاکٹر! بہت بہت شکریہ۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ اتنی دور سے اتنا سارا سامان کیسے لاؤں گا۔ چلو اب کاٹیج تک بھی پہنچا دو۔"

بابر نے یہ کہہ کر ایک بڑی سی پیٹی دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر اپنے سر پر رکھ لی۔ پیٹی کافی وزنی تھی۔ مگر بابر کے لئے وزنی نہیں تھی۔ اس کی دیکھا دیکھی ڈاکٹر نے اس بھاری پتھر کو دونوں ہاتھوں سے اٹھایا اور اسے اپنے سر پر رکھ لیا۔ وہ دونوں دم بخود ہو کر اسے دیکھنے لگے۔ وہ کوئی معمولی وزن کا پتھر نہیں تھا۔ کوئی کھلونا نہیں تھا۔ اگر کھلونا تھا تو پھر ہارس پاور کے حساب سے ڈاکٹر دس مین پاور کا بندر آدمی تھا۔

بابر نے جھنجلا کر کہا۔

"بیوقوف۔ بندر کی اولاد! یہ پتھر ہمارے کام کا نہیں ہے۔ اسے پھینک دو۔ پھینک دو اسے.........."

ڈاکٹر نے اس کے ہاتھ کے اشارے کو سمجھ کر پتھر کو دونوں ہاتھوں سے ایک طرف اچھال دیا۔ پتھر ایک درخت کے تنے سے ٹکرایا۔ ایک زبردست دھماکے کی آواز گونجی اور درخت پر بسیرا کرنے والے پرندے شور مچاتے ہوئے ان کے سروں پر منڈلانے لگے۔

ڈاکٹر اب لکڑی کی ایک پیٹی اٹھا رہا تھا۔

روزینہ ایک درخت کے تنے سے لگی اس شہ زور کو عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے کنارے سرخ ہو گئے تھے۔ بوجھل پلکوں کے پیچھے دل اور دماغ کے دو آتشہ پر کچھ سوچ کی کچی شراب پک رہی تھی۔

☆======☆======☆

ویران کاٹیج آباد ہو گیا۔

کاٹیج کی اچھی طرح صفائی کرنے اور تمام سامان ترتیب سے رکھنے کے بعد انہوں نے لیبارٹری کو بھی جھاڑ پونچھ کر دواؤں کی بوتلیں اور کتابیں وغیرہ سلیقے سے رکھ دی تھیں۔ اسی صفائی کے دوران وہ چھوٹی سی بوتل مل گئی۔ جس میں سرخ رنگ کا سیال تھا اور جس پر انسانی منصوبہ بندی کا لیبل لگا ہوا تھا۔

بابر اس بوتل کو ہاتھ میں لے کر اسے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا۔ پھر اس نے روزینہ سے کہا۔

”ہم اس دوا سے لاکھوں روپے کما سکتے ہیں۔“

”کیسے؟“

”اس دوا کے فارمولے کو ہم کسی ایسے ڈاکٹر کے ہاتھ فروخت کریں گے جو ڈاکٹر جان ڈیرک کی طرح خبطی ہو اور وہی خواب دیکھتا ہو کہ آئندہ نسلیں اس کی تصویر کو پھولوں کے ہار پہنایا کریں گی۔ اس دنیا میں ایسے خبطی دولت مند ڈاکٹروں اور سائنسدانوں کی کمی نہیں ہے۔“

اس نے مستطیل میز کی دراز کھول کر وہ نوٹ بک نکالی جس میں فارمولا درج کیا گیا تھا۔ دو ورق میں اس فارمولے کے جزئیات اور مقدار کی مختصر سی تفصیل تھی۔ اس نے دونوں اوراق پھاڑ کر جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

”ہم اس ملک میں بھی نہیں رہیں گے۔ یہاں سے دو سو میل کے فاصلے پر برما کی سرحد ہے میں کولپور جا کر کسی ایسے دلال سے ملوں گا جو دو چار سو روپے لے کر ہمیں بارڈر پار کرا دے گا۔“

”کیا تم مجھے تنہا چھوڑ کر کولپور جاؤ گے؟“

”تمہیں ساتھ لے جانا مناسب نہیں ہے۔ وہاں کسی کو بھی شبہ ہو سکتا ہے کہ ہم غیر ملکی ہیں۔ تمہیں یہاں کس بات کا ڈر ہے؟ کل سے ہم ڈاکٹر کو دیکھ رہے ہیں۔ وہ بے چارہ ہمارے اشاروں پر چل رہا ہے۔ ہمارے یہاں آ جانے سے بہت خوش ہے۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ وہ تمہیں نقصان پہنچائے گا؟“

”نن.......... نہیں۔ اب تو وہ دوست ہی معلوم ہوتا ہے۔ پھر بھی دو ایک دن اس کی عادات کو اچھی طرح سمجھ لینے دو۔ مجھے اطمینان ہونے کے بعد تم چلے جانا۔“

”اچھی بات ہے۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ”یہ فارمولا اور یہ بوتل یہاں نہیں رہنا چاہئے۔ اگر کوئی بھولا بھٹکا مسافر آ گیا تو یہ چیزیں اس کے ہاتھ لگ جائیں گی۔

میں نہر کی طرف جا رہا ہوں۔ وہاں جھاڑیوں کے درمیان زمین کھود کر انہیں چھپا دوں گا۔“

اس نے بوتل پتلون کی جیب میں رکھ لی اور زینے طے کرتے ہوئے تہ خانے سے باہر آ گیا۔ کاٹیج کے باہر ڈاکٹر گھاس پر پڑا اِدھر اُدھر لوٹ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر بابر نے کہا۔

”میں نہر پر جاؤں گا تو یہ بھی میرے پیچھے آئے گا۔ میں نہیں چاہتا کہ یہ وہ جگہ دیکھے۔ آخر کو بندر ہے۔ کبھی وہاں جائے گا اور ان چیزوں کو کھود کر نکال لے گا۔“

”اچھا ٹھہرو۔ میں اسے روکنے کی کوشش کرتی ہوں۔“

وہ کاٹیج کے اندر گئی اور پکی ہوئی روٹیاں ہاتھ میں لے کر دروازے کے پاس آ گئی۔

”ڈاکٹر جان!“ وہ آواز دینے لگی۔ ”ادھر آؤ جان!“

جان روٹیاں دیکھ کر قلابازیاں کھاتا ہوا دروازے پر آ گیا وہ روٹیاں لے کر اندر چلی گئی۔ جان بھی اچھلتا کودتا اندر جانے لگا۔ بابر مطمئن ہو کر نہر کی طرف چلا گیا۔ کمرے میں پہنچ کر روزینہ اسے بتا رہی تھی کہ کس طرح کرسی پر بیٹھ کر کھانا چاہئے۔ ڈاکٹر اس کے اشاروں پر فرمانبرداری سے عمل کر رہا تھا۔ مگر بندرانہ فطرت سے مجبور ہو کر کوئی ایسی حرکت کر بیٹھتا تھا کہ وہ بے اختیار ہنسنے لگتی تھی۔

روزینہ اس سے خوفزدہ نہیں تھی' بس ذرا ہچکچاتی تھی۔ نئی نئی دوستی میں ہچکچاہٹ ہوتی ہی ہے۔ پھر ہنستے کھیلتے بے تکلفی بڑھ جاتی ہے اور وہ مسخرا بندر اسے اپنی حرکتوں سے ہنساتا جا رہا تھا۔

وہ روٹی کا لقمہ بنا کر اس کے ہاتھ میں دے رہی تھی اور سمجھا رہی تھی کہ اسے ہمیشہ اسی طرح کھانا چاہئے۔ پھر اس نے لانبے ناخنوں کو دیکھ کر کہا۔

”مائی گاڈ! اگر کبھی غصے میں تم مجھے نوچنے کھسوٹنے لگو تو میرا کیا انجام ہو گا۔ ٹھہرو! میں یہ ناخن تراش دیتی ہوں۔“

وہ کپ بورڈ پر رکھا ہوا چھوٹا سا چاقو اٹھا کر لے آئی۔ اس کے سامنے اپنا ایک ناخن تراش کر دکھاتی ہوئی بولی۔

”لاؤ اپنا ہاتھ!“

اس نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ وہ کھلا ہوا چاقو دیکھ کر ہچکچا رہا تھا۔ مگر اس کے حکم سے انکار نہیں کر رہا تھا۔ وہ قریب کھڑی ہوئی تھی۔ اتنے قریب کہ شعلے آنچ دے رہے تھے۔ بندر کھوپڑی ڈاکٹر کو سمجھا نہ سکی کہ وہ کیسی آنچ ہے؟ وہ کیوں اچھی لگ رہی ہے۔؟ بس

اچھی لگ رہی تھی اس لئے اس کے حکم کی تعمیل کر رہا تھا۔

وہ دونوں ہاتھوں کے ناخن تراش رہی تھی۔ جن کانٹوں سے تکلیف پہنچنے والی ہو انہیں راستے سے ہٹا دینا ہی بہتر ہے.........

دو دن گزر گئے۔

تینوں کا وقت ہنستے کھیلتے گزر رہا تھا۔ ڈاکٹر ان کے درمیان ایک تماشا بنا ہوا تھا۔ اب وہ زیادہ دور جنگلوں میں نہیں جاتا تھا۔ کاٹج کے قریب ہی رہ کر اپنی اچھل کود سے روزینہ کو متوجہ کرتا رہتا تھا۔ وہ کاٹج کے باہر لکڑیاں جلا کر پکایا کرتی تھی۔ بابر کی موجودگی میں وہ یہی کوشش کرتی کہ ڈاکٹر کی طرف توجہ نہ دے۔ مگر وہ کمبخت کبھی کبھی پیچھے سے آکر اس کے شانے کو جھنجھوڑ دیتا۔ وہ جھلا کر پوچھتی۔ "کیا ہے؟" وہ جواباً قلابازیاں کھا کر دور چلا جاتا۔

"ہاں۔ بہت اچھی قلابازیاں کھاتے ہو۔ جاؤ کھیلو۔ مجھے کام کرنے دو........."

بابر نے ہنستے ہوئے کہا۔ "بھئی' وہ تم سے مانوس ہو گیا ہے۔ میں کل صبح کولپور جاؤں گا۔ ہمیں جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہئے۔"

جانے کا وقت مقرر ہو گیا۔ اس رات وہ دونوں جنگل میں ٹہلتے رہے۔ چاند بادلوں کے پیچھے آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔ چاندنی کبھی روشن ہو جاتی اور کبھی مدھم پڑ جاتی تھی۔ ان کے مزاج میں بھی کبھی نرمی آ جاتی تھی اور کبھی تیزی۔ پھر تیزی ہی آتی چلی گئی۔ جنگل کے سناٹے میں الوداعی جھگڑے کی آوازیں گونجنے لگیں۔

ڈاکٹر ایک درخت کی شاخ پر بیٹھا ہوا بڑی حیرانی سے اور بڑے اضطراب سے مہذب انسانوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے آباؤ اجداد بھی جنگلوں اور پہاڑوں کی گپھاؤں میں رہ کر کچھ اسی طرح لڑتے جھگڑتے تھے۔ ڈاکٹر بندر جان جھگڑنے کا یہ انداز نہیں جانتا تھا۔ اب جان گیا تھا۔ جتنے ناخن اس کے دماغ میں چبھے ہوئے تھے وہ ایک ایک کر کے نکلتے جا رہے تھے۔

بہت دیر کے بعد سناٹا چھا گیا۔ وہ شاخ پر سے چھلانگ لگا کر دھپ سے زمین پر آ گیا۔ اس کے آس پاس دور دور تک اب کوئی نہیں تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پیٹ لیا' گھاس پر گر کر لوٹنے لگا۔ یہ سمجھنا ذرا مشکل تھا کہ وہ لوٹ رہا تھا یا تڑپ رہا تھا یا کباب سیخ کی مانند یہ پہلو جل رہا تھا' وہ پہلو جل رہا تھا۔ آگ صرف انسان کو نہیں جلاتی؟ اور وہ بھی تو نصف انسان تھا۔ اگر کہیں سے اسے زبان مل جاتی تو وہ دو الفاظ۔ صرف دو الفاظ

ضرور ادا کرتا۔

"آتشی مخلوق........."

☆======☆======☆

پھر رات گزرتی چلی گئی۔

وہ دونوں ڈاکٹر جان کا انتظار کرتے کرتے سو گئے تھے۔ کمرے کا دروازہ بند کر دیا تھا تاکہ کوئی جنگلی جانور نہ گھس آئے۔ روزینہ بابر کے گلے میں بانہیں ڈالے سو رہی تھی۔ رات کو نیند کی حالت میں اس نے غراہٹ کی آواز سنی تھی۔ وہ سوتے میں ذرا کسمسائی' اٹھنے کا ارادہ ہوا پھر نیند غالب آ گئی۔

صبح بابر نے رخصت ہوتے وقت پوچھا۔ "کیا بات ہے' ڈاکٹر رات کو نہیں آیا؟"

"میرا خیال ہے وہ آیا تھا۔ میں نے اس کی آواز سنی تھی۔ مگر تھکن کی وجہ سے اٹھ کر دروازہ نہ کھول سکی۔ تم شام تک واپس آ جاؤ گے؟"

"کوشش کروں گا۔ اگر دیر ہو گئی تو کل صبح تک ضرور واپس آ جاؤں گا۔"

وہ مسکراتا ہوا رخصت ہو گیا۔ وہ بھی مسکراتی ہوئی اسے دیکھتی رہی۔

جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو اس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب ہو گئی اور وہ پریشان نظروں سے چاروں طرف پھیلے ہوئے درختوں کو دیکھنے لگی۔ وہ کرتب دکھانے والا نظر نہیں آ رہا تھا۔

وہ کاٹج میں واپس آکر گھریلو کام کاج میں مصروف ہو گئی۔ گھنٹے آدھے گھنٹے میں وہ باہر آتی تھی اور زور زور سے آوازیں دیتی تھی۔

"ڈاکٹر۔ جان۔ جان تم کہاں ہو۔ میں اکیلی ہوں۔ مجھے پریشان نہ کرو۔ آ جاؤ۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے........."

اس کی آوازیں گونجتی تھیں۔ پھر اس کے پاس لوٹ آتی تھیں۔

صبح سے دوپہر اور دوپہر سے شام ہو گئی۔ سائے گہرے ہو کر سیاہی میں بدلنے لگے۔ اندھیرا پھیلا تو جنگل سائیں سائیں کرنے لگا۔ دور و نزدیک گیدڑوں کی "ہو......... او......... ہا........." دل میں دہشت بٹھانے لگی۔ اس نے دروازے اور کھڑکیوں کو اندر سے بند کر لیا۔ خوف کے مارے برا حال ہو رہا تھا۔ اس نے ایک کی بجائے دو دو موم بتیاں روشن کر دی تھیں تاکہ کمرے میں زیادہ سے زیادہ روشنی رہے۔ پھر بھی وہ پلنگ کے سرے پر سہمی سہمی سی بیٹھی رہی۔

بڑی دیر بعد جانی پہچانی غراہٹ سنائی دی۔ وہ دوڑتی ہوئی آئی اور دروازہ کھول کر بولی۔

"جنگلی کہیں کے۔ کہاں چلے گئے تھے؟"

وہ غراتا ہوا اندر چلا گیا۔ دروازہ بند ہو گیا۔ اندر سے روزینہ کی آواز آ رہی تھی۔

"میں صبح سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ تم تو ایسے غائب تھے جیسے گھر والی کے لئے محنت مزدوری کرنے گئے ہو۔ ٹھیک ہے' آج میں تمہیں روٹی نہیں دوں گی۔"

"ارے تم اس طرح گھور کر کیا دیکھ رہے ہو؟ آں۔ کک۔ کیا بات ہے۔ دور ہٹو۔ مم۔ میرے قریب نہ آؤ۔ نہیں' نہیں۔ سور۔ کمینہ.........."

تڑاخ۔ ایک طمانچہ.........

چیخ اور پھر چیخیں.........

جنگل کا سناٹا گونجنے لگا۔

"ہو۔ او۔ ہا.........." گیدڑوں کی آوازیں تھرا رہی تھیں۔ کہیں کہیں ایسا ہوتا ہے کہ جنگل باہر سے خاموش ہوتا ہے اور اندر سے بولتا ہے۔ بولتا ہے اور بپھرتا ہے جیسے سمندر کے اندر طوفان اور تہذیب کے اندر بربریت بولتی ہے۔ بندر کے زمانے میں بھی بولتی تھی آدمی کے دور میں بولتی ہے۔

پھر خاموشی چھا گئی۔

پھر دردناک سسکیوں سے ایک سرگوشی ابھرنے لگی۔

"جان! جان میرے جسم و جان کے مالک! ہائے تم کتنے اچھے ہو۔ میں تم سے کبھی بے وفائی نہیں کروں گی.........."

بابر تمام معاملات طے کرنے کے بعد واپس آ رہا تھا۔ دلال سے سودا ہو گیا تھا کہ وہ تین سو روپے لے کر بارڈر پار کرا دے گا۔ ڈاکٹر کی لیبارٹری میں میز کی دراز کے اندر اس ملک کی کافی کرنسی تھی جسے وہ یہاں سے برما کی سرحد تک کام میں لا سکتا تھا۔

وہ رات کے تین بجے کولپور سے ایک ٹیکسی میں چلا تھا۔ دو گھنٹے کے بعد ایک قصبے میں پہنچ کر اس نے ٹیکسی چھوڑ دی اور جنگل کا راستہ پکڑ لیا۔ راستے ہی میں صبح ہو گئی تھی۔ جب وہ نہر کے قریب پہنچا تو سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا اور نہر کی چمکتی جھلملاتی لہروں میں روزینہ کی ہنسی سنائی دے رہی تھی۔

اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ بہت دور نہر کے ایک موڑ پر جھاڑیوں کے پیچھے سے اس

کی مترنم آواز لہرا رہی تھی۔ وہ لکڑی کے پل سے گزر کر دوسرے کنارے پر آ گیا۔ وہ جس کا جادو سر چڑھ کر بولتا تھا اور جو کوہ ندا کی طرح دیوانے کو اور آگ کی طرح پروانے کو کشاں کشاں آنے پر مجبور کر دیتی تھی۔ اسی آواز کی جانب وہ بڑھتا چلا گیا۔

پھر نہر کے موڑ پر پہنچ کر اس کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ ڈاکٹر سے کھیل رہی تھی۔ ڈاکٹر نہر کے کنارے بیٹھا ہوا تھا اور وہ پانی لا کر اس پر ڈال رہی تھی۔ اس کے بدن کو رگڑ رگڑ کر صاف کر رہی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ بڑبڑاتی جا رہی تھی۔

"اب اگر گندے رہو گے تو کبھی اپنے پاس نہیں آنے دوں گی۔ تم بالکل ہی بندر نہیں ہو' سمجھے؟ آدمی ہو۔ آدمی بننے کی کوشش کرو.........."

ڈاکٹر اس کی بڑبڑاہٹ کو کیا خاک سمجھتا؟ اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑ لیا۔ وہ قہقہے لگاتی ہوئی اپنا ہاتھ اس سے چھڑانے لگی۔

"ڈاکٹر!" بابر کی گونجتی گرجتی ہوئی آواز میں روزینہ کے قہقہے گھٹ گئے۔

ڈاکٹر نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ پھر دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ روزینہ کے لئے کوئی چونکنے کا مقام نہیں تھا۔ وہ بڑی بے نیازی سے چلتی ہوئی دور ایک پتھر پر جا کر بیٹھ گئی۔ اس کا یہ انداز بتا رہا تھا کہ وہ محض طاقت کے زیر اثر رہنے والی لونڈی ہے۔ ان میں سے جو زور آور ہو گا' اسے چھین کر لے جائے گا۔

بابر نے آنکھیں سکیڑ کر روزینہ کو دیکھا۔ اس عورت سے اسے کوئی شکایت نہیں تھی۔ وہ شروع ہی سے یہ ثابت کرتی آئی تھی کہ وہ ایک آگ ہے جو ایک ہی ہتھیلی پر نہیں رہ سکتی۔ ہتھیلی جل جائے گی۔ ہاں' ایسا کوئی جیالا آتش بردار ہے جو اسے مٹھی میں رکھ سکے تو رکھ لے۔ اس نے کب انکار کیا ہے؟

بابر نے اس کی طرف سے پلٹ کر ڈاکٹر کو غراتے ہوئے دیکھا۔ وہ یہ سوچ کر جنگل میں آیا تھا کہ کچھ عرصہ رقیبوں سے دور رہے گا۔ مگر اس ویرانے میں بھی ایک رقیب پیدا ہو ہی گیا۔

رقیب۔ رقیب۔ اس نے دانت کچکچاتے ہوئے ڈاکٹر کے منہ پر ایک گھونسہ جڑ دیا۔ وہ ایسا ہاتھ تھا کہ مار کھانے والوں کو چھٹی کا دودھ یاد آ جاتا۔ مگر ڈاکٹر لڑکھڑا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ پھر غصے میں خوخیا کر اس نے قلابازی کھائی' دونوں ہاتھ زمین پر ٹیکے اور بابر کے سینے پر ایسی لات ماری کہ اس کے قدم اکھڑ گئے۔ وہ اچھل کر دھپ سے چاروں شانے چت ہو گیا۔ ڈاکٹر اپنی عادت کے مطابق اچھلتا ہوا اس پر آیا مگر بابر نے اسے ٹانگوں پر

رکھ کر دوسری طرف پھینک دیا۔

روزینہ بڑی خاموشی اور دلچسپی سے یہ جنگ دیکھ رہی تھی۔ ایک بڑے وزنی پتھر کو اٹھا کر پھینکنے والے ڈاکٹر نے کئی بار بابر کو ہاتھوں پر اٹھا کر پھینکنے کی کوشش کی تھی مگر وہ تڑپ کر اس کے ہاتھوں سے نکل جاتا تھا۔ ڈاکٹر طاقت کے بل پر لڑ رہا تھا اور بابر داؤ پیچ اور ذہانت سے مقابلہ کر رہا تھا۔ بڑی زبردست ٹکر تھی۔ کوئی بھی تھکنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

ڈاکٹر درندہ تھا۔ ایک گوریلے کی طرح طاقتور۔ اس کے مقابلہ پر کوئی دوسرا ہوتا تو اپنی جان بچا کر بھاگ جاتا۔ مگر وہ پاگل۔ ضدی بابر بڑی جی داری اور ثابت قدمی سے لڑ رہا تھا۔ اس کی ناک سے اور باچھوں سے خون بہہ رہا تھا۔ جسم پر کئی جگہ زبردست چوٹیں آئی تھیں۔ وہ ذرا دیر کے لئے رکتا تھا' سنبھلتا تھا' اس کے حملے سے بچتا تھا پھر جوابی حملہ کر دیتا تھا۔ مگر ڈاکٹر کے فولادی بدن پر خاک اثر نہیں ہوتا تھا۔

پھر ڈاکٹر لڑتے لڑتے بری طرح جھلا گیا۔ جھلانے کی بات ہی تھی۔ لڑائی تھی کہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ آخر وہ بندر اپنی خصلت پر آ گیا اور پتھر پھینک کر مارنے لگا۔ پہلے پتھر سے وہ بچ گیا لیکن دوسرا پتھر اس کے سر پر آ کر لگا اور وہ الٹ کر نہر کے پانی میں چلا گیا۔

"جان۔ جان!" روزینہ چیختی ہوئی دوڑی۔ "یہ کیا کر رہے ہو۔ بزدل۔ تم بزدل ہو میں بزدلوں سے نفرت کرتی ہوں۔ چلے جاؤ یہاں سے........."

وہ دونوں کے درمیان آ گئی۔ پہلے اس نے ڈاکٹر کے ہاتھ سے پتھر چھین کر ایک طرف پھینکا۔ پھر پلٹ کر بابر کی طرف جانے لگی۔ ڈاکٹر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔

"چھوڑو مجھے۔ بندر کے بچے! پتھر اور پہاڑ اٹھا کر پھینکنے سے آدمی دلیر نہیں کہلاتا دلیر میرا بابر ہے۔ میں اس کے قدموں میں رہوں گی۔ چھوڑو مجھے........."

وہ خود کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔

بابر نہر کے کنارے پر پڑا گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ اس کا تمام چہرہ لہو میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے تھرتھراتے ہوئے اپنے سر کو اٹھایا اور روزینہ کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"تم اس سے رحم کی بھیک مانگ کر آؤ گی تو میں تمہیں ٹھکرا دوں گا۔ میں مانگتا نہیں' چھین کر لیتا ہوں۔ میں۔ میں سمجھ گیا ہوں کہ صرف لوہا لوہے کو کاٹتا ہے میں بھی

اسے لوہے کی طرح کاٹوں گا........."

یہ کہہ کر اس نے زمین پر سر رکھ دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

روزینہ چیخ رہی تھی۔ اس کے لئے رو رہی تھی اور وہ بندر اسے دونوں بازوؤں میں اٹھا کر دونوں ٹانگوں پر اچھلتا جا رہا تھا۔

☆======☆======☆

وہ کاٹج میں قید ہو کر رہ گئی۔

ڈاکٹر بندر جان دن رات کاٹج کے آس پاس ایک پہرے دار کی طرح موجود رہتا تھا۔ اس میں اتنی سمجھ نہیں تھی کہ روزینہ کوئی سازش کرے گی یا اس کی عدم موجودگی میں کہیں بھاگ جائے گی۔ وہ محض اپنے دشمن سے محتاط تھا۔

چھیننے جھپٹنے اور چھینی ہوئی چیز کو دوسروں سے محفوظ رکھنے کا رواج بندروں کے دور سے چلا ہے اور سینہ بہ سینہ یہ رواج آدمی تک پہنچا ہے۔ وہ بندر بھی اپنے رواج کے مطابق پہرہ دے رہا تھا۔

دو ہفتے گزر گئے۔ روزینہ کو بابر کی خبر نہ ملی۔ وہ کاٹج سے باہر آتی تھی۔ دور دور تک دیکھتی تھی اور کبھی کبھی جنونی انداز میں چیختی تھی۔

"بابر۔ بابر۔ تم کہاں ہو۔ تم نہیں آؤ گے تو میں مر جاؤں گی بابر........."

اس کی آواز دور تک گونجتی چلی جاتی تھی اور جب اسے جواب نہ ملتا تو وہ روتی ہوئی کاٹج میں چلی جاتی تھی۔

تین ہفتوں کے بعد اسے ذرا صبر آ گیا کہ رونے اور چیخنے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ بابر ایک دن آئے گا اور ضرور آئے گا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ کتنا ضدی ہے۔ اسے بھی بزدلی سے نفرت ہے۔ وہ اس بندر کے بچے سے اسے چھین کر لے جائے گا۔

لیکن وہ کیسے چھین سکتا ہے؟

وہ دیو پیکر بندر انسانی قوت سے زیر نہیں ہو سکتا تھا۔ بابر نے اس پر کتنے ہی زبردست حملے کئے تھے مگر اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔ کسی چاقو یا ریوالور سے ہی اس کا خاتمہ ہو سکتا تھا لیکن کوئی ایسا چاقو وہاں موجود نہ تھا جو اس کے فولادی جسم میں اتر سکتا۔ ریوالور بھی ایسے درخت کی شاخ پر لٹک رہا تھا کہ وہ اسے تلاش نہیں کر سکتا تھا۔ درخت کے نیچے سے گزرتے ہوئے دیکھو تو بڑے بڑے پتوں کے درمیان چھپ جاتا تھا۔

روزینہ ہر پہلو سے سوچتی رہتی تھی کہ بابر اسے کس طرح چھین کر لے جائے گا؟

اگر وہ لاٹھی ڈنڈا لے کر آئے گا تو ڈاکٹر درختوں پر چڑھ کر کرتب دکھائے گا۔ ایک ہی راستہ تھا کہ بابر کوئی ہتھیار لے کر آئے اور اس کی غفلت میں حملہ کرے۔ اس کے ہاتھوں کا ایک ہی ڈنڈا کھانے کے بعد وہ درختوں پر چڑھنے کے قابل نہیں رہے گا لیکن وہ جانتی تھی کہ بابر کبھی بزدلوں کی طرح پیچھے سے حملہ نہیں کرے گا۔ ہمیشہ سامنے آکر للکارے گا۔

وہ سوچتے سوچتے تھک گئی۔

آگ نہیں جانتی' پروانہ جانتا ہے کہ اسے آگ تک کس طرح پہنچنا چاہئے۔

ایک ماہ گزر گیا۔ جنگل کی رات چاند کی چاندنی سے محروم ہو گئی۔ سیاہ بادلوں میں تارے بھی چھپ گئے۔ ہر سو گہری تاریکی چھا گئی تھی۔ ڈاکٹر کاٹیج میں آکر ہاتھ کے اشارے سے روزینہ کو بتا رہا تھا کہ بھوک لگی ہے۔ اسی وقت کمرے کے اندر کوئی چیز آکر دیوار سے ٹکرائی۔ ایک چھناکے کی آواز پیدا ہوئی اور ڈاکٹر اچھل کر دروازے پر آ گیا۔ اسے کسی خطرے کا احساس ہو گیا تھا۔ روزینہ کے دماغ میں بھی یہی بات آئی کہ اس کا جیالا محبوب آ گیا ہے۔ وہ دوڑتی ہوئی دروازے پر آئی۔ اس وقت تک ڈاکٹر غراتا ہوا تاریکی میں گم ہو گیا تھا۔

"بابر۔ تم کہاں ہو۔ اس سے بچ کر رہو۔ اس خبیث کو اندھیرے میں بھی تم نظر آتے رہو گے۔ بابر! ایک بار مجھے آواز دو۔ میں تمہاری آواز سننے کو ترس گئی ہوں۔"

بابر کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔ دور اندھیرے میں دو سائے ٹکرا گئے تھے۔ دروازے کے پاس کھڑی ہوئی روزینہ کو کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ صرف غرانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

دو سائے۔ دو بھوت اچھل رہے تھے' ٹکرا رہے تھے۔ قد اور جسامت میں دونوں ایک جیسے تھے۔ اس لئے سائے بھی ایک جیسے تھے۔ یہ جاننا مشکل تھا کہ کون کس پر حملے کر رہا ہے۔ کس کے قدم اکھڑ رہے ہیں۔ کون غالب آ رہا ہے۔

ایک سائے نے دوسرے سائے کو پچھاڑ دیا۔ دوسرا گرنے کے بعد ہی قلابازی کھا کر پھر کھڑا ہو گیا۔ کبھی قلابازیاں تھیں' کبھی اچھل کود کبھی ہاتھ چل رہے تھے اور کبھی ٹانگیں چل رہی تھیں۔

تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد ایک سایہ لڑکھڑانے لگا۔ اپنے مدمقابل سے کترانے لگا۔ غالب آنے والا اسے گھیر گھیر کر مار رہا تھا۔ پھر اس نے دونوں ہاتھوں میں اسے اٹھا لیا' اپنے سر سے بلند کر لیا جیسے وزنی پتھر کو اٹھایا کرتا تھا۔ پھر اس نے پوری قوت سے اسے

زمین پر پٹخ دیا۔

گرانے والے کے حلق سے دردناک کراہیں نکلنے لگیں۔ گرانے والا اس پر سوار ہو گیا اور اس کا گلا گھونٹنے لگا۔

شکار تڑپ رہا تھا۔ شکاری دبوچ رہا تھا۔

جنگل کی ہوائیں سسک رہی تھیں' درختوں کے پتے شور مچا رہے تھے اور گیدڑ ایسے چیخ رہے تھے جیسے تاریکی ماتم کر رہی ہو۔

ایک ختم ہو چکا تھا اور دوسرا گہری گہری سانسیں لے کر غرا رہا تھا اور اپنے حریف کی لاش کو ہلا جلا کر اس کے مرنے کا یقین کر رہا تھا۔

جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ مر چکا ہے تو وہ قلقاریاں مار کر خوشی کا اظہار کرنے لگا۔ اس کے بعد اس نے قلابازی کھائی اور اِدھر سے اُدھر لاش کے آس پاس اچھلنے لگا۔ اندھیرے میں یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی بھوت ناچ رہا ہو۔

پھر وہ چاروں ہاتھ پاؤں ٹیک کر کاٹیج کی طرف جھومتے ہوئے جانے لگا۔ ایسی شان سے جیسے کوئی فاتح میدان مار کر اپنی عزیز ترین چیز انعام کے طور پر حاصل کرنے جاتا ہے۔

روزینہ دروازے پر کھڑی اپنی قسمت کے فیصلے کا انتظار کر رہی تھی۔ اسی وقت اسے دور تاریکی میں ایک سایہ حرکت کرتا ہوا نظر آیا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی۔ کون ہے؟ کون آ رہا ہے؟ دو پاؤں سے چل کر آ رہا ہے یا چار سے؟

"چار پاؤں سے!" اس کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ وہ سایہ چار پاؤں سے اچھل اچھل کر آتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

"نہیں!" اس نے چیخ مار کر اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔ وہ ڈاکٹر کی صورت نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔

وہ کیا کرے؟ کہاں جائے؟ موم بتی ہی بجھا دینی چاہئے۔ تاریکی ہو گی تو اس خبیث کی صورت نظر نہیں آئے گی۔

وہ تیزی سے پلٹ کر کمرے میں آئی اور موم بتی کی جانب بڑھنے لگی۔ اسی وقت اس کی نظریں فرش پر گئیں۔ شیشے کی کرچیاں اِدھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں۔ بابر نے ایک بوتل کمرے میں پھینکی تھی۔ اس بوتل کے ایک بڑے ٹکڑے پر لیبل نظر آ رہا تھا۔ لیبل پر لکھا تھا۔

"انسانی منصوبہ بندی۔"

شیشے کے ٹکڑوں کے ساتھ سرخ دوا کو بھی بکھرنا تھا۔ مگر فرش پر وہ سرخ دوا نہیں تھی۔ وہ خالی بوتل تھی۔

دروازے پر آہٹ سن کر وہ بے اختیار پلٹ گئی۔ پھر آنے والے کو دیکھتے ہی دم بخود رہ گئی۔

آگ نہیں جانتی' پروانہ جانتا ہے کہ اسے آگ تک کس طرح پہنچنا چاہئے!!!

وہ چیخیں مارتی اور دوڑتی ہوئی آ کر اس سے لپٹ گئی اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ "ہائے یہ تم نے کیا کیا؟ تم میرے لئے کیا سے کیا بن گئے؟ ضدی۔ پاگل۔ دیوانے۔ ایسی دیوانگی کی مثال کوئی نہیں پیش کر سکے گا۔ کوئی نہیں............"

وہ روتی جا رہی تھی۔

اور بڑی محبت سے اور بڑی عقیدت سے اس کے جسم کے بھورے بالوں کو سہلاتی جا رہی تھی۔

☆======☆======☆

بہروپیا

اپنے فن میں یکتا ایک بہروپے کا حیرت انگیز قصہ۔
وہ جرم کی راہ پر چل نکلا تھا۔ پولیس والے
اس کے سامنے بے بس تھے۔
بہروپے نے ایک مجبور شخص سے اس کی زندگی
کا سودا کر لیا تھا...... پھر کیا ہوا؟
ایک انتہائی دلچسپ اور سنسنی خیز کہانی۔

وہ ایک باکمال بہروپیا تھا۔ میک اپ اور گٹ اپ کے بعد ایسے روپ بدل لیتا تھا کہ اسے پیدا کرنے والی ماں بھی نہیں پہچان پاتی تھی۔ پیدائشی طور پر وہ اکہرے بدن کا تھا۔ بالکل دھان پان سا نازک سا۔ کسی دوشیزہ کا بہروپ بدلتے وقت اس کے جسم کی نزاکت خوب رنگ لاتی تھی۔ وہ حسن و جمال کی منہ بولتی تصویر بن جاتا تھا۔ جب مرد کے لباس میں ہوتا تو لڑکیاں اس کے مردانہ حسن پر مرمٹنے کے لئے آمادہ ہو جاتیں اور جب کسی عورت کا سوانگ بھرتا تو مرد اس کے زنانہ پن پر ہزار جان سے عاشق ہو جاتے تھے۔

اس کی دوسری خوبی یہ تھی کہ وہ کسی بھی عورت یا مرد کے لہجے کی بڑی کامیابی سے نقل کر لیا کرتا تھا۔ آواز بدلنے میں اسے مہارت حاصل تھی۔ تیسری خوبی یہ تھی کہ کسی کے دستخط کو ایک بار دیکھنے کے بعد ہو بہو ویسے ہی دستخط کر دیتا تھا۔ اصل اور نقل کا فرق سمجھنا مشکل ہو جاتا تھا اپنی ان خطرناک صلاحیتوں کی بدولت وہ خوب دولت سمیٹ رہا تھا۔ کبھی بڑے بڑے مجرموں کا آلہ کار بن جاتا تھا اور کبھی پولیس والوں کا ساتھ دیتا تھا۔ جدھر سے زیادہ رقم ملتی تھی ادھر ہی لڑھک جاتا تھا۔

قانون کے محافظ پہلے اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ وہ مجرموں کے بھی کام آتا ہے۔ ایک بار ایک حسین دوشیزہ ایک بہت بڑے جیولر کے یہاں ہیروں کا قیمتی سیٹ خریدنے گئی۔ دکاندار نے کتنے ہی ڈیزائنوں کے سیٹ اس کے سامنے رکھ دیئے لیکن اس سے پہلے کہ وہ کسی ایک سیٹ کا انتخاب کرتی، اچانک ہی تین بدمعاش دکان میں داخل ہوئے، انہوں نے ریوالور دکھایا، سوا لاکھ کے ہیرے سمیٹے، اس دوشیزہ کو بھی اٹھا کر اپنی کار میں ڈالا پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہوا ہو گئے۔

پولیس کو شبہ ہوا کہ وہ بہروپیا ایک حسین دوشیزہ کے روپ میں جیولر کے پاس گیا ہو گا تاکہ زیورات پسند کرنے کے بہانے تمام سیٹ نکلوا کر شوکیس اور سیف کے باہر لے آئے۔ اس طرح مجرموں کو مال اڑا کر لے جانے میں آسانی ہو گئی تھی۔

اگر وہ واقعی دوشیزہ ہوتی، اس کا تعلق کسی دولت مند گھرانے سے ہوتا تو کسی نہ کسی

تھانے میں اس کی گمشدگی کی رپورٹ ضرور درج کرائی جاتی، مگر اس کا کوئی رشتے دار قانون کے دروازے پر دہائی دینے نہیں آیا تھا۔ ایک پولیس انسپکٹر نے بہروپئے کا محاسبہ کیا تو اس بہروپئے نے جواب دیا۔

"آپ کا شبہ بے بنیاد ہے جبکہ میں قانون کا ساتھ دیتا ہوں۔ آپ یوں بھی سوچ سکتے ہیں کہ وہ دوشیزہ مجرموں کا دل خوش کرنے کے بعد اپنے والدین کے پاس پہنچ گئی ہو گی۔ اس کے والدین نے ڈکیتی کے سلسلے میں برسوں عدالت کے چکر لگانے کی بجائے اپنی بیٹی کو کہیں چھپا دیا ہو گا۔ یا اسے دور دراز کے علاقے میں کسی رشتے دار کے پاس بھیج دیا ہو گا۔ ایسی بہت سی باتیں ہو سکتی ہیں۔ آپ خواہ مخواہ مجھ پر شبہ کر رہے ہیں۔"

مشکل یہ تھی کہ وہ کسی جرم کے پیچھے اپنا کوئی نشان، کوئی ثبوت یا اپنی کوئی پہچان نہیں چھوڑتا تھا۔ پھر ایک بار اس شہر کے ایک دولت مند نے بینک میں آ کر یہ شکایت کی کہ اس نے فلاں نمبر کے چیک پر کبھی ستر ہزار کی رقم نہیں لکھی تھی اور نہ ہی اس پر اپنے دستخط کئے تھے لیکن جب اسے وہ چیک دکھایا گیا تو اسے دیکھ کر اس نے حیرانی سے کہا۔

"بلاشبہ یہ دستخط میرے ہیں لیکن میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہ دستخط میرے ہاتھ کا نہیں ہے۔"

پولیس والے جانتے تھے کہ دستخط کی اتنی کامیاب نقل کرنے والا وہی ایک بہروپیا ہے۔ لہٰذا ایک بار وہ پھر اس کا محاسبہ کرنے کے لئے نکلے، لیکن اس بار وہ ہاتھ نہیں آیا۔ وہ ہزاروں لاکھوں روپے کا فراڈ کرنے والا دو کمروں کے چھوٹے سے مکان میں رہتا تھا۔ اس مکان میں سونے کے لئے ایک چارپائی تھی اور کپڑوں کا ایک چھوٹا سا سوٹ کیس۔ یہ چیزیں وہ چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ بھلا ان چیزوں کی اہمیت ہی کیا تھی۔ پولیس والے اس کی ظاہری حالت سے دھوکہ کھا گئے تھے۔ انہیں پہلے ہی سمجھ لینا چاہئے تھا کہ ایسے باصلاحیت لوگ کرائے کے مکان میں ایک کھاٹ پر زندگی نہیں گزارتے۔

وہ جس حلئے میں پولیس والوں کے کام آتا تھا۔ اس حلئے میں اس کی ایک تصویر پولیس کے ریکارڈ میں تھی۔ اس تصویر کی مختلف کاپیاں تمام پولیس اسٹیشنوں میں پہنچا دی گئیں۔ اخبارات میں بھی شائع کرائی گئیں کہ جو شخص اس آدمی کے متعلق اہم معلومات فراہم کرے گا۔ اسے دو ہزار روپے نقد انعام کے طور پر دیئے جائیں گے۔ ایک ہفتہ بعد ایک نوجوان ایسی ہی ایک تصویر اپنے گھر سے لے کر آیا۔ اس نے کہا

"انسپکٹر صاحب! یہ تصویر میرے باپ کی ہے۔ تیس برس پہلے جب وہ جوان تھے تو انہوں نے یہ تصویر اتروائی تھی۔ پانچ برس پہلے وہ مر چکے ہیں۔"

اس نوجوان نے جو معلومات فراہم کیں۔ اس سے تو یہی ثابت ہوتا تھا کہ بہروپیا پانچ برس پہلے مر چکا ہے لیکن بینک میں جعلی دستخط سے ستر ہزار کی رقم کیش کرانے کا واقعہ صرف دس دن پہلے ہوا تھا۔ آخر پولیس والے اس نتیجہ پر پہنچے کہ بہروپیا ایک ایسے شخص کے روپ میں دھوکہ دیتا رہا ہے جو تیس برس پہلے جوان تھا اور پانچ برس پہلے مر چکا تھا۔ یعنی جو تصویر تمام پولیس اسٹیشنوں میں بھیجی جا چکی تھی اور اخبارات میں شائع ہو چکی تھی' وہ ایک مُردے کی تصویر تھی۔

اس بہروپئے کا اصلی روپ کیا تھا؟ یہ پولیس والے نہیں جانتے تھے اسے اپنا آلہ کار بنانے والے ڈاکو لٹیرے بھی نہیں جانتے تھے۔ سب ہی کو اس کی تلاش تھی لیکن وہ ایسے غائب ہو چکا تھا جیسے ہمیشہ کے لئے اس دنیا سے نابود ہو گیا ہو۔ پولیس والے یہ سوچ کر خاموش بیٹھ گئے کہ چور چوری سے جاتا ہے' ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔ وہ کچھ عرصہ بعد ضرور کہیں واردات کرے گا اور اس سے ذرا بھی بھول چوک ہو گی تو پولیس کو از سر نو تفتیش کے لئے شاید اس کی کوئی کمزوری ہاتھ آ جائے گی۔

تقریباً چھ ماہ بعد ایک کروڑ پتی سیٹھ ہارون کی صاحبزادی کی شادی ہو رہی تھی' بیگم ہارون اپنی اکلوتی بیٹی کے لئے لاکھوں روپے کے ہیرے جواہرات سے مزین زیورات کے سیٹ خرید رہی تھیں اور انہیں اپنے بیڈ روم میں لا کر ایک آہنی سیف کے اندر حفاظت سے رکھ دیتی تھیں۔ آہنی سیف کی ایک چابی سیٹھ ہارون کے پاس اور دوسری چابی بیگم کے پاس رہتی تھی۔ اس سیف کو کھولتے وقت دونوں چابیوں کی موجودگی لازمی ہوتی تھی۔ شادی سے ایک دن پہلے بیگم ہارون نے اپنے شوہر سیٹھ ہارون کے کمرے میں آ کر کہا۔

"مجھے سیف کی دوسری چابی دیجئے' یاقوت کا وہ سیٹ جو پچاس ہزار کا ہے' میں اسے بدل کر جوہری کے پاس سے دوسرا نئے ڈیزائن کا سیٹ لے آؤں گی۔"

سیٹھ ہارون اپنے کمرے میں تنہا تھے انہوں نے چابی دینے کے بہانے ہاتھ بڑھایا۔ پھر بیگم کو کھینچ کر اپنی آغوش میں دبوچ لیا اور مسکراتے ہوئے کہا۔

"بیگم کل بیٹی دلہن بن کر رخصت ہو جائے گی۔ آؤ آج ہم اپنی شادی کی یاد تازہ کریں۔"

"اللہ آپ کو شرم نہیں آتی۔ گھر میں اتنے مہمان آئے ہوئے ہیں چھوڑیئے مجھے........."

وہ ان کی آغوش سے نکل گئیں۔ نکلتے نکلتے بھی سیٹھ ہارون نے ایک بوسہ لے لیا۔ وہ چابی چھین کر اپنے بیڈ روم میں چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد سیٹھ ہارون کو محسوس ہوا کہ انہوں نے بیگم کو نہیں بلکہ کسی دوسری ہستی کو آغوش میں لے کر چوما ہے۔ وہ اپنی بیگم کے ساتھ پچیس برس تک اتنی بار تنہائی کے لمحات گزار چکے تھے کہ ان کی گنتی نہیں کی جا سکتی تھی۔ وہ بیگم کے ہونٹوں کو اور ان کے بدن کے ایک ایک لمس کو ایک رٹے ہوئے سبق کی طرح یاد کر کے پہچان سکتے تھے۔

وہ تھوڑی دیر تک الجھے ہوئے ذہن سے اس تبدیلی کو سمجھنے کی کوشش کرتے رہے جو ابھی بیگم میں محسوس کی تھی' بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ تبدیلی تو محسوس ہوتی ہے' مگر سمجھ میں نہیں آتی' آخر انہوں نے فیصلہ کیا کہ بیگم کے بیڈ روم میں جا کر پھر انہیں اپنی آغوش میں لے کر اس تبدیلی کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ یہ سوچ کر وہ اپنے کمرے سے نکلنا چاہتے تھے کہ ان کی صاحبزادی اپنی سہیلیوں کے ساتھ شاپنگ کر کے واپس آ گئی اور اپنے ڈیڈی کو پکڑ کر اپنی پسند کی خریدی ہوئی تمام چیزیں دکھانے لگی۔

آدھ گھنٹے بعد انہیں فرصت ملی تو وہ اپنی بیگم کی خوابگاہ میں آئے بیگم غسل سے فارغ ہو کر بالکونی میں کھڑی دھوپ میں بال سکھا رہی تھیں۔ سیٹھ ہارون ان کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے خواب گاہ میں لائے پھر انہیں آغوش میں دبوچ لیا۔

"توبہ ہے۔" بیگم نے حیرانی سے پوچھا۔ "یہ آج آپ کو کیا ہو گیا ہے۔"

"تبدیلی ہو گئی ہے۔ کیا بڈھا جوان نہیں ہو سکتا۔"

"توبہ ہے۔ جوان بننے کے لئے یہی وقت ملا ہے۔ باہر جائیے میں غسل کر چکی ہوں۔"

"کون کمبخت تمہیں غسل خانہ تک پہنچانا چاہتا ہے۔ میں تو تبدیلی کو سمجھنے آیا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے جب میں نے تمہیں آغوش میں لے کر پیار....."

"مجھے پیار کیا۔ مجھے آغوش میں لیا........." وہ غصہ سے چیخ کر اپنے میاں کا گریبان پکڑتی ہوئی بولیں۔ "آپ نے کس حرامزادی کو آغوش میں لے کر پیار کیا تھا۔ بتائیے کون تھی وہ حرافہ........."

وہ بھی غصہ سے اپنا گریبان چھڑاتے ہوئے بولے۔ "تم چیختی کیوں ہو؟ ابھی آدھ

گھنٹہ پہلے تم میرے کمرے میں آئی تھیں۔ تم ادھر تھیں' میں ادھر تھا۔ تم نے یوں سیف کی چابی مانگی۔ میں نے یوں ہاتھ پکڑا۔ تم نے "اونہہ" کہا۔ میں نے "آہ" کی۔ پھر میں نے چٹاخ سے شرارت کی۔ تم ہائے کہتی ہوئی چابی لے کر یہاں بھاگ آئیں۔"

وہ پاؤں پٹختی ہوئی بولیں۔ "میں نے آپ سے سیف کی چابی نہیں لی ہے۔"

بیگم نے یہ کہہ کر آئرن سیف کی جانب دیکھا تو وہاں کی ہول میں ایک چابی لگی ہوئی تھی۔ وہ چابی سیٹھ ہارون کی تھی اور بیگم کی چابیوں کا گچھا قریب ہی ایک تپائی پر رکھا ہوا تھا۔

"میں نے اپنی چابیاں تکئے کے نیچے رکھ دی تھیں اور بیڈ روم کے دروازے کو بند کر دیا تھا۔ اس کے بعد غسل کرنے باتھ روم میں چلی گئی تھی۔"

سیٹھ ہارون نے سیف کو کھولتے ہوئے کہا۔ "چور بالکونی سے آیا ہو گا۔"

"آیا تو ہو گا۔ مگر وہ آپ کی آغوش میں کیسے پہنچ گیا تھا؟"

سیف کھلتے ہی بیگم چکرا کر گر پڑیں۔ کیونکہ تجوری کے اندر جھاڑو پھیر دی گئی تھی۔ وہاں چند اہم دستاویزات کے سوا سونے اور ہیرے جواہرات کا ایک بھی سیٹ نہ تھا۔ سیٹھ ہارون دوڑتے ہوئے بیڈ روم سے باہر آئے انہوں نے ملازموں سے پوچھا۔

"کیا بیگم کے کمرے سے نکل کر کوئی باہر گیا ہے؟"

ایک ملازم اور ملازمہ کا مشترکہ بیان تھا کہ پندرہ منٹ پہلے بیگم صاحبہ ایک اٹیچی لے کر باہر گئیں پھر اپنی کار میں بیٹھ کر کہیں چلی گئیں۔ سیٹھ ہارون کا سر بھی چکرا گیا کہ ایک بیگم تو اپنی خوابگاہ میں اپنی چھاتی پیٹ رہی ہیں' پندرہ منٹ پہلے وہ غسل خانہ میں تھیں۔ پھر وہ دوسری بیگم کون تھیں جو کار میں بیٹھ کر چلی گئیں؟ ویسے وہ دوسری بیگم اپنے ایک بوسے کا بہت مہنگا ذائقہ بتا کر گئی تھی۔

پھر پولیس کا عملہ اور انٹیلی جنس کے سراغرساں حرکت میں آ گئے۔ بیگم کی کار ایک پبلک پارک کے پاس مل گئی۔ مگر دوسری بیگم صاحبہ نہیں ملیں۔ کوئی نام و نشان ہوتا تو شاید وہ بہروپیا مل جاتا۔ اس کے بنیادی روپ کو اس کے ماں باپ نے دیکھا ہو گا۔ مگر اسے پیدا کرنے والے مجرم ماں باپ مر چکے تھے۔ پھر اس کی شناخت کون کر سکتا تھا؟ پولیس والوں کی زندگی میں پہلی بار ہی .... ایک ایسا مجرم آیا تھا' جس کا کوئی چہرہ نہیں تھا۔

ظاہر ہے کہ ہزار بھاگ دوڑ کے بعد بھی وہ ہاتھ نہیں آ سکتا تھا۔ ایک ذہین پولیس انسپکٹر نے تمام پچھلی وارداتوں کا تجزیہ کرنے کے بعد یہ رائے قائم کی کہ وہ بہروپیا کسی

عورت کے روپ میں زندگی گزار رہا ہے اور اس کی جسامت کے پیش نظر وہ عورت دبلی پتلی نازک اندام ہو گی۔ اس کا قد پانچ فٹ ہو گا اور اتنی دولت حاصل کرنے کے بعد وہ عورت نما مرد رئیسانہ زندگی گزار رہا ہو گا۔

پولیس انسپکٹر نے خاموشی سے یہ رائے قائم کی اور بڑی خاموشی سے ایسی امیر کبیر عورتوں کو تاڑتا رہا جو تنہا زندگی گزار رہی تھیں۔ کیونکہ وہ بہروپیا اس دنیا میں تنہا تھا۔ نہ کوئی اس کا رشتہ دار تھا اور نہ ہی وہ اپنے جرم میں کسی کو شریک کرتا تھا۔ پہلے دوسرے مجرموں کا آلہ کار بن جاتا تھا۔ اب وہ روش بھی چھوڑ دی تھی۔ اب ہر ڈکیتی کے بعد یہی ثابت ہوتا کہ وہ واردات کے دوران تنہا تھا۔ چھ ماہ کے بعد پولیس کے ایک سینئر آفیسر کو بذریعہ ڈاک ایک لفافہ ملا۔ اس کے اندر انگریزی میں ٹائپ کیا ہوا خط تھا۔ جس میں لکھا تھا۔

"آپ کیوں اپنا وقت ضائع کرتے ہیں اپنی زندگی میں تو میں گرفتار ہونے سے رہا۔ ہاں مرجانے کے بعد ہو سکتا ہے کہ میری لاش پر سے نقاب اٹھا کر کوئی میرا چہرہ دیکھ سکے۔ یہ خط اس لئے لکھ دیا کہ شاید پولیس والے اپنی احمقانہ کوششوں سے باز آ جائیں۔ آپ لوگوں کی ناکامیاں دیکھ کر دل کڑھتا ہے۔ فقط آپ کا ناشناس شناسا۔"

وہ خط پولیس والوں کے لئے زبردست چیلنج تھا۔ ایسا چیلنج جس کا وہ جواب نہیں دے سکتے تھے۔ بس وہ جھنجلا کر عہد کرتے تھے۔ قسمیں کھاتے تھے کہ اسے گرفتار کریں گے اور اس کی زندگی میں اسے بے نقاب کریں گے۔ ان حالات میں وہ بہروپیا ہر جگہ ہر طبقے میں گفتگو کا موضوع بن گیا۔ سب ہی اس وقت کے منتظر تھے کہ دیکھیں کب وہ بے نقاب ہوتا ہے' اپنی زندگی میں یا اپنی موت کے بعد۔

☆======☆======☆

موسم سرما کی ایک کہر آلود رات تھی۔ ایک خوبرو نوجوان اس سرد اندھیری رات میں بھٹکتا ہوا سمندر کے ساحل پر آ گیا۔ اس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ کئی وقت کے فاقے کر چکا ہے۔ سمندر کے ساحل پر دور تک کاٹج بنے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک کاٹج بہت شکستہ اور ویران تھا۔ اس کی ویرانی بتا رہی تھی کہ اب کوئی دولت مند وہاں اپنی محبوبہ یا داشتہ کے ساتھ وقت گزارنے نہیں آتا ہے۔ جب امیروں کی عشرت گاہیں کھنڈر بن جاتی ہیں تو وہ غریبوں کی پناہ گاہیں بن جاتی ہیں۔

وہ غریب مفلوک الحال' فاقہ زدہ نوجوان اس کھنڈر میں آ گیا' بانس کے ٹکڑوں سے بنی ہوئی دیواریں جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھیں۔ ایک پرانا سا پلنگ اور دو کرسیاں رکھی ہوئی تھیں' جن پر سمندر کی ریت پھیلی ہوئی تھی فرش پر پھلوں کے چھلکے پڑے ہوئے تھے۔ ایک گوشے میں ایک کدال اور ایک موٹی سی' لانبی سی رسی پڑی ہوئی تھی۔ نوجوان نے آگے بڑھ کر رسی کو اٹھا لیا۔ پھر چھت کی طرف دیکھنے لگا چھت کے درمیان سے گزرنے والی شہتیر بہت مضبوط تھی۔ وہ تصور کی آنکھوں سے دیکھنے لگا۔ چھت کی شہتیر سے پھانسی کا پھندہ لٹک رہا ہے اور اس پھندے میں اس کی گردن پھنسی ہوئی ہے۔ اب نہ اس کے ساتھ فاقے ہیں نہ زندگی کے طمانچے ہیں۔ نہ اب وہ زمین پر ہے نہ آسمان پر۔ بلکہ آرام سے زمین و آسمان کے بیچ لٹک رہا ہے۔

آہ بس یہی ایک نجات کا راستہ رہ گیا ہے۔ اس نے حسرت سے سوچا پھر پلنگ کو کھینچ کر شہتیر کے نیچے لے آیا۔ فاقے اور نقاہت کے باعث پلنگ کو تھوڑی دور تک کھینچتے ہی وہ بے دم ہو کر گر پڑا تھا۔ اس طرح وہ اپنی زندگی میں ہر قدم پر گرتا آیا تھا۔ بس یہ آخری تھکن تھی۔ اس کے بعد موت کی گود میں سکون مل جاتا۔ وہ ہمت سے کام لے کر پھر اٹھ گیا۔ اس نے ایک کرسی اٹھا کر پلنگ پر رکھی۔ اس طرح وہ رسی لے کر چھت کی شہتیر تک پہنچ گیا۔ پھر رسی کے سرے کو مضبوطی سے باندھنے لگا۔ تھوڑی دیر کی کوشش کے بعد پھانسی کا پھندہ تیار ہو گیا۔

اس نے پلنگ کو پھر دور ہٹا دیا۔ کیونکہ اب پھندے تک پہنچنے کے لئے صرف ایک کرسی کی ضرورت تھی۔ وہ کرسی پر چڑھ کر حسرت سے چاروں طرف یوں تکنے لگا جیسے آخری بار اس دنیا کو دیکھ رہا ہو۔ اس کی نگاہوں کے سامنے کاٹیج کے ایک کونے میں کدال رکھی ہوئی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں کہا۔

"کدال موجود ہے۔ مگر میں اتنا بدنصیب ہوں کہ شاید یہاں کوئی میری قبر کھودنے نہیں آئے گا۔"

اس نے پھندے کو اپنے گلے میں ڈال لیا اور اس پھندے کو کسنے کے بعد وہ کرسی کو لات مار کر گرا دیتا پھر ہمیشہ کے لئے چھٹی ہو جاتی۔ مگر چھٹی نہ ہو سکی۔ پیچھے سے سریلی آواز سنائی دی۔

"اب تم مر چکے ہو۔ چلو نیچے اتر آؤ۔"

اس نے چونک کر آواز کی سمت دیکھا۔ کاٹیج کی ٹوٹی ہوئی دیواروں سے ؟

روشنی اندر آ رہی تھی اور چاندنی کی دھند میں لپٹی ہوئی ایک حسینہ اس کے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔ وہ رس بھری آواز میں کہہ رہی تھی۔

"میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ چلو نیچے آ جاؤ۔ ایک مرد کو خود کشی زیب نہیں دیتی۔"

اس نے پھندے کو گلے سے نکال لیا۔ پھر کرسی سے اتر کر اس حسینہ دوشیزہ کو سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے بولا۔

"تم میری مردانگی کی بات نہ کرو۔ جب زندگی سے زیادہ موت خوبصورت نظر آتی ہے' تبھی انسان اسے گلے لگاتا ہے۔ زندگی ٹھوکریں' آنسو اور اضطراب دیتی ہے۔ موت ایک ہی بار ہمیشہ کے لئے سکون پہنچا دیتی ہے۔"

"ہوں۔" دوشیزہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں سمجھ گئی' زندگی نے تمہیں ہر قدم پر جوتے لگائے ہیں اور اب تم مر کر ہی دکھاؤ گے۔"

"ہاں! میں ضرور مروں گا۔"

"تو پھر سمجھ لو کہ تم مر چکے ہو۔"

"وہ کیسے؟" اس نے حیرانی سے پوچھا۔ "میں تو ابھی زندہ ہوں۔"

"نہیں اب سے چند لمحے پہلے تم نے پھانسی کا پھندہ گلے میں ڈال لیا تھا کرسی کو لات مار کر ایک طرف گرا دیا تھا اور اس پھندے سے لٹک کر تڑپ تڑپ کر مر گئے تھے۔ تمہاری خود کشی کا یہ تصور مکمل ہو چکا ہے۔ اب جو آئندہ کی زندگی ہے۔ اسے میرے ہاتھ فروخت کر دو۔"

"فروخت کر دوں (میں سمجھا نہیں۔"

"میں کوئی ناقابل فہم بات نہیں کر رہی ہوں۔ اس خود کشی کے فیصلے کے بعد تمہاری جو زندگی باقی رہ گئی ہے اسے میں خریدنا چاہتی ہوں۔ تم قیمت بتاؤ میں ابھی ادا کروں گی۔"

وہ چند لمحوں تک حیرانی سے اسے دیکھتا رہا۔ اب تک کسی نے اس کی تعلیم کی اور صلاحیتوں کی قیمت ادا نہیں کی تھی اور وہ حسین دوشیزہ اس کی بولی لگا رہی تھی۔ اس نے ناگواری سے پوچھا۔

"کیا تم میری مفلسی اور بے بسی کا مذاق اڑانے آئی ہو؟"

"مجھے غلط نہ سمجھو۔ میں تمہیں زندگی دینے آئی ہوں۔"

"مگر تم کون ہو؟ اور میرے پیچھے کہاں سے آ رہی ہو؟"

دوشیزہ نے دور ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

"میں ادھر دور ساحلی ریسٹورنٹ کے سامنے اپنی کار میں بیٹھی ہوئی تھی۔ وہاں میں نے تمہیں دیکھا۔ تم گرماگرم سیخ کبابوں کی طرف بھوکی نظروں سے دیکھ رہے تھے' سیخ کباب والے نے تمہیں دھتکار کر بھگایا تو تم میری کار کے قریب سے بڑبڑاتے ہوئے گزرے کہ اب ذلت آمیز زندگی برداشت نہیں کرو گے اور ابھی کہیں جا کر اپنی جان دے دو گے میں اسی جگہ سے تمہارا پیچھا کرتی آ رہی ہوں۔ یہ دیکھو میرے ہینڈ بیگ میں تمہارے لئے سیخ کباب اور روٹیوں کا بنڈل ہے۔"

اس نے اپنا ہینڈ بیگ کھول کر کاغذ میں لپٹا ہوا روٹیوں کا چھوٹا سا بنڈل نکالا۔ بھوکے نے فوراً ہی ہاتھ بڑھایا۔ دوشیزہ نے اپنا ہاتھ کھینچ کر کہا۔

"نہیں۔ پہلے اپنی زندگی کا سودا کرو۔"

"کیسے کروں؟ تم میری بقیہ زندگی لے کر کیا کرو گی؟"

دوشیزہ نے روٹیوں کا بنڈل اس کی آنکھوں کے سامنے نچاتے ہوئے کہا۔

"اپنی کوئی چیز فروخت کرنے کے بعد فروخت کرنے والے کو یہ پوچھنے کا حق نہیں ہوتا کہ اس چیز کا کیا حشر ہو گا۔ اگر سودا منظور ہو تو اپنی زندگی کی قیمت لگاؤ۔"

جب بھوکے کو فوراً ہی روٹیاں نہ مل سکیں تو اس نے تھوک نگل کر پیٹ بھرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"صرف اپنی بھوک مٹانے کی بات ہوتی تو میں تین وقت کی روٹیوں کے بدلے اپنے آپ کو تمہارے حوالے کر دیتا۔ مگر میں اس ندامت سے خودکشی کرنے والا تھا کہ اپنی جوان بہن کو سہاگن نہیں بنا سکتا اور اپنی بیمار ماں کی ایک دن کی بھی دوا خرید کر نہیں لا سکتا۔"

"تمہاری ماں اور بہن کہاں ہیں؟"

"یہاں سے چھ سو میل دور حسن آباد میں رہتی ہیں۔ وہ روز ڈاکئے سے پوچھتی ہوں گی کہ میرے پاس سے کوئی منی آرڈر آیا ہے یا نہیں۔"

"اب نہیں پوچھیں گی۔ میں تمہاری بہن کی شادی کے لئے دس ہزار روپے دوں گی۔"

"دس ہزار روپے؟" اس نے شدید حیرانی سے چیخ کر کہا۔ "دیکھو' دیکھو زندگی نے میرا بہت مذاق اڑایا ہے۔ اب تم میرا مذاق نہ اڑاؤ۔ اتنی بڑی رقم کوئی کسی کو یونہی نہیں دے دیتا۔"

"میں یونہی تو نہیں دے رہی ہوں۔ تم سے تمہاری باقی زندگی لے رہی ہوں اور تمہاری ضرورتیں پوری کر رہی ہوں۔"

"مگر۔ مگر میں کیسے یقین کروں؟"

"جب تم یہ روٹیاں کھا لو گے۔ یعنی میرا نمک کھا لو گے اور میرے گھر چل کر اپنی زندگی کی قیمت وصول کر لو گے تو تمہیں یقین آ جائے گا۔ اس کے بعد بھی میں تمہیں اتنے پیسے دوں گی کہ تم اپنی ماں کا علاج کسی بڑے ہسپتال میں کرا سکو گے۔"

"بس تو پھر مجھے کچھ نہیں چاہئے۔ میں اپنی زندگی تمہارے نام کرتا ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے کھانے کا بنڈل جھپٹ لیا۔ پھر اسے کھول کر روٹیوں اور سیخ کباب کے بڑے بڑے لقمے بنا کر جلدی جلدی منہ میں ٹھونسنے لگا۔ دوشیزہ نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں نے کار میں بیٹھ کر اندازہ لگا لیا تھا کہ تمہارا قد میرے برابر ہے۔"

نوجوان نے ایک بڑے سے لقمے کو بڑی مشکل سے نگلتے ہوئے کہا۔

"میرا قد پانچ فٹ نصف انچ ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔" دوشیزہ نے کہا۔ "میرا قد پانچ فٹ ہے نصف انچ سے کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔"

"تمہیں میرے قد سے کیا لینا ہے؟"

"تم پھر سوال کر رہے ہو۔ بکنے کے بعد تمہیں سوال کرنے کا حق نہیں ہے۔"

"میں بھول گیا تھا۔ آئندہ کبھی کوئی سوال نہیں کروں گا۔"

دوشیزہ نے آگے بڑھ کر اس کے بازوؤں کو ٹٹولا' پھر اس کے جسم کے دوسرے حصوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

"تم میری طرح دبلے پتلے ہو۔ بس ذرا یہ جسم ٹھوس ہے۔ آخر مرد ہو نا ویسے بعض دبلی پتلی عورتوں کے بدن میں بھی ایسی سختی ہوتی ہے۔ بہرحال کام چل جائے گا۔"

"تم ایک قصائی کی طرح بکرا سمجھ کر مجھے ٹٹول رہی ہو۔ مگر میں کچھ نہیں پوچھوں گا۔"

"تم خود کو بکرا ہی سمجھو' کیونکہ تم موت کی چھری تلے آنے سے نہیں ڈرتے۔ ابھی مرنے جا رہے تھے۔ آئندہ جس دن' جس گھڑی میں تمہیں مرنے کے لئے کہوں گی تو کیا تم انکار کرو گے؟"

"کبھی نہیں۔ میں کسی وقت بھی تمہارے ایک اشارے پر جان دے دوں گا۔"

"شاباش، مجھے تمہارے ہی جیسے جانباز کی ضرورت تھی، تم مل گئے، تمہارا نام کیا ہے؟"

"میرا نام جمشید ہے۔ اب مجھے پیاس لگ رہی ہے۔"

"میرے ساتھ چلو۔" وہ ساحل کی سمت بڑھتی ہوئی بولی۔ "میرا نام شازیہ ہے دو برس پہلے میں نے جو شناختی کارڈ بنوایا تھا۔ اس میں میرا نام شازیہ عباس لکھا ہوا ہے، لہٰذا آج سے تمہارا نام عباس ہے اور تم میرے مرحوم شوہر ہو۔"

"مرحوم شوہر؟" وہ سوال تو نہ کر سکا۔ مگر بڑبڑا کر رہ گیا۔

"ہاں، میں ایک نوجوان بیوہ ہوں۔ عباس نام کا ایک شخص مر چکا ہے۔ تم بھی ایک دن مرحوم بن جاؤ گے۔"

وہ ایک سرد آہ بھر کر رہ گیا۔ شازیہ نے کہا۔

"تمہاری سرد آہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تمہیں پھر زندگی سے محبت ہو چلی ہے۔"

"ہاں،جب زندگی کی تمام ضرورتیں پوری ہونے لگتی ہیں تو موت بڑی بھیانک اور بدصورت دکھائی دیتی ہے لیکن اپنی ماں اور بہن کے لئے جو قربانی کا جذبہ ہے میں اس جذبہ کے تحت تمہارے ایک ہی اشارے پر جان دے دوں گا۔"

"اچھی بات ہے، میں تم پر بھروسہ کر رہی ہوں۔ مگر یہ بات اچھی طرح یاد رکھنا کہ تم مجھے کبھی دھوکہ نہیں دے سکو گے۔ اگر تم نے اپنی ماں اور بہن سے بھی اس معاہدے کا ذکر کیا یا مرنے سے انکار کیا یا پولیس والوں تک پہنچنے کی کوشش کی تو تمہیں جواباً........ اپنی ماں اور بہن کی لاشیں ملیں گی۔"

"تم مجھے دھمکی نہ دو، میں اپنے وعدہ کا پابند رہوں گا۔"

وہ دونوں ساحل پر پہنچ کر کار میں بیٹھ گئے۔ پھر شازیہ اسے ایک چھوٹی سی کوٹھی میں لے آئی۔ وہاں پہنچ کر اس نے کہا۔

"باتھ روم میں شیو بنانے کا سامان ہے۔ اس الماری میں مردانہ کپڑے رکھے ہوئے ہیں باتھ روم میں تمہیں گرم اور ٹھنڈا دونوں قسم کا پانی مل جائے گا۔ جاؤ اپنا حلیہ بدل کر آؤ۔"

اس نے الماری کھول کر دیکھا تو بہت سے مردانہ لباس رکھے ہوئے تھے۔ اس نے ایک جوڑا نکالتے ہوئے پوچھا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ تم مردانہ لباس بھی پہنتی ہو؟"

"ہاں! ہمارے قد میں صرف آدھ انچ کا فرق ہے۔ اب یہ تمام لباس تم پہنا کرو گے۔ آدھ انچ سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

وہ لباس اٹھا کر باتھ روم میں چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد شازیہ ایک ایزی چیئر پر بیٹھ کر سوچنے لگی۔ بلکہ اب یوں کہنا چاہئے کہ وہ بہروپیا سوچنے لگا۔

"میں کل صبح جمشید عرف عباس کو کچھ رقم دے کر ماں باپ کے پاس بھیج دوں گا اور کسی دوسرے روپ میں اس کا پیچھا کروں گا۔ اس طرح میں اس شہر کی پولیس سے کچھ عرصے کے لئے دور چلا جاؤں گا۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ اس شہر میں تنہا زندگی گزارنے والوں کی فہرست میں میرا نام بھی آ چکا ہے۔ پولیس والے کسی دن بھی یہاں پوچھ گچھ کے لئے آ سکتے ہیں۔

اس لئے اس کوٹھی کو کچھ دنوں کے لئے لاک کر دینا بہتر ہے جب جمشید اپنی بہن کی شادی کر دے گا تو میں اسے شوہر کی حیثیت سے اور اس کی ماں کو ساس کی حیثیت سے یہاں لے آؤں گا۔ پھر پولیس والے میرا محاسبہ نہیں کریں گے۔"

وہ ایک سگریٹ سلگانے کے بعد کش لگاتے ہوئے سوچتا چلا گیا۔

"سیٹھ ہارون کے یہاں سے میں نے تین لاکھ کے زیورات اور ہیرے جواہرات اڑائے تھے، آئندہ جہاں واردات کروں گا وہاں جمشید کو ایک عورت کے میک اپ میں سامنے رکھوں گا۔ پھر کوئی ایسی چال چلوں گا کہ وہ پولیس مقابلے میں مارا جائے۔ واردات سے پہلے میں شازیہ عباس کا شناختی کارڈ اس کی جیب میں رکھ دوں گا۔ تاکہ پولیس والے مطمئن ہو جائیں کہ انہوں نے اس بہروپئے کو ختم کر دیا ہے جو شازیہ عباس کے نام سے زندگی گزار رہا تھا۔ پولیس والوں کی فہرست سے نکل جانے کے بعد میں اطمینان سے اس وقت تک شریفانہ زندگی گزاروں گا، جب تک میری موجودہ دولت ساتھ دیتی رہے گی۔ اس کے بعد دیکھا جائے گا۔"

جمشید باتھ روم سے باہر آیا تو وہ بالکل ہی بدل چکا تھا۔ بہروپیا بھی دوبارہ شازیہ بن گیا۔ شازیہ اسے دیکھ کر حیرت اور مسرت سے بولی۔

"ونڈر فل۔ تم تو میری توقع سے زیادہ خوبصورت نکلے۔ قدرتی طور پر بعض مردوں کو زنانہ خوبصورتی ملتی ہے۔ تمہارے چہرے پر بھی زنانہ حسن ہے۔ اب میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ جب تک تم میرے دوست اور ہمراز بن کر رہو گے اس وقت تک میں

تمہیں زندہ رکھوں گی۔"

"میں تمہارا ہمراز بن کر رہوں گا۔ تم کسی موقع پر بھی مجھے آزما سکتی ہو۔"

شازیہ نے ہینڈ بیگ سے چابیوں کا ایک گچھا نکال کر اس کی طرف اچھال کر کہا۔

"وہ آہنی سیف کھول کر دس ہزار روپے نکال لو۔"

وہ چابیاں لے کر سیف کے پاس گیا۔ جب اس سیف کو کھول کر دیکھا تو اس کی آنکھیں حیرت سے کھل گئیں۔ اتنی دولت اس کے باپ نے بھی کبھی نہیں دیکھی تھی۔ چند لمحوں تک تجوری کے سامنے ساکت کھڑا رہا۔ نوٹوں کی گڈیاں تھیں۔ سونے کے زیورات تھے' ہیرے جواہرات کی چمک اس کی آنکھوں میں اتر رہی تھی۔ شازیہ کی آواز سنائی دی۔

"وہاں ہر گڈی دس ہزار روپے کی ہے ایک گڈی اٹھالو۔"

اس نے ایک گڈی اٹھا کر تجوری بند کر دی۔ پھر چابیاں واپس کرتے ہوئے بولا۔

"اتنی دولت تم نے کہاں سے حاصل کی ہے؟"

"چوری' دھوکے اور فریب سے۔"

وہ اس کے سامنے ایک صوفہ پر بیٹھ کر تھکے ہوئے انداز میں بولا۔

"میں نے بے روزگاری سے تنگ آ کر ایک بار چوری کرنے کی کوشش کی۔ مگر چوری کرنے سے پہلے ہی پکڑا گیا۔"

"دنیا میں ہر کام کرنے کے لئے ذہانت کی ضرورت پڑتی ہے۔ میں تمہیں چوری کرنے کے گر سکھاؤں گی۔ اگر تم سیکھ جاؤ گے تو مال غنیمت میں سے آدھا حصہ تمہیں ملا کرے گا۔"

جمشید اب شازیہ کے حسن اور اس کے بناسپتی شباب کو گہری دلچسپی سے دیکھنے لگا۔ کیونکہ اب اس کا پیٹ بھر چکا تھا۔ ہاتھ میں دس ہزار کی رقم بھی آ گئی تھی۔ ایسے وقت عورت کی بھوک شدت سے لگتی ہے۔ شازیہ نے کہا۔

"مجھے بھوکی نظروں سے نہ دیکھو۔ میں ہاتھی کا دانت ہوں۔ صرف دکھاوے کے لئے' کھانے کے لئے نہیں.........."

"تم کہہ رہی تھیں کہ ہم میاں بیوی بن کر رہیں گے۔"

"ہاں صرف دنیا والوں کو دکھانے کے لئے اس گھر کی چار دیواری میں تم کبھی مجھے ہاتھ نہیں لگاؤ گے۔"

"تم اتنی مہربانیوں کے بعد سنگدل بن رہی ہو۔"

"بکواس مت کرو۔ اب جا کر سو جاؤ۔ کل اپنی ماں کے پاس چلے جانا وہاں جتنی جلدی ہو سکے اپنی بہن کی شادی کر دینا اور اپنی ماں کو بتا دینا کہ تم مجھ سے شادی کر چکے ہو۔"

یہ کہنے کے بعد وہ وہاں سے اٹھ کر اپنے بیڈ روم میں جانے لگی۔ پھر دروازے کے پاس ٹھہر کر اس نے چابیوں کے گچھے میں سے سیف کی دونوں چابیاں نکال کر اپنے پاس رکھ لیں۔ پھر چابیوں کا گچھا زمین پر اس کی طرف پھینکتی ہوئی بولی۔

"یہ اس کوٹھی کے تمام دروازوں کی چابیاں ہیں۔ کل تم یہاں سے جاتے وقت کوٹھی کو لاک کر کے چلے جانا۔"

"کیا تم یہاں نہیں رہو گی؟"

"نہیں میں تھوڑی دیر بعد یہاں سے چلی جاؤں گی۔ یہ ساتھ والا کمرہ میری خوابگاہ ہے۔ یہ ہمیشہ مقفل رہتا ہے۔ اگر یہ کبھی کھلا رہے تب بھی اس کمرے میں نہ جھانکنا۔ اس کمرے کو چھوڑ کر تم پوری کوٹھی کے مالک ہو۔"

یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ جمشید چابیوں کا گچھا فرش سے اٹھا کر بستر پر لیٹ گیا' اس کے دماغ میں کتنی ہی چیزیں گڈ مڈ ہو گئی تھیں۔ کبھی کھلی ہوئی تجوری کی دولت سامنے آتی تھی' کبھی شازیہ کی توبہ شکن جوانی للچاتی تھی۔ پھر اس کے ذہن میں ایک سوال پیدا ہوتا۔

"کیا اس تنہا لڑکی نے اتنی دولت حاصل کی ہے؟ اس کا کوئی نہ کوئی ساتھی تو ضرور ہو گا لیکن یہ تنہا نظر آ رہی ہے۔ اگر میں چاہوں تو اس کوٹھی میں اسے ہمیشہ کی نیند سلا دوں۔ پھر یہ ساری دولت میری ہو جائے گی۔"

اس کی نیت خراب ہو رہی تھی۔ اس کا دماغ اسے سمجھا رہا تھا کہ دولت مند بننے کا اس سے بہتر موقع ہاتھ نہیں آئے گا۔ بس ذرا سی محنت کی ضرورت ہے پاس والے کمرے میں جا کر صرف اس پر قابو پانا اور اس کی گردن دبوچ کر اسے راستے سے ہٹا دینا ہے۔ مگر سوچنے اور کر گزرنے میں بڑا فرق ہوتا ہے جب عمل کا وقت آتا ہے تو چاروں طرف سے طرح طرح کے اندیشے گھیر لیتے ہیں۔ وہ پھر سوچنے لگا۔

"چوری ڈکیتی سے دولت حاصل کرنے والی یہ لڑکی اتنی احمق نہیں ہو سکتی کہ پہلی ہی ملاقات میں مجھ پر اس قدر بھروسہ کر لے۔ مجھے دس ہزار روپے اٹھا کر یونہی دے دے اور اس خزانے سے بھری ہوئی تجوری کے سامنے چھوڑ کر اطمینان سے چلی جائے۔ اس

نے اپنی اور اپنی دولت کی حفاظت کا پورا انتظام کر رکھا ہو گا۔ اگر میں کوئی غلط حرکت کروں گا تو یہ دس ہزار روپے بھی ہاتھ سے نکل جائیں گے۔ پھر وہی فاقے ہوں گے اور دنیا بھر کی مصیبتیں اور ذلتیں اٹھانی پڑیں گی۔"

جب کوئی شخص کسی بڑی واردات کی جرأت نہیں کر سکتا اور آنے والی مصیبتوں سے گھبرا جاتا ہے تو اس وقت شرافت سے سوچنے لگتا ہے۔ وہ بھی پٹڑی بدل کر سوچنے لگا۔

"مجھے شازیہ کا احسان مند رہنا چاہئے۔ میں اس کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچاؤں گا۔ آج اس نے دس ہزار دیئے ہیں کل میری ایمانداری سے خوش ہو کر کچھ اور زیادہ دے گی۔ پھر اس کے ساتھ رہتے رہتے میں بھی دولت حاصل کرنے کے بہت سے ہتھکنڈے سیکھ جاؤں گا۔"

وہ شازیہ کے ساتھ ایماندار رہنے کی باتیں سوچ کر اطمینان سے سو گیا۔ دوسری صبح اٹھ کر اس نے پاس والے دروازے پر دستک دی۔ مگر کوئی جواب سنائی نہیں دیا۔ اس نے دروازے کو کھولنے کی کوشش کی تو پتہ چلا کہ وہ مقفل ہے پھر اس نے تمام کوٹھی میں اسے تلاش کیا مگر وہ نظر نہیں آئی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ صبح ہونے سے پہلے ہی کوٹھی چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ اب وہ اس کوٹھی میں تنہا تھا۔ تقدیر مہربان ہو گئی تھی۔ ایسی مہربان دوشیزہ ملی تھی کہ اسے پوری کوٹھی کا مالک بنا کر چلی گئی تھی وہ جو کمرے میں خزانے سے بھری ہوئی تجوری رکھی تھی اس کا بھی وہی مالک تھا۔ بس اتنی سی کمی تھی کہ اس تجوری کو کھول نہیں سکتا تھا۔ تجوری کے باہر بیٹھ کر صرف اس دولت کا حساب کر سکتا تھا۔ فی الحال اس نے دس ہزار روپے لے کر اس کوٹھی کو لاک کیا اور اپنی ماں اور بہن کو یہ خوشخبری سنانے کے لئے وہاں سے روانہ ہو گیا کہ اب وہ دولت والا اور بیوی والا ہو گیا ہے۔

☆======☆======☆

پہلے اس کے پاس ریل گاڑی کا کرایہ نہیں ہوتا تھا۔ اب وہ ہوائی جہاز میں سفر کر سکتا تھا۔ جب وہ ائیرپورٹ پہنچا تو بکنگ کاؤنٹر پر ایک نوجوان سے ملاقات ہو گئی۔ وہ بھی حسن آباد جا رہا تھا۔ جمشید ہمیشہ سے الگ تھلگ رہنے کا عادی تھا۔ مگر وہ نوجوان دوسروں کو دوست بنانے کا فن جانتا تھا۔ اس نے خود ہی اپنا تعارف کرایا۔

"میرا نام شاہد عباس ہے اور آپ کا نام میں کاؤنٹر پر سن چکا ہوں۔ یعنی آپ کا نام جمشید عباس ہے۔ بھئی خوب اتفاق ہے ہم دونوں کے نام میں عباس مشترک ہے۔ چلئے

ٹھیک ہے جب ہم نام ہیں تو سفر کے دوران ہم کلام بھی ہوتے رہیں گے۔"

اس کی باتیں سن کر جمشید کو بڑی اپنائیت سی محسوس ہوئی۔ وہ بے تکان بولے جا رہا تھا۔

"جمشید صاحب! جہاز دو بجے روانہ ہو گا۔ یعنی ابھی چار گھنٹے باقی ہیں۔ کیوں نہ آپ میرے ساتھ میرے گھر چلیں۔ ہم اطمینان سے لنچ کریں گے پھر فلائٹ کے وقت یہاں آ جائیں گے۔"

جمشید نے کہا۔ "آپ تکلیف نہ کریں۔ اب میں اپنی کوٹھی میں جا کر آرام کروں گا۔"

"تو پھر چلئے۔ میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ جب آپ کو دوست سمجھ لیا ہے تو پھر غیریت کیسی؟"

جمشید الجھن میں پڑ گیا۔ کیونکہ اس کی کوٹھی خالی تھی۔ کھانے پینے کا انتظام نہیں تھا۔ وہ شاہد عباس کو ایک پیالی چائے بھی نہیں پلا سکتا تھا۔ اسے سوچتے دیکھ کر شاہد عباس نے کہا۔

"میں سمجھ گیا دوست! آپ کی بیگم یعنی ہماری بھابی جان ذرا سخت مزاج کی خاتون ہوں گی۔ اپنے صاحب کے دوستوں کو برداشت نہیں کرتی ہوں گی۔"

"نہیں' یہ بات نہیں ہے۔ دراصل میری بیگم اپنے میکے گئی ہوئی ہیں۔"

"تو پھر میری بات رہے گی۔ آپ میرے ساتھ چلیں گے۔"

جمشید کو اس کے ساتھ جانا پڑا۔ کیونکہ وہ اپنی خیالی شازیہ عباس کو اس کے خیالی میکے بھیج چکا تھا۔ یوں بھی شازیہ کی اجازت کے بغیر کسی نئے دوست کو اپنی کوٹھی تک نہیں لا سکتا تھا۔ اسی لئے وہ شاہد عباس کی کوٹھی میں پہنچ گیا۔ اس کوٹھی میں صرف ایک ملازم تھا جو اپنے صاحب کا حکم سنتے ہی لنچ تیار کرنے چلا گیا۔ شاہد نے تاش کی گڈی نکال کر کہا۔

"تاش کی بازی ہو جائے۔ اس طرح وقت گزر جائے گا۔"

وہ دونوں ایک خوبصورت سی خوابگاہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جمشید نے پوچھا۔

"آپ کی بیوی بچے کہاں ہیں؟"

"آپ ایک وقت میں ایک سوال پوچھیں۔ یعنی پہلے بیوی کے متعلق سوال کریں۔ جواباً جب وہ ہی نہ ہو گی تو بچے کہاں سے آئیں گے؟"

"بیوی کیوں نہیں ہے؟ آپ شادی نہیں کرنا چاہتے یا کہیں سے رشتہ نہیں ملتا؟"

"میری پسند کی لڑکی نہیں ملتی۔ ویسے تو بڑے بڑے گھرانوں کی لڑکیاں مجھ سے شادی کرنے کے خواب دیکھتی رہتی ہیں۔ ٹھہریئے' آپ کو میری بات کا یقین نہیں آئے گا۔ میں ابھی ثبوت پیش کرتا ہوں۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر سامنے دیوار سے لگے ہوئے آئرن سیف کے پاس گیا۔ پھر دو چابیوں کی مدد سے اس کے آہنی پٹ کو کھول دیا۔ جمشید کی نگاہوں کے سامنے پھر ایک بار قارون کا خزانہ کھل گیا۔ ساتھ ہی اس کا منہ حیرت سے یوں کھل گیا جیسے وہ آنکھ کی بجائے منہ سے دیکھ رہا ہو۔ ٹھیک وہی شازیہ والی تجوری کا منظر تھا۔ نوٹوں کی موٹی موٹی گڈیاں نظر آ رہی تھیں۔ ہیرے جواہرات دور ہی سے اپنی چمک دکھا رہے تھے۔ مخمل سے منڈھے ہوئے چھوٹے بڑے بکس بتا رہے تھے کہ ان میں سونے کے زیورات ہیں۔

جمشید کو اچانک خیال آیا کہ اسے یوں حیرانی کا اظہار نہیں کرنا چاہئے۔ کیونکہ اب وہ بھی شازیہ کی بدولت اتنا ہی مالدار ہو گیا ہے۔ اب اسے کسی دولت مند کے سامنے مرعوب نہیں ہونا چاہئے۔ شاہد عباس نے تجوری کو بند کرنے کے بعد واپس اپنی جگہ آ کر کہا۔

"دیکھا آپ نے؟ یہ دولت اس بات کا ثبوت ہے کہ بڑے بڑے گھرانوں کی لڑکیاں میرے آگے پیچھے پھرتی رہتی ہیں۔ آپ بتائیں کیا میں جھوٹ کہہ رہا ہوں؟"

"نہیں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ بہت ہی حسین اور دولت مند لڑکیاں بلکہ اونچی سوسائٹی کی لڑکیاں آپ سے شادی کرنا چاہتی ہوں گی۔ مگر آپ اب تک کنوارے کیوں ہیں؟"

"میری پسند کچھ اور ہے۔ میں ایک شریف سیدھی سادی غریب لڑکی کو شریک حیات بنانا چاہتا ہوں۔ جس نے فاقے کئے ہوں۔ غریبی کے برے دن دیکھے ہوں تاکہ کبھی مجھ پر برا وقت آئے تو وہ میرا ساتھ نہ چھوڑے۔"

جمشید کو اپنی بہن کا خیال آگیا۔ وہ شاہد کی کسوٹی پر پوری اترتی تھی۔ اگر وہ یہاں دلہن بن کر آ جاتی تو بھائی کی طرح بہن کے دن پھر جاتے' لیکن وہ کس طرح کہے کہ ہوائی جہاز میں سفر کرنے والے بھائی کی بہن غریب ہے اور ابھی شاید فاقے بھی کر رہی ہو گی۔ شاہد تو یہی سمجھے گا کہ اس کی دولت کو دیکھ کر وہ گرگٹ کی طرح رنگ بدل رہا ہے۔ اپنی اٹیچی میں دس ہزار روپے رکھ کر خود کو غریب ظاہر کر رہا ہے۔

اس کے جی میں آیا کہ وہ گڑگڑا کر کہہ دے۔ "شاہد صاحب! میں ہاتھی کا دانت ہوں۔ دکھاوے کا امیر ہوں۔ کل رات نو بجے تک میں فاقے کرتا تھا۔ اپنی بہن کو سہاگن نہیں بنا سکتا تھا۔ اس لئے خودکشی کرنا چاہتا تھا لیکن ایک پُراسرار دوشیزہ نے میری باقی زندگی دس ہزار روپے میں خرید لی ہے۔ یہ کیسی زندگی ہے۔ پہلے میرے حالات سمجھاتے تھے کہ دولت کے بغیر بہن کے ہاتھ پیلے نہیں ہوں گے۔ اب دولت ملی ہے تو تم سمجھا رہے ہو کہ تمہارے جیسے دولت مند اپنی شریک حیات بنانے کے لئے غریب لڑکیوں کی تمنا کرتے ہیں۔ آخر ہم کس طرح زندگی گزاریں نہ غریبی میں سکون ہے' نہ امیری سے مقصد حاصل ہوتا ہے۔ عجیب چکر بازی ہے جب تک جیتے رہو' اِدھر سے اُدھر چکراتے رہو..........."

پھر اس کے دماغ نے کہا۔ "میں کیسی باتیں سوچ رہا ہوں' شازیہ نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ میری زندگی کا رخ موڑ دیا ہے۔ اگر میں شاہد کے سامنے اپنی حالت زار بیان کرنے کے لئے شازیہ کو ایک پُراسرار دولت مند دوشیزہ کہوں گا۔ تو پتہ نہیں یہ شاہد کیسا آدمی ہے؟ اگر یہ پولیس والوں تک یہ بات پہنچا دے گا تو میری شازیہ' میری محسنہ مصیبت میں گرفتار ہو جائے گی۔ یہ سراسر احسان فراموشی اور بے ایمانی ہو گی۔ نہیں' میں شازیہ کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچاؤں گا.........."

شاہد عباس نے اس کی آنکھوں کے سامنے انگلیاں نچاتے ہوئے پوچھا۔ "جمشید صاحب! آپ خاموش کیوں ہیں؟ اتنی دیر سے کیا سوچ رہے ہیں؟"

"آں؟" اس نے چونک کر شاہد کو دیکھا۔ پھر سنبھل کر بولا۔ "میں اپنے حالات پر غور کر رہا ہوں۔ بائی دی وے آپ نے کبھی ایسے شخص کو دیکھا ہے جو دولت مند بھی ہو اور غریب بھی؟"

"نہیں بھئی' ایسا ممکن نہیں ہے کہ کوئی شخص بیک وقت امیر اور غریب ہو۔ کیا آپ نے کسی ایسے شخص کو دیکھا ہے؟"

"جی ہاں' وہ شخص میں خود ہوں۔"

"آپ؟" شاہد نے حیرانی کا اظہار کیا۔

"جی بات دراصل یہ ہے کہ میں دولت مند نہیں ہوں' میری بیوی ایک امیر کبیر عورت ہے۔ اس لئے میری ماں اور بہن غریب ہیں۔"

"اوہ اچھا۔ میں سمجھ گیا۔ آپ اپنی بیوی کی دولت سے اپنی ماں اور بہن کی مدد نہیں

کر سکتے۔"

"جی نہیں۔ میری بیوی شازیہ بہت اچھی ہے۔ بہت رحمدل ہے' اس نے دس ہزار روپے دیئے ہیں تاکہ میں اپنی ماں کا علاج کر سکوں اور بہن کو کسی شریف آدمی سے منسوب کر سکوں۔ ابھی میں یہ روپے لے کر حسن آباد ان کے پاس جا رہا ہوں۔"

"اوہ اچھا۔ اب سمجھ گیا۔ جب تک آپ یہ روپے اپنی بہن تک نہیں پہنچائیں گے۔ اس وقت تک وہ غریب ہی رہے گی۔ اگر آپ میری صاف گوئی کا برا نہ مانیں تو میں کہوں گا کہ آپ کی غریب بہن میرا آئیڈیل ہے۔ وہ فاقے کرنے والی آپ کی بہن میرے خوابوں کی ملکہ ہے۔ وہ میرے.........."

جمشید زور زور سے اپنا سر کھجانے لگا۔ تاکہ شاہد کی زبان سے اپنی بہن کا قصیدہ سنائی نہ دے۔ ویسے شادی کے بعد اکثر بہنوئی اپنے سالوں کے سامنے چھیڑ چھیڑ کر ان کی بہنوں کی تعریفیں کرتے ہیں لیکن شادی سے پہلے جمشید کو برا لگ رہا تھا۔ ایسے وقت وہ اعتراض بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ اس طرح بات ہی بات میں بہن کے رشتے کی بات چل نکلی تھی۔

شاہد کی باتونی عادت نے جمشید کی مشکل آسان کر دی۔ بہن کو سہاگن بنانے کے لئے جو باتیں وہ زبان تک نہیں لا سکتا تھا۔ وہ شاہد خود ہی کہتا چلا جا رہا تھا۔ وہ کھانے کے دوران بھی بولتا رہا۔ سفر کے دوران بھی یقین دلاتا رہا کہ وہ اس کی بہن کے لئے ایک وفادار خاوند ثابت ہو گا۔ حسن آباد پہنچ کر وہ ہوٹل میں قیام کرنا چاہتا تھا۔ مگر جمشید اسے اپنے گھر لے آیا۔ دوسرے لفظوں میں اپنی ماں اور بہن کے لئے خوشیوں کا خزانہ لے آیا۔ ماں کو بیٹے کی طرف سے بہو مل رہی تھی اور بیٹی کی طرف سے داماد بننے کے لئے شاہد خود ہی دروازے پر آ گیا تھا۔

جب سب ہی رشتہ کے لئے راضی تھے تو پھر شادی میں دیر کیوں ہوتی؟ ماں نے جمشید سے کہا کہ وہ شازیہ کو لے آئے۔ تاکہ اس کی بہن صفیہ اور شاہد کی شادی میں شریک ہو سکے۔ صفیہ نے بھی ضد کی کہ وہ اپنی بھابی کو دیکھنا چاہتی ہے۔ جمشید اس بات کو سمجھتا تھا کہ شازیہ کو اس کی بہن کی شادی سے کوئی دلچسپی نہیں ہو گی۔ اس نے تو محض دس ہزار میں سودا کیا ہے۔ یہ باتیں وہ اپنے گھر والوں کو نہیں بتانا چاہتا تھا۔ اس نے بہانہ کیا۔'

"امی! آپ کی بہو چند ماہ کے لئے ملک سے باہر گئی ہے میں اس کی واپسی کا انتظار

نہیں کرنا چاہتا۔ صفیہ کی شادی جلد از جلد ہو جائے تو بہتر ہے۔"

شاہد عباس بھی یہی چاہتا تھا کہ اس کی شادی میں شازیہ کو نہ بلایا جائے۔ اس نے کہا۔

"نیک کام میں دیر نہیں ہونی چاہئے۔ میں اپنا لاکھوں کا کاروبار چھوڑ کر آیا ہوں۔ اس لئے جلد سے جلد صفیہ کو اپنی بیوی بنا کر لے جانا چاہتا ہوں۔"

جلد یا بدیر شادی تو ہونی ہی تھی سو ہو گئی۔ جس رات صفیہ دلہن بن کر شاہد عباس کے ساتھ گئی تو وہ ساری رات جمشید سو نہ سکا۔ اپنے حالات پر غور کرتا رہا کہ تقدیر اس کے ساتھ کیسا مذاق کر رہی ہے۔ اسے ایک دولت مند بیوی ملی۔ صفیہ کو ایک دولت مند شوہر ملا لیکن اس کی بیوی محض ایک دکھاوا ہے۔ کاش کہ وہ بھی حسین شازیہ کے ساتھ ازدواجی زندگی گزار سکتا۔

شازیہ اس کے تصور میں انگڑائیاں لینے لگی۔ آخر وہ جوان تھا۔ اس کے دل میں بھی جذبات مچلتے تھے۔ جب وہ فاقے کرتا تھا۔ تب کسی کو چاہنے اور کسی سے چاہے جانے کی آرزو نہیں تھی۔ بس مرجانے کو جی چاہتا تھا۔ اب زندگی کا حسین چہرہ سامنے آیا تھا۔ اب یہ دنیا جنت بن گئی تھی اور جنت میں شجر ممنوعہ کی طرف جانے کے لئے دل مچلتا ہے۔ ایسے وقت رکاوٹ پیدا ہو جائے تو انسان باغی ہو کر سوچنا شروع کر دیتا ہے۔

"میں جنت سے نکل سکتا ہوں۔ مگر شازیہ کے خیال سے باز نہیں آ سکتا۔ اب یہاں سے واپس جا کر میں اس حسینہ سے صاف صاف کہہ دوں گا کہ کنویں کے قریب پیاسا نہیں رہ سکتا۔ وہ ناراض ہو کر میرا کیا بگاڑ لے گی۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا کہ وہ مجھے اپنے گھر سے نکال دے گی۔ اپنے دس ہزار روپے مانگے گی۔ اب میری بہن مالدار ہو گئی ہے۔ میں اس کے دس ہزار واپس کر سکتا ہوں۔ اگر مجھے پہلے سے تقدیر کا حال معلوم ہوتا کہ مجھے شاہد عباس جیسا دولت مند بہنوئی ملنے والا ہے تو میں خود کشی کرنے کے لئے سمندر کے ساحل پر نہ جاتا اور نہ ہی اپنی باقی زندگی شازیہ کے ہاتھ فروخت کرتا.........."

سوچتے سوچتے اس کے خیالات کی رو دوسری طرف بہک گئی۔ اس کے دماغ میں سوالات کلبلانے لگے۔

"آخر یہ کیا چکر ہے؟ شازیہ محض دکھاوے کے لئے مجھے اپنا شوہر بنا کر کیوں رکھنا چاہتی ہے؟ وہ بہت مکار ہے۔ ایسا نہ ہو کہ مجھے کسی مصیبت میں پھنسا دے۔ اس کی تجوری میں چوری ڈکیتی کا مال ہے۔ اگر کبھی پولیس نے چھاپہ مارا تو میں جیل جاؤں گا۔ پھر

شاہد عباس کو میری حقیقت معلوم ہو گی تو وہ عزت دار آدمی میری بہن کو طلاق دے دے گا۔ نہیں' مجھے اس چکر سے نکلنا چاہئے............"

وہ اپنی بہن کو سہاگن بنانے کے لئے ایک پُراسرار حسینہ کے جال میں پھنس گیا تھا اور اب اپنی بہن کو سدا سہاگن بنائے رکھنے کے لئے اس جال کو توڑنا چاہتا تھا۔ ساتھ ہی یہ خوف بھی دل میں سمایا ہوا تھا کہ شازیہ جیسی دولت مند لڑکی نہ جانے کیسے کیسے اثر و رسوخ کی مالک ہو گی۔ اس نے دھمکی بھی دی تھی کہ اگر وہ غداری کرے گا تو اس کی ماں اور بہن مٹی میں مل جائیں گی۔

"کیا مجھے ایک عورت کی دھمکی سے خوفزدہ ہونا چاہئے؟ یہ بڑی شرم کی بات ہے۔ میں مرد ہوں۔ مجھے مرد کی طرح حالات کا مقابلہ کرنا چاہئے۔ کوئی ایسی تدبیر کرنی چاہئے کہ شازیہ مجھ سے مرعوب ہو جائے یا پھر ہمیشہ کے لئے میرا پیچھا چھوڑ دے۔"

وہ تدبیر سوچنے لگا۔ اس نے اپنی زندگی میں کبھی ہیرا پھیری نہیں کی تھی۔ اگر کرتا تو فاقے کرتا ہوا شازیہ تک نہ پہنچتا۔ اس کے پاس بھی کار اور کوٹھیاں ہوتیں۔ مگر اسے مکاری نہیں آتی تھی۔ دوسرے دن شاہد نے اسے ٹوک دیا۔

"جمشید بھائی! آپ کافی پریشان نظر آ رہے تھے۔ کیا میں آپ کے کسی کام آ سکتا ہوں۔"

"نہیں شاہد! میں بالکل ٹھیک ہوں۔ کوئی پریشانی نہیں ہے۔"

"کیسے نہیں ہے۔ میں اڑتی چڑیا کے پر گن لیتا ہوں۔ اپنے دکھوں کا بوجھ کم کرنے کے لئے کسی نہ کسی کو اپنا راز دار بنانا پڑتا ہے۔ کیا آپ مجھ پر اعتماد کر کے مجھے اپنے دل کی بات نہیں بتائیں گے؟"

جمشید اس کا منہ تکنے لگا اور سوچنے لگا۔ "میرے سامنے یہ جو نوجوان کھڑا ہے۔ پہلے یہ ایک اجنبی کی طرح میرے سامنے آیا۔ پھر دوست بن گیا۔ اس کے بعد میری بہن کی زندگی کا محافظ بن گیا۔ یہ ہمارے لئے رحمت کا فرشتہ ہے۔ مجھے اس فرشتے سے کچھ نہیں چھپانا چاہئے۔"

پھر اس نے کچھ نہیں چھپایا۔ ابتدا سے اپنی داستانِ غم شاہد کو سناتا چلا گیا۔ شازیہ کے متعلق جو کچھ اس کے دل میں تھا' اس نے کہہ دیا۔ یعنی دل میں شازیہ کی چاہت بھی تھی اور کئی طرح کے اندیشے بھی تھے۔ اس نے شاہد سے کہا۔

"شازیہ کے ارادے خطرناک ہیں۔ اس نے مجھے اسی شرط پر دس ہزار دیئے ہیں کہ

جب بھی وہ مجھے مرنے کا حکم دے' میں اسی وقت اپنی جان دے دوں۔ صاف ظاہر ہے کہ وہ میری موت سے کوئی بہت بڑا فائدہ اٹھانا چاہتی ہے۔"

شاہد بڑے انہماک سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اس نے تائید میں سرہلا کر کہا۔

"بے شک اس عورت نے اپنے کسی اہم مقصد کے لئے آپ کو خرید لیا ہے۔ یہ آپ نے بہت اچھا کیا ہے کہ مجھے سب کچھ بتا دیا۔ اب آپ ایک دانشمندی کا ثبوت اور دیں' وہ یہ کہ یہ باتیں اپنے گھر کی کسی عورت کو نہ بتائیں۔ صفیہ آپ کی بہن ہے اور میری شریک حیات ہے' اسے بھی شازیہ کی حقیقت معلوم نہ ہو۔ کیونکہ عورتوں کے پیٹ میں بات نہیں رہتی۔ اگر بات اڑتے اڑتے شازیہ کے کانوں تک پہنچے گی تو وہ آپ کی جان کی دشمن بن جائے گی۔"

جمشید نے اس کا مشورہ مان لیا۔ دوسرے لفظوں میں شاہد نے اسے قائل کر دیا کہ اب شازیہ کی حقیقت کسی تیسرے کو معلوم نہ ہو۔ اس نے کہا۔

"جمشید بھائی! شازیہ جیسی پُراسرار اور خطرناک عورت نے آپ کو دس ہزار دے کر یونہی آزاد نہیں چھوڑ دیا ہو گا۔ وہ مختلف ذرائع سے آپ کے متعلق ایک ایک پل کی خبر رکھتی ہو گی۔ کیا آپ جاسوسی ناول یا اخبارات میں جرائم کی رپورٹ وغیرہ پڑھتے ہیں؟"

جمشید نے نفی میں سرہلا کر کہا۔ "جی نہیں' چور بدمعاشوں کی کہانیوں سے مجھے دلچسپی نہیں ہے۔"

"آپ بڑے بھولے ہیں۔ اس دنیا میں زندہ رہنے کے لئے ہر قسم کی معلومات رکھنی چاہئے۔ ہمارے ملک میں ایک بہروپیا اکثر موضوع گفتگو بنا رہتا ہے۔ وہ جدید میک اپ کے لوازمات سے کتنے ہی روپ بدلتا رہتا ہے۔"

جمشید نے کچھ سوچتے ہوئے سرہلا کر کہا۔

"ہاں! مجھے یاد آیا۔ بہت پہلے میں نے بھی اس بہروپئے کے بارے میں سنا تھا مگر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

"میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس بہروپئے سے کوئی بات بعید نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ شازیہ کے روپ میں آپ سے مل رہا ہو۔"

جمشید نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تم کیسی بچوں جیسی باتیں کر رہے ہو۔ شازیہ واقعی شازیہ ہے۔ ایک حسین قیامت ہے کوئی مرد روپ بدل کر اتنی حسین دوشیزہ نہیں بن سکتا۔ میں شازیہ کو کبھی ایک بہروپیا تسلیم نہیں کر سکتا۔ کیونکہ میں نے اسے بہت قریب

سے دیکھا ہے۔"

شاہد نے اطمینان کی گہری سانس لی۔ پھر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بولا۔

"ہاں جب آپ نے اتنے قریب سے دیکھا ہے تو پھر آپ کی شازیہ لڑکی ہی ہو گی لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی دولت کے بل پر اس بہروپئے کی خدمات حاصل کر رہی ہو۔ آپ کی وفاداری کو سمجھنے کے لئے اس بہروپئے کو جاسوس کی طرح آپ کے پیچھے لگا دیا ہو۔"

جمشید نے قائل ہو کر کہا۔

"ہاں ایسا ہو سکتا ہے۔ چوری ڈکیتی سے دولت حاصل کرنے والی یقیناً میری نگرانی کروا رہی ہو گی۔ میں بہت زیادہ محتاط رہوں گا۔ شازیہ کی باتیں میں نے صرف تمہیں بتائی ہیں۔ اب کسی دوسرے کو تو کیا اپنی امی کو بھی اس کی حقیقت نہیں بتاؤں گا۔"

"ہاں دانشمندی یہی ہے۔ ہم مرد ہیں راز کو راز رکھ سکتے ہیں۔ اب آپ یہ بتائیں کہ شازیہ کے پاس کب جا رہے ہیں۔"

"میں کل صبح کی فلائیٹ سے امی کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں لیکن میں امی کو شازیہ کے ساتھ نہیں رکھ سکوں گا۔"

"ٹھیک ہے وہ میرے اور صفیہ کے ساتھ رہا کریں گی۔ شازیہ کے پاس ان کا رہنا مناسب نہیں ہے۔"

انہوں نے حسن آباد سے واپسی کا پروگرام طے کر لیا۔ دوسرے دن صبح کی فلائیٹ سے جمشید اپنی ماں کے ساتھ چلا گیا۔ شاہد کے ساتھ صفیہ جیسی حسین شریک حیات تھی۔ اس نے ٹرین کے ائیر کنڈیشنڈ کوچ میں سفر کیا تاکہ ہنی مون کا فرض ادا ہوتا رہے۔ ویسے وہ جمشید کی باتیں سننے کے بعد بہت الجھا ہوا تھا۔ ایک ہی سوال اس کے دماغ میں چکرا رہا تھا۔

"کیا جمشید آئندہ شازیہ کے سلسلے میں اپنی زبان بند رکھے گا؟"

اسے جمشید کے ساتھ ہی حسن آباد سے فیض آباد جانا چاہئے تھا۔ مگر صفیہ کی قربت نے اسے دیوانہ بنا دیا تھا۔ شاید اس کی زندگی میں شادی سے پہلے کوئی عورت نہیں آئی تھی۔ یا پھر صفیہ جیسی حسین اور شبابی اداؤں سے ہوش اڑا دینے والی حسینہ پہلی بار اس کی تنہائیوں کی رفیق بن کر آئی تھی۔ اب اس سے دور رہنے کے خیال سے ہی دل میں بے چینی سی پیدا ہو جاتی تھی۔ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ ٹرین کے ذریعہ سفر کر رہا تھا۔ ائیر

کنڈیشنڈ کوچ کی خاموش اور رومان پرور فضا میں صفیہ اس کے دل کی دھڑکنوں سے لگی ہوئی تھی اور اس سے آخری سانس تک ساتھ نبھانے کا وعدہ لے رہی تھی۔

ایسے وقت نیند نہیں آتی۔ پیار کے وعدوں اور قسموں میں رات گزرتی چلی جاتی ہے۔ جب صبح ہونے لگی تو صفیہ کی آنکھ لگ گئی۔ شاہد کے جذبے بھی شانت ہو گئے تھے۔ تب وہ پھر جمشید کی طرف سے فکر مند ہو گیا۔ وہ سوچنے لگا۔

"پولیس والوں سے بچنے کے لئے میں نے جمشید کی آڑ لے کر ایک چال چلی تو اب صفیہ کی طرف سے مات کھا رہا ہوں۔"

وہ صفیہ کو دیکھنے لگا۔ اس کا خوابیدہ حسن بری طرح للچا رہا تھا۔ وہ ایسی تھی کہ پیاس بجھانے کے بعد اور بڑھا دیتی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا۔

"میں نے بے انتہا دولت حاصل کی ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ اب میری زندگی میں کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ مگر اب یہ حسین شریک حیات سمجھانے آ گئی ہے کہ اس کے بغیر میں سب کچھ پانے کے بعد بھی خالی رہوں گا۔ قانون میرا کچھ نہیں بگاڑ سکا۔ بڑے بڑے بدمعاش میری تلاش میں تھک ہار کر بیٹھ گئے۔ مگر یہ ایک عورت ابھی سے مجھے تھکا رہی ہے۔ اگر یہ نہ ہوتی تو میں جمشید کی زبان ہمیشہ کے لئے بند کر دیتا۔ ویسے اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔ میں جمشید کو ایک اچھا سبق سکھاؤں گا۔"

وہ صفیہ کے پاس سے اٹھ کر دوسری برتھ پر آ گیا۔ ٹرین تیز رفتاری سے بھاگی جا رہی تھی۔ اس نے ایک سگریٹ سلگایا۔ پھر ایک گہرا کش لگانے کے بعد دھواں چھوڑتے ہوئے سوچنے لگا۔

"پہلے میں نے جمشید کو دھمکی دی تھی کہ اگر اس نے میری حقیقت کسی کے سامنے بیان کی یا پولیس تک پہنچنے کی کوشش کی تو اس کی ماں یا بہن کی لاش اسے ملے گی۔ آہ! اب صفیہ کو مارنا تو دور کی بات ہے۔ اس کے پاؤں میں کانٹا بھی چبھے گا تو تکلیف مجھے پہنچے گی۔ دراصل غلطی مجھ سے ہو گئی۔ میں روپ بدل کر حسن آباد تک جمشید کا پیچھا کرنا چاہتا تھا۔ پھر اس پلاننگ میں تبدیلی کر دی۔ میرے دماغ نے مجھے سمجھایا کہ اگر میں جمشید کی بہن کا سہاگ بن جاؤں تو وہ ہمیشہ میری مٹھی میں رہے گا۔ اگر وہ مجھ سے دھوکہ کرے گا تو میں اس کی بہن کو ایک شوہر کی حیثیت سے تکلیفیں پہنچاؤں گا۔ وہ بہن کی خاطر ہمیشہ میرا وفادار بن کر رہے گا۔ مگر افسوس تقدیر کس طرح ناچ نچاتی ہے۔ یہ پہلے سے کوئی نہیں جانتا۔ میں بھی نہیں جانتا تھا کہ صفیہ کے حسن و شباب کا جادو سر چڑھ کر بولے گا۔"

وہ صفیہ کو پیار سے دیکھتا جا رہا تھا مگر پریشانی سے سوچتا جا رہا تھا۔ پھر اس نے اپنا سوٹ کیس کھول کر کپڑوں کے نیچے سے ایک پاکٹ کیسٹ ریکارڈر نکالا۔ اس ریکارڈر کو دیکھتے ہی اس کی پریشانی قدرے کم ہو گئی۔ اس کا دماغ تیزی سے سوچ رہا تھا کہ وہ جمشید کو کس طرح بلیک میل کر سکتا ہے۔

☆======☆======☆

جمشید جب اپنی ماں کے ساتھ فیض آباد پہنچا تو شازیہ کی کوٹھی اسی طرح مقفل تھی' جس طرح وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ اس نے اپنی چابیوں سے وہاں کے دروازے کھولے۔ اس کی ماں نے ناگواری سے کہا۔

"تم نے کیسی لڑکی سے شادی کی ہے۔ آخر وہ ملک سے باہر جا کر کیا کرتی ہے' ایک اچھی بیوی کی طرح گھر نہیں سنبھال سکتی؟"

جمشید نے ایک سرد آہ بھری۔ اس کی بھی یہی خواہش تھی کہ شازیہ اگر اچھی بیوی بن کر گھر کی چاردیواری میں نہیں رہ سکتی تو کم از کم اس کی آغوش کی چاردیواری میں رہے اور سنگدل محبوبہ بن کر اسے دھمکیاں نہ دے۔ اس نے ماں کو سمجھایا۔

"امی! میں نے کسی لڑکی سے نہیں' دولت سے شادی کی ہے۔ ایسا نہ کرتا تو صفیہ اتنی جلدی سہاگن نہ بنتی۔ نہ میں ایئرپورٹ جاتا نہ شاہد سے ملاقات ہوتی اور نہ وہ آپ کا داماد بنتا۔ آپ ایک بہو کی حسرت کو دل سے نکال دیں۔ ایک اچھا داماد مل گیا ہے۔ اسی کی قدر کریں۔ میں شازیہ کے ساتھ کسی طرح زندگی گزار لوں گا۔"

وہ پھر تصور میں شازیہ کو دیکھنے لگا کہ کس طرح اس کے ساتھ زندگی گزارے گا۔ یہ تو صرف تقدیر کا بہی کھاتہ ہی کھول کر دیکھا جا سکتا تھا اور تقدیر کا رجسٹر اپنے وقت سے پہلے کبھی نہیں کھلتا۔ دوسرے دن وہ اپنی بہن اور بہنوئی کو ریسیو کرنے ریلوے اسٹیشن گیا۔ پھر انہیں لے کر شازیہ کی کوٹھی میں واپس آیا۔ صفیہ اس کوٹھی کو دیکھ کر بہت خوش ہو رہی تھی۔ خوشی کی بات ہی تھی۔ اسے ایک دولت مند شوہر ملا تھا اور اس کے بھائی کو ایک دولت مند بیوی ملی تھی۔

شاہد اپنی بیوی صفیہ اور جمشید کے درمیان کھڑا ہوا تھا۔ صفیہ کے ساتھ کھلم کھلا میاں بیوی کا رشتہ تھا۔ جمشید کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی رشتہ تھا۔ جو جمشید کی بھی سمجھ میں نہیں آ سکتا تھا۔ شاہد نے واپسی میں صفیہ کی ماں کو بھی ساتھ میں لے لیا۔ تاکہ بوڑھی عورت اس کوٹھی میں نہ رہے۔ جاتے وقت اس نے جمشید سے کہا۔

"کل میں ایک دن کے لئے کاروبار کے سلسلے میں باہر جا رہا ہوں۔ پرسوں واپس آ جاؤں گا۔ میری غیر موجودگی میں آپ ذرا صفیہ کا خیال رکھیں۔"

یہ کہہ کر وہ صفیہ اور اپنی ساس کے ساتھ وہاں سے چلا گیا۔ جمشید تنہائی میں پھر شازیہ کے متعلق سوچنے لگا۔ جب بھی وہ صفیہ اور شاہد کو ہنستے بولتے دیکھتا تھا اسے اپنی محرومیاں ستانے لگتی تھیں۔ اس رات وہ جب تک جاگتا رہا شازیہ کا انتظار کرتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ شازیہ اگر اس کی نگرانی کرتی رہی ہو گی تو اسے یہ بھی علم ہو گیا ہو گا کہ اس کا نام نہاد شوہر حسن آباد سے واپس آ گیا ہے۔ لہٰذا وہ ضرور ملنے آئے گی۔

مگر وہ انتظار کرتے کرتے سو گیا۔ دوسرے دن دس بجے اس کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے کمرے کے دروازے کو کھلا پایا۔ وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ٹھیک اس کی نگاہوں کے سامنے پلنگ کے پاس ایک تپائی پر ایک پاکٹ کیسٹ ریکارڈر رکھا ہوا تھا۔ ریکارڈر کے نیچے ایک کاغذ تہہ کیا ہوا دبا ہوا تھا۔ اس نے کاغذ کو اٹھایا پھر اسے کھول کر پڑھا۔ اس میں لکھا تھا۔

"جمشید۔ تم جھوٹے اور فریبی ہو۔ تم سمجھتے تھے کہ مجھے تمہارے جھوٹ اور فریب کا علم نہیں ہو سکے گا۔ مگر تم مجھ سے کسی بھی حال میں نہیں چھپ سکتے۔ تمہارے سامنے یہ کیسٹ ریکارڈر رکھا ہوا ہے۔ اسے آن کرو تمہیں پتہ چل جائے گا کہ میں کس طرح تمہارے بارے میں پل پل خبر رکھتی ہوں۔ کیسٹ سننے کے بعد تم مندرجہ ذیل فون نمبر پر فوراً رابطہ قائم کرو۔ فقط شازیہ۔

نیچے فون نمبر لکھا ہوا تھا۔ وہ کاغذ کو ایک طرف رکھ کر پھر کیسٹ ریکارڈر کو آن کر کے اس میں سے ابھرتی ہوئی آواز سننے لگا۔ وہ اپنی اور شاہد کی آوازیں سن رہا تھا۔ حسن آباد میں شاہد کے ساتھ جو باتیں ہوئی تھیں۔ وہ سب اس کیسٹ میں ریکارڈ ہو گئی تھیں۔ کیسے ہو گئی تھیں؟ وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر سوچنے لگا۔

"یہ شازیہ حسین ناگن ہے' ہر وقت ڈسنے کے لئے قریب رہتی ہے مگر نظر نہیں آتی۔ ہماری آواز ریکارڈ کرنے کے لئے وہ یا اس کا کوئی آدمی ہمارے قریب ضرور آیا ہو گا یا پھر پہلے ہی سے یہ کیسٹ ریکارڈر کہیں میرے قریب چھپا دیا گیا ہو گا۔ ویسے اب یہ پوری طرح ثابت ہو گیا ہے کہ شازیہ بہت محتاط اور خطرناک عورت ہے۔ وہ مجھ سے کسی لمحے بھی غافل نہیں رہے گی۔"

اسے یاد آیا کہ شازیہ نے فوراً ہی فون پر رابطہ قائم کرنے کی تاکید کی ہے اس نے

اس کاغذ کو اٹھا کر فون نمبر کو ذہن نشین کیا۔ پھر وہاں سے اٹھ کر ڈرائنگ روم میں آگیا۔ وہاں ایک صوفے کے پاس ٹیلیفون رکھا ہوا تھا۔

وہ صوفے پر بیٹھ گیا اس کے بعد ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگا۔

دوسری طرف شازیہ ایک ٹیلیفون کے پاس بیٹھی ہوئی تھی اور بار بار اپنی رسٹ واچ کو دیکھ رہی تھی۔ آخر فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے ریسیور اٹھا کر کہا۔

"ہیلو جمشید۔ معلوم ہوتا ہے دیر سے سو کر اٹھے ہو۔ میں بہت دیر سے انتظار کر رہی ہوں۔ مجھے امید ہے کہ تم نے اپنے جھوٹ اور فریب کو کیسٹ ریکارڈر کے ذریعہ سن لیا ہوگا۔ اب تم اپنی سزا خود تجویز کرو۔"

دوسری طرف سے جمشید کی آواز آنے لگی۔

"شازیہ میں شرمندہ ہوں۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں نے کسی دشمنی کے خیال سے شاہد کے سامنے تمہاری حقیقت بیان نہیں کی ہے۔ میں تمہاری عزت بھی کرتا ہوں اور تم سے محبت بھی کرتا ہوں۔"

"بکواس مت کرو۔ اگر میں اپنی ذہانت سے تمہاری فریب کاریوں کو نہ سمجھ پاتی تو تم اس طرح التجائیں نہ کرتے۔ یہ سب دکھاوے کی شرمندگی ہے۔ میں تمہارے فریب میں نہیں آؤں گی۔ میں نے تمہیں ایک نئی زندگی دی۔ تمہاری بہن کی شادی کے لئے دس ہزار روپے دیئے۔ مگر تم احسان فراموش نکلے۔ تم میرے مجرم ہو اور مجرم خود کو کبھی سزا نہیں دیتے۔ لہٰذا میں تمہیں سزا دے رہی ہوں۔ لو ذرا اس سزا کو بھی کان کھول کر سن لو۔"

اتنا کہہ کر شازیہ خاموش ہوگئی۔ اس کے آس پاس کوئی نہیں تھا لیکن اس کی آواز بدلتے ہی فون پر شاہد بولنے لگا۔ وہ تکلیف سے کراہ رہا تھا اور نقاہت سے کہہ رہا تھا۔

"آہ۔ ہاں۔ آہ۔ جمشید بھائی یہاں مجھے بہت اذیتیں پہنچائی جا رہی ہیں۔ اب مجھے یقین آگیا ہے کہ آہ۔ کہ تمہاری یہ شازیہ کتنی مکار اور خطرناک ہے۔"

دوسری طرف سے جمشید نے گھبرا کر پوچھا۔

"شاہد۔ تم کہاں ہو۔ تمہاری آواز سے پتہ چل گیا ہے کہ وہ مکار عورت تم سے بہت برا سلوک کر رہی ہے۔ تم کیسے اس کے ہتھے چڑھ گئے؟؟"

"آہ۔ ہائے۔ کچھ نہ پوچھو۔ تین بدمعاش اچانک ہی میری کار میں گھس آئے تھے۔ انہوں نے ریوالور دکھا کر مجھے اس ویرانے تک آنے پر مجبور کر دیا۔ یہ لوگ اب بھی

میرے آس پاس کھڑے ہوئے ہیں۔ ہائے میں کیا کروں۔"

"آپ ذرا ہمت سے کام لیں۔ شازیہ کو فون دیں میں اس سے بات کرتا ہوں۔"

فون کا وہ ریسیور تو بیک وقت شاہد اور شازیہ کے ہاتھ میں تھا۔ صرف آواز اور لب ولہجہ مختلف تھا۔ لہٰذا آواز بدل گئی۔ شازیہ نے کہا۔

"ہیلو جمشید! مجھ سے غداری کا نتیجہ دیکھ لیا۔ تم سمجھتے تھے کہ تمہاری بے ایمانی کی سزا میں تمہیں دوں گی۔ نہیں۔ میں ایسی نادان نہیں ہوں۔ میں چاہوں تو ایک پل میں تمہاری بہن کا سہاگ اجاڑ سکتی ہوں۔"

"نہیں۔" جمشید گھبرا کر چیخنے لگا۔ "شازیہ پہلے میری بات سن لو۔ مجھ سے پہلی بار غلطی ہوئی ہے۔ اس کی اتنی بھیانک سزا نہ دو۔ میں اپنی بہن کے سہاگ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اب تمام عمر تمہارا وفادار بن کر رہوں گا۔"

"ہوں۔ جب میں تمہارے بہنوئی کو آزاد کر دوں گی تو تم اس کے ساتھ پولیس اسٹیشن پہنچ جاؤ گے۔ کیا تم مجھے کوئی نادان بچی سمجھتے ہو۔"

"پلیز شازیہ! مجھے ایک ذرا سی مہلت دو۔ مجھ سے ملاقات کرو۔ میں تمہیں مطمئن کر دوں گا۔"

"اچھی بات ہے۔ میں ابھی آ رہی ہوں۔"

دونوں طرف ریسیور رکھ دیئے گئے۔ جمشید اب تک خوشامدیں کر رہا تھا۔ ریسیور رکھتے ہی غصہ سے پیچ و تاب کھانے لگا۔ شازیہ کی مکاریاں بڑھتی ہی جا رہی تھیں۔ پہلے اس نے اس کی غربت اور بے بسی سے فائدہ اٹھا کر اس کی زندگی خریدی۔ اسے زر خرید شوہر بنایا۔ پھر جاسوسہ کی طرح حسن آباد تک اس کے پیچھے لگی رہی اور اب اس کی بہن کو بیوہ بنانے پر تل گئی تھی۔

وہ غصہ سے کانپ گیا۔ ابھی ایک ہفتہ گزرا تھا کہ بہن سہاگن بنی تھی۔ ابھی وہ ازدواجی مسرتوں کا منہ دیکھ رہی تھی اور وہ ناگن اس کی مسرتیں چھین لینا چاہتی تھی۔ وہ دنیا کا ہر ظلم برداشت کر سکتا تھا۔ مگر بہن کی آنکھوں میں بیوگی کے آنسو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اگر شازیہ عام عورتوں کی طرح کمزور ہوتی تو وہ ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر اس کا گلا گھونٹ کر اسے مار ڈالتا۔ مگر افسوس اس مکار عورت کے ہاتھ بہت دور تک پہنچے ہوئے تھے۔

وہ اپنے غصے کو برداشت کرنے لگا۔ کیونکہ ابھی خوشامد اور التجاؤں سے کام نکالنا دانشمندی ہوتی۔ اس لئے وہ ایک آئینے کے سامنے بیٹھ کر اپنے چہرے پر نرمی اور بیچارگی

کے تاثرات پیدا کرنے لگا۔ اس وقت اسے پتہ چل رہا تھا کہ زہر پینا آسان ہے مگر غصہ پینا بہت مشکل ہے۔ بڑی مشکلوں کے بعد اس نے خود کو اوپر سے سرد بنا لیا۔ اس کے لئے کافی دیر تک مشق کرنی پڑی۔ جب شازیہ ایک گھنٹہ بعد آئی تو وہ بہت حد تک سنبھل چکا تھا۔ وہ جمشید کی مسکین سی صورت دیکھ کر مسکراتی ہوئی بولی۔

"کہو، دماغ ٹھکانے آگیا۔ اگر نہ آیا ہو تو آؤ آگے بڑھو اور مجھے تنہا اور بے یارو مددگار سمجھ کر میرا گلا گھونٹ دو۔"

جمشید ہاتھ جوڑ کر سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ حالانکہ اس کی مردانگی کو ٹھیس پہنچ رہی تھی جو ہاتھ وہ جوڑ رہا تھا انہی ہاتھوں سے اس کی بوٹی بوٹی کاٹ کر پھینک سکتا تھا۔ مگر حالات کے آگے بڑے بڑے سورما گھٹنے ٹیک دیتے ہیں۔ وہ عاجزی سے کہنے لگا۔

"میری پہلی غلطی معاف کر دو یا اگر کہو تو اپنے وعدہ کے مطابق ابھی تمہارے ایک اشارہ پر جان دے دوں۔ مگر میری بہن کی خوشیاں نہ چھینو۔ میں ہاتھ جوڑ کر التجا کرتا ہوں۔ میری بہن کا سہاگ لوٹا دو۔ شاہد کو اپنی قید سے آزاد کر دو۔"

وہ ہنستی کھلکھلاتی ہوئی آرام سے بستر پر لیٹ گئی۔ اس کے بعد کہنے لگی۔

"شاہد ابھی آزاد نہیں ہو سکتا۔ میں نے جو اذیتیں اسے پہنچائی ہیں ان کے کچھ نشانات اس کے جسم پر ہیں۔ دو چار دنوں کے بعد جب وہ نشانات مٹ جائیں گے تو اسے رہائی مل جائے گی۔"

جمشید یہ سوچ کر اندر ہی اندر غصے سے تلملا رہا تھا کہ اس کے بہنوئی پر کیسے کیسے مظالم ڈھائے گئے ہیں۔ اس نے کہا۔

"غلطی میں نے کی تھی۔ تم نے شاہد کو سزا کیوں دی؟"

"میں نے بیک وقت تم دونوں کو سزائیں دی ہیں۔ وہ تمہارا بہنوئی ہے۔ تمہاری بہن کا سرمایہ حیات ہے۔ اس لئے جو تکلیفیں اسے دی جائیں گی وہ تمہارے دل تک بھی پہنچیں گی۔ ذرا خود کو دیکھ لو کہ کس طرح تڑپ رہے ہو۔"

"ہاں! میں اپنی بہن کے لئے تڑپ رہا ہوں۔ اگر شاہد دو چار دنوں تک نہیں آیا تو صفیہ رو رو کر اپنا برا حال کر لے گی۔"

شازیہ کے ہنستے ہوئے چہرے پر اچانک ہی سنجیدگی آگئی۔ وہ خود بھی اپنی صفیہ کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ اس نے جمشید سے کہا۔

"میں تمہاری بہن کو رونے نہیں دوں گی۔ آج رات کسی وقت فون کرنے کی

اجازت دوں گی۔ وہ فون پر صفیہ سے کہہ دے گا کہ وہ کاروبار کے سلسلے میں بہت مصروف ہے۔ دو چار دنوں کے بعد آئے گا مگر یہ اچھی طرح یاد رکھو کہ اب کی بار اگر تم نے اور شاہد نے میرے متعلق باتیں کیں یا میری بات کسی تیسرے تک پہنچی تو تمہیں اور تمہاری بہن کو شاہد کی لاش ملے گی۔"

"میں اس بات کو اچھی طرح یاد رکھوں گا کہ تم صرف دھمکیاں نہیں دیتیں ان پر سختی سے عمل کرنا بھی جانتی ہو۔"

"ہاں یہ بھی یاد رکھنا کہ جس طرح وہ کیسٹ ریکارڈر تمہاری لاعلمی میں تمہاری آواز ریکارڈ کرتا رہا تھا اسی طرح تم سب کی لاعلمی میں ایک ریوالور ہمیشہ شاہد کے قریب رہے گا۔ ادھر تم کوئی غلطی کرو گے ادھر تمہاری بہن اپنے سہاگ کا ماتم کرے گی۔"

اسی وقت کوٹھی کے باہر کسی گاڑی کے آنے اور رکنے کی آواز سنائی دی۔ شازیہ نے فوراً ہی بستر سے اٹھ کر کہا۔

"کوئی آیا ہے۔ پولیس والے بھی ہو سکتے ہیں۔ اب تمہیں بڑی خوبصورتی سے ایک شوہر کا رول ادا کرنا ہو گا۔ میں بار بار تمہیں دھمکی نہیں دینا چاہتی۔ چلو اب ہم ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر ہنستے بولتے رہیں گے۔"

جمشید اس کے حکم کے مطابق مسکرانے پر مجبور ہو گیا۔ وہ دونوں مسکراتے ہوئے اور باتیں کرتے ہوئے ڈرائنگ روم میں پہنچے تو اسی وقت ڈرائنگ روم کا بیرونی دروازہ کھلا۔ شازیہ ایک دم سے ٹھٹک گئی۔ اگر سامنے پولیس والے ہوتے تو وہ اس قدر پریشان نہ ہوتی۔ مگر وہاں صفیہ کو دیکھ کر ایک دم سے شازیہ کا رنگ بدل گیا۔ جذبات و احساسات بدل گئے۔ اندر سے شاہد انگڑائی لینے لگا۔ اس کے سامنے اس کی دلنواز شریک حیات کھڑی ہوئی تھی۔ حنائی رنگ کی ساڑھی میں اس کے جسم کے نشیب و فراز پکار رہے تھے۔ اس کی گوری اور گلابی رنگت اور چہرے کی چکناہٹ پر نظریں پھسل رہی تھیں۔ اب وہ جو شاہد بن چکا تھا۔ خود کو اپنی محبوبہ کی طرف بڑھنے سے روک رہا تھا مگر بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ لوہا اگر مقناطیس کی طرف نہ بڑھے تو مقناطیس لوہے کی طرف کھنچا چلا آتا ہے۔ صفیہ تیزی سے چلتی ہوئی پہلے جمشید کے پاس آئی پھر اس نے خوش ہو کر پوچھا۔

"بھائی جان جلدی سے بتائیے یہ میری شازیہ بھابی ہیں نا؟ میں اپنی بھابی کو گلے لگاؤں گی۔"

گلے لگنے کی بات سن کر بھابی جان کا دل دھڑکنے لگا جمشید کی طرف سے اثبات میں

جواب پا کر صفیہ دونوں باہیں پھیلا کر آگے بڑھی۔

"ہائے میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میری بھابی اتنی خوبصورت ہوں گی۔"

یہ کہتے ہی وہ گلے میں باہیں ڈال کر لپٹ گئی۔ اپنی جان حیات کو اپنی جان سے لگتے دیکھ کر وہ خود کو پتھر نہ بنا سکا۔ ایک دم سے اسے بازوؤں کے حصار میں لے کر جکڑ لیا۔ اس کے ہاتھ صفیہ کی پشت پر پھسلنے لگے۔ اس کے ہونٹ جھکتے ہوئے صفیہ کے شانے اور گردن کے سنگم پر ٹھہر گئے۔ صفیہ بھابی سمجھ کر آئی تھی۔ چند لمحوں تک تو بھابی ہی سمجھتی رہی پھر اچانک اسے یوں لگا جیسے وہ اپنے شاہد کی آغوش میں آ گئی ہو۔ کہیں نہ کہیں سے شاہد کے پیار کا انداز کھٹک رہا تھا۔

وہ ہڑبڑا کر الگ ہو گئی اور الجھی ہوئی نظروں سے اپنی شازیہ بھابی کو دیکھنے لگی۔ دو عورتیں ایک دوسرے کے روبرو کھڑی تھیں اور اپنے اپنے جذبات و تاثرات کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ شازیہ حتی الامکان شازیہ ہی بننے کی کوشش کر رہی تھی اور صفیہ سوچ رہی تھی کہ اس کی بھابی ایک عورت ہو کر ایک مرد کے انداز میں کس طرح پیار کر رہی تھی۔ وہ بھی شاہد کے انداز میں۔

شاہد کا انداز یہی تھا کہ وہ آغوش میں لیتے ہی اس کے شانے اور گردن کے سنگم پر ہونٹ رکھ دیتا تھا اور اس کے ہاتھ بے اختیار پشت کو سہلانے لگتے تھے۔ پھر بازوؤں کی گرمی اور بدن کے پسینے کی مہک اپنی عورت سے چھپائے نہیں چھپتی۔ صفیہ کے جی میں آیا کہ ایک بار پھر اپنی بھابی کی آغوش میں چلی جائے۔ شاہد صبح سے بچھڑا ہوا تھا۔ بھابی کی آغوش میں کم از کم اس کی یاد تازہ ہو جاتی وہ تھوڑی دیر کے لئے بہل جاتی۔

مگر وہ ایسا نہ کر سکی۔ کچھ یوں شرمانے لگی جیسے بھابی کے پاس جائے گی تو کسی غیر کے پاس پہنچ جائے گی۔ شازیہ نے اس کے جھجکنے اور شرمانے سے فائدہ اٹھا کر کہا۔

"صفیہ تمہارے بھائی جان تمہاری بہت تعریفیں کر رہے تھے۔ واقعی تم اتنی اچھی ہو کہ تمہیں خوب پیار کرنے کو جی چاہتا ہے مگر ابھی تو میں بہت ضروری کام سے جا رہی ہوں۔ پھر کبھی اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کروں گی..........."

وہ صفیہ کا جواب سنے بغیر کوٹھی سے باہر آ گئی۔ بلکہ آ گیا کہنا چاہئے۔ کیونکہ اب شازیہ کے روپ میں شاہد تڑپ رہا تھا مگر تڑپنے سے کیا ہوتا ہے۔ اس نے جمشید کے ساتھ ایسا ناٹک رچایا تھا کہ اب شاہد کے روپ میں دو چار دنوں تک اپنی صفیہ سے نہیں مل سکتا تھا۔ انسان اپنی آسودگی کے لئے اور اپنے تحفظ کے لئے کتنی ہی چالیں چلتا ہے مگر

اپنی ہی کسی چال میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔ ایک طرف سے سنبھلتا ہے تو دوسری طرف سے ٹھوکر کھاتا ہے۔

اب وہ تنہا تھا۔ شازیہ کے روپ میں جمشید کے پاس وقت نہیں گزارنا چاہتا تھا۔ وہاں اس کے لئے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ساری دلچسپیاں صفیہ کی طرف لے جانا چاہتی تھیں۔ مگر وہ تو جمشید سے کہہ چکا تھا کہ شاہد کے جسم پر تشدد کے نشانات ہیں۔ جب تک وہ نشانات نہیں مٹیں گے شاہد کو رہا نہیں کیا جائے گا۔ یعنی اس نے خود ہی اپنی صفیہ تک پہنچنے کے راستے مسدود کر دیئے تھے۔

وہ رات کو بہت دیر تک اپنی کار میں بیٹھا اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ پھر اپنے خفیہ اڈے پر پہنچ کر صفیہ سے ٹیلی فون پر رابطہ قائم کیا۔ وہ بیچاری محبت کی ماری اس کے انتظار میں جاگ رہی تھی۔ فون پر اس کی آواز سنتے ہی خوشی سے چہکنے لگی۔

"شاہد! اللہ یوں لگ رہا ہے جیسے میں صدیوں کے بعد آپ کی آواز سن رہی ہوں۔ آپ کہاں ہیں؟ جلدی کیوں نہیں آتے۔ دیکھئے آپ ابھی نہیں آئیں گے تو میں رونے لگوں گی۔"

وہ قانون سے لڑنے والا بھروپیا پہلے نہیں جانتا تھا کہ مرد بھی کبھی روتے ہیں۔ آج اس کی صفیہ نے رونے کی بات چھیڑی تو اس کا دل بھی رونے لگا۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"میری جان میری زندگی کی ایک ایک سانس میں تم بسی ہوئی ہو۔ میں اس وقت بھی تمہارے ہی نام سے سانسیں لے رہا ہوں۔ تم سے ایک لمحے کی جدائی بھی گوارا نہیں ہے مگر کیا کروں ایک کام کی وجہ سے یہاں مجبوراً رکنا پڑ رہا ہے۔"

"کیا آپ ابھی نہیں آئیں گے؟ خدا کے لئے انکار میں جواب نہ دیں۔ نہیں تو میں مر جاؤں گی۔"

وہ الجھ کر رہ گیا۔ ایسی محبت کرنے والی ہستی پہلی بار اس کی زندگی میں آئی تھی جو اس کی جدائی میں اپنی جان دے سکتی تھی۔ وہ ایک دم سے پگھلنے لگا۔ اس نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"صفیہ میری جان۔ تم ذرا سمجھنے کی کوشش کرو۔ یہاں میرا کام کچھ بڑھ گیا ہے۔ ویسے میں بہت جلد تمہارے پاس پہنچنے کی کوشش کروں گا۔ اگر تمہارا دل نہ لگے تو تم اپنے جمشید بھائی کے پاس چلی جاؤ۔"

"اوہ شاہد! یہ بتانا تو میں بھول ہی گئی۔ میں شام کو بھائی جان کے پاس گئی تھی۔ وہاں شازیہ بھابی سے ملاقات ہو گئی۔"

"اچھا۔" شازیہ نے انجان بن کر پوچھا۔ "کیسی ہیں تمہاری شازیہ بھابی؟"

"اللہ' بہت خوبصورت ہیں۔ میں تو ان سے لپٹ گئی تھی مگر۔ مگر پھر مجھے ان سے ڈر بھی لگنے لگا۔ آپ شاید یقین نہ کریں بھابی نے بالکل آپ کے انداز میں پیار کیا تھا۔ بالکل یہاں شانے اور گردن کے پاس۔ اف اللہ میرا بدن گرم ہو رہا ہے۔ کپکپی سی طاری ہو رہی ہے۔ آجایئے نا"

شاہد کے ہاتھ میں بھی ریسیور کانپنے لگا۔ اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

"یہ۔ یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ جب تک میں نہ آؤں تم اپنی بھابی کے پاس جاکر سو جاؤ۔ اس طرح تم تھوڑی دیر کے لئے مجھے بھول جاؤ گی۔"

"خدا نہ کرے کہ میں آپ کو بھولوں۔ آپ کو بھولنے سے پہلے مرجاؤں گی مگر میرا ذہن الجھ کر رہ گیا ہے شاہد۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کے پیار کا انداز شازیہ کو کس طرح آگیا........"

وہ تفصیل سے بتانے لگی کہ شاہد اور شازیہ کے پیار کے انداز میں کس قدر ہم آہنگی ہے۔ حتیٰ کہ شازیہ کے جسم سے شاہد کے پسینے کی مہک آ رہی تھی۔ اس کی باتیں سن کر شاہد گڑبڑا گیا۔ آج تک بڑے بڑے پولیس آفیسر بڑے بڑے نامور جاسوس اس کی گرد کو نہیں پا سکے تھے۔ صفیہ اس کے پسینے کی مہک سے اسے شازیہ کے اندر ٹٹول رہی تھی۔ اس طرح تو بڑا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔

اس نے جلد ہی صفیہ سے ملنے کا وعدہ کر کے ریسیور رکھ دیا۔ پھر بے چینی سے اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ اپنی چھپی ہوئی پہچان تک پہنچنے والی صفیہ کو وہ کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا۔ اپنی زندگی کو کوئی اپنے ہاتھوں سے نہیں مارتا۔ اب یہی صورت رہ گئی تھی کہ وہ شازیہ کے روپ کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دے۔ تاکہ صفیہ آئندہ بھابی کے بدن کی خوشبو تک نہ پہنچ سکے۔

شازیہ کا روپ ختم کرنے سے پہلے جمشید کو راستے سے ہٹانا بے حد ضروری تھا کیونکہ شازیہ کا روپ ختم ہونے کے بعد جمشید اس کی کوٹھی پر قابض ہو جاتا۔ وہ ایک کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔ پھر ایک سگریٹ سلگا کر سنجیدگی سے سوچنے لگا۔

"میں پہلے جمشید کو ہمیشہ کے لئے راستے سے ہٹاؤں گا۔ پھر صفیہ کو کچھ دنوں کے

لئے شہر سے باہر لے جاؤں گا۔ تاکہ وہ اپنے بھائی اور اپنی بھابی سے نہ مل سکے۔ اس کے بعد میں شازیہ کے روپ کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دوں گا۔ پولیس والوں سے چھپنے کے لئے مجھے صفیہ جیسی شریک حیات کا سہارا مل گیا ہے۔ میں ایک باعزت اور شریفانہ زندگی گزار رہا ہوں۔ کوئی مجھ پر شبہ نہیں کرے گا۔"

وہ بہت دیر تک سوچتا رہا اور اپنے نئے منصوبوں کا ہر پہلو سے جائزہ لیتا رہا۔ پھر وہ فون کے پاس آکر اور ریسیور اٹھا کر اس کوٹھی کے نمبر ڈائل کرنے لگا جہاں جمشید موجود تھا۔ رابطہ قائم ہوتے ہی اس نے شاہد کی آواز میں اسے مخاطب کیا۔

"ہیلو جمشید بھائی! میں اس وقت ڈاکٹر جبار کے پرائیویٹ ہسپتال سے باتیں کر رہا ہوں۔ شازیہ اور اس کے آدمیوں نے مجھے چھوڑ دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی دھمکی بھی دی ہے کہ میں فی الحال آپ سے نہ ملوں اور پولیس والوں سے رابطہ قائم نہ کروں۔ ورنہ دوسری بار وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ میں نے آپ کو یہ کہنے کے لئے فون کیا ہے کہ آپ فی الحال مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کریں۔ کل صبح میں کسی وقت صفیہ کے پاس چلا جاؤں گا اور اسے سمجھا دوں گا کہ ایک حادثے میں مجھے چوٹیں آئی ہیں۔ اگر آپ میری زندگی چاہتے ہیں تو خدا کے لئے آئندہ شازیہ کو شکایت کا موقع نہ دیں۔"

دوسری طرف سے جمشید کی آواز سنائی دی۔

"شاہد! تمہارے دم سے میری بہن کا سہاگ قائم ہے۔ میں تمہارے لئے اپنی جان دے دوں گا اور آئندہ شازیہ کو تمہارے سائے تک بھی پہنچنے نہیں دوں گا۔ تم اطمینان رکھو میں شازیہ سے کوئی فیصلہ کرنے کے بعد ہی تم سے ملوں گا۔"

جمشید نے اتنا کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔ اب اس کے دل میں بیک وقت اطمینان بھی تھا اور بے چینی بھی۔ اطمینان اس لئے کہ شاہد اس ناگن کے چنگل سے نکل گیا تھا اور بے چینی اس لئے کہ ناگن ابھی زندہ تھی۔ وہ پھر کسی وقت ڈسنے کے لئے تیار ہو سکتی تھی۔ وہ بہت دیر تک سوچتا رہا کہ اب اسے کیا کرنا چاہئے۔ اتنے میں شازیہ آگئی۔ اس نے آتے ہی کہا۔

"میں تمہیں بہت بڑی خوشخبری سنانے آئی ہوں۔ میں نے تمہارے بہنوئی کو آزاد کر دیا ہے۔ شاید وہ اب تک تمہاری بہن کے پاس پہنچ گیا ہو گا۔ یا کہیں اپنے زخموں کی مرہم پٹی کروا رہا ہو گا۔"

جمشید کو پہلے ہی اس کی رہائی کی اطلاع مل چکی تھی۔ اس نے انجان بن کر کہا۔

"واقعی یہ میرے لئے بہت بڑی خوشخبری ہے۔ تم نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ میں یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔"

"یہ سب زبانی باتیں ہیں۔ تم میرے احسانات کو بھول جاتے ہو۔ اگر تمہیں موقع ملے گا تو تم میری جان کے دشمن بن جاؤ گے۔"

"نہیں شازیہ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں تمہارے خلاف بھی کوئی بات نہیں سوچوں گا۔ تمہارے ہر حکم کی تعمیل کروں گا۔ تم مجھے آزما کر دیکھ لو۔"

"ہاں! میں تمہیں آزمانے آئی ہوں۔ کیا تم ابھی اس جگہ جاؤ گے جہاں ہماری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔"

"تم مجھے سمندر کے ساحل پر جانے کے لئے کہہ رہی ہو۔"

"ہاں اسی شکستہ کاٹیج میں۔ جہاں شاید اب تک پھانسی کا پھندہ لٹک رہا ہو گا۔ تم ابھی اور اسی وقت روانہ ہو جاؤ۔ کسی ٹیکسی میں جانا اور کاٹیج سے بہت دور اس ٹیکسی کو چھوڑ دینا۔"

جمشید نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ فوراً ہی کوٹھی سے باہر آ گیا۔ مین روڈ پر پہنچ کر اسے ایک ٹیکسی مل گئی۔ ٹیکسی میں بیٹھ کر کاٹیج کی طرف جاتے ہوئے وہ یہ بات اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ آج رات زندگی اور موت کا فیصلہ ہے۔ شازیہ اس کے پیچھے ضرور آئے گی۔ ان دونوں میں سے کسی کو زندگی ملے گی اور کسی کو موت۔ وہ ٹیکسی کی کھڑکی سے باہر شہر کی گزرتی ہوئی رونق کو دیکھنے لگا۔ شہر گزر جاتا ہے۔ رونقیں گزر جاتی ہیں۔ جب زندگی تمام ہو جاتی ہے۔

آج سے تقریباً دو ہفتہ پہلے وہ اپنی مرضی سے پھانسی کے پھندے کو گلے لگانے گیا تھا۔ اس وقت زندگی اتنی خوبصورت نہیں تھی۔ دولت اور اتنی آسائشیں نہیں تھیں۔ اب دنیا کی ساری نعمتیں پانے کے بعد اب انہیں اپنے ہاتھوں سے کھو دینے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ کوئی پاگل ہی اچھی بھلی زندگی کا خاتمہ کر سکتا تھا اور وہ پاگل نہیں تھا۔

کاٹیج سے بہت دور اس نے ٹیکسی چھوڑ دی اور پیدل ہی کاٹیج کی طرف جانے لگا۔ ریت میں اس کے پاؤں دھنس رہے تھے۔ جیسے ہر قدم پر زندگی اس کے پاؤں پکڑ رہی ہو کہ وہ موت کی طرف نہ جائے مگر وہ خود کو کشاں کشاں اس طرف لئے جا رہا تھا۔ اس لئے کہ اپنی زندگی سے زیادہ بہن کا سہاگ عزیز تھا۔

کاٹیج میں پہنچ کر اس نے دیکھا۔ چھت کی شہتیر سے پھانسی کا پھندہ اسی طرح لٹک رہا

ہے۔ اب وہ گرد آلود ہو چکا تھا۔ تعجب ہے کہ دو ہفتوں کے دوران وہاں کوئی نہیں آیا تھا۔ اگر کوئی آیا ہوتا تو اس پھندے کو ضرور وہاں سے ہٹا دیتا۔ مگر تقدیر جہاں موت لکھ دیتی ہے وہ جگہ کسی نہ کسی طرح محفوظ رہ جاتی ہے۔

پھندے کے نیچے اسی طرح ایک کرسی رکھی ہوئی تھی۔ شکستہ پلنگ ایک طرف کھسکا ہوا تھا اور پلنگ کے پاس ہی وہ کدال پڑی ہوئی تھی۔ جسے دیکھ کر اس نے سوچا تھا کہ کدال موجود ہے مگر شاید اس کی قبر کھودنے کوئی نہیں آئے گا۔ تھوڑی دیر بعد شازیہ بھی وہاں آ گئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ دروازے پر کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ریوالور تھا۔ وہ اسے ریوالور کی زد میں رکھ کر آگے بڑھتے ہوئی بولی۔

"جمشید۔ میں نے صرف آج رات تک کے لئے تمہاری زندگی خریدی تھی مگر میں نہیں چاہتی کہ فائرنگ کی آواز دور تک جائے بہتر یہ ہو گا کہ تم اپنے وعدے کے مطابق خود ہی اس پھندے کو گلے لگا لو۔"

جمشید نے رضامندی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں! میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ اپنا وعدہ پورا کرنے کا وقت آ چکا ہے۔ یوں بھی میں اس لئے خوشی سے مرنا چاہتا ہوں کہ تمہاری دشمنی میرے بہنوئی سے نہیں مجھ سے ہے۔ میں مرجاؤں گا تو تم اس کا پیچھا چھوڑ دو گی۔"

یہ کہہ کر وہ کرسی پر چڑھ گیا۔ پھانسی کے پھندے تک پہنچ گیا۔ پھندے کو گلے میں ڈالنے سے پہلے اس نے رسی کو کھینچ کر اس کی مضبوطی کا جائزہ لیا۔ پھر اسے کھینچ کر دیکھنے کے دوران ہی وہ اک بارگی رسی سے لٹکتا ہوا شازیہ کی طرف آیا اور اس کے منہ پر ایک ٹھوکر ماری۔ منہ پر ٹھوکر پڑتے ہی وہ ایک طرف جا گری اور ریوالور دوسری طرف جا پڑا۔ جمشید کدال کے پاس پہنچ گیا تھا۔ پھر شازیہ کے سنبھلنے اور زمین سے اٹھنے سے پہلے کدال چل پڑی۔ اس کی نوک شازیہ کی کمر میں پیوست ہو گئی۔ جمشید نے کدال کو ایک طرف پھینک کر اس کی گردن دبوچ لی۔ اسے چیخنے چلانے کا موقعہ ہی نہیں دیا۔ اسے کھینچتا ہوا کرسی کے پاس لے آیا۔ شازیہ کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ اس کی مدافعت بہت ہی کمزور تھی۔ اس لئے جمشید کو زیادہ جدوجہد نہیں کرنی پڑی۔ وہ اس کی گردن دبوچ کر اسے کھینچتا ہوا کرسی پر چڑھ گیا۔ پھر پھندے کو اس کے گلے میں ڈال کر اسے اچھی طرح کس دیا۔ ایسی حالت میں پہلی بار شازیہ کے حلق سے مردانہ آواز نکلی۔ جمشید نے کرسی کو ایک طرف گراتے ہوئے نفرت سے کہا۔

"سالی مرتے وقت مرد کی آواز میں چیخ رہی ہے۔"

وہ سالی دوسری بار چیخنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ پھندے نے اس کی آواز ختم کر دی' اور وہ جو حقیقت میں سالا تھا وہ اس کے تڑپنے اور مرنے کا منظر دیکھ رہا تھا اور آئندہ کی پلاننگ کر رہا تھا کہ اب وہ کدال سے اسی جگہ قبر کھودے گا اور اس میں شازیہ کو ہمیشہ کے لئے چھپا دے گا۔

"اب میری بہن کی آنکھوں میں آنسو نہیں آئیں گے۔ اب اس کے انتظار کی گھڑیاں ختم ہو جائیں گی۔ میں کیا کروں میں مجبور تھا۔ کبھی کبھی بہن کے سہاگ کی سلامتی کے لئے بھائی کو قاتل بننا پڑتا ہے۔ میں قاتل ہوں مگر اپنی بہن کے سہاگ کا محافظ ہوں...."

وہ کدال اٹھا کر قبر کھودنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد لاش زمین کی تہہ میں چھپ جائے گی۔ بہروپیا پولیس کی فائل میں رہ جائے گا اور لوگ انتظار کرتے رہیں گے کہ دیکھئے وہ کب بے نقاب ہوتا ہے۔ اپنی زندگی میں یا اپنی موت کے بعد؟

☆======☆======☆

ناقابلِ شکست

ایک پٹھان بازی گر کا حیرت انگیز قصہ جو ناقابل شکست تھا۔
ایک خود سر انگریز کی جھوٹی انا اس ناقابل شکست انسان کو اپنے قدموں میں جھکانا چاہتی تھی۔
ایک خوبصورت اور تاثر انگیز کہانی۔

اس کی دونوں ٹانگیں آسمان کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ اپنی دو ہتھیلیوں کے بل پر الٹا کھڑا ہوا تھا۔ یہ کوئی حیرت انگیز کمال نہ تھا۔ ایسا تو سب ہی کرتے ہیں۔ اس لئے مجمع خاموش رہا۔ کسی نے تالی نہیں بجائی۔ وہ چند لمحوں تک دونوں ہتھیلیاں زمین پر ٹیکے الٹا کھڑا رہا۔ پھر اس نے بائیں ہتھیلی زمین پر سے اٹھالی۔ اب وہ دائیں ہتھیلی پر اپنے جسم کا بوجھ اٹھائے آسمان کو لاتیں دکھا رہا تھا۔

تماشائیوں میں سے چند ایک نے یوں سر ہلایا جیسے خاموشی سے داد دے رہے ہوں۔ وہ آہستہ آہستہ ایک ٹانگ کو اپنی پشت کی جانب اور دوسری ٹانگ کو آگے سینے کی جانب جھکانے لگا۔ اس حرکت سے پتہ چلتا تھا کہ وہ اب تب میں زمین پر گر پڑے گا لیکن وہ اسی طرح دائیں ہتھیلی کے بل پر الٹا کھڑا طرح طرح کی حرکتیں کرتا رہا اور تماشائیوں سے داد وصول کرتا رہا۔ اس کے چاروں طرف رہ رہ کر تالیاں بجتی رہیں۔ پھر اس نے ناقابلِ یقین کرتب دکھایا۔ وہ ایک ہاتھ سے زمین پر مینڈک کی طرح پھدکنے لگا۔ دونوں ٹانگیں آسمان کی طرف یوں چلنے لگیں جیسے وہ ٹانگیں سائیکل چلا رہی ہوں۔ ایسی حالت میں ایک ہاتھ پر تمام جسم کا توازن قائم رکھتے ہوئے پھدکتے رہنا ایک ناقابلِ یقین عمل تھا مگر سب اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ مسلسل پھدکتا ہوا شامیانے کی طرف جا رہا تھا' جہاں راجہ بھیم سین اور ریذیڈنٹ والٹن ڈیوڈ مخملی گدوں کی آرام دہ کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔

دیوالی کا تہوار تھا۔ راج محل کے در و دیوار ہزاروں دیوں کی روشنی سے جگمگا رہے تھے۔ شامیانے میں گیس کے ہنڈے روشن تھے۔ کچھ دیر پہلے آتش بازی کا تماشا ہو چکا تھا۔ اب ایک پٹھان بازی گر تماشا دکھا رہا تھا وہ ایک ہاتھ سے پھدکتا ہوا اسی طرح سر نیچے اور ٹانگیں اوپر کئے ان کے سامنے آ کر رک گیا۔ وہ تماشے کا آغاز تھا اور آغاز کے وقت اپنے حاکم کو سلام کرنا لازم تھا۔

لیکن وہاں حاکم کون تھا؟ راجہ بھیم سین یا ریذیڈنٹ والٹن ڈیوڈ؟

بھیم سین صرف شانتی نگر کا راجہ تھا۔ اس علاقے کا حاکم تھا اور والٹن ڈیوڈ انگریز آقا تھا۔ پورے ہندوستان پر ان کی حکومت تھی۔ وہ بڑے فخر سے کہتے تھے کہ سلطنت برطانیہ میں سورج کبھی غروب نہیں ہوتا۔ اگر ان کے ایک مقبوضہ علاقے میں غروب ہوتا ہے تو دوسرے مقبوضہ علاقے میں اسی وقت طلوع ہو جاتا ہے۔ اس لحاظ سے ان کی سلطنت میں کبھی اندھیرا نہیں ہوتا۔ ہندوستان کے جتنے راجے مہاراجے تھے' سب ان کے سامنے ہاتھ جوڑتے تھے۔ خراج کے طور پر نقدی بھی دیتے تھے' باغیوں کو کچلنے کے لئے تربیت یافتہ سپاہی بھی تیار رکھتے تھے اور انہیں خوش رکھنے کے لئے اپنے دیس کی سندر کنواریاں بھی پیش کرتے تھے۔

اس وقت بھی راجہ اور ریذیڈنٹ کے درمیان بھیم سین کی اکلوتی بیٹی راجکماری پدمنی اپنے حسن و شباب کی جلوہ سامانیوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی بڑی دلچسپی سے پٹھان بازی گر کو دیکھ رہی تھی۔ وہ پہاڑی بازی گر گورے رنگ کا گبرو جوان تھا۔ جسم فولاد کا تھا۔ سینہ چٹان کی طرح چوڑا تھا اور چہرے پر مردانگی ایسی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی کہ اسے دیکھتے ہی کنواریوں کے دل دھڑکنے لگتے تھے۔

راجکماری پدمنی کی ہرنی جیسی آنکھیں اشتیاق سے پھیلی ہوئی تھیں اور وہ مر مٹنے کے انداز میں اسے دیکھے جا رہی تھی۔ بازی گر اسی طرح دایاں ہاتھ زمین پر ٹیکے الٹا کھڑا ہوا تھا۔ اس نے ایک نظر پدمنی پر ڈالی۔ اس کا بایاں ہاتھ آزاد تھا۔ اس نے بائیں ہاتھ سے پہلے والٹن ڈیوڈ کو سلام کیا۔

وہ بائیں ہاتھ سے سلام کرنے پر اس لئے مجبور تھا کہ دائیں ہاتھ سے کرتب دکھا رہا تھا لیکن یہ آقاؤں کی توہین تھی کہ دائیں ہاتھ سے سلام کرنے والا مسلمان بائیں ہاتھ سے سلام کرے۔ راجہ بھیم سین کے پیچھے کھڑے ہوئے سیناپتی کو نمک حلالی دکھانے کا موقع مل گیا۔ وہ ہاتھ میں لانبی سی بید لئے گرجتا ہوا اس کی طرف آنے لگا۔

"بدتمیز۔ گستاخ! صاحب بہادر کو بائیں ہاتھ سے سلام کرتا ہے۔ میں تیری کھال کھینچ لوں گا۔"

اس نے دانستہ گرج کر اس لئے کہا کہ اس کے آقاؤں نے بائیں ہاتھ کے سلام پر توجہ نہ دی ہو تو اب اس کی بدتمیزی کو سمجھ لیں۔ راجہ بھیم سین نے تائید میں سر ہلا کر والٹن ڈیوڈ کو انگریزی زبان میں بتایا کہ اس کا سیناپتی بازی گر کو کس جرم کی سزا دینے جا رہا ہے۔

والٹن ڈیوڈ نے بھی سر ہلا کر سزا دینے کی اجازت دی۔ راجکماری پدمنی کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ سیناپتی کے ہاتھ میں بید بجلی کی طرح فضا میں لہرائی۔ بازی گر اتنی ہی پھرتی سے ایک ہاتھ کے سہارے یوں اچھلا کہ بید اس کے نیچے سے گزر گئی اور وہ الٹ کر دونوں پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔

اس نے کھڑے ہوتے ہی جھک کر دائیں ہاتھ سے سلام کیا لیکن سلام قبول نہیں ہو سکتا تھا۔ معافی کا وقت گزر چکا تھا اور سیناپتی کا وار بھی خالی گیا تھا اس لئے اس نے دوبارہ بید سے حملہ کیا۔ وہ حملہ بھی ناکام رہا۔ بازی گر اچھل کر بید کی پہنچ سے دور ہو گیا تھا۔ پھر تو سیناپتی جنونی انداز میں حملے کرنے لگا۔ بید دائیں بائیں' اوپر نیچے شائیں شائیں کرتی بجلی کی طرح لہرا رہی تھی اور وہ بجلی کی سی تیزی سے خود کو بچا رہا تھا۔ بندر کی طرح اِدھر سے اُدھر اچھل رہا تھا۔ قلابازیاں کھا رہا تھا۔ سارے تماشائی گم صم ہو کر وہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ راجکماری میں برداشت کا حوصلہ نہ رہا تھا۔ وہ بیٹھے بیٹھے کرسی پر آگے کھسک آئی۔ والٹن ڈیوڈ کن انکھیوں سے راجکماری کی نگاہوں کو تاڑ رہا تھا اور اس کے سینے کے زیرو بم کو سمجھ رہا تھا کہ وہ زرخیز سینہ ایک بازی گر کے لئے ہانپ رہا ہے۔

بازی گر نے ایک بار اتنی اونچی قلابازی کھائی کہ سیناپتی کے سر پر سے گزرتا ہوا اس کے پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ ایسا کمال تھا کہ راجکماری بے اختیار تالیاں بجانے لگی۔ دوسرے عام تماشائی ضبط کئے بیٹھے تھے۔ بازی گر خواہ کیسے ہی کمالات دکھائے وہ راجہ صاحب اور صاحب بہادر سے پہلے تالیاں بجا کر داد نہیں دے سکتے تھے۔ پھر یہ کہ اس وقت سیناپتی اسے سزا دینے کی کوشش میں ناکام ہو رہا تھا۔ ایسی صورت میں تالیاں بجانا گویا جلتی پر تیل چھڑکنا تھا لیکن راجکماری کی شہ پاتے ہی مجمع بے قابو ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چاروں طرف سے تالیوں کا شور گونجنے لگا۔ سیناپتی غصے سے تھر تھر کانپتے ہوئے چاروں طرف گھوم گھوم کر مجمع کو دیکھنے لگا۔ جس طرف وہ دیکھتا تھا' اس طرف کے لوگ سہم کر تالیاں بجانا بند کر دیتے تھے۔

اس دوران سیناپتی کو ہانپنے اور اپنی سانسیں درست کرنے کا موقعہ مل گیا۔ وہ تازہ دم ہونے کے بعد بازی گر کو دیکھتے ہوئے پھر غرانے لگا اور اس پر حملہ کرنے کے لئے پینترے بدلنے لگا۔ اسی وقت والٹن ڈیوڈ اپنی نشست چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے اٹھتے ہی سارا مجمع عزت و احترام کے لئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ راجہ بھیم سین نے خوشامدانہ انداز میں ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"حضور! یہ پٹھان بہت ہی بدتمیز ہوتے ہیں۔ ہم ابھی آپ کے سامنے اسے کوڑے لگواتے ہیں۔"

"نو۔ میں دیکھتا ہوں کہ یہ کتنا پھرتیلا ہے۔" والٹن ڈیوڈ نے ہاتھ اٹھا کر اپنی زبان میں کہا۔ "میں اسے کچل دوں گا۔ میں نے بڑے سے بڑے تیس مار خاں کو اپنی ٹھوکروں سے اڑا دیا ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے فخر سے راجکماری کو دیکھا اور اپنا گنبد نما ہیٹ سر سے اتار کر ملازم کی طرف بڑھایا' دوسرا ملازم اس کا لانگ کوٹ اتارنے لگا۔ راجکماری پدمنی اس کی جسامت دیکھ کر سمجھ رہی تھی کہ پٹھان بازی گر پھونک مارے گا تو صاحب بہادر اڑ جائیں گے۔ وہ صرف اقتدار کے نشے میں اس کے مقابلے پر جا رہے تھے۔

راجہ بھیم سین کی آنکھوں سے پریشانی عیاں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ انگریز حاکم اپنی رعایا کو کیڑے مکوڑے سمجھتے ہیں۔ ان کے سر اٹھاتے ہی انہیں خاک میں روند ڈالتے ہیں۔ دوسری طرف وہ بازی گر پٹھان تھا۔ پٹھانوں کی ضد اور غصہ مشہور ہے۔ وہ ٹوٹنا جانتے ہیں' جھکنا نہیں جانتے۔ اگر وہ جھکنے پر آمادہ نہ ہوا تو والٹن کی توہین تاج برطانیہ کی توہین ہو گی۔ پھر راجہ بھیم سین پر سے انگریزوں کی تمام مہربانیاں اٹھ جائیں گی اور ساری شان و شوکت دھری کی دھری رہ جائے گی۔

☆======☆======☆

والٹن ڈیوڈ میدان میں اتر کر مقابلے سے پہلے ہی ایک فاتح کی طرح اکڑتا ہوا بازی گر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ راجہ بھیم سین نے بازی گر کو اپنی زبان میں مخاطب کیا تاکہ وہ زبان والٹن کی سمجھ میں نہ آئے۔ اس نے کہا۔

"اے نٹ راج! اچھی طرح سن لے۔ صاحب بہادر کے مقابلے پر کبھی ہاتھ نہ اٹھانا۔ اگر وہ حملہ کریں تو ان کا کوئی حملہ خالی نہ جائے ورنہ وہ تم پر شکاری کتے چھوڑ دیں گے اور تم حرام موت مارے جاؤ گے۔ اپنی زندگی چاہتے ہو تو یہ ہمیشہ یاد رکھو کہ تم خاک کے کیڑے ہو اور کیڑے ہمیشہ پیروں تلے روندے جاتے ہیں۔"

پٹھان بازی گر راجہ صاحب کا حکم سن رہا تھا اور محتاط نظروں سے والٹن ڈیوڈ کو دیکھ رہا تھا۔ والٹن وزنی بوٹ پہنے ہوئے تھا۔ جسم پر پتلون اور قمیض تھی۔ پتلون کے ایلاسٹک بیلٹ سینے اور شانے پر سے ہوتے ہوئے پیچھے کی طرف چلے گئے تھے۔ ان دنوں انگریز ہاف پینٹ اور فل پینٹ میں اسی قسم کے بیلٹ استعمال کرتے تھے۔ اس نے بازیگر کے

بالکل قریب آ کر پوچھا۔

"یور نیم؟"

سیناپتی نے بازی گر سے کہا۔ "صاحب بہادر پوچھتے ہیں کہ تمہارا نام کیا ہے؟"

"خرم!"

اس نے جیسے ہی اپنا نام بتایا' والٹن نے اس کی طرف ایک گھونسہ رسید کیا۔ خرم غافل نہیں تھا' اس نے کھڑے ہی کھڑے اپنی ٹھوڑی اوپر اٹھالی۔ والٹن کا گھونسہ ٹھوڑی کے نیچے سے گزر گیا۔

صاحب بہادر کا پہلا وار خالی جاتے ہی راجہ بھیم سین پر گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ اس نے طیش میں آ کر خرم سے کہا۔

"ارے او مورکھ! اگر تو یہاں سے زندہ سلامت جانا چاہتا ہے تو صاحب بہادر سے مار کھا لے۔ حاکم سے سب ہی مار کھاتے ہیں' تو بھی مار کھا لے گا تو اس میں تیری بے عزتی نہیں ہو گی' بلکہ تجھے انعام ملے گا۔ میں تجھے انعام دوں گا۔ تو صاحب بہادر سے جتنی مار کھائے گا' میں تجھے اتنے ہی چاندی کے سکے دوں گا۔"

اتنی باتیں سمجھانے تک والٹن کئی حملے کر چکا تھا اور خرم بندر کی طرح اچھل کر اور قلابازیاں کھا کر اس کے سامنے یوں کھڑا تھا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ اسے مارنا تو دور کی بات ہے' والٹن اسے چھو بھی نہ سکا تھا۔ تب راجکماری پدمنی نے کہا۔

"اے نٹ راج! تو بڑا بلوان ہے' پر تیری نادانی سے ہمیں بھی نقصان پہنچے گا۔ کیا تو نہیں جانتا کہ عورت خاوند سے مار کھا کر اپنا غصہ بچوں پر اتارتی ہے۔ اسی طرح یہ انگریز سرحدی پٹھانوں سے شکست کھاتے ہیں اور اپنا غصہ چھوٹے چھوٹے راجاؤں' نوابوں اور جاگیرداروں پر اتارتے ہیں۔ ابھی تیری بھلائی اسی میں ہے کہ تو اس سے مار کھا لے.........."

وہ اپنے کرتبوں کے ذریعے والٹن کے حملوں کو ناکام بنا رہا تھا اور اسے جھلاہٹ میں مبتلا کر رہا تھا۔ شامیانے کے قریب سے گزرتے وقت اس نے راجکماری پدمنی کی جانب ذرا سا سر گھما کر دیکھا۔ اسی وقت سیناپتی نے پیچھے سے ٹانگ اڑا دی۔ وہ سنبھل نہ سکا اور زمین پر گر پڑا۔

والٹن کو اچھا موقعہ مل گیا۔ وہ زمین پر گرے ہوئے اس پھرتیلے بازی گر کو کم از کم ایک لات مار سکتا تھا۔ اس خیال سے وہ فوراً ہی آگے بڑھا۔ خرم زمین پر سے اٹھنا چاہتا

تھا۔ اسی وقت والٹن نے اپنا دایاں پاؤں اٹھایا۔ وہ اپنے وزنی بوٹ سے اسے کچلنا چاہتا تھا۔ اب بھی وہ اپنے مقابل کو چیونٹی سمجھ رہا تھا۔ خرم نے ایک ہاتھ سے اس کے وزنی بوٹ کو تھام لیا۔ والٹن نے زور لگا کر اپنے پاؤں کو چھڑانا چاہا لیکن وہ پاؤں بازی گر کے آہنی پنجے میں جکڑا ہوا تھا۔ اس نے پھر ایک جھٹکے سے چھڑانے کی کوشش کی۔ بازی گر نے خود ہی اسے چھوڑ دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ والٹن اپنی ہی زور آزمائی کے جھٹکے سے دوسری طرف الٹ کر زمین پر گر پڑا۔

اس کے گرتے ہی راجہ بھیم سین دوڑتا ہوا میدان میں آیا۔ اس کے محافظ بھی اس کے ساتھ دوڑتے ہوئے آئے۔ تخت پر بیٹھنے والا راجہ زمین پر والٹن کے قریب بیٹھ کر اسے اٹھانے لگا۔ اپنے عمل سے یہ ثابت کرنے لگا کہ اپنے انگریز آقا کے ساتھ وہ بھی زمین پر آ سکتا ہے۔ اس کے لئے تخت کی بلندی چھوڑ کر پستی میں گر سکتا ہے۔ اس نے فوراً سپاہیوں کو حکم دیا کہ پٹھان بازی گر کو گرفتار کر لیں۔

حکم سنتے ہی سپاہیوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ان کے ہاتھوں میں تلواریں اور بندوقیں تھیں۔ خرم بے بسی سے اِدھر اُدھر گھوم کر دیکھنے لگا۔ وہ بازی گری کے بڑے بڑے کرتب دکھا سکتا تھا' مقابلے پر آئے ہوئے کسی ایک شخص کو تگنی کا ناچ نچا سکتا تھا لیکن اتنے سپاہیوں کے نرغے میں اپنی پھرتی اور چالاکی دکھانے کا مطلب اپنی موت کو دعوت دینا تھا۔

سپاہیوں نے اسے زنجیریں پہنا دیں۔ جب وہ اچھی طرح جکڑ لیا گیا اور اس بات کا یقین ہو گیا کہ اب وہ بازی گری کے ذریعے اپنا بچاؤ نہیں کر سکے گا تو سیناپتی اس پر گھونسے اور لاتیں برسانے لگا۔ اس نے کئی بار غرا کر سیناپتی پر جھپٹنے کی کوشش کی لیکن سپاہیوں نے اس کی زنجیریں کھینچ لیں۔

والٹن ڈیوڈ غصے میں طنطناتا ہوا شامیانے کے نیچے آ گیا اور اپنی جگہ پر بیٹھ کر پٹھان بازی گر کو گھورتے ہوئے سوچنے لگا کہ اسے کیسی عبرتناک سزا دی جائے۔ اگر اسے موت کی سزا دی جاتی تو وہ مرتے ہی زندگی کی دوسری سزاؤں سے آزاد ہو جاتا۔ اگر اسے کوڑے لگوائے جاتے اور دوسری سو طرح کی اذیتیں پہنچائی جاتیں تو وہ سزائیں مقابلے کی مناسبت سے منصفانہ نہ ہوتیں۔ سزا سناتے وقت مقابلے کا ذکر لازمی تھا تاکہ یہ ثابت ہو جائے کہ ایک غریب دو کوڑی کے بازی گر کو پورے انصاف سے سزا دی گئی ہے۔

وہ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا۔ راجہ بھیم سین اس کے سامنے خوشامدانہ انداز میں

والٹن کو کہہ رہا تھا کہ اس کی بوٹی بوٹی کاٹ کر اس کا قیمہ بنانے کی اجازت دی جائے۔
والٹن نے حکم دیا کہ خرم کو اس کے سامنے حاضر کیا جائے۔

چند سپاہی اس کی زنجیریں چاروں طرف سے کھینچتے ہوئے یوں لا رہے تھے جیسے کسی درندے کو جال میں پھانس کر قابو میں رکھنے کی کوشش کر رہے ہوں۔

والٹن ڈیوڈ نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "ابھی ہمارا مقابلہ ختم نہیں ہوا ہے۔ ہم برطانوی باشندے بہادروں کی قدر کرتے ہیں۔ کتنے ہی ہندو سپاہی ایسے ہیں جن کی بہادری سے خوش ہو کر انہیں وکٹوریہ کراس دیا گیا ہے۔ یہ بازی گر جو اپنا نام خرم بتاتا ہے' یقیناً بہادر ہے لیکن ہماری فوج کا سپاہی نہیں ہے۔ اس نے مجھ سے مقابلہ کیا ہے لیکن یہ اپنے حاکم سے مقابلہ کرنے کے آداب نہیں جانتا۔ یہ اگر ایک انگریز کو گراتا ہے تو گویا پوری انگریز قوم کو گرانے کا چیلنج کرتا ہے اور ہم چیلنج کرنے والوں کی گردنیں اڑا دیتے ہیں۔

لیکن افسوس کہ ابھی ہمارا مقابلہ ختم نہیں ہوا ہے۔ ہم اس کی گردن اڑانے کا حکم نہیں دے سکتے مگر ہاں تھوڑی بہت سزا دینا لازمی ہے تاکہ دوسروں کو عبرت حاصل ہو اور مقابلہ بھی جاری رہے۔

اس بازی گر نے اپنے دائیں ہاتھ سے ایک انگریز کی ٹانگ پکڑ لی تھی اور اسی ہاتھ سے اسے جھٹکا دے کر گرایا تھا لہٰذا اس کا دایاں ہاتھ کہنی سے کاٹ کر الگ کر دیا جائے۔"

یہ فیصلہ سن کر راجکماری پدمنی کا پھول سا چہرہ کھلا گیا۔ راجہ بھیم سین انگریز راج اور اس کے انصاف کی تعریفیں کر رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ صاحب بہادر نے صرف ایک ہاتھ کاٹنے کا حکم دے کر خرم کے ساتھ رعایت برتی تھی۔ والٹن نے کہا۔

"یہ رعایت اس لئے کی گئی ہے کہ ابھی مقابلہ ختم نہیں ہوا۔ جب اس کے کٹے ہوئے دائیں ہاتھ کا زخم بھر جائے گا تو دوبارہ مقابلہ شروع ہو گا۔ اس وقت تک یہ بازی گر میرے مہمان کے طور پر اس راج محل میں رہے گا۔ اس کے کھانے پینے اور آرام و آسائش کا پورا پورا خیال رکھا جائے۔ کٹے ہوئے ہاتھ کا زخم بھرنے کے لئے ڈاکٹروں کا معقول انتظام ہونا چاہئے۔ مقابلے کا دوسرا راؤنڈ شروع ہونے تک اس پٹھان کو کسی چیز کی کمی نہ ہو اور نہ ہی کوئی اسے کسی قسم کی تکلیف پہنچائے۔ میں چاہتا ہوں کہ جب یہ دوبارہ میدان میں آئے تو ذہنی اور جسمانی طور سے ایسا ہی صحت مند رہے' جیسا کہ ابھی نظر آ رہا ہے۔ جاؤ' اسے ابھی یہاں سے لے جاؤ۔"

سپاہی زنجیریں کھینچ کر اسے وہاں سے لے جانے لگے۔ راجکماری ایک ٹک اس

جانے والے قیدی کو دیکھ رہی تھی' جو قیدی بھی تھا' راج محل میں رہنے والا مہمان بھی اور جس کا مہمان تھا' مقابلے میں اس کا حریف بھی تھا۔ راجکماری پدمنی دل ہی دل میں کہنے لگی۔

"اونہہ! یہ صاحب بہادر دکھاوے کے لئے خرم کو مہمان بنا رہے ہیں۔ اگر ایسے ہی مہمان نواز ہیں تو اس بے چارے کا ہاتھ کاٹنے کا حکم کیوں دیا ہے۔ میں اس بے گناہ پر ایسا ظلم نہیں ہونے دوں گی۔ اس کے لئے معافی کی درخواست کروں گی۔"

تھوڑی دیر بعد وہ والٹن کے ساتھ راج محل کے باغ میں چہل قدمی کے لئے وہاں سے اٹھ گئی۔ والٹن نے فرمائش کی تھی کہ وہ رومانٹک ماحول میں تھوڑا وقت گزارنا چاہتا ہے۔ راجہ بھیم سین نے بڑی فراخدلی سے اپنی بیٹی کو صاحب بہادر کا دل بہلانے کی اجازت دے دی۔ وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے باغ کی روش میں ٹہلنے لگے۔ راجکماری اپنے مطلب کی بات کہنا چاہتی تھی' پھر یہ سوچ کر سہم جاتی تھی کہ صاحب بہادر ناراض نہ ہو جائیں۔ والٹن نے ہی باتوں کے دوران خرم کا ذکر چھیڑ دیا۔

"تم بازی گر کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھیں؟"

"میں بازی گر کو نہیں' اس کی بازی گری کو دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔"

والٹن نے مسکرا کر کہا۔ "اب وہ اپاہج بازی گر کہلائے گا۔"

راجکماری کو یوں لگا جیسے اس کا اپنا ہاتھ کاٹا جا رہا ہے۔ اس نے ہمدردی سے کہا۔

"اس کی روزی کا ذریعہ یہی بازی گری ہے۔ ایک بازو کٹ جانے کے بعد وہ ایسے کمالات نہیں دکھا سکے گا۔"

"مجھے اس کے کمال سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ہاں اگر وہ مجھ سے مقابلے میں جیت جائے تو میں اس کے نام اتنی زمینیں الاٹ کر دوں گا کہ اس کی آئندہ نسلیں بھی عیش و آرام سے زندگیاں گزاریں گی۔"

"لیکن وہ تم سے کس طرح جیت سکتا ہے۔ اس نے مقابلے کے دوران ایک بار تمہیں ہاتھ لگایا تھا اور تم نے اس کا ہاتھ........"

والٹن نے بات کاٹ کر کہا۔ "اس نے مجھے نہیں' تاج برطانیہ کو ہاتھ لگایا تھا۔ اس نے بہت بڑا جرم کیا ہے اور بہت چھوٹی سزا پا رہا ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ آئندہ اسے مقابلے کے دوران ہاتھ نہیں اٹھانا چاہئے' صرف تمہارے ہاتھوں سے مار کھاتے رہنا چاہئے۔"

"اگر وہ سمجھ دار ہو گا تو آئندہ یہی کرے گا۔ یہ پٹھان بڑے ضدی ہوتے ہیں۔ جھکنا نہیں جانتے۔ ایک بازو کٹنے کے بعد اسے جھکنا ہی پڑے گا۔ وہ جلد ہی سمجھ لے گا کہ حاکم کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اس کی لاتیں اور گھونسے کھانا نہایت ضروری ہے۔ غلام کی جیت اسی میں ہے کہ وہ اپنے آقا سے ہار جائے۔"

"اگر وہ ہار مان لے تو کیا آپ اسے معاف کر دیں گے؟"

"بے شک۔ ہم جھکنے والے باغیوں کو راجہ اور نواب بنا دیتے ہیں۔ تمہارا باپ بھی کبھی باغی تھا۔ جب اس نے ہتھیار ڈال دیئے اور دوسرے باغیوں کا سراغ لگانے اور انہیں کچل ڈالنے میں ہمارا ساتھ دینے لگا تو ہم نے انعام کے طور پر اسے شانتی نگر کا راجہ بنا دیا لیکن ہم نے سرحد کے پٹھانوں کو دیکھا ہے۔ وہ کم بخت پہاڑوں اور چٹانوں میں بسیرا کرتے ہیں مگر کسی کے محکوم رہ کر عیش و طرب کی زندگی پر تھوکتے ہیں۔ یہ بازی گر بھی پٹھان ہی ہے۔ ویسے تم بہت دیر سے اس پٹھان کی باتیں کئے جا رہی ہو' ہمیں اپنے مطلب کی بھی کچھ باتیں کرنا چاہئیں؟"

وہ چلتے چلتے ایک درخت کے سائے میں رک گئے۔ والٹن نے راجکماری پدمنی کے چاندی جیسے اجلے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔

"تمہارے باپ نے برٹش گورنمنٹ کو بارہا قیمتی تحائف پیش کئے ہیں۔ یہ تحفہ بھی کسی سے کم نہیں ہے۔ وہ تحائف انمول تھے اور تم بے مثال ہو۔"

یہ کہہ کر وہ اس حسین تحفے کو چومتے ہوئے قبولیت کی مہر ثبت کرنے لگا۔ باغ میں تنہائی تھی۔ رنگ برنگے پھول اپنی اپنی خوشبو لٹا رہے تھے۔ دور راج محل کے دروازے پر آتش بازی کا شور سنائی دے رہا تھا۔ اندھیرے میں رنگ برنگی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ پٹاخوں کی آواز تڑاتڑ گونج رہی تھی۔ کچھ پٹاخے ایسے تھے جو نمی کے باعث نہیں پھٹ رہے تھے۔ آگ دکھانے پر پھُس ہو جاتے تھے۔ راجکماری پر بھی اوس سی پڑ گئی تھی۔ والٹن اس کے بدن کے ایک ایک پٹاخے کو آگ دکھا رہا تھا مگر وہ پھُس ہو کر رہ جاتی تھی۔ اس کی نگاہوں کے سامنے وہ چیتے کی طرح پھرتیلا بازی گر بار بار چلا آتا تھا۔

راجکماری پدمنی کی زندگی میں اب سے پہلے بھی دو چار صاحب بہادر آچکے تھے مگر اپنے دیس کے گبرو جوانوں کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ جو مزہ دیسی گھی میں ہوتا ہے' وہ ولایتی مکھن میں نہیں ہوتا اور راجکماری ایسی بدنصیب تھی کہ اسے صرف گوری چمڑی والے ملتے تھے لیکن جس طرح شیر کو انسان کے خون کا چسکا پڑ جاتا ہے' اسی طرح

راجکماری کو مردوں کی قربت کا چسکا پڑ گیا تھا اور وہ اتنا سمجھنے لگی تھی کہ وہ پٹھان جیسا بازی گر ہی اسے پوری طرح سیراب کر سکے گا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بار بار اس کے متعلق سوچ رہی تھی۔ صاحب بہادر اس کی سرد مہری کو سمجھ رہے تھے اور یہ بھی سمجھ رہے تھے کہ ہندوستان ہو یا ہندوستان کی کوئی عورت' انہیں جبراً فتح کرنا پڑتا ہے۔ ایسی سندر عورتیں اپنی خوشی سے اپنے بدن کے شہر میں آنے کی اجازت نہیں دیتیں' اسی لئے وہ جبراً فتح کے جھنڈے گاڑ رہا تھا۔

☆======☆======☆

وہ تقریباً آدھی رات تک دیوالی کی خوشیاں مناتا رہا۔ اس کے بعد راج محل سے ریذیڈنسی کی طرف چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی راجکماری نے اشنان کیا۔ اپنی پسند کا لباس پہنا۔ اپنے شباب کو خوشبوؤں میں بسایا اور ایک داسی کو ساتھ لے کر قید خانے کی طرف جانے لگی۔

راجکماری کی سواری کے لئے دو گھوڑوں کی بگھی تھی۔ راجہ صاحب کی بگھی میں چار گھوڑے جوتے جاتے تھے اور انگریز افسروں کی بگھیاں چھ گھوڑے کھینچ کر لے جاتے تھے۔ عام شہری دور سے دیکھ کر سمجھ جاتے تھے کہ کس کی سواری آ رہی ہے۔

قید خانے کے سنتری نے دو گھوڑوں کی بگھی دیکھتے ہی بیرونی دروازہ کھول دیا۔ راجکماری نے بگھی سے جھانک کر پوچھا۔

"وہ پٹھان قیدی کہاں رکھا گیا ہے؟"

سنتری نے بتایا کہ قیدی اس حصے میں رکھا گیا ہے جہاں بیمار قیدیوں کا علاج کیا جاتا ہے۔

"کیا وہ بیمار ہو گیا ہے؟" راجکماری نے پوچھا۔

"جی نہیں۔" سنتری نے جواب دیا۔ "اس کا ایک ہاتھ کہنی سے اتار دیا گیا ہے۔ وہ وہاں زیر علاج ہے۔"

راجکماری پدمنی کا دل ڈوبنے لگا۔ وہ جیلر کے ساتھ چلتی ہوئی سوچ رہی تھی کیا واقعی اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا ہے؟ وہ شیر جیسا جوانمرد ایک ہاتھ کے بغیر کیسا نظر آتا ہو گا؟ آہ! یہ کیا ہو گیا۔ میں نے یہاں پہنچنے میں دیر کر دی مگر میں کیا کرتی؟ والٹن مجھے چھوڑتا ہی نہیں تھا۔ اس کے جانے کے بعد مجھے یہاں آنے کا موقعہ ملا ہے۔ اب میں اس کے لئے کیا کر سکتی ہوں؟ یہ بے چارہ ایک ہاتھ سے معذور ہو گیا۔ آئندہ مقابلے میں اس نے

والٹن پر اگر حملہ کیا تو اسے موت کی سزا سنائی جائے گی۔ اب یہاں سے اس کا زندہ بچ کر نکلنا مشکل ہے۔ صرف ایک ہی راستہ ہے کہ میں اس کے لئے فرار ہونے کے راستے ہموار کر دوں۔ یہ کسی طرح سے نکل کر آزاد علاقے میں چلا جائے۔ انگریزوں کی اتنی جرأت نہیں ہے کہ وہ اس علاقے میں قدم رکھ سکیں۔

وہ جیلر اور ایک سپاہی کے پیچھے چلتی ہوئی ایک کوٹھڑی کے پاس آ کر رک گئی۔ دوسری کوٹھڑیوں کے قیدی سلاخوں سے چپکے ہوئے راجکماری کو حیرانی سے دیکھ رہے تھے۔ سنتری کوٹھری کے آہنی دروازے کا تالا کھول رہا تھا۔ جیلر ہاتھ میں لالٹین لئے کھڑا تھا۔ کوٹھری کے اندر سے خرم کے کراہنے کی بہت ہی دھیمی دھیمی سی آواز آ رہی تھی۔ دروازہ کھلنے کے بعد لالٹن کی زرد روشنی سے کوٹھری روشن ہو گئی۔ وہ فرش پر پڑا ہوا تھا۔ اس کے جسم پر صرف ایک شلوار تھی۔ شلوار سے اوپر آدھا جسم ننگا تھا۔ لالٹین کی روشنی میں اس کا کٹا ہوا بازو صاف نظر آ رہا تھا۔ بازو پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس کے باوجود کٹے ہوئے حصے سے بہت ہی آہستہ آہستہ خون رس رہا تھا۔ ہاتھ کی پٹی سرخ ہو چکی تھی اور جہاں اس کا ہاتھ رکھا ہوا تھا' وہاں کی زمین کا کچھ حصہ خون سے بھیگ رہا تھا۔

راجکماری پدمنی دوڑتی ہوئی اس کے قریب آ کر دو زانو ہو گئی اور اس کے چٹان جیسے سینے پر ہاتھ رکھ کر دل کی دھڑکنوں کو محسوس کرتی ہوئی جیلر سے بولی۔

"اس کے زخم سے خون ابھی تک جاری ہے۔ کس نے اس کی مرہم پٹی کی ہے؟"

"ویدراج نے!" جیلر نے جواب دیا۔

راجکماری نے پوچھا۔ "مسٹر والٹن کا حکم ہے کہ اسے راج محل کے مہمان خانے میں رکھا جائے' پھر اسے جیل کی کوٹھری میں کیوں رکھا گیا ہے؟"

جیلر نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "ہم تو حکم کے بندے ہیں۔ سیناپتی نے حکم دیا ہے کہ اسے صبح تک یہاں رکھا جائے۔"

"ہوں۔ میں سمجھ گئی۔" راجکماری نے سر ہلا کر کہا۔ "سیناپتی اپنی شکست کا انتقام لینا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ صبح تک اس کے بدن سے سارا خون بہہ جائے۔ شاید انہوں نے ویدراج کو بھی یہی حکم دیا ہو گا کہ مرہم پٹی کے بعد بھی خون بہتا رہے۔ کہاں ہیں ویدراج اور سیناپتی؟ دونوں کو حاضر کرو۔"

جیلر حکم کی تعمیل کے لئے وہاں سے چلا گیا۔ وہاں صرف ایک سپاہی اور راجکماری کی داسی رہ گئی۔ راجکماری نے دونوں کو وہاں سے جانے کا حکم دیا۔ جب وہ دونوں کوٹھڑی

سے باہر چلے گئے تو وہ قیدی کے چہرے پر جھک گئی۔ خون زیادہ بہہ جانے کے باعث اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ لالٹین کی روشنی اسے کچھ اور زرد بنا رہی تھی۔ وہ اس کے چہرے کو اِدھر اُدھر سے چھو کر اس کی سختی اور مردانگی کو محسوس کرنے لگی اور زیر لب بڑبڑانے لگی۔

"اٹھو بازی گر۔ آنکھیں کھولو۔ دیکھو تم کتنے بھاگ وان ہو۔ راجکماری تم سے ملنے آئی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ مجھے یہاں آنے میں دیر ہو گئی ورنہ میں ہاتھ کاٹنے سے پہلے ہی تمہیں فرار ہونے کا موقعہ فراہم کر دیتی۔"

یہ کہہ کر وہ اپنے لئے موقعہ فراہم کرنے لگی۔ اس کے بالوں بھرے چٹانی سینے پر اپنے ملائم رخساروں کو رگڑنے لگی۔ اس کے ننگے بدن کے پسینے سے اپنی ہی دھرتی کی مہک ابھر رہی تھی۔ اپنی چیز اپنی ہی ہوتی ہے۔ والٹن سات سمندر پار کا اجنبی تھا۔ وہ اس قدر اپنا نہیں تھا جتنا کہ وہ پٹھان بازی گر اپنا اپنا سا لگ رہا تھا۔ وہ والہانہ انداز میں اسے چومنے لگی۔ پتہ نہیں پھر کبھی اسے چومنے کا موقعہ ملے یا نہ ملے۔ پتہ نہیں کب والٹن کا مزاج بدل جائے اور اس کے لئے موت کا حکم سنا دے اس لئے وہ موقعہ غنیمت تھا۔ اگرچہ وہ اس کی محبت کا جواب محبت سے نہیں دے سکتا تھا۔ محبت میں دونوں طرف سے برابر آگ لگتی ہے مگر وہاں صرف راجکماری جل رہی تھی۔ بازی گر سرد پڑا ہوا تھا اس لئے راجکماری اپنے طور پر جہاں تک اسے حاصل کر سکتی تھی' وہاں تک اپنے جذبات اور چاہت کے شعلوں کو سرد کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد خرم کی کراہوں میں زندگی کے آثار پیدا ہوئے۔ یوں لگتا تھا جیسے راجکماری اپنے شباب کی حرارت سے اس میں زندگی کی روح پھونک رہی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ آنکھیں کھولنے لگا۔

اس کی نگاہوں کے سامنے دھند چھائی ہوئی تھی۔ وہ آنکھیں سکیڑ کر دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ کہاں ہے؟

پھر اسے یاد آیا کہ اس کا ہاتھ کاٹا گیا تھا۔ کوئی دوسرا ہوتا تو اتنی اذیت برداشت نہ کرتا وہ مر جاتا۔ بیہوش ہو جاتا لیکن اس پر نیم بیہوشی طاری ہو گئی تھی۔ پھر ویدراج نے پتہ نہیں کیسی دوا کھلائی تھی کہ اسے ذرا دیر کے لئے نیند آ گئی تھی۔ اب اس کی دھندلائی نگاہوں کے آس پاس اندھیرا تھا۔ اس اندھیرے میں دھیمی دھیمی زرد روشنی تھی۔ اس روشنی کے ہالے کے پیش منظر میں چہرے کی چاندنی دھندلائی ہوئی تھی۔ وہ راجکماری کو

پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔

راجکماری نے پھر اسے مخاطب کیا لیکن اس پر دوبارہ غنودگی طاری ہو گئی۔ اس کی آنکھیں بند ہوتے ہی راجکماری نے اسے کئی آوازیں دیں۔ بار بار چوم کر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرتی رہی لیکن زخم سے خون رستا جا رہا تھا اور لحہ بہ لحہ اس پر کمزوری غالب آ رہی تھی۔ اتنے میں کوٹھری کے باہر بہت سے قدموں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ وہ فوراً ہی خرم سے الگ ہو کر کھڑی ہو گئی۔

جیلر' سیناپتی اور ویدراج یکے بعد دیگرے کوٹھری میں داخل ہو کر راجکماری کے سامنے مودب کھڑے ہو گئے۔ وہ غصہ میں مٹھیاں بھینچ کر انہیں باتیں سنانے لگی۔ سیناپتی اور ویدراج کو دھمکیاں دینے لگی کہ اگر خرم مر گیا تو وہ مسٹر والٹن سے کہہ کر انہیں عبرتناک سزائیں دلوائے گی۔

سیناپتی نے والٹن کے حکم کے خلاف اسے کوٹھری میں رکھا تھا۔ یہ بات والٹن تک پہنچتی تو سیناپتی کی شامت آ جاتی۔ ویدراج کو بھی خاطر خواہ علاج نہ کرنے پر الٹا لٹکا کر کوڑے لگوائے جاتے' پھر یہ بات سبھی جانتے تھے کہ راجکماری پر والٹن کی خاص مہربانیاں ہیں۔ وہ صاحب بہادر راجہ بھیم سین سے زیادہ اس کی بیٹی کو اہمیت دیتا تھا۔ اس لئے سب ہی راجکماری پدمنی کے غصہ سے تھر تھر کانپتے تھے۔

ذرا سی دیر میں سب کے سب اس غریب بازیگر پر مہربان ہو گئے۔ وید نئے سرے سے اس کی مرہم پٹی کرنے لگا۔ سیناپتی اسے راج محل کے مہمان خانے تک آرام سے پہنچانے کے انتظامات میں مصروف ہو گیا لیکن وہ دل ہی دل میں راجکماری کو گالیاں دے رہا تھا اور سمجھ رہا تھا کہ پٹھان بازیگر پر راجکماری کی مہربانیاں کچھ زیادہ ہی ہیں اگر یہ بات والٹن کو معلوم ہو جائے تو پھر راجکماری کی بھی شامت آ جائے گی کیونکہ اپنی زمین ہو یا اپنی عورت ہو۔ انگریز اس پر کسی دوسرے کا قبضہ برداشت نہیں کرتے۔

صبح ہونے سے پہلے ہی خرم کو راج محل کے مہمان خانے میں پہنچا دیا گیا۔ ویدراج کو حکم دیا گیا کہ بازیگر کا زخم بھرنے تک وہ راج محل سے باہر نہ جائے اس کے مہمان خانے میں آتے ہی راجکماری کی مصروفیات بڑھ گئیں۔ وہ صبح و شام اس کی تیمارداری میں اپنا عیش و آرام کو بھول گئی۔ اس کے دم سے مہمان خانے میں اچھی خاصی چہل پہل ہو گئی۔ وہاں ملازم حکم بجا لانے کے لئے ہمیشہ مستعد رہتے تھے۔ راجکماری کی نگرانی میں اس کے لئے بہترین غذائیت سے بھرپور کھانے پکائے جاتے تھے اور اس کے سامنے اسے کھلایا

جاتا تھا۔

والٹن کبھی کبھی کسی خاص موقعہ پر راج محل میں آتا تھا ورنہ مہینوں اس طرف کا رخ نہیں کرتا تھا۔ جب سے خرم مہمان خانے میں آیا تھا۔ وہ اس کی خیریت معلوم کرنے ہفتے میں ایک بار ضرور آتا تھا۔ جب بھی اس کے آنے کی خبر ملتی تو راجکماری مہمان خانے سے چلی جاتی۔ اس نے اپنی داسیوں اور دوسرے ملازموں کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ وہ والٹن کو یہی یقین دلائیں کہ صاحب بہادر کے حکم کی تعمیل کی جا رہی ہے اور بازیگر کی صحت یابی کا پورا پورا خیال رکھا جا رہا ہے۔ راجکماری تو کبھی بھولے سے بھی مہمان خانے میں نہیں آتی ہے۔

والٹن کو یقین تھا کہ راجکماری دو کوڑی کے بازیگر کو منہ نہیں لگائے گی وہ ویدراج کے پیچھے پڑ گیا تھا کہ جلد از جلد اس کے زخم کا علاج کرے تاکہ مقابلے کا دوسرا راؤنڈ شروع کیا جائے۔

آہستہ آہستہ خرم کا زخم بھر رہا تھا۔ آہستہ آہستہ راجکماری کی نگرانی' تیمارداری اور مسلسل توجہ نے ایک بازیگر کے دل میں جگہ بنالی۔ دن ہو یا رات اس نے یہی دیکھا تھا کہ راجکماری اس کی صحت یابی کے لئے کچھ نہ کچھ کرتی ہی رہتی تھی۔ بارہا اسے اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلایا تھا۔ رات کو ایک آدھ بار وہ اس کے کمرے میں ضرور آتی تھی۔ اگر اسے نیند نہ آتی تو وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر کر اسے سلانے کی کوشش کرتی تھی۔

جب کوئی دن رات نگاہوں کے سامنے رہے تو دماغ اس کے متعلق سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ وہ پہاڑوں کا رہنے والا جوان اوپر سے بھی پتھر تھا اور اندر سے بھی پتھر تھا لیکن راجکماری کی بے لوث خدمات اسے موم بنا رہی تھیں۔ وہ اکثر سوچتا تھا کہ اتنی بڑی راجکماری مجھ جیسے غریب پر اتنی مہربان کیوں ہے۔ مہربانیاں بھی ایسی جیسے وہ میری داسی ہو اور میں اس کا مالک و مختار ہوں۔ میں نے کئی بار نیم غنودگی کی حالت میں محسوس کیا ہے کہ وہ مجھے چومتی ہے اور میرے سینے پر اپنا بوجھ ڈال کر مجھے اپنے دل کی دھڑکنیں سناتی ہے میرا دل بھی اس کی طرف کھنچا جاتا ہے۔ میں کیا کروں؟ میں نے پہلے کبھی کسی عورت کے متعلق نہیں سوچا تھا لیکن اس عورت نے اپنی خدمات اور اپنی اتنی ساری محبتوں کا بوجھ مجھ پر ڈالا ہے کہ اب میں اس کے سامنے گردن نہیں اٹھا سکتا۔

دو ماہ گزر گئے۔ اس کے ہاتھ کا زخم سوکھ گیا تھا۔ اب وہ کمرے سے باہر کھلی فضا میں سانس لینا چاہتا تھا لیکن راجکماری اسے باہر جانے سے روکتی تھی اور سمجھاتی تھی کہ وہ اس

طرح تفریح کے لئے نکلے گا تو والٹن اسے مقابلے کے قابل سمجھ کر دوسرے راؤنڈ کے لئے للکارے گا۔

لیکن خرم کو کسی کے للکارنے کی پرواہ نہیں تھی۔ وہ باہر جانے کے لئے ضد کر رہا تھا۔ راجکماری نے اس کے گلے میں اپنی مرمریں بانہیں ڈال کر اسے آگے بڑھنے سے روک دیا۔ آہنی زنجیریں توڑنے والا زلفوں کی زنجیر میں الجھ گیا۔

"خرم عقل سے کام لو۔ یہاں چاروں طرف تمہارے دشمن ہی دشمن ہیں۔ وہ انگریز والٹن بھی تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔ دیکھو میں تمہیں کتنا چاہتی ہوں۔ میں یہاں کی راجکماری ہوں۔ کتنی ہی داسیاں دن رات میری خدمت کے لئے حاضر رہتی ہیں اور میں ہوں کہ ایک داسی کی طرح تمہاری خدمت کرتی ہوں۔ آخر میں بھی تو ایک عورت ہوں نا؟ ہر عورت کے دل میں یہ ارمان ہوتا ہے کہ اس دنیا میں کوئی ایک مرد ایسا ہو جس کی وہ دن رات خدمت کرے۔ میری دنیا میں تم ہی ایک ایسے مرد ہو جس کے لئے میں نے اپنی عزت' وشان و شوکت کا خیال نہیں کیا۔ میں راج سنگھاسن کی بلندی سے اتر کر تمہارے چرنوں میں آگئی ہوں کیا تم میری ذرا سی بات نہیں مانو گے؟"

"ضرور مانوں گا۔ تم نے مجھ پر احسان بھی کیا ہے اور مجھ سے محبت بھی کرتی ہو۔ تم نے پیار میں اپنا تن' من اور دھن سب کچھ میرے حوالے کیا ہے۔ میں تمہارے لئے جان کی بازی لگا سکتا ہوں۔"

"یہی تو میں نہیں چاہتی کہ تم میرے لئے یا کسی کے لئے جان کی بازی لگاؤ۔ میں تو یہی چاہتی ہوں کہ تم یہاں سے جان بچا کر بھاگ جاؤ۔ میں تمہیں محل کے باہر پہنچا دوں گی اور ایک گھوڑے کا بندوبست بھی کر دوں گی۔ تم بخیریت آزاد علاقے تک پہنچ جاؤ گے۔"

خرم نے اسے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کسی نادان بچی کو دیکھ رہا ہو۔ پھر اس نے کہا۔

"تم کیسی باتیں کرتی ہو۔ ابھی تو ہماری جنگ کا فیصلہ نہیں ہوا ہے میں میدان چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہوں؟"

"کیوں نہیں جا سکتے؟ بھلا یہ بھی کوئی مقابلہ ہے کہ وہ تم پر جارحانہ حملے کرتا ہے اور تم صرف مدافعت میں لگے رہتے ہو۔ اس طرح تو کبھی فیصلہ نہیں ہو سکے گا یا پھر یہ ہو سکتا ہے کہ تم ہی تھک کر گر جاؤ اور شکست تسلیم کر لو۔"

خرم نے غصہ سے کہا۔ "ایسی بات کوئی مرد کہتا تو میں اس کا منہ توڑ دیتا۔ کیا تم

نہیں جانتیں کہ پٹھان مرجاتے ہیں مگر اپنی شکست تسلیم نہیں کرتے۔"

"مجھے معاف کر دو۔ میں پٹھانوں کے مزاج سے واقف نہیں ہوں پہلی بار تم سے پالا پڑا ہے مگر خرم! میں تمہیں عقلمندی کی باتیں بتاتی ہوں۔ فرنگی سیاست کے سامنے تمہاری جسمانی قوت اور بازی گری کے کمالات کام نہیں آئیں گے۔ دانشمندی یہی ہے کہ تم یہاں سے بھاگ جاؤ۔"

"تمہارے ہاں جو دانشمندی ہے اسے ہمارے ہاں بزدلی کہتے ہیں۔ ہم پٹھان لوگ میدان چھوڑ کر کبھی نہیں جاتے۔ اس انگریز نے کہہ دیا ہے کہ مقابلہ جاری رہے گا۔ اس لئے پٹھان بھی یہی کہے گا کہ مقابلہ مرتے دم تک جاری رہے گا۔"

راجکماری نے عاجز آکر کہا۔ "تمہیں انگریز کی یہ بات یاد ہے کہ مقابلہ جاری رہے گا مگر یہ کیوں بھول گئے کہ اسی انگریز نے تمہیں ایک ہاتھ سے معذور کر دیا ہے؟"

خرم نے جواب دیا۔ "یہ ہاتھ تو میدان جنگ کے باہر کاٹا گیا ہے اگر وہ انگریز میدان جنگ میں ایسی حرکت کرتا تو میں اس کی گردن توڑ دیتا۔ تم عورت ہو اس لئے لڑائی کے اصولوں کو نہیں سمجھتی ہو۔ ہماری لڑائی کا جو اصول ہے وہ دوسروں سے مختلف ہے۔ اصول یہ ہے کہ وہ انگریز مجھ پر حملہ کرے گا اگر وہ مجھے مار کر گرا دینے میں کامیاب ہو جائے گا تو جیت اس کی ہو گی اور اگر میں اپنا بچاؤ کرتے ہوئے اسے تھکا تھکا کر گرنے پر مجبور کر دوں گا تو جیت میری ہو گی اور میں اچھی طرح جانتا ہوں ماشاء اللہ جیت میری ہو گی۔ وہ سؤر کا گوشت کھانے والا اور شراب کو پانی سمجھ کر پینے والا ذرا سی دیر میں تھک کر میرے قدموں پر گر پڑے گا۔"

"کیا تم ایک ہاتھ سے معذور ہونے کے بعد بھی اسے شکست دے سکتے ہو؟"

"انشاء اللہ! وہ منہ کی کھائے گا۔"

"کیا تم نہیں جانتے کہ اس کی شکست کا مطلب تمہاری موت ہے۔ وہ اپنی توہین کبھی برداشت نہیں کرے گا۔ اسی وقت تمہاری گردن اڑا دینے کا حکم دے گا۔"

"یہ ٹھیک ہے کہ وہ مجھے موت کی سزا دے گا لیکن اس کی زندگی موت سے بدتر ہو جائے گی۔ وہ جہاں جائے گا لوگ یہی کہیں گے کہ ایک پٹھان نے اسے ہاتھ لگائے بغیر تھکا کر زمین پر گرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ جب میرے قبیلے میں میری موت کی خبر پہنچے گی تو سب ہی فخر سے کہیں گے کہ پٹھان بچہ موت کو سامنے دیکھ کر بھی میدان نہیں چھوڑتا ہے۔"

راجکماری پدمنی پریشانی سے سر تھام کر سوچنے لگی کہ ایسے شخص کو وہ کیسے سمجھا

سکتی ہے جو عقل سے لڑنا ہی نہیں جانتا اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ موت اس کا مقدر ہو چکی ہے۔ وہ میدان چھوڑنے کو بزدلی سمجھتا ہے۔ یہ بات اسے گھٹی میں پلائی گئی تھی کہ غیرت اور دلیری عقل سے بڑھ کر ہے۔ پٹھان بزدلی کی زندگی پر ہمیشہ بہادری کی موت کو ترجیح دیتے ہیں۔

راجکماری نے اس کے مزاج کو اچھی طرح سمجھنے کے بعد کہا۔

"اچھا اگر تم جیت جاؤ اور وہ ہار جائے اور تمہیں جیل خانے بھیج دے اور تمہارے لئے موت کی سزا سنا دے پھر ایسی حالت میں تو تم فرار ہو سکتے ہو؟ ایسے وقت تو تم خود کو بزدل نہیں سمجھو گے؟"

"ہاں جب میں میدان جیت لوں گا اور میدان کے باہر مجھے موت نظر آئے گی تو میں یہاں سے فرار ہو جاؤں گا کیونکہ میں تنہا اور نہتا ہو کر پوری انگریز سرکار کا مقابلہ نہیں کر سکوں گا۔ ایسے وقت جان بچا کر بھاگنا اور آئندہ مقابلہ کے لئے منصوبہ بنانا دانشمندی ہے۔ فی الحال مجھے یہاں سے بھاگنے کا مشورہ نہ دو' مرد کبھی میدان چھوڑ کر نہیں بھاگتے۔"

راجکماری کی سمجھ میں یہ بات آ گئی کہ وہ اس پٹھان کو پیار کرنے پر مجبور کر سکتی ہے لیکن میدان چھوڑنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔ وہ دل ہی دل میں کڑھنے لگی۔ اسے ایسا عاشق ملا تھا جس کی کھوپڑی میں اس کی معقول باتیں نہیں سماتی تھیں۔

آخر ایک دن مقابلہ کا وقت آ پہنچا۔ راج محل اور مہمان خانے کے درمیان جو باغ تھا۔ اس باغ کو مقابلے کے لئے منتخب کیا گیا تھا۔ تماشائیوں میں راجہ بھیم سین' سیناپتی' دیوان جی اور اس راج کے دوسرے اعلیٰ افسر' شانتی نگر کے بڑے بڑے رئیس اور راج محل کے سپاہی تھے۔ راج محل کے اونچے چبوترے پر وہی تین آرام دہ کرسیاں تھیں۔ ایک راجہ بھیم سین کے لئے دوسری والٹن ڈیوڈ کے لئے اور تیسری راجکماری پدمنی کے لئے تھی۔

مقابلے کے لئے ڈھول اور تاشے بجنے لگے۔ پھر خرم کو میدان میں اترنے کے لئے کہا گیا۔ وہ بازیگروں کے انداز میں اچھلتا ہوا آیا۔ وہ اپنا سر اور بایاں ہاتھ زمین پر ٹیکے بغیر فضا میں قلابازیاں کھا رہا تھا۔ ہر قلابازی کے بعد وہ چند لمحوں کے لئے اپنے پیروں پر کھڑا ہو جاتا تھا۔ تمام تماشائی اسے حیرانی سے دیکھ رہے تھے۔ راجکماری پدمنی کی طرح ہر شخص یہی سوچ رہا تھا کہ اگر دیانتداری سے مقابلہ ہوا تو بازیگر ایک ہی ہلے میں صاحب بہادر کو زمین دکھا دے گا۔

اب اس بازیگر کے دو ہاتھ نہیں تھے۔ ایک ہاتھ آدھا تھا اور دوسرا سالم۔ وہ بیچ میدان آ کر سالم ہاتھ کے بل پر الٹا کھڑا ہو گیا۔ دونوں ٹانگیں آسمان کی طرف' سر زمین کی طرف اور اس نے ایک بائیں ہاتھ پر اپنے جسم کے تمام بوجھ کو اٹھا رکھا تھا۔ اس کا دایاں ہاتھ آزاد تھا مگر اس کٹے ہوئے ہاتھ کو وہ بازیگری کے لئے استعمال نہیں کر سکتا تھا۔

پھر اس نے وہی حیرت انگیز کمال دکھایا۔ اس بار وہ بائیں ہتھیلی کے بل پر پھدکتا ہوا محل کے چبوترے کی طرف جانے لگا۔ آسمان کی طرف اٹھی ہوئی دونوں ٹانگیں یوں چل رہی تھیں جیسے وہ ٹانگیں سائیکل چلا رہی ہوں۔ راجکماری پہلے کی طرح بے اختیار تالیاں بجانے لگی۔ اس کی شہ پا کر دوسرے تماشائی بھی بڑھ بڑھ کر داد دینے لگے۔ وہ ایک ہاتھ سے زمین پر پھدکتا ہوا راجہ صاحب اور صاحب بہادر کے سامنے آ کر رک گیا۔ ان دونوں کے درمیان راجکماری پدمنی اس شان سے بیٹھی ہوئی تھی جیسے بازیگر کی بجائے وہ میدان جیتنے والی ہو کیونکہ بازی گر کی جیت اس کی جیت تھی۔ اس لئے کہ وہ بازیگر کو پہلے ہی جیت چکی تھی۔

خرم نے ایک محبت کی نظر اس پر ڈالی پھر دائیں ہاتھ سے والٹن ڈیوڈ کو سلام کیا۔ اس وقت والٹن اس کا حریف نہیں تھا' حاکم تھا اسے سلام کرنا ضروری تھا اور ایک مسلمان کی حیثیت سے وہ دائیں ہاتھ سے سلام کر رہا تھا لیکن وہ ہاتھ آدھا کٹ چکا تھا۔ سیناپتی نے پھر غصہ سے چیخ کر کہا۔

"بدتمیز۔ گستاخ' صاحب بہادر کو ٹوٹے ہوئے ہاتھ سے ٹوٹا ہوا سلام پیش کر رہا ہے۔ میں تیری کھال کھینچ لوں گا۔"

وہ ہاتھ میں لانبی سی بید لے کر اس کی جانب بڑھنے لگا۔ راجکماری نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"رک جاؤ سیناپتی۔ صاحب بہادر اس کا انصاف کریں گے۔"

راجکماری نے والٹن کی طرف گھوم کر کہا۔ "یہ بازیگر کٹے ہوئے ہاتھ سے سلام کرنے پر مجبور ہے۔ اس لئے کہ اگر وہ دوسرے ہاتھ سے سلام کرے گا تو پھر یہی اس پر عائد ہو گا کہ وہ بائیں ہاتھ سے سلام کرنے کی گستاخی کر رہا ہے۔ اب آپ ہی انصاف سے کہئے کہ وہ کس ہاتھ سے سلام کرے؟"

جواب میں والٹن اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ اس کے اٹھتے ہی تمام لوگ مودبانہ انداز میں اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ والٹن نے ہاتھ کے اشارے سے سیناپتی کو واپس جانے کے

لئے کہا اور خود اس بازیگر پٹھان کی جانب بڑھنے لگا۔

وہ بدستور بایاں ہاتھ زمین پر ٹیکے الٹا کھڑا ہوا تھا اور والٹن کو قریب آتے دیکھ رہا تھا۔ والٹن نے قریب آتے ہی ایک لات چلائی۔ خرم پھدک کر پیچھے ہٹ گیا۔ وہ ابھی تک ایک ہاتھ کے بل پر الٹا کھڑا ہوا تھا۔ پہلا وار خالی جاتے ہی والٹن کو سبکی سی محسوس ہوئی۔ وہ اب بھی سامنے الٹا کھڑا تھا۔ بالکل ایسا شکار نظر آ رہا تھا جو آسانی سے ہاتھ آ جاتا ہے۔ وہ والٹن کو بہت حقیر نظر آ رہا تھا۔ اس نے سوچا پہلی بار اس نے سوچ سمجھ کر کک نہیں لگائی تھی۔ اب کی بار وہ ایک ہی کک میں زمین پر لوٹتا ہوا نظر آئے گا۔ یہ سوچ کر وہ پینترا بدلنے لگا۔ خرم بھی اس کے پاؤں کی حرکتوں کے ساتھ ایک ہاتھ پر گھومنے لگا۔

ڈھول تاشے اپنی مخصوص تال پر بج رہے تھے۔ راجکماری کا دل گھبرا رہا تھا کہ اب کی بار اس کا محبوب مار کھا جائے گا۔ والٹن نے اچانک ہی پینترا بدل کر ایک زور کی کک لگائی۔ جتنی زور سے کک لگائی اتنی ہی تیزی سے اس کی ٹانگ خالی حملے کے باعث دوسری طرف گھوم گئی اور وہ دھڑام سے زمین پر گر پڑا۔

خرم اسی طرح ایک ہاتھ کے بل پر الٹا کھڑا ہوا اپنے حریف کو زمین بوس ہوتے دیکھ رہا تھا۔ راجکماری کا جی چاہ رہا تھا کہ ابھی اپنی جگہ سے اٹھ کر جائے اور اپنے بازیگر سے لپٹ کر خوب پیار کرے لیکن وہ راجکماری ہو کر بھی انگریز کی محکوم تھی۔ اپنے محبوب کو چومنا تو دور کی بات ہے۔ وہ اس کے کمالات سے خوش ہو کر اب تالیاں بھی نہیں بجا سکتی تھی۔ کیونکہ والٹن یہی سمجھتا کہ اس کی شکست پر تالیاں بجائی جا رہی ہیں۔

والٹن نے زمین پر گرنے کے بعد فوراً ہی اٹھنے کی کوشش نہیں کی۔ وہیں لیٹے ہی لیٹے اسے غرا کر دیکھنے لگا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اپنے حریف پر آسانی سے قابو نہیں پا سکے گا اور اگر جلد ہی اسے زیر نہ کیا گیا تو بڑی جگ ہنسائی ہو گی۔ یہ سوچتے ہی وہ شیر کی طرح گرجتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ اس بار ارادہ تھا کہ وہ اپاہج بازیگر پر چھلانگ لگائے گا اور اسے دونوں بازوؤں میں دبوچ لے گا۔ یہی سوچ کر اس نے زبردست چھلانگ لگائی۔ خرم بڑی پھرتی سے بائیں طرف قلابازی کھا کر دونوں ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا۔ والٹن کی زبردست چھلانگ نے اسے پھر اس طرح زمین بوس کیا کہ اب کی بار اس کی ناک پر چوٹ آئی اور ایک نتھنے سے خون کی پتلی سی دھار بہنے لگی۔

خرم نے مسکرا کر اپنی ناک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"صاحب جی۔ تمہاری ناک سے خون بہہ رہا ہے۔ اپنا رومال نکالو۔"

والٹن اس کی زبان نہیں سمجھتا تھا لیکن خرم نے ناک کی طرف اشارہ کیا تھا۔ اس اشارے کو سمجھ کر اس نے الٹی ہتھیلی سے اپنی ناک صاف کی تو ہتھیلی کی پشت پر خون پھیل گیا۔ خون دیکھتے ہی وہ غصہ کے مارے سرخ ہو گیا۔ اس کے لئے یہ کتنی شرم کی بات تھی کہ خرم اسے ہاتھ نہیں لگا رہا تھا مگر وہ مار کھا رہا تھا۔ ناک سے خون بھی بہنے لگا تھا اور وہ خرم پر بار بار حملے کر رہا تھا لیکن اب تک اسے چھو کر بھی نہیں گزر سکا تھا۔

وہ غصہ میں تلملاتا ہوا ایک سپاہی کے پاس گیا۔ وہ ایک ہاتھ میں نیزہ اور دوسرے ہاتھ میں ڈھال لئے کھڑا تھا۔ وہ نیزہ اور ڈھال اس کے ہاتھوں سے لے کر میدان میں واپس آ گیا۔ پھر اس نے ڈھال کو خرم کی طرف اچھال دیا۔ خرم نے اسے بائیں ہاتھ سے روک لیا۔ اب بھی مقابلہ اسی طرز کا تھا یعنی والٹن نیزے سے حملے کر رہا تھا اور خرم ڈھال کے ذریعہ اپنا بچاؤ کرتا جا رہا تھا۔

تھوڑی دیر تک اسی طرح وہ پینترے بدل بدل کر حملے کرتا رہا لیکن نیزے کی انی ایک بار بھی ڈھال تک نہیں پہنچی۔ خرم اچھل اچھل کر اِدھر اُدھر چلا جاتا تھا اور والٹن نیزہ مارنے کی جھونک میں آگے بڑھ جاتا تھا۔

ایک بار والٹن کا نیزہ زمین پر دھنس گیا۔ اس نے زور لگا کر نکالنا چاہا لیکن اسے نہ نکال سکا۔ خرم ڈھال کو ایک طرف پھینک کر اس کے قریب آ گیا۔ اس نے نیزے کو بائیں مٹھی میں جکڑا اور ایک جھٹکے سے اسے نکال لیا۔ اتنی دیر میں والٹن نے اس کے بائیں بازو کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ وہ دوسرے ہاتھ سے اس کے منہ پر گھونسہ رسید کرنا چاہتا تھا لیکن وہ بازیگر سے زیادہ پھرتیلا نہیں تھا۔ بازی گر نے اسی نیزے کو زمین پر ٹیک کر قلابازی کھائی۔ وہ تو والٹن کے گھونسے سے بچ گیا مگر اس کا نیزہ زمین میں گڑنے کی بجائے والٹن کے دائیں پاؤں میں گڑ گیا تھا۔

اس کی چیخ سن کر لوگ دوڑتے ہوئے میدان میں آ گئے۔ سپاہیوں نے نیزے تان کر چاروں طرف سے خرم کو گھیر لیا۔ سیناپتی نے فوراً ہی والٹن کے پاؤں سے نیزے کی انی نکالی۔ اس کا پاؤں انگوٹھے کے قریب زخمی ہوا تھا۔ اسے فوری طبی امداد پہنچائی جانے لگی۔ راجکماری بھی اپنی کرسی چھوڑ کر میدان میں آ گئی تھی۔ تاکہ اسے قریب دیکھ کر سیناپتی بازی گر پر کوئی ظلم نہ کرے۔

جلد ہی صاحب بہادر کے پاؤں کی مرہم پٹی ہو گئی وہ اپنی آرام دہ کرسی پر بیٹھا ہوا خرم کو ایسے دیکھ رہا تھا جیسے کسی مجرم کو دیکھ رہا ہو۔ حالانکہ اس نے کوئی جرم نہیں کیا

تھا۔ وہ مقابلے کے دوران نیزے کو زمین میں گاڑ کر قلابازی کھانا چاہتا تھا مگر نادانستگی میں اس کے نیزے کی انی والٹن کے پاؤں میں چبھ گئی تھی۔ وہاں کوئی اس حقیقت کو تسلیم نہ کرتا۔ سب یہی کہتے کہ بازی گر نے صاحب بہادر کو جان بوجھ کر زخمی کیا ہے۔

والٹن اپنے حریف کے بائیں ہاتھ کو دیکھ کر سوچ رہا تھا۔ یہ کمبخت جب سے میدان میں اترا ہے اپنے بائیں ہاتھ سے کمالات دکھا رہا ہے مقابلے کے دوران بھی یہ بائیں ہاتھ سے پھدکتا رہا اور قلابازیاں کھاتا رہا۔ اس نیزے کو بھی اس نے بائیں ہاتھ سے میرے پاؤں میں گاڑ دیا تھا۔ اگر اس کا وہ بایاں ہاتھ نہ ہوتا تو آج میں مار مار کر اس کا کچومر نکال دیتا۔

خرم کو زنجیریں پہنا دی گئی تھیں اور وہ سپاہیوں کے نرغے میں اپنی قسمت کا فیصلہ سننے کے لئے کھڑا ہوا تھا۔ والٹن نے اس کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"اس نے بائیں ہاتھ سے مجھے زخمی کیا ہے۔ یہ میرے پاؤں کو زخمی کر کے میدان سے میرے قدم اکھاڑنا چاہتا تھا۔ میرے قدم اکھاڑنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ ہندوستان سے پوری انگریز قوم کے قدم اکھاڑنا چاہتا ہے۔ یہ باغی ہے اور باغی کی سزا موت ہوتی ہے مگر افسوس کہ ابھی مقابلہ ختم نہیں ہوا ہے۔ جب تک فیصلہ نہ ہو' یہ مقابلہ جاری رہے گا۔ مگر باغی کو سزا دینا بھی ضروری ہے۔ یہ باغی سمجھتا ہے کہ یہاں سے ہمارے قدم اکھاڑنا بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ لہٰذا اس کا بایاں ہاتھ کہنی سے کاٹ کر الگ کر دیا جائے۔"

یہ سزا سنتے ہی راجکماری کے دل و دماغ پر جیسے بجلی گر پڑی۔ اگر خرم کو موت کی سزا سنائی جاتی تو راج کماری کو اتنا صدمہ نہ پہنچتا' وہ صبر کر لیتی کہ اس بازی گر کی قسمت میں موت لکھی تھی لہٰذا وہ مر گیا لیکن اسے تو زندہ رکھ کر دھیرے دھیرے مارا جا رہا تھا۔ پہلے اس کا دایاں ہاتھ کاٹا گیا' اب بایاں ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا جا رہا تھا۔ یہ حکم سن کر راجکماری کے دماغ کو اتنا شدید جھٹکا پہنچا کہ اس پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ اس کی زبان گنگ ہو گئی۔ اس کے کان بھی اس دنیا کی کوئی آواز نہیں سن رہے تھے۔ وہ چپ چاپ خلا میں دیدے پھاڑے گھورتی جا رہی تھی۔

والٹن کہہ رہا تھا کہ مقابلہ ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔ جب بازیگر کے بائیں بازو کا زخم بھر جائے گا تو مقابلے کا تیسرا راؤنڈ شروع کیا جائے گا۔ اس وقت تک وہ بازیگر راج محل میں مہمان کے طور پر رہے گا..........

اتنا کہہ کر اس نے راج کماری کی جانب دیکھا اور اسے اپنے ساتھ چلنے کی

درخواست کی لیکن وہ گم صم بیٹھی رہی۔ راجہ بھیم سین نے اس کے بازو کو جھنجھوڑ کر اٹھنے کے لئے کہا تب بھی وہ بیٹھی رہی۔ تب ان کی سمجھ میں آیا کہ اس پر سکتہ طاری ہو گیا ہے۔ راجہ صاحب اور صاحب بہادر نے دو طرف سے اس کے بازوؤں کو تھام لیا اور اسے محل کے اندر لے جانے لگے۔

اب یہ موضوع زیر بحث آ گیا کہ اچانک راجکماری کو کیا ہو گیا ہے۔ راج محل کے داس اور داسیاں چپ تھیں۔ وہ سب راز دار تھے اور یہ سمجھ رہے تھے کہ اتنی بڑی راجکماری ایک غریب بازی گر کی محبت میں چپ چاپ مر رہی ہے۔

والٹن کو شبہ تھا کہ وہ بازیگر میں دلچسپی لیتی ہے لیکن وہ اس حد تک نہیں سوچ سکتا تھا کہ ایک راجکماری اپنی شان و شوکت بھول کر اور اپنا غرور آپ توڑ کر کسی دو ٹکے کے بازیگر کی آغوش میں چلی جائے گی۔ ایک بار اس کے پیار کی لذت سے آشنا ہو کر بار بار اس کی تمنا کرے گی۔ بلندی اور مرتبے کا خیال رکھنے والا فرنگی اس حد تک نہیں سوچ سکتا تھا اور راج محل میں پروان چڑھنے والا عشق حد سے بڑھ گیا تھا۔ ایک غریب کا دکھ' ایک راجکماری کا دکھ ہو گیا تھا۔ ایک کو سزا ملتی تھی اور دوسری اپنے دل و دماغ میں اس سزا کی اذیتیں برداشت کرتی تھی۔

☆======☆======☆

ویدراج نے آ کر راجکماری کی نبض دیکھی۔ اس کی آنکھیں دیکھیں اور کہا کہ راجکماری کو کوئی بیماری نہیں ہے۔ صرف ذہنی طور پر صدمہ پہنچا ہے۔ راجہ بھیم سین اپنی بیٹی کے دکھ کو سمجھتا تھا۔ وہ اندھا یا نا سمجھ نہیں تھا۔ اس نے بیٹی کے والہانہ عشق کو دیکھا تھا کہ وہ کس طرح ایک غریب کی سیوا کرتی رہی تھی لیکن راجہ صاحب نے بیٹی کے معاملات میں اس لئے مداخلت نہیں کی تھی کہ اب سے پہلے خود انہوں نے فرنگیوں کے سامنے راجکماری کو چارہ بنا کر پیش کیا تھا اس لئے وہ نادم تھے اور یہ راج پاٹ حاصل کرنے کے بعد بیٹی سے آنکھیں ملا کر باتیں نہیں کر سکتے تھے۔

جب والٹن راج محل سے رخصت ہوا تو سیناپتی اسے ریذیڈنسی تک چھوڑنے گیا۔ راستے میں اس نے کہا۔

"حضور! راجکماری کی بیماری کو میں سمجھتا ہوں۔ فی الحال ثبوت پیش نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہنے سے ڈرتا ہوں۔"

"تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے' جو کہنا ہے صاف صاف کہو۔"

اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "حضور! راجکماری اپنے استھان سے بہت نیچے گر چکی ہے اگر آپ مجھے تھوڑا سا وقت دیں تو میں چند دنوں میں ثابت کر دوں گا کہ وہ اپنی راتیں مہمان خانے میں اس اپاہج بازی گر کے ساتھ گزارتی ہے۔"

والٹن نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ "ہوں۔ تمہیں چند دنوں کی مہلت دی جاتی ہے' ان کی کڑی نگرانی کرو۔ تم جب بھی اطلاع دو گے' میں اسی وقت راج محل میں پہنچ جاؤں گا۔"

سیناپتی کو والٹن کی طرف سے شہ مل گئی۔ وہ قید خانے کی وہ رات نہیں بھولا تھا جب راجکماری نے اسے جیلر اور سپاہیوں کے سامنے ڈانٹا تھا اور اس کی بے عزتی کی تھی۔ خرم نے بھی اس کے حملے ناکام بنا کر سینکڑوں تماشائیوں کے سامنے اس کی توہین کی تھی' اب ان دونوں سے انتقام لینے کا موقعہ ہاتھ آ گیا تھا۔

وہ دن رات اسی تاک میں رہنے لگا کہ کبھی انہیں رنگے ہاتھوں پکڑ لے دو دنوں تک راجکماری کو اپنا ہوش نہیں تھا۔ وہ بار بار خرم کے متعلق سوچتی تھی اور صدمے سے بے ہوش ہو جاتی تھی۔ تیسرے دن وہ مہمان خانے میں آئی تو یہ دیکھ کر پھر اس کا سر چکرا گیا کہ اب اس کے محبوب کے دونوں ہاتھ کہنیوں تک کٹے ہوئے تھے۔ دائیں ہاتھ کا زخم تو کب کا سوکھ چکا تھا مگر بائیں ہاتھ کی کہنی پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ خون زیادہ بہہ جانے کے باعث اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ وہ برسوں کا بیمار نظر آ رہا تھا لیکن راجکماری کو دیکھتے ہی اس کے چہرے پر رونق آ گئی۔ اس نے مسکرا کر کہا۔

"میں دو دنوں سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ مجھے داسیوں نے بتایا ہے کہ تم میری وجہ سے بیمار پڑ گئی ہو۔ پدمنی! یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے دیکھو' کبھی کبھی مقدر کی باتیں پہلے سے معلوم ہو جاتی ہیں۔ میں اپنے مقدر کی باتیں جانتا ہوں کہ یہاں سے زندہ سلامت واپس نہیں جا سکوں گا۔ وہ فرنگی چاہتا ہے کہ میں اس کے سامنے جھک جاؤں۔ میرے دونوں ہاتھ کاٹنے کے بعد اسے یقین آ گیا ہو گا کہ وہ مجھے کبھی نہیں جھکا سکے گا اس لئے آئندہ وہ مجھے موت کی سزا دے گا۔

میری موت یقینی ہے' اس لئے تم سے التجا کرتا ہوں کہ میری محبت میں دیوانگی اختیار نہ کرو۔ سمجھ لو کہ میں مر چکا ہوں اور اب تمہیں صبر کرنا چاہئے۔"

"مجھ سے صبر نہیں ہوتا۔ تم کیسے ضدی ہو خرم! تم نے میری بات نہیں مانی۔ اگر پہلے ہی یہاں سے فرار ہو جاتے تو یہ دوسرا ہاتھ کبھی ضائع نہ ہوتا۔ اب بھی موقع ہے' میں

کسی سواری کا انتظام کرتی ہوں۔ ہم دونوں یہاں سے نکل جائیں گے۔"

خرم نے پوچھا۔ "یہاں سے نکل کر ہم کہاں جائیں گے؟ صرف ایک آزاد علاقہ ایسا ہے جہاں ہم فرنگیوں سے آزاد رہ سکتے ہیں لیکن میرے کٹے ہوئے ہاتھ دیکھ کر میرے پٹھان بھائی مجھے لعنت ملامت کریں گے۔ جو بندوق نہ پکڑ سکے اور دشمن سے انتقام نہ لے سکے وہ پٹھان کیسا؟ یہ درست ہے کہ اب میں بندوق نہیں پکڑ سکوں گا لیکن کسی طرح اپنے دشمن سے انتقام تو لے سکوں گا۔"

راجکماری نے حیرانی اور پریشانی سے پوچھا۔ "تم کیسے انتقام لو گے؟ تم اپنے کسی ہاتھ سے تنکا نہیں اٹھا سکتے' پھر دشمن پر کس طرح حملے کرو گے؟"

"پہلے تو میں نے سوچا تھا کہ کبھی اس پر حملہ نہیں کروں گا کیونکہ وہ مجھ سے کمزور ہے لیکن وہ دوبار مجھے دھوکا دے چکا ہے میں نے اس پر حملہ نہیں کیا۔ مگر وہ یہی الزام لگاتا ہے کہ میں اس پر حملے کرتا ہوں۔ جھوٹے الزامات لگا کر اس نے میرے دونوں بازو کاٹ ڈالے ہیں۔ اب میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔

یہ درست ہے کہ میرے ہاتھ نہیں ہیں۔ میں بے دست ہوں مگر بے پا نہیں ہوں۔ اب بھی پیروں سے میں بازی گری کے نت نئے تماشے دکھا سکتا ہوں۔ اپنے دشمن کو میدان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک نچا سکتا ہوں۔ اپنے سر سے اسے ٹکریں مار سکتا ہوں' اگر کچھ نہ کر سکا تو اپنے دانتوں سے اس کی بوٹیاں نوچ سکتا ہوں۔ جیسے بھی ہو' میں اس سے انتقام لوں گا اور جب تک انتقام نہیں لوں گا' یہاں سے جانے کا تصور بھی نہیں کروں گا۔"

راجکماری اس کی گردن میں بانہیں ڈال کر سینے سے لگ گئی۔

"تم واقعی ضدی ہو' میں تمہیں سمجھا نہیں سکتی۔ ٹھیک ہے اگر تمہیں موت پسند ہے تو مجھے بھی پسند ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی آغوش میں مریں گے۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی خوابگاہ کا دروازہ ایک دھڑاکے سے کھلا۔ وہ دونوں چونک کر ایک دوسرے سے الگ ہو گئے اور دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔ وہاں والٹن ڈیوڈ اور سیناپتی کھڑے ہوئے تھے' ان کے پیچھے سپاہی نظر آ رہے تھے۔ والٹن نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ سیناپتی نے اس کا اشارہ پا کر سپاہیوں کو حکم دیا کہ ان دونوں کو حراست میں لے لیں۔

انہیں جرم نہیں بتایا گیا۔ سپاہی انہیں حراست میں لے کر مہمان خانے کے باہر محل

کے سامنے اسی باغ میں آ گئے جہاں دو دن پہلے مقابلے کا دوسرا راؤنڈ ہوا تھا۔ راجہ بھیم سین کو بھی وہاں بلایا گیا۔ وہ اپنی بیٹی کو قیدی کی حیثیت سے دیکھ کر والٹن کے سامنے فریاد کرنے لگا۔ والٹن نے کہا۔

”تمہاری بیٹی نے دو جرم کئے ہیں۔ ایک جرم یہ ہے کہ وہ پٹھان بازی گر کو یہاں سے فرار ہونے کا مشورہ دے رہی تھی۔ اس کا دوسرا جرم یہ ہے کہ یہ اس بازی گر سے عشق کرتی ہے۔“

راجہ بھیم سین ہاتھ جوڑ کر گڑگڑانے لگا کہ اس کی بیٹی کا قصور معاف کیا جائے۔ والٹن نے کہا۔

”اس کا پہلا قصور معاف کیا جا سکتا ہے لیکن اس کی دوسری غلطی ناقابل معافی ہے۔ راجکماری نے عشق نہیں کیا بلکہ غداری کی ہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ جو چیز ہماری ہو جاتی ہے اس پر ہم کسی دوسرے کا قبضہ برداشت نہیں کرتے۔ جس بگھی پر ہم سوار ہوتے ہیں اس پر غلام قوم کا کوئی فرد سوار نہیں ہو سکتا۔ اگر ایسا ہو جائے تو ہم بگھی کو آگ لگا دیتے ہیں۔ راجکماری کے ساتھ بھی یہی ہو گا اس نے ہماری جگہ ایک حقیر بازی گر کو دی ہے' ہم اس کے وجود کو مٹا دیں گے' تاکہ پھر کبھی کوئی دوسرا اس حسینہ کے قریب نہ جا سکے۔ چلو آگے بڑھو اور اسے شوٹ کر دو۔“

دو سپاہی راجکماری کو کھینچتے ہوئے محل کی دیوار کی طرف لے گئے۔ خرم نے چیخ کر کہا۔

”فرنگی! اپنی زندگی چاہتا ہے تو راجکماری کو چھوڑ دے۔ چھوڑ دے راجکماری کو..........“

وہ آگے بڑھنے لگا۔ سپاہیوں نے نیزے تان لئے' تلواریں سونت لیں اور اس دیوانے بازی گر کا راستہ روکنے لگے۔ وہ نیزوں اور تلواروں سے کترا کر راجکماری کی طرف جانا چاہتا تھا مگر سپاہی بار بار اس کے راستے میں حائل ہو رہے تھے۔ پھر فائرنگ کی آواز سن کر وہ لڑکھڑا گیا' اور زمین پر اوندھے منہ گر پڑا۔ دشمنوں کے سامنے وہ زندگی میں پہلی بار گرا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ دور اس کی محبوبہ گولی کھا کر سبز گھاس پر پڑی ہوئی تھی اور سر اٹھا کر اپنے بازیگر کو الوداعی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔ پھر کھڑا ہو گیا۔ اسی وقت والٹن ایک سپاہی سے تلوار لے کر اس کے سامنے ڈٹ گیا۔ خرم کو تلوار کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ تلوار پکڑنے کے لئے

اس کے پاس ہاتھ نہیں تھے۔ اب صرف دو ٹانگیں تھیں' بائیں ہاتھ کی کٹی ہوئی کہنی سے لہو رس رہا تھا۔ تکلیف بڑھتی جا رہی تھی اور راجکماری کو دم توڑتے دیکھ کر دل پر قیامت گزر رہی تھی۔ وقت بہت کم تھا۔ وہ جلد از جلد راجکماری تک پہنچنا چاہتا تھا۔ اس لئے اس نے والٹن کو ایک ہی حملہ کرنے کا موقعہ دیا۔ والٹن نے آگے بڑھ کر کھڑی تلوار ماری۔ وہ اچھل کر پیچھے گیا۔ وار خالی جاتے ہی والٹن تلوار کے ساتھ زمین کی جانب جھک گیا۔ اسی وقت بازی گر نے اچھل کر فضا میں قلابازی کھائی۔ اس کی ٹانگیں والٹن کے سر کی طرف آئیں۔ پھر دوسرے ہی لمحے وہ اپنے حریف کی گردن میں ٹانگوں کی قینچی ڈال کر پلٹی کھاتے ہوئے زمین پر آ گیا۔

والٹن کی گردن ٹانگوں کی قینچی میں پھنسی ہوئی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ اگر خرم ذرا بھی زور لگائے گا تو اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ جائے گی۔ اسے بے بسی کی حالت میں دیکھ کر سیناپتی اور سپاہی دوڑتے ہوئے قریب آنے لگے۔ خرم نے للکار کر کہا۔

”خبردار! اگر کوئی میرے قریب آئے گا تو صاحب بہادر کی گردن ٹوٹ جائے گی۔ اگر تم چاہتے ہو کہ تم پر فرنگیوں کا قہر نازل نہ ہو اور یہ صاحب بہادر زندہ بچ جائے تو مجھ سے دور رہو۔ اگر کسی نے مجھے گولی مارنی چاہی تو میرے دم توڑنے میں وقت لگے گا لیکن اس انگریز کی گردن صرف ایک جھٹکے سے ٹوٹ جائے گی۔“

وہ سب دور ہی رک گئے تھے۔ سیناپتی نے کہا۔

”صاحب بہادر کو چھوڑ دو' ورنہ ہمارے ساتھ تم بھی مارے جاؤ گے۔“

”مجھے موت کی پرواہ نہیں ہے۔ میں جو کہتا ہوں اس پر عمل کرو۔ اپنے دو سپاہیوں سے کہو کہ وہ اپنے ہتھیار پھینک دیں۔ نہتے ہو کر راجکماری کے پاس جائیں اور اسے اٹھا کر میرے پاس لے آئیں۔“

اس کے حکم کی فوراً تعمیل کی گئی۔ دو سپاہی راجکماری کو اٹھا کر لائے اور بازی گر کے قریب اسے لٹا دیا۔ والٹن کی سانسیں رک رہی تھیں۔ وہ ہولے ہولے پھڑپھڑا رہا تھا۔ چونکہ گردن نہیں گھما سکتا تھا اس لئے دیدے گھما کر اِدھر اُدھر رحم طلب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ سو سنار کی' ایک لوہار کی۔

اس نے سر گھما کر اپنی محبوبہ کو دیکھا۔ وہ اکھڑی اکھڑی سی سانسیں لے رہی تھی۔ اس نے ہولے سے آواز دی۔

”پدمنی! دیکھو تم نے کہا تھا کہ ہم ایک دوسرے کی آغوش میں مریں گے۔ تمہاری

یہ خواہش پوری ہو رہی ہے۔ ذرا آنکھیں کھول کر دیکھو۔"

راجکماری کی پلکیں تھرتھرانے لگیں۔ پھر اس نے ہولے سے آنکھ کھول کر اپنے بازی گر کو دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم آیا' پھر اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ اس کے ساتھ ہی کڑاک کی آواز کے ساتھ ایک حریف کی گردن ٹوٹ گئی۔ ٹانگوں کی قینچی کھل گئی۔ پھر بازی گر نے راجکماری کے سینے پر سر رکھ دیا اور ہمیشہ کے لئے اپنی آنکھیں بند کر دیں۔

☆======☆======☆

صفرِ حیات

ایک پُراسرار گولی کی کہانی، جو اسے نگل لیتا دوسروں کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا۔

خون میں شامل ہونے والے ایک قطرہ سیماب کے حیرت انگیز واقعات۔

کہانی کا عنوان تھا "نادیدہ محبوب" یعنی وہ محبت کرنے والا جو نظر نہیں آتا لیکن اپنی محبوبہ کو یقین دلاتا رہتا ہے کہ وہ اس کے آس پاس موجود ہے۔

نعیمہ عرف نامی ہے اس کی سہیلی نے کہا تھا کہ اس ماہ کے ڈائجسٹ میں مختار محبوب کی جو کہانی شائع ہوئی ہے 'اسے ضرور پڑھنا' ہائے کیسا ماحول پیش کیا ہے' رومانس بھی ہے اور اسرار و تجسس بھی۔ میں تو پڑھتے پڑھتے خوابوں میں کھو گئی تھی۔

نامی بھی خوابوں کی دنیا میں رہنے والی ایک لڑکی تھی۔ وہ ایسی محبت کی تلاش میں تھی' جو منفرد ہو' دوسروں سے الگ' اچھوتی ہو اور وہ محبت اس کے مرنے کے بعد بھی اس دنیا میں یادگار بن کر رہ جائے۔ وہ اپنی سہیلی کے مشورے پر ماہ رواں کا ڈائجسٹ خرید کر لے آئی۔ تین روپے کا ڈائجسٹ خریدنے کے لئے اس نے بیالیس روپے کا پٹرول جلایا۔ اس کے شہر سری پور کے اسٹالوں پر اس ڈائجسٹ کی تمام کاپیاں فروخت ہو چکی تھیں۔ لہٰذا وہ پچیس میل دور اپنے ایک بوائے فرینڈ کے ساتھ جمال کوٹ گئی۔ وہاں بھی ڈائجسٹ نہ ملا۔ وہ اور آگے بڑھ گئی۔ وہاں سے ستر میل دور جلال آباد چلی گئی۔

وہ اپنی ضرورت کو دیکھتی تھی' پیسوں کو کبھی انگلیوں پر نہیں گنتی تھی۔ دولتمند باپ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ ہمیشہ ایسے کام کرتی تھی کہ دوسروں کی توجہ کا مرکز بن جاتی۔ اس کی یہی حرکت سہیلیوں اور دوستوں کی گفتگو کا موضوع بن سکتی تھی کہ وہ محض تین روپے کا ایک ڈائجسٹ خریدنے سو میل دور جلال آباد گئی ہے۔

خود کو دوسروں سے منفرد اور نمایاں رکھنے کے لئے وہ نت نئے فیشن کے ایسے لباس پہنتی تھی کہ دوسری لڑکیاں اس کی نقالی پر مجبور ہو جاتی تھیں۔ نوجوان بے اختیار اس کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔ ادھیڑ عمر کی عورتیں جو اپنی بوسیدہ جوانی کو چھپانے کے لئے بھڑکیلے ریشمی لباس اور دولت کا سہارا لیتی تھیں۔ وہ جل کر کہتی تھیں کہ نامی لباس کے اندر کوئی مقناطیس چھپا کر رکھتی ہے اسی لئے مرد اس کی طرف کھنچے چلے جاتے ہیں ورنہ اس لڑکی میں کوئی خاص بات نہیں ہے ویسے لباس کے پیچھے مقناطیس ہوتا ہے۔ اسے مرد سمجھ

ہیں' عورتوں کے سمجھنے یا نہ سمجھنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

جلال آباد پہنچ کر نامی نے ڈائجسٹ خریدنے کے بعد کہا۔ "میں آنٹی کے ہاں جاؤں گی۔ پہلے مختار محبوب کی کہانی پڑھوں گی پھر ہم سری پور واپس جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے"۔ اس کے بوائے فرینڈ نے کہا۔ "تم چلو' میں ذرا اپنے چرس کے اسپیشل سگریٹ لے کر آتا ہوں۔"

وہ کار سے اتر کر چلا گیا۔ نامی نے ڈائجسٹ کے سرورق پر ایک نظر ڈالی۔ اس کی ایک کہانی اسے پکار رہی تھی۔ وہ تیزی سے کار ڈرائیو کرتی ہوئی اپنی آنٹی کی کوٹھی کے احاطہ میں آئی لیکن وہاں دروازے کھڑکیاں بند تھیں۔ مالی نے بتایا کہ بیگم صاحبہ بچوں کو لے کر اس کے ہاں سری پور گئی ہیں۔ وہ جھنجلا گئی۔ سری پور سے وہ کہانی پڑھنے کی لگن میں وہاں تک آئی تھی مگر وہاں بھی پڑھنے کے لئے آرام دہ جگہ نہیں تھی۔

وہ کار سے اتر کر لان میں آ گئی۔ پھر ہری بھری ملائم گھاس پر بیٹھ کر ڈائجسٹ کو کھولا اور مختار محبوب کی کہانی تلاش کرنے لگی۔ کہانی آخری چند صفحات پر تھی۔ اس کا عنوان تھا" نادیدہ محبوب"۔ کہانی کا خلاصہ کچھ یوں تھا۔

"میرا نام محبوب ہے۔ نام کی مناسبت سے میں کتنی ہی حسیناؤں کی نگاہوں کا مرکز تھا۔ میری شخصیت اور مردانہ حسن میں اتنی کشش تھی کہ راہ چلتی لڑکیاں پلٹ کر مجھے دیکھنے پر مجبور ہو جاتی تھیں۔

وہ شخصیت' وہ مردانہ حسن اور کشش آج بھی مجھ میں موجود ہے لیکن یہ چیزیں اب کسی کو نظر نہیں آتیں۔ میں اس دنیا میں موجود ہوں لیکن کسی کو نظر نہیں آتا۔ یہ اتنی عجیب اور ناقابل یقین بات ہے کہ کوئی ذی فہم اس کو تسلیم نہیں کرے گا۔ یہی وجہ ہے کہ میں اپنی زندگی کی اس ٹھوس حقیقت کو ایک کہانی بنا کر پیش کر رہا ہو۔

میں ایک دولتمند نوجوان ہوں۔ میرے والدین اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ صرف ایک چچا ہیں جو طب کے میدان میں ایک بہت بڑے حکیم کہلاتے تھے مگر اب نیم پاگل سمجھے جاتے ہیں۔ وہ بعض اوقات ایسے طبی تجربے کرتے ہیں جو دوسروں کے لئے ناقابل فہم ہوتے تھے۔ کہتے ہیں کہ پارا ایک ایسی شے ہے جس میں کوئی چیز حل نہیں ہوتی لیکن ان دنوں میرے چچا جان اس کوشش میں مصروف تھے کہ چند جڑی بوٹیاں پارے میں کسی طرح حل ہو جائیں۔ وہ فرماتے تھے' اگر ایسا ہو جائے تو چنے کے برابر پارے کے ایک قطرے میں ایسی حیرت انگیز خاصیت پیدا ہو جاتی ہے کہ جسے وہ وقت سے پہلے بیان نہیں

کر سکتے ورنہ لوگ انہیں پاگل کہیں گے۔

وہ اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ لوگ انہیں پاگل نہیں سمجھتے ہیں۔ میں نے انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ اگرچہ وہ ان تجربات میں میری دولت پانی کی طرح بہا رہے تھے لیکن میں ان کا ہاتھ نہیں روک سکتا تھا۔ وہ بزرگ تھے' اس دنیا میں نہ جانے اور کتنے دن ان کی زندگی کے باقی رہ گئے تھے۔ اس لئے میں ان کی دل شکنی نہیں کرتا تھا۔

ایک رات ہم ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ اس وقت چچا جان کچھ بے چین سے نظر آرہے تھے۔ میں نے پوچھا۔

"کیا بات ہے؟ آپ کچھ پریشان سے نظر آرہے ہیں۔"

"آں۔ کچھ نہیں بیٹے۔ آج میرا ایک تجربہ مکمل ہو گیا ہے۔ اب میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ مجھے کس حد تک کامیابی ہوئی ہے۔ تم بیٹھے کیوں ہو' کھاؤ بیٹا! یہ تو کھانے پینے کی عمر ہے۔"

میں خاموشی سے کھانے لگا۔ کھانے کے بعد میں سویٹ ڈش پسند کرتا ہوں۔ اس روز باورچی نے میرے لئے فرنی تیار کی تھی۔ چچا جان کو شوگر کی بیماری ہے اس لئے وہ میٹھا نہیں کھاتے اور نہ ہی اپنی بیماری کا مناسب علاج کرتے تھے۔ خواہ مخواہ تجربات میں اپنی زندگی برباد کر رہے تھے۔

میں فرنی کھانے لگا۔ چند چمچے کھانے کے بعد اچانک ہی میرے ہاتھ سے چمچہ چھوٹ کر گر پڑا۔ چمچہ خود بخود نہیں گرا تھا حیرانی کی شدت سے میں نے اسے چھوڑ دیا تھا اور گھبرا کر اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے پوری آستین کی قمیض پہنی ہوئی تھی۔ جہاں تک آستین تھی' وہاں تک میرے ہاتھ نظر آرہے تھے لیکن ہتھیلی اور انگلیاں نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تھیں۔ میں بری طرح بوکھلا گیا۔ یہ کیسے ممکن ہے؟ میں نے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کو چھو کر دیکھا ہتھیلیاں اور انگلیاں بالکل ٹھوس تھیں۔ ایک مادی حقیقت کی طرح موجود تھیں مگر نظر نہیں آرہی تھیں۔

"چچا جان!" میں نے حیرت سے چیخ کر کہا۔ "مجھے اپنے ہاتھ نظر نہیں آرہے ہیں' دیکھئے۔ دیکھئے' کیا آپ کو یہ ہاتھ نظر آرہے ہیں؟"

چچا جان کیا دیکھتے؟ وہ تو بہت پہلے ہی سے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے اور سب کچھ سمجھ رہے تھے اور حیرت و مسرت سے اپنی مٹھیاں بھینچ رہے تھے۔ انہوں نے خوشی سے بتیسی نکال کر کہا۔

"میں دیکھ رہا ہوں بیٹا۔ صرف تمہارے ہاتھ ہی نہیں' تمہاری گردن اور کھوپڑی بھی غائب ہے۔ اگر تم لباس اتار دو تو سر سے پیر تک نظروں سے اوجھل ہو جاؤ گے' تم کسی کو نظر نہیں آؤ گے۔ میں اپنی کامیابی کی منزل پر پہنچ گیا ہوں۔"

میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر چیختے ہوئے پوچھا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ کیسی کامیابی؟ کیسی منزل؟ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

"بیٹے! میں جو پارے میں چند جڑی بوٹیاں حل کرنا چاہتا تھا' اس میں کامیابی نصیب ہوئی ہے' پارے کا ایک قطرہ جو چنے کے دانے کے برابر تھا' میں نے تمہیں فرنی میں ملا کر کھلایا ہے۔ اس کی خاصیت یہ ہے کہ یہ انسانی جسم کو ٹرانسپیرنٹ بنا دیتا ہے۔ یعنی ہم تمہیں دیکھنا چاہیں گے تو تمہارے آرپار دیکھ سکتے ہیں' جس طرح شیشے کے آرپار دیکھتے ہیں لیکن تمہیں نہیں دیکھ سکتے۔"

میں نے میز پر گھونسہ مارتے ہوئے کہا۔ مجھے غصے میں یاد نہیں رہا کہ میرے ہاتھ نہیں ہیں' میں گھونسہ نہیں مار سکتا مگر اضطراری حالت میں میری مٹھی بند ہو گئی اور ایک زبردست گھونسہ میز پر پڑا۔ کانچ کے برتن اچھل کر پھر اپنی جگہ آگئے۔ میں نے غصے سے پوچھا۔

"آپ نے مجھ پر یہ تجربہ کیوں کیا؟"

"ارے بیٹا! اتنا اہم اور اتنا قیمتی تجربہ اور کس پر آزماتا؟ تم میرے بھتیجے ہو۔ میری کوئی اولاد نہیں ہے اس لئے میرے بیٹے بھی ہو۔ میں اپنی زندگی کی تمام آرزوئیں' تمام کوششیں اور تمام تجربے تمہیں نہیں دوں گا تو اور کسے دوں گا؟"

میں غصے سے مٹھیاں بھینچ کر انہیں دیکھنے لگا۔ جی تو چاہتا تھا کہ ان کا گلا گھونٹ دوں لیکن ان کی نیت صاف تھی' وہ اپنے طور پر میری بھلائی کر رہے تھے۔ میں نے کہا۔

"چچا جان! کیا واقعی میرا چہرہ بھی غائب ہو گیا ہے؟ اگر ایسا ہے تو آپ خوش کیوں ہو رہے ہیں؟ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ میرا وجود مضحکہ خیز اور دہشت انگیز بن گیا ہے؟ جہاں تک میرا لباس ہے' وہاں تک میں نظر آرہا ہوں' باقی میرے ہاتھ نہیں ہیں' میری گردن نہیں ہے' میرا سر نہیں ہے' میرا چہرہ نہیں ہے۔ اگر باورچی نے مجھے دیکھ لیا تو دہشت سے مرجائے گا۔"

"تم فکر نہ کرو' میں نے باورچی کو چھٹی دے دی ہے۔ اب تم یہ لباس اتار دو تو سر سے پاؤں تک کسی کو نظر نہیں آؤ گے۔ تم یہاں رہو گے لیکن میں ملازم سے کہہ دوں گا

کہ تم سری پور کی حویلی میں چلے گئے ہو۔"

"چچا جان۔ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ مجھے لباس اتارنے کے لئے کہہ رہے ہیں۔ یہ کیسی بے شرمی کی بات ہے؟ آپ یہ نہیں سوچتے کہ میں کس طرح برباد ہو گیا ہوں۔ اب میں اپنی شخصیت کا مظاہرہ نہیں کر سکتا۔ جو شخص‘ سماجی زندگی میں اپنی ظاہری پُرکشش شخصیت کو برقرار نہیں رکھ سکتا‘ اس کا زندہ رہنا یا نہ رہنا ایک برابر ہے۔"

"ذرا ٹھہرو بیٹے! میں تمہاری ہر بات کا جواب دیتا ہوں۔ دیکھو انسان لباس اس لئے پہنتا ہے کہ اپنی شرم کو چھپائے۔ مگر تم تو لباس کے بغیر ہی چھپے ہوئے ہو۔ آؤ۔ آئینے کے سامنے آؤ۔ میں تمہیں دکھاتا ہوں۔"

یہ کہتے ہوئے انہوں نے میرا بازو پکڑا۔ میں ان کے ساتھ اپنے بیڈ روم میں آگیا۔ وہاں میں نے قد آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر دیکھا آئینے میں میرا چہرہ اور گردن نظر نہیں آرہی تھی۔ کلائی سے آگے دونوں ہتھیلیاں بھی غائب تھیں۔ میرے وجود کا صرف وہی حصہ نظر آرہا تھا جو لباس میں چھپا ہوا تھا۔ انہوں نے کہا۔

"اپنی قمیص اتار دو۔"

میں نے قمیص اتار دی۔ پھر میں نے آئینے میں دیکھا تو کمر کے اوپر سے آدھا جسم غائب ہو چکا تھا۔ کمر سے نیچے میں پتلون میں ملبوس تھا اس لئے آدھا نظر آرہا تھا۔ چچا جان نے کہا۔

"اب تمہیں یقین ہو گیا ہو گا کہ لباس اتارنے کے باوجود تم عریاں نہیں ہو سکتے کیونکہ تمہارا ننگا جسم کسی کو نظر نہیں آتا ہے‘ خود تمہیں نظر نہیں آتا ہے لہٰذا اب پتلون بھی اتار دو۔"

میں نے جھجکتے ہوئے پتلون بھی اتار دی۔ واقعی میں سر سے پیر تک غائب ہو چکا تھا۔ صرف اس جگہ جہاں میں کھڑا ہوا تھا‘ وہاں چپلیں نظر آرہی تھیں۔ میں نے پیروں کو جھٹک کر چپلوں کو ایک طرف پھینک دیا۔ چچا جان نے کہا۔

"میں ان چپلوں کی وجہ سے تمہیں پہچان رہا تھا کہ تم اس وقت کس جگہ ہو۔ اب میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ تم میرے سامنے ہو‘ پیچھے ہو یا دائیں بائیں کھڑے ہو گئے ہو۔ اب تم ایک پُراسرار ہستی ہو۔ ابھی تم نے کہا تھا کہ تم اپنی شخصیت کا مظاہرہ نہیں کر سکتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ ہر شخص اپنی شخصیت کا مظاہرہ کرتا ہے‘ اگر تم بھی کرو تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہو گی۔ نئی‘ انوکھی اور اچھوتی بات تو یہ ہے کہ تم موجود ہوتے ہوئے بھی

موجود نہیں رہو گے۔ تم ساری دنیا کو دیکھو گے ان کی اچھائی کو‘ ان کی برائی کو‘ ان کے ظاہر کی سچائی کو اور تنہائی میں چھپے ہوئے جھوٹ اور فریب کو دیکھو گے۔ تم سب کو ان کی خلوت اور جلوت میں دیکھو گے۔ مگر کوئی تمہیں نہیں دیکھ سکے گا۔ دنیا کو ایک نئے انداز میں بھی دیکھو بیٹے! اس طرح تمہیں اس دنیا کا ایک نیا روپ نظر آئے گا۔"

"نہیں چچا جان۔ میں اس دنیا کا اصلی روپ دیکھ کر کیا کروں گا؟ کسی کی تنہائی میں جا کر کسی کے رازو نیاز کو آنکھوں سے دیکھنا شرافت نہیں ہے‘ مجھے دولت کا لالچ بھی نہیں ہے کہ ایک نادیدہ انسان بن کر جاؤں اور کسی کی تجوری صاف کردوں۔ میرے پاس اتنی دولت اور جائیداد ہے کہ ہماری آئندہ نسلیں بھی محنت مزدوری کئے بغیر عیش و آرام سے زندگی گزار سکتی ہیں۔ میں دنیا والوں سے چھپ کر کیا کروں گا؟ اگر میں بدصورت ہوتا تو شاید اس طرح چھپ کر‘ نظروں سے اوجھل رہ کر کسی حسینہ کو متاثر کرتا لیکن آپ مجھے دیکھ چکے ہیں۔ میں جوان ہوں‘ خوبرو اور پُرکشش شخصیت کا مالک ہوں پھر میں کسی حسینہ کے ساتھ یا آپ کی کسی ہونے والی بہو کے ساتھ آنکھ مچولی کیسے کھیلوں؟

نہیں چچا جان۔ آپ اخلاقی نقطہ نظر سے یہ ثابت کیجئے کہ میرا اس طرح ساری دنیا کی نظروں سے چھپ کر رہنا جائز ہے تو میں اپنے اس بے نام سے وجود کو تسلیم کرلوں گا‘ ورنہ آپ میری بات مان لیں۔ مجھے میرا نمائشی جسم واپس کر دیں۔"

چچا جان سوچ میں پڑ گئے۔ وہ اخلاقی نقطہ نظر سے یہ ثابت نہیں کر سکتے تھے کہ مجھے دوسروں کی نظروں سے اوجھل رہنا چاہیے اور ان کے رازوں تک پہنچنا چاہیے۔ انہوں نے شکست خوردہ انداز میں کہا۔

"بیٹے! اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنا۔ ابھی ساری رات پڑی ہے۔ اگر صبح تم نے یہی فیصلہ سنایا کہ تمہیں اپنے نمائشی جسم کی ضرورت ہے تو میں اپنے تجربے کا توڑ کروں گا۔ انشاء اللہ تمہیں تمہارا نمائشی جسم واپس کردوں گا۔ جاؤ آرام کرو اور اچھی طرح میری باتوں پر غور کرو۔"

وہ کمرے سے چلے گئے۔ میں دروازہ بند کر کے ٹہلنے لگا۔ بار بار آئینے کے سامنے آکر خود کو دیکھنے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ میں نے آئینے پر اپنی بائیں ہتھیلی رکھی کہ شاید صرف ہتھیلی نظر آجائے لیکن میں حرفِ غلط کی طرح اس دنیا کے ماحول سے مٹ گیا تھا۔

میں پریشان ہو کر بستر پر لیٹ گیا اور بے چینی سے کروٹیں بدلنے لگا۔ پھر میں نے سوچا کہ پریشانی کی کیا بات ہے؟ چچا جان نے وعدہ کیا تھا کہ صبح تک اگر میں اپنے فیصلے پر

قائم رہا تو وہ مجھے میری سابقہ حالت میں لے آئیں گے۔ مجھے میرا نمائشی جسم واپس کر دیں گے۔ ایسی صورت میں پریشان ہونے یا گھبرانے کی کیا بات تھی۔

میں بستر سے اٹھ گیا۔ میں نے سوچا کہ کل صبح میں اپنی سابقہ حالت پر واپس آ جاؤں گا۔ یہ عجیب و غریب زندگی صرف رات بھر کی ہے۔ پھر کیوں نہ ذرا کوٹھی سے باہر جا کر دیکھوں کہ یہ دنیا اپنے باطن میں کیسی ہے؟

میں کمرے کا دروازہ کھول کر باہر آیا۔ باہر کاریڈور میں چچا جان دیوار سے ٹیک لگائے کھڑے تھے۔ میں انہیں نظر نہیں آ رہا تھا لیکن دروازہ کھلتے ہی انہوں نے سمجھ لیا کہ میں کمرے سے باہر نکل رہا ہوں۔ انہوں نے دروازے کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"برخوردار۔ یہ تم نے اچھا کیا کہ کمرے سے نکل آئے۔ ایک رات کی پُراسرار زندگی میں خود کو قید نہ کرو۔ باہر جاؤ اور دنیا کو دیکھو۔ دنیا میں دیکھنے کے لئے بہت کچھ ہے۔ اس بہت کچھ میں دیکھنے کے لئے عورت بھی ہے۔ جو مرد کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ میں اس کمزوری سے تمہیں محفوظ رکھنا چاہتا ہوں' اور تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ خود کو ایسی ویسی عورت سے دور رکھو۔ ایک بات یاد رکھنا کہ صرف عورت کی عصمت نہیں ہوتی' شریف مرد کی بھی عصمت اور پاکیزگی ہوتی ہے۔ وہ صرف اپنی بیاہتا عورت کو اپنی تنہائی کا راز دار بناتا ہے۔ تم سمجھ دار ہو' میری بات سمجھ گئے ہو گے۔ اب تم جا سکتے ہو۔ یہ دروازہ بند کر دو تاکہ میں سمجھ لوں کہ تم نے میری نصیحت سن لی ہے۔"

میں نے دروازہ بند کر دیا اور ان کے قریب سے گزرتا ہوا نکل گیا۔ میرا دعویٰ ہے کہ انہوں نے مجھے قریب سے گزرتے ہوئے محسوس نہیں کیا تھا۔ کیونکہ وہ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے محسوس کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ میں کدھر سے گزر رہا ہوں۔

میں کوٹھی سے باہر آ کر مین گیٹ پر پہنچا تو چوکیدار ایک اسٹول پر بیٹھا چرس کا ایک سگریٹ تیار کر رہا تھا۔ اگر وہ مجھے دیکھ لیتا تو کبھی نشہ استعمال کرنے کی جرأت نہ کرتا۔ چونکہ وہ مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا اس لئے بڑے اطمینان سے چرس کا سگریٹ تیار کر رہا تھا۔ اب بھلا ایسا نشہ کرنے والا آدمی کیا چوکیداری کرتا اور کیسے میری کوٹھی کی حفاظت کرتا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ کل صبح اس کی چھٹی کر دوں گا۔

میں اپنی کوٹھی سے بہت دور چلا آیا۔ ایک کھلے میدان میں خانہ بدوشوں کا ایک قافلہ آ کر ٹھہرا ہوا تھا۔ دن کے وقت جب میں نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے دیکھا تھا تو یہی سمجھا تھا کہ وہ خانہ بدوش ہیں۔ مگر اب قریب جانے کے بعد پتہ چلا کہ وہ ہپیوں کی ایک

جماعت ہے جس نے وہاں کچھ عرصہ کے لئے پڑاؤ کیا ہے۔ وہاں تین خیمے تھے' ان کے پیچھے دو ویگنیں کھڑی ہوئی تھیں۔ جوان مرد اور عورتیں ایک ایک جوڑے کی صورت میں کہیں اونچے پتھروں پر بیٹھے ہوئے تھے' کہیں گھاس پر لیٹے ہوئے تھے۔ ایک جوڑا ویگن کی چھت پر تھا۔ ایک لڑکی اس کے زانو پر سر رکھے لیٹی ہوئی تھی اور وہ گٹار بجا رہا تھا۔ چھت پر لیٹنے کی وجہ سے لڑکی کا پاؤں ویگن کی کھڑکی تک لٹک رہا تھا۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر اس کے تلوے میں گدگدی کی۔ وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ اس کے ساتھی نے پوچھا۔

"کس بات پر ہنس رہی ہو؟"

اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ "نیچے کوئی کھڑا ہے' میرے پاؤں میں گدگدی کر رہا ہے۔"

اس کے ساتھی نے ذرا جھک کر نیچے دیکھا' پھر مسکرا کر بولا۔ "کوئی نہیں' تمہیں ایک ہی سگریٹ میں نشہ ہو جاتا ہے۔ سنو! میں ایک گیت گاتا ہوں۔"

وہ گانے لگا۔ میں انہیں مزید چھیڑنا چاہتا تھا لیکن اسی وقت میری نظریں ایک نوجوان لڑکی پر جم گئیں۔ اسے دیکھ کر مجھے یوں لگا جیسے چاندنی زمین پر آ کر ایک حسینہ کے روپ میں مجسم ہو گئی ہے۔ وہ ویگن کے پیچھے تنہا کھڑی ہوئی تھی۔ شاید کسی کا انتظار کر رہی تھی۔ پھر وہ کھلے میدان کی طرف جانے لگی۔ میں تیزی سے قدم بڑھاتا ہوا اس کے پاس آیا اور اس کے شانہ بشانہ چلنے لگا۔ وہ بلاشبہ اتنی حسین تھی کہ اسے چھو کر دیکھنے کو جی چاہتا تھا لیکن میری یہ خواہش اتنی جلدی پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ اگر میں اچانک ہی اسے چھو لیتا تو وہ خوفزدہ ہو کر چیخنے لگتی۔ اس وقت وہ بے خوف و خطر اکیلی ٹہل رہی تھی۔ میں اسے ڈرانا نہیں چاہتا تھا۔ اتنے میں دور سے کسی لڑکی نے اسے آواز دی۔

"سوانہ۔ کہاں جا رہی ہو؟ یہاں آ جاؤ۔"

سوانہ لہرا کر پلٹ گئی۔ اس کے ساتھ پیٹی کوٹ بھی لہرا گیا۔ پیٹی کوٹ کے اوپر اس کا پیٹ ننگا تھا۔ ایک زرد رنگ کی چولی سینے کے ابھاروں کو چھلکنے سے روکنے کی انتہائی ناکام کوشش کر رہی تھی گلے میں ایک باریک سنہری زنجیر تھی۔ ہاتھوں کی انگلیوں سے کلائی تک سونے کا زیور پہنے ہوئے تھی۔ سر کے اطراف بھی سونے کا جھومر نما زیور تھا۔ سیاہ ریشمی زلفیں شانوں تک لہرا رہی تھیں۔ اس کا حسن مغربی تھا' لباس کسی ایشیائی خانہ بدوش لڑکی کا تھا۔ زیورات مشرقی لڑکیوں جیسے تھے۔ ان سب نے مل کر اسے مختلف ممالک کے حسن کا کاک ٹیل بنا دیا تھا۔

اس کی ہر بات اور ہر ادا مجھے پسند تھی۔ مگر اس کے گلابی بدن سے جو چرس کی بو آ رہی تھی' وہ مجھے پسند نہیں تھی۔ اس نے سگریٹ کا دھواں چھوڑنے کے بعد آواز دینے والی لڑکی سے کہا۔

"نو تھینکس۔ میں ٹونی کا انتظار کر رہی ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی۔ ان سب سے بہت دور گھاس پر آ کر بیٹھ گئی۔ اس وقت مجھے بڑی بوڑھیوں کی وہ بات یاد آئی کہ جوان لڑکی کو بن سنور کر رات کے وقت کھلی فضا میں نہیں رہنا چاہئے' ورنہ جنات کا سایہ پڑ جاتا ہے۔ یہ بات کسی حد تک درست ثابت ہو رہی تھی۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس پر بھی کسی کا ان دیکھا سایہ پڑ رہا ہے۔ اس کے قریب ہی گھاس پر اس کا ایک دیوانہ بیٹھا اسے بڑی لگن اور چاہت سے دیکھ رہا ہے.........."

کہانی رک گئی۔ بلکہ نامی پڑھتے پڑھتے رک گئی۔

وہ بھی گھاس پر بیٹھی ہوئی تھی اور بالکل تنہا تھی۔ اسے یوں لگا جیسے اس کے قریب کوئی بیٹھا ہوا ہے اور اسے بڑی لگن سے اور بڑی چاہت سے دیکھ رہا ہے۔

وہ اپنے آپ میں سمٹنے لگی۔ جھکی جھکی نظروں سے کبھی سامنے اور کبھی دائیں بائیں دیکھنے لگی۔ کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کے باوجود اس نادیدہ محبوب نے ایک عجیب سی رومانی کیفیت طاری کر دی تھی۔ وہ بہت دیر تک سوچ میں گم رہی اور کہانی کے ان دیکھے محبوب کو سوانہ سے چھین کر اپنے تصور میں بلاتی رہی۔ پھر اس نے سوچا کہ آگے پڑھنا چاہئے۔ ذرا دیکھوں' کہ سوانہ پر کیا گزرتی ہے۔

وہ کہانی پڑھنے لگی۔ آگے مختار محبوب نے لکھا تھا۔

"میں نے سوانہ کو دیکھ کر سوچا کہ وہ نشے میں ہے۔ اس کی آنکھیں چڑھی ہوئی ہیں' رخسار تمتما رہے ہیں۔ اس وقت اس کے دماغ میں چرس کے دھوئیں کے سوا کچھ نہ ہو گا۔ ایسے میں مجھے مخاطب کرنا چاہئے۔

"سوانہ!" میں نے ہولے سے سرگوشی کی "ڈارلنگ!" وہ گردن کو ہلکا سا خم دے کر آواز کی سمت دیکھنے لگی' پھر اس نے جلتے ہوئے سگریٹ کو دیکھا' پھر مسکرا کر بولی۔

"ڈارلنگ۔ ٹونی! نشے میں بھی تم ہی نظر آتے ہو' تم ہی مجھے پکارتے ہو۔ ہائے.........."

یہ کہہ کر وہ گھاس پر لیٹ گئی۔ میں اس کے سرہانے آ گیا۔ پھر میں نے اس پر جھک

کر اس کی پیشانی چوم لی۔ اس نے کچھ نشے کی اور کچھ جذبات کی فراوانی سے آنکھیں بند کر لیں۔ میرے ہونٹ اس کی پیشانی سے اترتے ہوئے اس کی بند آنکھوں پر آئے۔ پھر ان نشے میں بھیگی ہوئی آنکھوں سے بھٹکتے ہوئے اس کے دائیں رخسار پر آ گئے۔ اس کی انگلیوں سے سگریٹ چھوٹ کر گھاس کے درمیان الجھ گیا۔ اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر میرے چہرے کو اپنی ہتھیلیوں کے درمیان لے لیا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ صرف جذباتی سسکاریاں لیتی ہوئی بند آنکھوں کے پیچھے اپنے محبوب کو دیکھ رہی تھی اور ہاتھوں سے چھو رہی تھی۔

ایسے وقت وہ مجھے کچھ پرائی پرائی سی لگی۔ کیونکہ وہ مجھے صرف خیالوں میں قبول کر رہی تھی' نشے میں بہک رہی تھی۔ یہ اچھا نہیں لگتا کہ عورت ہماری شخصیت کو نہ پہچانے اور کسی دوسرے کے روپ میں قبول کرے۔ میں نے اس کی مدہوشی سے چونکانے کے لئے اس کے بھرے بھرے رخسار کو اپنے دانتوں تلے رکھ لیا۔

وہ تکلیف کی شدت سے کراہتی ہوئی کروٹ بدل کر گھاس پر اوندھی ہو گئی۔ میں فوراً ہی اس سے دور ہو گیا۔ کیونکہ اسی وقت ایک نوجوان اس کے قریب آ گیا تھا۔ سوانہ نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ اسے دیکھ لیا تھا اور اٹھ کر بیٹھتی ہوئی کہہ رہی تھی۔

"بڑے ظالم ہو۔ کیا اسی طرح بوسہ لیا جاتا ہے۔"

"کیا کہتی ہو؟ میں تو ابھی آ رہا ہوں۔ میں نے تمہیں ہاتھ بھی نہیں لگایا ہے۔"

وہ اس کا ہاتھ تھام کر کھڑی ہو گئی۔ پھر اس کے طرف پشت کر کے اپنا سر اس کے شانے پر ٹیک دیا۔ اس کے بعد بولی۔

"کیوں مذاق کرتے ہو؟ کیا مجھے نشے میں سمجھتے ہو؟ میں خوب سمجھتی ہوں' مجھے چھپ چھپ کر پکارتے ہو' آنکھیں بند کرتی ہوں تو آ کر پیار کرتے ہو۔"

نوجوان نے اس کے دائیں رخسار کو دیکھا۔ وہاں دانتوں کے نشان واضح تھے۔ اس نے غصے سے کہا۔ "تم مجھے بیوقوف بنا رہی ہو' سچ سچ بتاؤ' کس کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہی تھیں؟"

"تمہارے ساتھ.........." وہ مسکرا رہی تھی۔

اچانک ہی نوجوان کے ہاتھوں میں ایک خنجر نظر آیا۔ اس نے غرا کر کہا۔

"میں تمہاری خاطر چرس حاصل کرنے کے لئے دنیا جہان کی خاک چھانتا رہتا ہوں۔ آج تم تھوڑی دیر میرا انتظار نہ کر سکیں' ایک سگریٹ کے لئے بک گئیں۔ بتاؤ وہ کون

ہے؟"

خنجر کی نوک اس کے ابھرے ہوئے سینے کے درمیان آ کر ٹھہر گئی۔ وہ عجیب منظر تھا۔ وہ نوجوان ٹونی خنجر بکف تھا' دشمن بنا ہوا تھا۔ مگر سوانہ محبت کے (یا چرس کے) نشے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ عورت خود ایک نشہ ہے۔ اگر وہ نشے میں ڈوب جائے تو قیامت بن جاتی ہے۔ وہ خنجر سے خائف نہیں تھی۔ سر اٹھا کر اسے نشیلی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ ان کے پیچھے دور بہت دور میری حویلی دھندلائی ہوئی سی نظر آ رہی تھی۔

میں نے خنجر کو دیکھا۔ سینے کی وادی میں جہاں ایک بوسے کو اترنا چاہئے وہاں خنجر کی نوک اترنا چاہتی تھی۔ مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر ٹونی کی کلائی کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ وہ ایک دم سے بوکھلا گیا۔ اسے سامنے کوئی مدمقابل نظر نہیں آ رہا تھا۔ اگر نظر آتا تو سوانہ جیسی لڑکی کی خاطر اس سے مقابلہ ضرور کرتا۔ مگر اس نے یہی سمجھا کہ اس کی کلائی کسی جن یا بھوت کی گرفت میں ہے' مارے دہشت کے اس کے ہاتھ سے خنجر چھوٹ گیا۔ میں نے اس کی کلائی کو ایک جھٹکا دیا تو وہ سوانہ سے الگ ہو کر دور چلا گیا۔ دور جانے کے بعد وہ نہیں رکا۔ وہاں سے بھاگتا چلا گیا۔

سوانہ اسے آوازیں دیتی ہوئی آگے بڑھی لیکن میں سامنے آ گیا۔ وہ مجھ سے ٹکرا گئی۔ پھر وہ بھی گھبرا کر چیخنا چاہتی تھی مگر میں نے فوراً ہی اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور اس سے کہا۔

"سوانہ۔ ڈونٹ بی آفریڈ آف می۔ گھبراؤ نہیں۔ میں تمہاری ضرورت ہوں۔ میرے پاس اتنی دولت ہے کہ میں تمہارے سامنے چرس کا ڈھیر لگا دوں گا۔"

یہ سچ ہے کہ بیرونی ممالک سے آنے والی ہپی لڑکیاں چٹکی بھر چرس کے عوض اپنی جوانی کی سوغات پیش کرتی ہیں۔ اس وقت میری باتوں نے اسے کچھ سوچنے سمجھنے پر مجبور کیا۔ پھر بھی وہ خوفزدہ تھی۔ ایک انجانا' ایک ان دیکھا شخص اس سے مخاطب تھا۔ وہ اتنی جلدی میرے نادیدہ وجود کو تسلیم نہیں کر سکتی تھی۔ مگر اس میں اتنا حوصلہ بھی نہیں تھا کہ وہ میری کسی بات سے انکار کر دیتی۔ میں نے اسے دھمکی دی۔

"سوانہ۔ میری دوست بن کر فائدے میں رہو گی' دشمن بن کر نقصان اٹھاؤ گی۔ بولو' کیا بننا چاہتی ہو۔ دوست یا دشمن؟"

"دو۔ دوست.........!" وہ سہم کر بولی۔ "مم۔ مگر تم کون ہو' مجھے نظر کیوں نہیں آتے؟"

"میں بہت جلد تمہیں نظر آ جاؤں گا لیکن فی الحال مجبوری ہے۔ ابھی تم مجھے نہیں دیکھ سکتیں۔ میں اس بات کا بھی تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں کوئی بدصورت انسان نہیں ہوں۔ میں دولت کی طرح خوبصورت اور جوانی کی طرح زور آور ہوں۔ تم مجھے پا کر ٹونی جیسے جوانوں کو بھول جاؤ گی۔ کیا تم مجھ سے محبت کرو گی؟"

"ہاں۔ اگر تم دوست ہو' مہربان ہو تو میں تم سے محبت کروں گی۔"

"کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟"

"ہاں کروں گی۔ مگر تم میرے مستقبل کی ضمانت کیا دو گے؟"

"ہمارے ہاں ضمانت کے طور پر مہر کی رقم لکھوائی جاتی ہے یعنی لڑکی کو ہزار روپے یا لاکھ روپے تک دیئے جاتے ہیں۔ میں تمہارے نام ایک لاکھ روپے لکھ دوں گا۔"

"میں روپے لے کر کیا کروں گی۔ بعض ممالک میں ہزاروں روپے خرچ کرنے کے باوجود چرس نہیں ملتی۔ میں اسی شرط پر شادی کروں گی کہ تم روزانہ میرے لئے چرس مہیا کرو گے۔"

اس کی قربت مجھے دیوانہ بنا رہی تھی۔ میں نے اسے آغوش میں لے کر کہا۔ "مجھے تمہاری شرط منظور ہے۔"

"مجھے یقین ہے۔" اس نے کہا۔ "اگر تم چرس خرید نہ سکے تو کہیں سے چرا کر لاؤ گے۔ کیونکہ کوئی تمہیں نہیں دیکھ سکتا ہے۔ تم بڑی آسانی سے چوری کر سکتے ہو۔ دیکھو' میرے پاس ایک ہی سگریٹ تھا' وہ ختم ہو گیا۔ کیا تم میرے لئے دو چار سگریٹ چوری کرو گے؟"

"ہاں۔ مگر اس وقت ایسے سگریٹ کہاں سے ملیں گے؟"

"یہاں سب ہی کے پاس موجود ہیں' کسی کے پاس سے بھی چرا سکتے ہو۔"

"اچھی بات ہے۔ تم یہاں ٹھہرو۔ میں ابھی لے کر آتا ہوں۔"

میں اسے چھوڑ کر خیموں کی طرف جانے لگا۔ وہاں سے کچھ لوگ سوانہ کی طرف جا رہے تھے۔ میں نے پلٹ کر کہا۔

"دیکھو سوانہ۔ ٹونی آ رہا ہے' تم اس کے ساتھ نہ جانا۔ میرا انتظار کرنا۔"

"میں انتظار کروں گی۔"

میں مطمئن ہو کر آگے بڑھ گیا۔ جب ٹونی میرے قریب سے گزرنے لگا تو میں نے اپنی ایک ٹانگ آگے بڑھا دی۔ وہ لڑکھڑا کر اوندھے منہ گر پڑا پھر ایک بار اس پر ایسی

دہشت طاری ہوئی کہ وہ دوبارہ نہ اٹھ سکا۔ زمین پر تڑپتے ہوئے کہنے لگا۔

"کسی نے مجھے گرایا ہے۔ میں نے صاف طور سے محسوس کیا ہے۔ کسی نے میرے پاؤں میں ٹانگ اڑائی تھی۔"

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے' یہاں کوئی نہیں ہے۔" ایک نے آس پاس دیکھتے ہوئے کہا۔

"معلوم ہوتا ہے' زیادہ پی گئے ہو' زیادہ چرس ہے تو ہمیں دے دو یا پھر اپنی برداشت کے مطابق نشہ کرو۔"

سوانہ نے بھی قریب آ کر کہا۔ "ہاں۔ یہ کچھ زیادہ ہی پی گیا ہے' خنجر نکال کر مجھے مار ڈالنے کی دھمکی دے رہا تھا۔ ہم ہپی ہیں' امن کے پجاری ہیں۔ ہمارے کسی آدمی کے پاس ہتھیار نہیں ہونا چاہئے۔"

سب نے سوانہ کی تائید کی اور ٹونی کو برا بھلا کہنے لگے۔ میں خیموں کی طرف گیا اور وہاں ہر ایک کا سامان ٹٹولنے لگا۔ پندرہ بیس منٹ کی تلاشی کے بعد سگریٹ تو نہیں ملے لیکن کاغذ کی ایک پڑیا میں چرس مل گئی۔ وہ پڑیا کسی لڑکی کے انڈر ویئر کی چور جیب میں تھی۔ وہ انڈر ویئر دوسرے میلے کپڑوں کے ساتھ ریک میں ٹھنسا ہوا تھا۔

سوانہ میرا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے ہولے سے کہا۔ "میں آ گیا ہوں' اپنا ہاتھ بڑھاؤ۔"

اس نے آواز کی سمت ہتھیلی پھیلائی۔ میں نے اپنی مٹھی کھول کر چرس کی پڑیا اس کی ہتھیلی پر رکھ دی۔ اس نے جلدی سے کھول کر اسے دیکھا۔ پھر خوشی سے اس کا چہرہ کھل گیا۔ اس نے دوبارہ اسے لپیٹ کر پڑیا بنائی' اسے چولی کے اندر ٹھونسا' اس کے بعد ایک اندھی کی طرح ٹٹولتی ہوئی آگے بڑھی۔ پھر مجھے چھوتے ہی مجھ سے لپٹ گئی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ چرس کے انمول تحفے کے عوض خود کو تحفہ بنا کر پیش کر رہی ہے۔ میں اس دہکتے ہوئے اور پھڑکتے ہوئے تحفے کو قبول کرنے لگا۔ نشہ پھر نشہ ہوتا ہے' خواہ وہ شراب کا ہو یا شباب کا۔ ایسے عالم میں پتہ نہیں چلتا کہ ہم کس جہاں میں کھو گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت مجھے اس کے بدن سے چرس کی بو محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

لیکن میں زیادہ دیر تک اور زیادہ دور تک نہ بہک سکا۔ مجھے چچا جان کی بات یاد آ گئی۔ انہوں نے کہا تھا کہ ایسی ویسی عورتوں سے دور رہو' صرف بیاہتا عورت کو اپنی تنہائی کا راز دار بناؤ۔ ایسے عالم میں بھلا بزرگوں کی نصیحتیں کہاں یاد رہتی ہیں۔ مجھے بھی یاد نہ

رہتیں۔ مگر میرے دل میں ایک اندیشہ تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس نصیحت کا ضرور اس دوا سے کوئی تعلق ہے' جسے نگلنے کے بعد میں نادیدہ انسان بن گیا ہوں۔ اگر میں نے اس نصیحت پر عمل نہ کیا تو ہو سکتا ہے میں اپنی سابقہ حالت میں واپس نہ آ سکوں۔ وہ مجھے میرا نمائشی جسم واپس کرنے کے لئے جو بھی دوا کریں گے وہ تمام دوائیں میری ایک جذباتی غلطی سے بے اثر ہو جائیں گی۔

میں سوانہ سے الگ ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھتی ہوئی بولی۔

"تم کہاں چلے گئے۔ مجھ سے دور کیوں ہو گئے؟"

"میں مجبور ہوں۔ کیا تم مجھے دیکھنا چاہتی ہو؟"

"ہاں۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں۔ میں نے تمہیں چھو کر اور ٹٹول کر اپنے ذہن میں ایک خوبرو نوجوان کی تصویر بنائی ہے۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ تم میری خیالی تصویر سے کس قدر ملتے ہو۔ آؤ۔ میرے سامنے آؤ۔"

"ابھی نہیں' کل رات میرا انتظار کرنا۔ میں اپنا ظاہری جسم لے کر تمہارے سامنے آؤں گا اور تمہیں ہمیشہ کے لئے اپنا بنا کر یہاں سے لے جاؤں گا۔"

"چرس کا وعدہ یاد ہے نا؟ اگر کسی روز مجھے نہ ملی تو میں طلاق لے لوں گی۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ابھی تو شادی نہیں ہوئی اور تم طلاق کی دھمکی دے رہی ہو۔ میری جان! میں تمہیں کہیں جانے نہیں دوں گا۔ تمہارے آگے پیچھے چرس کے پہاڑ کھڑے کر دوں گا۔ بس کل تک مجھ پر اعتماد کرو۔ اب میں جا رہا ہوں۔ شب بخیر۔"

میں اس سے دور ہونے لگا۔ وہ تھوڑی دور دونوں ہاتھوں سے مجھے تلاش کرتی ہوئی آگے بڑھتی رہی۔ پھر مجھے نہ پا کر بڑی حسرت سے کہا۔ "شب بخیر۔"

☆======☆======☆

میں حویلی میں پہنچا تو چچا جان اپنے کمرے کے فرش پر بہت سی موٹی موٹی کتابیں پھیلائے بیٹھے تھے اور جن دواؤں کی آمیزش سے مجھے پارہ کھلایا تھا' اس کا توڑ تلاش کر رہے تھے۔ کمرے کا دروازہ کھلتے ہی انہوں نے دروازے کی جانب دیکھا' پھر پوچھا۔

"کیا تم آ گئے؟"

"جی ہاں۔ میں باہر گیا تھا اور اب اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ میں اس طرح دنیا والوں کی نظروں سے چھپ کر سکون کی زندگی نہیں گزار سکوں گا۔ آپ خود ہی سوچیں۔ دن کے وقت لوگوں کی آمدورفت زیادہ ہوتی ہے' میں کوٹھی کے باہر نہیں جا سکتا۔ اگر کسی

سے ٹکرا گیا یا کوئی انجانے میں میرے بدن کو چھوتے ہوئے گزر گیا تو ایک ہنگامہ برپا ہو جائے گا کہ سڑکوں پر ایک نادیدہ انسان چل پھر رہا ہے۔ اگر میں کار ڈرائیو کروں گا تو کار چلتی ہوئی نظر آئے گی لیکن کار چلانے والا نظر نہیں آئے گا۔ آپ کو ڈرائیونگ نہیں آتی ہے اور میں کسی ڈرائیور کو ملازم نہیں رکھ سکتا۔ ورنہ اسے بھی یہ راز معلوم ہو جائے گا اور اس کے ذریعے بات دور تک پھیل جائے گی۔

آپ میرے نادیدہ وجود پر جتنا بھی غور کریں گے' مجھے پیش آنے والی اتنی ہی الجھنیں آپ پر واضح ہوتی جائیں گی۔ میں ہاتھ جوڑ کر آپ سے التجا کر رہا ہوں۔ خدا کے لئے مجھے میرا ظاہری جسم واپس کر دیجئے۔"

انہوں نے ہاتھ اٹھا کر تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "فکر نہ کرو۔ میں اس کوشش میں ہوں کہ میرا تجربہ ضائع نہ ہو اور تمہارا ظاہری جسم بھی واپس آ جائے۔ یعنی ایک ایسا عمل ہو کہ تم جب چاہو' دنیا کے سامنے آ جاؤ اور جب چاہو' نظروں سے اوجھل ہو جاؤ۔"

"کیا ایسا ہو سکتا ہے؟" میں نے خوش ہو کر پوچھا۔ ایسی صورت میں مجھے اعتراض نہیں تھا۔ اس طرح میں ہمیشہ کے لئے دنیا کی نظروں سے اوجھل نہیں رہ سکتا تھا۔ غائب ہونے یا نہ ہونے کا انحصار مجھ پر ہوتا۔

چچا جان نے جواب دیا۔ "ہاں' ایسا ہو سکتا ہے۔ دیکھو' اس وقت تمہارے جسم کے اندر ایک چنے کے دانے کے برابر پارہ ہے۔ عام حالات میں اگر کوئی رائی کے برابر پارہ نگل لے' تو اس کے سارے جسم پر آبلے پڑ جاتے ہیں لیکن میں نے اس پارے میں ایسی جڑی بوٹیاں حل کی ہیں جن کے باعث کبھی جسمانی نقائص پیدا نہیں ہوں گے۔ بہرحال میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جب تک وہ پارہ تمہارے اندر ہے' تم کسی کو نظر نہیں آؤ گے۔ میں اپنے تجربے کے لحاظ سے طبی اصطلاح میں اس پارے کو "صفرِ حیات" کہتا ہوں۔ یعنی ایسی زندگی جو یقینی طور پر ہے مگر دیکھنے والوں کے لئے صفر کے برابر ہے۔ اس صفرِ حیات نے تمہیں صفر بنا دیا ہے۔ اگر تم اسے اگل دو گے تو پھر دنیا والوں کے سامنے ظاہر ہو جاؤ گے۔"

"لیکن میں کیسے اگل سکتا ہوں؟"

"یہ کل دیکھا جائے گا کہ اگلنے کا طریقہ کیا ہو گا۔ جاؤ ابھی جا کر سو جاؤ مجھے بھی نیند آ رہی ہے۔"

یہ کہہ کر وہ فرش پر سے اٹھ گئے اور پلنگ پر لیٹ کر کمر سیدھی کرنے لگے۔ میں

بھی اپنے کمرے میں سونے کے لئے چلا گیا۔

دوسری صبح چچا جان نے باورچی اور چوکیدار کو تنخواہیں دے کر رخصت کر دیا۔ ان کے جانے کے بعد میں آزادی سے حویلی کے اندر گھومنے پھرنے لگا۔ دوپہر کو انہوں نے مجھے ایک دوا کھانے کے لئے دی۔ وہ زرد رنگ کا سفوف تھا۔ میں نے اسے پھانک کر پانی پی لیا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے قے ہونے لگی۔ چچا جان چلمچی میرے آگے رکھتے تھے اور ہر قے کے بعد پُر امید نظروں سے دیکھتے تھے کہ شاید میں جسمانی طور پر ظاہر ہو جاؤں گا لیکن میں ظاہر نہ ہو سکا۔ دوپہر سے شام تک چھ بار قے کرنے کے بعد میری حالت خراب ہو گئی۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے۔ ساتویں بار صرف ابکائی آتی تھی مگر کچھ نکلتا نہیں تھا۔ پیٹ میں جو کچھ تھا' وہ سب باہر آ چکا تھا۔ وہ کمبخت صفرِ حیات نہ جانے پیٹ میں کہاں گھسا ہوا تھا' نکلنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔

شام آہستہ آہستہ رات کے اندھیرے میں گھل رہی تھی۔ چاند نکلتے ہی مجھے سوانہ کے پاس جانا تھا۔ مگر میرے پاؤں ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ میں بہت زیادہ نقاہت محسوس کر رہا تھا۔ مجھ پر جھلاہٹ طاری ہو گئی۔ مجھے ناراض ہوتے دیکھ کر چچا جان نے دوسری دوا کھلائی۔ اس کے بعد قے بند ہو گئی مگر بخار چڑھ گیا۔ سردی سے اس بری طرح کانپنے لگا کہ چچا جان نے دو لحاف مجھ پر ڈال دیئے۔ تھوڑی دیر بعد مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ کبھی میں سوتا تھا' کبھی جاگتا تھا۔ صبح بخار اتر گیا۔ میں نے سوچا کہ اب ذرا بھی چلنے پھرنے کی سکت ہو گی تو میں دن کی روشنی میں بھی سوانہ سے ملنے جاؤں گا۔ میری حویلی شہری آبادی سے دور ہے۔ وہاں خیموں تک جاتے ہوئے اکے دکے راہگیر سے ٹکرا جانے کا اندیشہ نہیں تھا۔ مجھے یہ فکر تھی کہ سوانہ مجھے وعدہ فراموش سمجھ رہی ہو گی۔

لیکن میں اپنے کمرے سے باہر نہ جا سکا۔ دوپہر کو پیچش کی شکایت ہو گئی۔ چچا جان نے کہا۔

"کسی چیز کو باہر دھکیلنے کے لئے اندرونی قوت یا ابال کی ضرورت ہوتی ہے۔ جوش اور جذبے سے بھی اندر ہلچل سی مچ جاتی ہے لیکن اس کے لئے فطری جذبے اور جوش کا انتظار کرنا ہو گا لیکن جلاب سے بھی کام بن جاتا ہے' اس لئے میں نے تمہیں جلاب دیا ہے۔"

یہ سنتے ہی میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اب سمجھ میں آیا کہ مجھے پیچش کی شکایت کیسے ہو گئی۔ میں غصے سے بے قابو ہو کر انہیں برا بھلا کہنے لگا لیکن کچھ کہنے سننے کا

وقت گزر چکا تھا۔ دوسری رات بھی گزر گئی اور میں سوانہ کی طرف جانے کے بجائے بار بار ٹائلٹ کی طرف جا رہا تھا۔ مجھ میں اتنی سکت نہیں تھی کہ میں حویلی سے باہر جا سکتا۔ اگر سکت ہوتی بھی تو میں نے آج تک کسی کو جلاب لے کر محبوبہ سے ملتے نہیں دیکھا تھا۔

بہرحال وہ صفرِ حیات نہ تو جلاب سے نکلا اور نہ ہی قے کرنے سے باہر آیا۔ چچا جان کی تمام کوششیں بیکار گئیں۔ پھر بھی انہوں نے ہمت نہیں ہاری۔ دوسری دوا تیار کرنے لگے۔ میں نے تمام دوائیں اٹھا کر پھینک دیں۔ انہیں نیم حکیم خطرہ جان بننے سے روکنے کے لئے میں نے ان کی تمام کتابیں اور پرانے نسخے جلا دیئے۔ وہ چیختے چلاتے رہے اور اپنا سر پیٹتے رہے مگر میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ اس حویلی میں رہنا ہے تو تین وقت کی روٹی کھایئے اور اللہ اللہ کیجئے۔ اگر کبھی حکمت کا نام لیا تو میں انہیں حویلی سے نکال دوں گا۔

چچا جان کی طرف سے مطمئن ہو کر میں حویلی سے باہر آیا تو میرے دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ دور میدان میں خیمے نظر آ رہے تھے' قافلہ جا چکا تھا۔ سوانہ بھی جا چکی تھی۔ اس نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ چرس نہ ملی تو وہ ساتھ چھوڑ دے گی۔ ہر انسان اپنی ضرورت کا غلام ہوتا ہے۔ مجھے اس کی ضرورت تھی اور اسے نشے کی ضرورت تھی۔ شاید پھر ٹونی اس کے کام آ رہا ہو گا۔ میں اسے کہاں تلاش کروں؟ کیسے تلاش کروں؟ کسی نہ کسی طرح اسے تلاش کرنا ہی ہو گا ورنہ اس کی یاد مجھے تڑپاتی رہے گی....."

نامی پڑھتے پڑھتے رک گئی۔

اسے کہانی کا یہ حصہ پسند نہیں آیا کہ محبوب ایک ایسی لڑکی کے لئے تڑپ رہا تھا جو اس کی چاہت کو نہیں سمجھتی تھی اور محبت کو چرس کے دھوئیں میں اڑا کر چلی گئی تھی۔

"اگر اس کی جگہ میں ہوتی تو......." وہ خود کو سوانہ کی جگہ دیکھنے لگی۔ ایک رات' دوسری رات' پھر تیسری رات۔ قافلہ چلا گیا اور وہ اپنے محبوب کا انتظار کرتی رہی۔ ایسا محبوب کسی نصیب والی کو ہی ملتا ہے جو موجود ہو اور موجود نہ ہو۔ وہ ایک کہانی بھی ہو اور ایک حقیقت بھی ہو۔ ہائے کتنا عجیب و غریب رومانس ہے۔

وہ سوچ رہی تھی اور اپنے خیالی محبوب کو دیکھ رہی تھی۔ اتنے میں اس کا بوائے فرینڈ آ گیا۔ خیالات کا سلسلہ ٹوٹتے ہی اس نے ناگواری سے اسے دیکھا۔ اس کے بوائے فرینڈ نے کہا۔

"سوری نامی! میں یہ کہنے آیا ہوں کہ سری پور واپس نہیں جاؤں گا۔ ابھی دوپہر ہے'

تم تنہا جا سکتی ہو' شام تک پہنچ جاؤ گی۔ یہاں میرے چند دوست مجھے رکنے پر مجبور کر رہے ہیں۔"

نامی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"میں نے خواہ مخواہ تمہارے انتظار میں وقت ضائع کیا ہے۔" وہ ڈائجسٹ اٹھا کر کار کے پاس آئی اور ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔ پھر اس کی طرف دیکھے بغیر کار اسٹارٹ کی اور تیزی سے ڈرائیو کرتی ہوئی کوٹھی کے احاطے سے باہر نکل گئی۔

سفر طویل تھا' تنہائی تھی اور کار کی محدود فضا میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ایسے میں وہی ان دیکھا محبوب سوچ کی نگری میں آ رہا تھا۔ وہ کہیں بھی آ سکتا تھا۔ نظروں کے سامنے آ کر بھی نظروں سے اوجھل رہتا۔ جہاں وہ بیٹھی ڈرائیو کر رہی تھی' ٹھیک اس کے ساتھ والی سیٹ پر آ کر بیٹھ سکتا تھا۔ اس کے پیچھے والی سیٹ خالی تھی' وہ وہاں بھی موجود ہو سکتا تھا۔

ایسا سوچتے وقت اسے عجیب سا لگا۔ بس یوں لگ رہا تھا کہ وہ کہیں قریب ہی ہے' بہت قریب سے اسے دیکھ رہا ہے۔ اس کے پیچھے بیٹھا اس کے بائیں بیٹھا بڑی خاموشی سے اس کے حسن کا مطالعہ کر رہا ہے' اس کی آنکھوں کی گہرائیوں میں جھانک رہا ہے اور اس کے چہرے کے جاذب نظر نقوش کو اپنے دل میں نقش کر رہا ہے۔

وہ صرف کار میں نہیں جا رہی تھی خیالات کے اڑن کھٹولے پر بھی اڑتی جا رہی تھی۔ اسے زمان و مکاں کی وسعتوں کا احساس نہ ہوا کہ وقت کیسے گزر گیا اور طویل فاصلہ کیسے طے ہو گیا۔ جب شام کے گہرے سائے پھیلنے لگے تو وہ ہری پور کے قریب پہنچ گئی لیکن شہری حدود میں داخل ہونے سے پہلے اس حویلی پر اس کی نظریں جم گئیں۔ پہلے کار کی رفتار سست ہوئی۔ پھر وہ رک گئی۔ بالکل وہی منظر تھا۔ حویلی کے سامنے ایک کھلا میدان نظر آ رہا تھا۔ شاید وہاں کبھی ہپیوں کا قافلہ آیا ہو گا۔

وہ کار سے اتر کر باہر آ گئی۔ شام کے دم توڑتے ہوئے اجالے پر اندھیرا حاوی ہو رہا تھا۔ اس ملگجی روشنی میں اور آسیب زدہ ذہن کی تاریکی میں وہ حویلی بڑی پُراسرار نظر آ رہی تھی۔ نامی کی پلکیں خوابوں سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ اسے یاد آیا کہ کہانی پڑھتے وقت اس کے دماغ میں اسی حویلی کا تصور تھا۔ پھر یہ کہ کہانی میں بھی اس کے شہر سری پور کا ذکر کیا گیا تھا۔ اس طرح وہ کہانی حقیقت کو چھو رہی تھی۔

وہ بہت دیر تک اس حویلی کو اور اس کے آس پاس کے ماحول کو خوابیدہ نظروں سے

دیکھتی رہی۔ پھر اچانک ہی وہ ایک ہلکی سی کلک کی آواز سن کر چونک گئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ کار کا پچھلا دروازہ ایک ذرا سا کھل گیا تھا۔

وہ آپ ہی آپ کیسے کھل گیا؟ اس نے حیرانی سے سوچا۔ شاید کوئی وجہ ہو گی۔ وہ دروازے کو بند کرنے کے لئے آگے بڑھی لیکن اس سے پہلے وہ ایک جھٹکے سے بند ہو گیا۔ نامی بھی ایک جھٹکے سے رک گئی۔ اس کی اوپر کی سانس اوپر ہی رہ گئی تھی۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی۔ نہ کوئی دروازہ کھولنے اور بند کرنے والا نظر آ رہا تھا اور نہ ہی پچھلی سیٹ پر کوئی نظر آ رہا تھا۔

اس نے ذرا جرأت سے کام لیا۔ کار کے بالکل قریب جا کر دیکھنے لگی۔ وہاں پچھلی سیٹ پر کسی کا سایہ تک نہ تھا۔ تب اس نے سوچا کہ وہ دروازہ اس کے خیالوں میں کھلا تھا اور بند ہوا تھا۔ جب سے اس نے کہانی پڑھی ہے' اس وقت سے وہ اس کے ذہن پر چھا گیا ہے اور اس کے دل کا دروازہ کبھی کھول رہا ہے اور کبھی بند کر رہا ہے۔

وہ ایک سرد آہ بھرتی ہوئی ڈرائیونگ سیٹ پر آ کر بیٹھ گئی۔ پھر کار دھیمی رفتار سے آگے بڑھنے لگی۔ اب وہ سوچ رہی تھی کہ اگر سچ مچ کار کا دروازہ کھلتا اور وہ پچھلی سیٹ پر آ کر بیٹھ جاتا تو اس وقت کار کا ماحول کتنا رومانٹک ہو جاتا۔ وہ تو خواہ مخواہ سہم گئی تھی۔ یہ عجیب سی بات تھی کہ اس کی چاہت بھی تھی اور خوف سا بھی محسوس ہوتا تھا۔

اپنی کوٹھی کے پورچ میں آ کر اس نے گاڑی روک دی۔ ذرا گھوم کر حسرت سے پچھلی سیٹ کی جانب دیکھا۔ پھر کار سے اتر کر کوٹھی کے اندر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد کار کی پچھلی سیٹ کا دروازہ آہستگی سے کھلا پھر چند لمحوں کے بعد بند ہو گیا۔

نامی ڈرائنگ روم میں پہنچی تو وہاں اس کے والدین بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اسے دیکھتے ہی اس کے ڈیڈی نے کہا۔

"بیٹی! ساجد لندن سے آ گیا ہے۔ کہہ رہا ہے کہ جلد ہی شادی ہو جانی چاہئے۔ ہم بھی یہی سوچ رہے ہیں۔ تم ذرا سنجیدگی سے سوچ کر اپنا فیصلہ سناؤ۔"

وہ کیا سوچتی۔ اس کے خیالوں میں تو دنیا سے نرالا ایک محبوب بسا ہوا تھا۔ اس کی ممی نے جلدی سے ایک تصویر اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

"یہ ساجد کو دیکھو۔ تین سال کے عرصے میں کتنا ہینڈسم اور اسمارٹ ہو گیا ہے۔"

نامی نے بے دلی سے تصویر لے کر دیکھی۔ مگر وہ تصویر والا دل کو بھا گیا۔ واقعی تین سال پہلے والا ساجد نہیں رہا تھا۔ توقع سے زیادہ خوبصورت اور اسمارٹ نظر آ رہا تھا

اس کا آئیڈیل بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ وہ سوچنے لگی کہ خوابوں سے اور کہانی کے کسی خیالی کردار سے بہلنا دانشمندی نہیں ہے۔ ساری زندگی تصورات کے طلسم ہوشربا میں نہیں گزر سکتی۔ اسے کسی ایک جیون ساتھی کا انتخاب کرنا ہی ہو گا اور جیون ساتھی کے لئے ساجد ہی مناسب نظر آ رہا تھا۔

"ڈیڈی!" اس نے کہا۔ "میں ابھی جا کر ساجد سے ملوں گی۔ پھر اپنا فیصلہ سناؤں گی۔"

یہ کہہ کر وہ تصویر لیتی ہوئی اپنے بیڈ روم میں آ گئی۔ اس نے ڈائجسٹ کو بستر پر پھینک دیا اور ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے بیٹھ کر ساجد کی تصویر کو بڑی لگن سے دیکھنے لگی۔ ڈائجسٹ کی کہانی ادھوری رہ گئی تھی۔ اسے اختتام تک پڑھنے سے پہلے ہی ساجد اپنی شخصیت سے اس کے ذہن پر چھا رہا تھا اور تین سال پہلے کی بہت سی ملاقاتیں یاد دلا رہا تھا۔

کچھ دیر تک تصویر سے بہلنے کے بعد اس نے تصویر کو گلدان کے قریب رکھ دیا۔ وہاں سے اٹھ کر اس نے کمرے کے دروازے کو بند کر کے اندر سے چٹخنی لگا دی۔ پھر اپنا لباس اتارنے لگی۔ پروگرام یہ تھا کہ وہ غسل کر کے بہترین لباس پہنے گی' پھر ساجد سے ملنے جائے گی۔

وہ غسل خانے میں چلی گئی۔ غسل خانے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اسے بند کرنا اس لئے ضروری نہیں تھا کہ کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ ایک گھنٹے میں اس نے غسل کیا اور لباس زیب تن کیا۔ پھر میک اپ کرنے کے لئے سنگار میز کے پاس آئی۔ آئینے میں خود کو دیکھنے کے بعد اس نے گلدان کے قریب رکھی ہوئی تصویر کو دیکھا تو ایک دم سے چونک پڑی۔

ساجد کی تصویر کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے۔ کسی نے اسے پھاڑ کر پھر اسے گلدان کے قریب رکھ دیا تھا۔ کس نے اس کے ٹکڑے کئے ہیں؟ اس کے دل کی دھڑکنیں اچانک ہی تیز ہو گئیں۔ وہ حیران حیران نظروں سے اپنے چاروں طرف گھوم کر دیکھنے لگی۔ کمرے کا دروازہ بند تھا۔ اندر کوئی نہیں آ سکتا تھا۔ پھر کس نے تصویر کو پھاڑ ڈالا؟

وہ کہانی دوبارہ ذہن میں تازہ ہونے لگی۔ حویلی کے سامنے اپنی کار کا پچھلا دروازہ کھلتا اور بند ہوتا نظر آنے لگا۔ وہ دھڑکتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھ کر لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

"کک......... کون ہے یہاں؟"

جواب میں گلدان کا ایک پھول ہولے سے لرزنے لگا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی اس گلدان سے نکل رہا ہے۔ پھر وہ پھول گلدان سے اٹھ کر فضا میں معلق ہو گیا۔ نامی کا منہ حیرت سے کھل گیا تھا۔ اس نے چیخنا چاہا مگر اس کے حلق سے آواز نہ نکل سکی۔ وہ پھول آہستہ آہستہ اس کے قریب آ رہا تھا۔ اگر وہ کوئی نادیدہ دشمن ہوتا تو پھول کے بجائے خنجر لے کر اس کی جانب بڑھتا۔ وہ محبت کا عجب انداز تھا کہ پھول سے بھی ڈر لگ رہا تھا۔ وہ سہمی ہوئی کھڑی تھی۔

پھول اس کے چہرے کے بالکل قریب آ گیا۔ پھر وہ اس کے سر کی جانب اٹھ گیا۔ اس نے آئینے میں دیکھا۔ وہ پھول اس کی سیاہ زلفوں کے درمیان آ کر ٹھہر گیا تھا۔ پھر ایک دھیمی سی سرگوشی سنائی دی۔

"مائی......... لو........."

نامی کے ذہن میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔

"کیا تم مجھ سے ڈرتی ہو؟"

وہ اثبات میں سر ہلانے لگی۔

"کیوں ڈرتی ہو؟ میں شیطان بھوت نہیں ہوں۔ میں دشمن نہیں ہوں اور بدصورت نہیں ہوں۔ جس تصویر کو تم چاہت سے دیکھ رہی تھیں، میں اس سے زیادہ خوبصورت ہوں۔ کیا تم میری تصویر دیکھو گی؟"

وہ کوئی جواب نہیں دے سکی۔ آواز نے پوچھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

وہ پھر بھی خاموش رہی۔

دیکھو، میں چاہتا ہوں کہ تمہارا خوف، تمہاری جھجک دور ہو جائے۔ تم خود ہی سوچو، اگر میں تمہیں پریشان کرنا چاہوں یا نقصان پہنچانا چاہوں تو دنیا کی کوئی طاقت مجھے نہیں روک سکے گی۔ مگر تم اتنی اچھی ہو، اتنی حسین ہو کہ میں تمہاری مرضی کے بغیر تمہیں ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ کیا اب بھی تم مجھ پر بھروسہ نہیں کرو گی؟"

اس کی بات دل کو لگی۔ واقعی وہ دوستانہ انداز میں پیش آ رہا تھا۔ نامی نے اقرار میں سر ہلا کر کہا۔

"میرا نام نامی ہے۔ نعیمہ۔ کیا تم وہی ہو؟ وہی۔ جس کی کہانی میں نے پڑھی ہے"

"ہاں۔ میں وہی بدنصیب ہوں۔ آہ۔ کیا تم نے کہانی کا انجام پڑھا ہے؟"

"نہیں۔"

"اچھا ہے، نہ پڑھو۔ بڑا دردناک انجام ہے۔ سوانہ خود غرض تھی۔ اس نے میری مجبوریوں کو نہیں سمجھا۔ اس کی ضرورت پوری نہ ہوئی۔ اس لئے مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔ میں ایک ایسی لڑکی کی تلاش میں بھٹک رہا ہوں، جو مجھے دل و جان سے اپنا لے، مجھ سے خوفزدہ نہ رہے۔ اسی مقصد کے لئے میں نے وہ کہانی لکھی۔ اس کہانی میں میں نے سری پور کا ذکر کیا۔ اپنی حویلی کا صحیح پتہ لکھا اور آخر میں یہ لکھ دیا کہ میں ایک ایسی لڑکی کا انتظار کر رہا ہوں جو اپنے سینے میں محبت بھرا دل رکھتی ہو۔ میں ہر شام اپنی حویلی کے سامنے اس لڑکی کا انتظار کروں گا۔ مجھے یقین ہے کہ ایک دن کوئی مجھ سے محبت کرنے والی ادھر سے گزرے گی۔

آج تم وہاں تھوڑی دیر کے لئے رک گئیں۔ تمہیں دیکھتے ہی یہ دل مچل گیا۔ سوانہ کا مغربی حسن پھیکا پڑ گیا۔ تمہیں دیکھ کر یقین ہوا کہ فطری حسن مشرق میں ہوتا ہے۔ یہ حسن کسی میک اپ اور کسی نشے کا محتاج نہیں ہوتا۔ نامی! کیا تم میرے خیالات کو اور میرے جذبات کو سمجھ رہی ہو؟ اگر سمجھ رہی ہو تو اپنا ہاتھ آگے بڑھاؤ۔ مجھے چھو لینے کی اجازت دو۔ میں تمہارا ہاتھ تھامنا چاہتا ہوں۔"

نامی کے ذہن سے ساجد اور اس کی تصویر ڈھل گئی۔ پھر وہی نادیدہ محبوب کا پیار دل میں انگڑائیاں لینے لگا۔ اس نے جھجکتے ہوئے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ دوسرے ہی لمحے اسے اپنا ہاتھ مردانہ ہاتھوں کے درمیان محسوس ہوا۔ وہ بڑے غور سے اپنے ہاتھ کو دیکھ رہی تھی۔ مگر وہ دو ہاتھ نظر نہیں آ رہے تھے۔ پھر وہ جذبات کی ہلچل میں لہرانے لگی۔ اسے اپنے ہاتھ پر کسی کا سلگتا ہوا بوسہ محسوس ہو رہا تھا۔

"نامی! میں تمہیں اپنی تصویر دکھانا چاہتا ہوں۔ کیا تم میرے ساتھ حویلی تک چلو گی؟"

وہ سوچنے لگی کہ پہلی ملاقات میں ایک انجانے اور ان دیکھے محبوب کے ساتھ جانا مناسب ہے یا نہیں؟ اس کی آواز سنائی دی۔

"انکار نہ کرنا۔ میرا دل ٹوٹ جائے گا۔ میں پھر وعدہ کرتا ہوں کہ تمہاری اجازت کے بغیر تمہیں ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔"

اس نے نامی کا ہاتھ بڑی آہستگی سے چھوڑ دیا۔ وہ مسکرا کر بولی۔

"تم بہت اچھے ہو۔ میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔"

وہ آئینے کے قریب آئی' اپنے بالوں کو برش کیا' سینڈل پہنے' پھر دروازے کے پاس آکر اسے کھولتی ہوئی بولی۔ "آؤ چلو۔"

وہ دونوں کمرے سے نکل کر ڈرائنگ روم کی طرف جانے لگی۔ نامی اسے اپنے قریب ہی محسوس کر رہی تھی۔ بالکونی سے اس کی ممی نے اسے تنہا باہر جاتے ہوئے دیکھا اور یہ سوچ کر مسکرانے لگیں کہ وہ ساجد سے ملنے جا رہی ہے۔

حویلی اس کی کوٹھی سے ایک میل کے فاصلے پر تھی۔ وہاں تک نامی کار ڈرائیو کرتی گئی۔ حویلی کے دروازے پر نیم حکیم چچا کھڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے ایک جوان لڑکی کو کار سے اترتے دیکھ کر پوچھا۔

"بیٹی! تم کس سے ملنا چاہتی ہو؟"

"آپ سے۔" انہیں محبوب کی آواز سنائی دی۔ "یہ آپ کی ہونے والی بہو ہیں۔"

حکیم چچا نے مسکرا کر اس کا استقبال کیا۔ اس کے ساتھ حویلی کے اندر آئے اور کہنے لگے۔

"بیٹی! یہ اتنی بڑی حویلی تمہارے قدموں کی آواز سننے کو ترس رہی تھی۔ حویلی ہو یا ایک چھوٹی سی جھونپڑی' عورت کے بغیر گھر ویران رہتا ہے۔"

"چچا جان!" محبوب کی آواز سنائی دی۔ "آپ کھانے کا انتظام کیجئے' میں نامی کو اپنی تصویریں دکھاتا ہوں۔"

حکیم چچا کچن کی طرف چلے گئے۔ نامی نے کہا۔

"محبوب! یہ حویلی میرے لئے انجانی ہے۔ میں یہاں تنہا کھڑی ہوں۔ مجھے کچھ عجیب سا لگ رہا ہے۔ میرا ہاتھ تھام لو' تاکہ مجھے ایک ساتھی کی موجودگی کا احساس رہے۔"

اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ پھر ان دیکھے ہاتھوں کے سہارے آگے بڑھتی ہوئی ایک بیڈ روم میں آئی۔ مینٹل پیس پر ایک خوبرو نوجوان کی تصویر مسکرا رہی تھی۔ وہ تصویر کی جانب بڑھتی چلی گئی۔ اسے اپنے قریب سرگوشی سنائی دی۔

"یہ میری تصویر ہے۔"

وہ دونوں ہاتھوں سے تصویر اٹھا کر دیکھنے لگی۔ وہ نوجوان ایسا جاذب نظر تھا کہ اس پر سے نظریں ہٹانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ ذرا دیر بعد اسے آواز سنائی دی۔

"یہ البم دیکھو۔ اس میں کتنے ہی زاویوں سے میری تصویریں نظر آئیں گی۔"

نامی نے وہ تصویر مینٹل پیس پر رکھ دی اور البم لے کر وہاں سے چلتی ہوئی پلنگ کے پاس آئی۔ پھر اس پر بیٹھ کر تصویریں دیکھنے لگی۔

کچن میں چچا سالن گرم کر رہے تھے۔ انہیں اپنے بھتیجے کی آواز سنائی دی۔

"چچا جان! آپ نے نامی کو دیکھ لیا۔ اب بتائیے میرا انتخاب کیسا ہے؟"

"بہت خوب ہے۔ میں کہتا ہوں' ابھی نکاح پڑھالو۔"

"آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ میں کسی کو نظر نہیں آتا ہوں۔ کوئی مولوی ان دیکھے دولہا کا نکاح نہیں پڑھائے گا۔ اگر کسی مولوی کو زبردستی پکڑ کر یہاں لائیں گے تو دوسرے دن سے یہ حویلی آسیب زدہ مشہور ہو جائے گی یا پھر ہم پولیس والوں کی توجہ کا مرکز بن جائیں گے۔"

"کچھ تو کرنا ہی ہو گا بیٹا۔ ورنہ اسے اپنی دلہن کیسے بناؤ گے؟"

"وہ بغیر نکاح کے آج میری دلہن بنے گی۔"

"ارے توبہ توبہ۔ کیسی باتیں کرتے ہو' توبہ کرو۔ یہ گناہ کبیرہ ہے۔"

"آپ توبہ کرتے رہیں۔ میں جا رہا ہوں۔ میں آپ سے کہہ چکا ہوں کہ میں ہمیشہ اس حال میں نہیں رہ سکتا۔"

"مگر بیٹے! سنو تو۔ تم سن رہے ہو نا؟"

وہ سننے والا جا چکا تھا۔ نامی پلنگ کے سرے پر بیٹھی محبوب کی مختلف تصویروں میں کھوئی ہوئی تھی۔ بیڈ روم کا دروازہ بڑی آہستگی سے بند ہوا۔ پھر اندر سے آپ ہی آپ چٹخنی چڑھ گئی۔ تھوڑی دیر بعد نامی کو اپنے قریب اس کی موجودگی کا احساس ہوا۔

"تم کہاں چلے گئے تھے؟"

"چچا جان کے پاس گیا تھا۔ تم یہ بتاؤ' کیا میری تصویریں پسند آئیں؟"

"ہاں' تم بہت اچھے ہو۔ میں۔ میں تمہارے چہرے کو چھو کر دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"میں تمہارا ہوں' اور جو اپنے ہوتے ہیں' ان سے اجازت نہیں لی جاتی۔"

نامی نے البم کو ایک طرف رکھ دیا۔ پھر دونوں ہاتھ بڑھا کر ایک اندھی کی طرح ٹٹولتی ہوئی اس کے چہرے تک پہنچ گئی۔ وہ ایک انسان کا ٹھوس مادی چہرہ تھا۔ اس کی انگلیاں اس پر پھسل رہی تھیں۔ پیشانی' آنکھیں' ناک' رخسار اور ہونٹ' سب کچھ تصویروں کے مطابق تھے۔ اسے چھوتے وقت نامی کے تصور میں وہی خوبرو نوجوان ابھر رہا تھا جسے البم میں دیکھ چکی تھی۔

“نامی!” اسے پیار بھری سرگوشی سنائی دی۔

“ہاں۔ بولو میرے محبوب!”

“میں بھی تمہارے چہرے کو چھونا چاہتا ہوں۔”

“میں تمہاری ہوں‘ اور جو اپنے ہوتے ہیں‘ ان سے اجازت نہیں لی جاتی۔”

یہ کہتے ہی اس کی نظریں جھک گئیں۔ وہ زیرِ لب مسکرانے لگی۔ دوسرے لمحے اسے اپنا چہرہ دو مردانہ ہاتھوں کے درمیان محسوس ہوا۔ پھر موٹی موٹی اور بھاری بھاری انگلیاں اس کے گلابی رخساروں پر رینگنے لگیں۔ کیسی انوکھی قربت تھی۔ نگاہوں کے سامنے وہ نہیں تھا مگر وہ بلاشبہ موجود تھا اور جذبوں کی طرح گدگدا رہا تھا۔ پھر پھول کی پنکھڑیوں جیسے لب ان دیکھے بوسوں کی لذت سے آشنا ہونے لگے۔

کتنی ہی باتیں‘ کتنی ہی ادائیں اور کتنی ہی گھاتیں تھیں جو نظر نہیں آتی تھیں‘ صرف احساسات کو چھو رہی تھیں‘ جذبات کو ورغلا رہی تھیں اور ایک دیدہ بدن کو نادیدہ بدن سے منسلک کر رہی تھیں۔

کمرے کے باہر بند دروازے کے سامنے حکیم چچا ٹہل رہے تھے اور ایک گھنٹے سے دروازہ کھلنے کا انتظار کر رہے تھے۔ چولہے پر گرم کیا ہوا سالن ٹھنڈا ہو گیا۔ اِدھر سے اُدھر ٹہلتے ٹہلتے پاؤں دکھنے لگے تھے۔ آخر وہ تھک ہار کر دروازے کے قریب آئے اور کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کرنے لگے۔

پہلے تو کچھ سنائی نہیں دیا۔ پھر ذرا دیر بعد نامی کی آواز سنائی دی۔ وہ مسرت سے چیخ رہی تھی۔

“محبوب۔ محبوب! میں تمہیں دیکھ سکتی ہوں۔ تم نظر آ رہے ہو۔ تم سر سے پاؤں تک نظر آ رہے ہو..........”

حکیم چچا کی باچھیں خوشی سے کھل گئیں۔ مگر کمرے کے اندر محبوب بہت زیادہ اداس نظر آ رہا تھا۔ اس نے پلنگ کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

“نامی! اس وقت تم کہیں اِدھر اُدھر نہ دیکھنا۔ اپنے آپ کو بھی نہ دیکھنا‘ صرف میری طرف دیکھتی رہو۔ ہاں‘ مجھے میرا ظاہری جسم واپس مل گیا ہے مگر اس کے لئے تمہیں بہت بڑی قربانی دینی پڑی ہے۔ اب اس قربانی کے بعد تم گھبراؤ گی تو نہیں؟”

“اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے۔ میرا جسم تمہارے لئے تھا میں نے تمہارے حوالے کر دیا۔ مگر۔ تم کچھ پریشان نظر آ رہے ہو؟”

“ہاں۔ میں پریشان ہوں۔ کیونکہ اب تم نظر نہیں آ رہی ہو۔”

“کیا کہہ رہے ہو؟” نامی کی گھبرائی ہوئی سی آواز سنائی دی۔

وہ پلنگ بہت دیر سے خالی پڑا تھا۔ وہاں نامی کا وجود نظر نہیں آ رہا تھا۔ صرف اس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

“میرے ہاتھ؟ میرے پاؤں؟ میرا جسم کہاں ہے؟ کہاں ہے؟ مجھے نظر کیوں نہیں آ رہا ہے؟”

“نامی!” محبوب نے قریب آ کر اسے چھوتے ہوئے کہا۔ “خود کو چھو کر دیکھو‘ تم موجود ہو‘ صرف نظر نہیں آ رہی ہو۔”

“نہیں۔ نہیں۔” اس کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ “مجھے میرا جسم واپس کرو۔ میں پردے میں رہنے والی عورت نہیں ہوں۔ ہائے کس اندھیرے میں تم نے مجھے چھپا دیا ہے؟ کیا تم نے یہی میرے پیار کا صلہ دیا ہے؟”

“مجھے سمجھنے کی کوشش کرو نامی۔ میں تمہیں فریب نہیں دے رہا ہوں۔ بے وفائی نہیں کر رہا ہوں۔ میں ہمیشہ تمہیں اپنے سینے سے لگا کر رکھوں گا۔ تم یہ نہ سوچو کہ میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔ میری زندگی میں تمہارے سوا کوئی عورت نہیں آئے گی۔ کیا تم میری محبت کی خاطر تمام عمر چھپ کر نہیں رہ سکتیں؟”

“نہیں محبوب! تم ایسی بات نہ کہو جو عورت کی فطرت کے خلاف ہو۔ عورت نمائش کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ وہ اپنے محبوب یا خاوند کے سامنے حسن و شباب کے ہر زاویے سے ظاہر ہونا چاہتی ہے۔ تم میرا سنگار نہیں دیکھ سکو گے۔ لباس اور زیورات کی جگمگاہٹ میں میرے حسن کی آب و تاب کیسے بڑھ جاتی ہے۔ یہ تمہیں دکھائی نہیں دے گا۔ تم ایک اندھے کی طرح ٹٹول کر مجھے محسوس کرو گے۔ کیا پھول اندھے کے لئے کھلتا ہے؟ کیا چاند ایک اندھے کو کبھی اپنی چاندنی کی خیرات دیتا ہے؟ میرے حسن کی چاندنی کہاں کھو گئی محبوب۔ میرا حسن اور میرا جسم مجھے واپس کرو..........”

وہ رو رہی تھی۔ محبوب اس کا سر اپنے سینے پر محسوس کر رہا تھا۔ اسے بھی اس بات کا دلی صدمہ تھا کہ وہ اپنی حسین محبوبہ کو کبھی نہیں دیکھ سکے گا۔

اس کی آنسو بھری آواز سنائی دی۔

“یہ کیسا طلسم ہے محبوب۔ پہلے تم نظر نہیں آ رہے تھے۔ اب تم ظاہر ہو گئے ہو تو میں نظر نہیں آ رہی ہوں۔ آخر یہ کیسے ہو گیا؟”

محبوب نے ایک سرد آہ بھر کر جواب دیا۔

"میری جان۔ وہ۔ وہ صفر حیات ٹرانسفر ہو گیا ہے۔ اب وہ تمہارے جسم میں ہے..........."

☆======☆======☆

صبح چار بجے تک نامی کو صبر آ گیا۔

محبوب نے تمام رات اسے اپنی آغوش میں تھپک تھپک کر اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ رونے دھونے سے یا جھنجلانے سے ظاہری جسم واپس نہیں آئے گا۔ محبوب پر جو تے کرنے اور جلاب لینے کے طریقے آزمائے گئے تھے' ان سے بھی نامی کا مسئلہ حل نہیں ہو گا۔ چچا جان کی حکمت پر بھی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ آئندہ کوئی کامیاب نسخہ تیار کر سکیں گے۔ کوئی بہت بڑا ڈاکٹر بھی ایکسرے کے ذریعے نامی کے جسم میں نہیں جھانک سکتا تھا کہ وہ صفر حیات کہاں چھپا ہوا ہے۔ کیونکہ وہ صفر حیات بھی ایک رقیق مادہ تھا۔ ایکسرے کی اسکرین پر نظر نہیں آ سکتا تھا۔

نامی سمجھ گئی تھی۔ مگر اب اس کے والدین کو سمجھانے کا مسئلہ تھا۔ اول تو وہ یقین نہیں کرتے کہ ان کی بیٹی کا حسن اور سراپا ساری دنیا کی نگاہوں سے چھپ گیا ہے۔ اگر نامی کسی طرح یقین دلاتی کہ وہ نظر نہ آنے والی ان کی بیٹی ہے تو اس کے والدین محبوب اور حکیم چچا کے خلاف قانونی کارروائی کرتے۔ اگر ایسا نہ کرتے' تب بھی نامی دنیا والوں کے لئے ایک نہ دکھائی دینے والا تماشہ بن جاتی۔

آخر یہ فیصلہ ہوا کہ نامی کے والدین کو بھی حقیقت نہ بتائی جائے۔ پہلے نامی کا ظاہر جسم واپس لانے کی کوشش کی جائے۔ اس مقصد کے لئے محبوب کو جلال آباد جانا پڑا۔ اس نے گیراج سے اپنی کار نکالی' نامی کی کار کو گیراج میں بند کر دیا اور نامی کے میک اپ اور گیٹ اپ کا سامان خریدنے کے لئے جلال آباد چلا گیا۔

شام کو وہ نامی کی ضروریات کی تمام چیزیں لے کر واپس آ گیا۔ اس کی آنکھوں میں نیند بھری ہوئی تھی۔ وہ پچھلی رات سے جاگ رہا تھا۔ لہٰذا تمام سامان نامی کے حوالے کر کے سونے چلا گیا۔

رات کے دس بجے نامی نے اسے اٹھایا۔ وہ آنکھیں ملتے ہوئے اٹھا پھر حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ سر سے پاؤں تک نظر آ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر سوسائٹی میک اپ تھا۔ محبوب ایسا پین کیک خرید کر لایا تھا جس کا رنگ نامی کی جلد سے ملتا تھا۔ اس پین کیک

نے نامی کی جلد کی رنگت واپس کر دی تھی۔ اس کے ہونٹ لپ اسٹک سے واضح ہو گئے تھے۔ بھنویں آئی بروپنسل سے اجاگر ہو گئی تھیں۔ آنکھوں کے بادامی خطوط اور پلکیں کاجل سے ظاہر ہو گئی تھیں اور آنکھوں کے اندر جہاں تاریک گڑھے نظر آ سکتے تھے' وہاں آئی لینز لگا دیئے گئے تھے۔ اس کی تراشیدہ زلفیں ہیئر کلر سے نمایاں ہو گئی تھیں۔ اس کے باوجود اس نے وگ پہن لیا تھا۔ پاؤں میں اسکن کلر کے باریک نائیلون کے موزے تھے۔ ناخنوں پر نیل پالش چڑھی ہوئی تھی۔ لباس کے باہر جسم کا جو بھی حصہ نظر آتا ہے' اسے بڑی کامیابی اور ہنرمندی سے میک اپ کے ذریعے اجاگر کر دیا گیا تھا۔

محبوب نے اسے اپنی آغوش میں لے کر کہا۔

"نامی۔ تم نے کمال کر دیا۔ اتنے سلیقے سے میک اپ کیا ہے کہ اپنے ظاہری جسم کو مکمل طور پر واپس لے آئی ہو۔ اب ہم آسانی سے کورٹ میں جا کر شادی کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد تم اپنی ممی اور ڈیڈی کو اطلاع دینا۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

نامی نے اس کی گردن میں بانہیں ڈال کر کہا۔ "ہاں۔ شادی کے بعد میں ممی اور ڈیڈی کو اپنے نئے گھر میں بلاؤں گی لیکن ان کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ وہاں بہت سی بے تکلف سہیلیاں گھیر لیں گی۔ اگر میری کسی غلطی سے میرے نادیدہ وجود کا پتہ چل گیا تو مصیبت آ جائے گی۔ میں اپنے والدین کو یہ کہہ کر کچھ عرصے کے لئے ٹال دوں گی کہ ہم ہنی مون کے لئے کسی پہاڑی علاقے میں جا رہے ہیں۔"

اس رات وہ دونوں آئندہ زندگی گزارنے کے پروگرام بناتے رہے۔ دو دن کے بعد انہوں نے جلال آباد جا کر کورٹ میرج کر لی۔ نامی نے وہاں سے اپنے والدین کو اطلاع دی کہ وہ مختار محبوب سے شادی کر چکی ہے۔ اس کے والدین اس کی گمشدگی سے پریشان تھے۔ نامی نے انہیں بتایا کہ وہ شام کو سات بجے کے بعد اپنے نئے گھر میں ملے گی۔ کیونکہ وہ اپنے خاوند کے ساتھ جلال آباد میں ہے۔ شام تک حویلی میں پہنچے گی۔ اس نے محبوب کی حویلی کا پتہ بتا دیا۔

اس نے شام کے بعد ملاقات کا وقت اس لئے رکھا کہ اس وقت اندھیرا ہو جاتا ہے۔ اگر اس کے میک اپ میں کوئی خامی یا کمی رہے گی تو قمقموں کی روشنی میں کوئی اس پر توجہ نہیں دے گا۔

شام کو تاریکی چھا جانے کے بعد جب وہ محبوب کے ساتھ حویلی میں آئی تو وہاں اس کے والدین' اس کی آنٹی' ساجد اور اس کی بے تکلف سہیلی ناز نین وغیرہ پہنچے ہوئے

تھے۔ ماں نے اسے گلے لگا کر شکایتیں شروع کر دیں کہ شادی کی اتنی جلدی کیا پڑی تھی۔ اس خوشی میں اپنے ماں باپ کو تو شریک کرنا چاہئے تھا۔

سہیلی نے بھی گلے لگ کر شکایت کی۔ ساجد دور کھڑا اسے حسرت سے دیکھتا رہا۔ وہ حسین دولت مند لڑکی اس کے ہاتھ آتے آتے رہ گئی تھی۔ محبوب اپنے اس رقیب کو دیکھ کر مسکرا رہا تھا جس کی تصویر اس نے نامی کے بیڈ روم میں پھاڑ ڈالی تھی اور بڑی آسانی سے نامی کو اس سے چھین لیا تھا۔

نامی کی حالت کچھ عجیب سی تھی۔ وہ اپنے گھر میں اپنے والدین کو بلا کر خوش ہو رہی تھی اور اندر ہی اندر پریشان بھی تھی کہ کسی وجہ سے اگر میک اپ کا پلستر ادھڑ گیا تو مصیبت آ جائے گی۔ اگر ہاتھوں کا میک اپ چھوٹ گیا تو انہیں ہاتھ نظر نہیں آئیں گے۔ اگر ہونٹوں کی لالی اڑ گئی یا دانتوں کی فلوریسنٹ پالش اتر گئی تو وہ دانتوں کے بغیر پوپلی یا ہونٹ کے بغیر ایک خوبصورت چڑیل نظر آئے گی۔ سب ہی خوفزدہ ہو کر چیختے چلاتے بھاگیں گے۔ اس کے والدین بھی اسے اپنی بیٹی تسلیم کرنے سے انکار کر دیں گے۔ ان کی سمجھ میں یہی آئے گا کہ کوئی چڑیل بیٹی بن کر انہیں دھوکہ دے رہی ہے۔

اس نے نمائشی ہونٹوں اور دانتوں کی خاطر سب کے ساتھ کھانے پینے سے انکار کر دیا۔ ان کے سامنے طبیعت خراب ہونے کا بہانہ کرتی رہی۔ وہ اپنے ظاہری وجود کو قائم رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتی رہی۔ آخر رات کے دو بجے سب مہمان رخصت ہو گئے۔ اس کی ممی کی خواہش تھی کہ وہ ہنی مون کے لئے جانے سے پہلے دو چار روز اپنے میکے آ کر رہے لیکن نامی نے مجبوری ظاہر کی کہ محبوب نے صبح ہی یہاں سے روانگی کا پروگرام بنا لیا ہے۔ ماں یہ سوچ کر خاموشی سے چلی گئی کہ لڑکی اب پرائی ہو گئی ہے۔ جو خاوند چاہے گا' اسی پر عمل کرے گی۔

ان کے جانے کے بعد نامی نے کہا۔

"محبوب خدا کے لئے یہاں سے بھاگ چلو۔ اس میک اپ کے باوجود میں کسی کا سامنا نہیں کر سکتی۔"

"حوصلہ کرو نامی۔ تم جہاں بھی جاؤ گی' کسی نہ کسی کا سامنا کرنا ہی پڑے گا۔ چونکہ ہم دونوں کے دل میں چور ہے' اس لئے ہم ڈرتے ہیں کہ کہیں بھید نہ کھل جائے۔ تم سوچو ناں کہ آخر بھید کیسے کھلے گا۔ تم جانتی ہو میکس فیکٹر کا میک اپ کتنا پائیدار ہوتا ہے۔ پانی سے یا پسینے سے نہیں دھلتا ہے اور نہ ہی شربت پینے یا چائے پینے سے لپ اسٹک کا

رنگ اڑ سکتا ہے۔ تم تو خواہ مخواہ گھبرا جاتی ہو۔"

"میں اس لئے گھبراتی ہوں کہ جس بات کی ہم توقع نہیں کرتے' اکثر وہی بات سامنے آ جاتی ہے۔ فرض کرو کہ میرے لباس کا کوئی حصہ کار کے دروازے میں پھنس کر یا کسی کیل سے الجھ کر پھٹ جاتا ہے۔ پھر نتیجہ کیا ہو گا؟ دیکھنے والوں کو میرے پھٹے ہوئے لباس کی جگہ میرا ننگا جسم نظر نہیں آئے گا۔ ان کی نظریں آر پار چلی جائیں گی۔"

"تم غیر متوقع حادثوں کے بارے میں سوچتی ہو۔ ایسے وقت انسان عزم و ہمت اور ذہانت سے کام لیتا ہے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تم کسی طرح کی فکر نہ کرو۔ ہم کچھ عرصے تک پہاڑی علاقے میں رہیں گے تو تمہاری یہ پریشانیاں دور ہو جائیں گی۔"

صبح وہ دونوں اپنی کار میں روانہ ہو گئے۔ وہاں پہاڑی علاقے میں انہوں نے ایک ایسی جگہ ایک کاٹج کرائے پر لی' جہاں آبادی زیادہ نہیں تھی۔ دوسرے کاٹج بہت دور وادیوں میں یا پہاڑیوں کی بلندیوں پر تھے۔ وہاں پہنچ کر نامی کو سکون حاصل ہوا۔ آس پاس کوئی پڑوسن نہیں تھی جو اس سے دوستی کرنے اور وقت گزارنے کے لئے چلی آتی۔ محبوب نے بھی کسی سے بے تکلفی کی حد تک دوستی نہیں کی۔ حتیٰ کہ کسی کو کبھی چائے کے لئے بھی کاٹج میں دعوت نہیں دی۔

موسم گرما کے دو ماہ بڑے سکون سے گزر گئے۔ تیسرے ماہ نامی نے ایک نئی مصیبت کی اطلاع دی۔

"محبوب۔ میں نے کہا تھا کہ کوئی غیر متوقع مصیبت آ سکتی ہے۔ اب میرا راز فاش ہونے کا وقت آ رہا ہے۔ میں۔ میں ماں بننے والی ہوں۔"

محبوب نے خوش ہو کر اسے آغوش میں لیا' پھر بڑی محبت سے چوم کر بولا۔ "یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے اور تم اسے مصیبت کہہ رہی ہو۔"

"میری بات سمجھنے کی کوشش کرو محبوب۔ زچگی کے وقت عورتوں کو اپنا ہوش نہیں رہتا۔ ایسے وقت میں میک اپ میں نہیں رہ سکتی۔ کسی مڈوائف یا دایہ کے سامنے اپنا جسم نہیں چھپا سکتی۔ پھر تم ہی سوچو کہ زچگی کیسے ہو گی؟ کوئی دایہ میرے قریب نہیں آئے گی۔ مجھ نادیدہ ہستی کی آہیں کراہیں سنتے ہی خوفزدہ ہو کر بھاگ جائے گی.........."

محبوب کی پیشانی پر شکنیں پھیل گئیں۔ اولاد کی خوشی میں اس نے یہ نہیں سوچا تھا کہ اولاد کی پیدائش ایک مسئلہ بن جائے گی۔

اب ان کے دن اسی فکر میں گزرنے لگے کہ یہ مسئلہ کیسے حل ہو گا۔ نت نئی

ترکیبیں سوچی جاتی تھیں لیکن وہ کسی نہ کسی وجہ سے قابل عمل نہیں ہوتی تھیں۔

آخر محبوب نے کہا۔ "تم اپنی ممی کو راز دار بنا لو۔ انہیں تمہاری نادیدہ ہستی کی حقیقت معلوم ہو گی تو وہی تمہاری راز دار بن کر تمہارے کام آئیں گی۔"

"نہیں۔ تم نہیں جانتے۔ میری ممی بھوتوں اور چڑیلوں کے ذکر سے ہی ڈر جاتی ہیں۔ جب وہ مجھے میک اپ کے بغیر غائب ہوتے دیکھیں گی تو مارے دہشت کے وہیں بے ہوش ہو جائیں گی۔ وہ کبھی یقین نہیں کریں گی کہ میں ان کی بیٹی ہوں۔"

نامی کسی طرح راضی نہ ہوئی کہ اس کی ممی کو راز دار بنایا جائے۔ کسی دوسری عورت کے متعلق بھی یہی سوچا جا رہا تھا کہ وہ دہشت زدہ ہو جائے گی۔ یا پھر راز دار بن کر نہیں رہ سکے گی۔ عورت کے پیٹ میں کبھی بات نہیں ٹھہرتی۔ وہ کسی نہ کسی کے سامنے اگل ہی دیتی ہے۔

سوچتے سوچتے چار ماہ گزر گئے۔ گرمی کا موسم جا رہا تھا۔ سردی کا موسم آ رہا تھا۔ نامی پہاڑی علاقے کی سردی برداشت نہ کر سکتی تھی۔ پانچ ماہ کے بعد وہ جلال آباد واپس آ گئے۔ سری پور اس لئے نہیں گئے کہ نامی کے والدین وغیرہ سے سامنا ہو سکتا تھا۔ وہاں ایک کوٹھی کرائے پر لے کر رہنے لگے۔ نامی نے میک اپ کرنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ کوٹھی سے باہر نہیں نکلتی تھی۔ محبوب بھی کسی ضروری کام سے باہر جاتا تھا ورنہ اس کا وقت بھی کوٹھی کے اندر یہی سوچتے گزرتا تھا کہ زچگی کا مسئلہ کس طرح حل ہو گا؟

پھر آٹھ ماہ پورے ہو گئے۔ زچگی کا وقت بالکل قریب آ گیا۔ محبوب کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو اس نے اپنے حکیم چچا کو حویلی سے بلوا لیا اور ان کے سامنے اپنی پریشانیوں کی تمام داستان سنا دی۔

تمام باتیں سننے کے بعد انہوں نے کہا۔

"برخوردار! اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟ میں ایک بوڑھی دائی کو جانتا ہوں' وہ یہ کام کر دے گی اور اس کوٹھی سے باہر جا کر کسی کے سامنے نامی کو نادیدہ ہستی نہیں کہے گی۔"

"آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ اپنی زبان بند رکھے گی۔ وہ تو بڑی حیرانی اور فخر سے کہے گی کہ اس نے ایک ایسی عورت کو ماں بنتے دیکھا ہے جو آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتی۔ یہ واقعہ اس کے لئے اتنا حیرت انگیز ہو گا کہ اسے دوسروں کے سامنے بیان کرتے وقت فخر محسوس کرے گی۔"

انہوں نے محبوب کا شانہ تھپکتے ہوئے کہا۔ "بیٹے! پہلے پوری بات تو سن لو۔ اس بوڑھی دائی کو یہ معلوم ہی نہیں ہو گا کہ ہماری نامی ایک نادیدہ ہستی ہے۔ اس لئے نہیں معلوم ہو گا کہ وہ بوڑھی اندھی ہے۔"

محبوب نے چونک کر پوچھا۔ "کیا؟ کیا وہ اندھی ہے؟ آپ۔ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ اگر وہ اندھی ہے تو دایہ کے فرائض کیسے انجام دیتی ہے؟"

"یہ میں نہیں جانتا لیکن اتنا یقین سے کہتا ہوں کہ کتنے ہی بچے اس کے ہاتھوں پیدا ہوئے ہیں۔ کوئی دو سال پہلے کی بات ہے' ایک ادھیڑ عمر کی عورت میرے پاس آئی تھی۔ اس کی بیٹی شادی سے پہلے ہی ماں بننے والی تھی۔ وہ عورت مجھے منہ مانگی رقم دے کر کوئی ایسی دوا حاصل کرنا چاہتی تھی کہ جس سے حمل ضائع ہو جائے۔ میں قانون کے خلاف ایسا کام نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے میں نے دوا دینے سے انکار کر دیا۔ وہ عورت مایوس ہو کر چلی گئی۔

سات ماہ کے بعد اس اندھی دایہ سے میری ملاقات ہوئی۔ اس نے بتایا کہ وہ بڑھاپے میں اندھی ہونے کے باوجود دایہ کے فرائض انجام دیتی ہے۔ میں نے طنزیہ کہا۔ "پھر تو گنہگاروں کو تمہاری ذات سے فائدہ پہنچتا ہو گا۔" اس نے اعتراف کیا۔ جب تک اس کی آنکھیں اچھی تھیں' اس وقت تک شہر کے کتنے ہی علاقوں سے اسے زچگی کے وقت بلایا جاتا تھا۔ مگر جب سے وہ اندھی ہوئی ہے' اسے کبھی کبھی خاص موقعوں پر بلایا جاتا ہے۔ بلانے والے اسے اپنا اور ماں بننے والی لڑکی کا نام نہیں بتاتے۔ اس جگہ کا علم نہیں ہونے دیتے' جہاں وہ بلائی جاتی ہے۔ کام ہو جانے کے بعد اسے اچھی خاصی رقم دے کر رخصت کر دیئے ہیں۔ وہ کہتی ہے کہ کسی آنکھ والی دایہ کی اتنی قدر نہیں ہو سکتی ہو گی' جتنی اس کی ہوتی ہے۔ گناہ کا کاروبار جتنا پھیلے گا' اتنی ہی اس اندھی کی اہمیت بڑھتی جائے گی۔"

"بہرحال تم اور نامی گنہگار نہیں ہو۔ مگر نامی کا کام وہی اندھی کر سکتی ہے۔ تم یہ نہ سوچو کہ وہ اندھی ہے۔ وہ جو کچھ بھی کرتی ہے' اپنے تیس سالہ تجربات کی روشنی میں کرتی ہے۔"

محبوب نے نامی کے پاس جا کر مشورہ کیا۔ پھر وہ اس فیصلے پر متفق ہو گئے کہ وہ اندھی ہی ان کے کام آ سکتی ہے۔

==☆======☆

دوسرے دن حکیم چچا اس اندھی کو تلاش کر کے لے آئے۔ محبوب اسے نامی کے کمرے میں لے گیا۔ نامی نے میک اپ نہیں کیا تھا۔ سردی سے بچنے کے لئے گرم کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ لباس کی حد تک اس کا وجود ظاہر تھا۔ باقی گردن اور سر' ہتھیلیاں' انگلیاں اور پاؤں کا کچھ حصہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ لیکن وہ اندھی اسے چھو کر دیکھ رہی تھی۔ لہٰذا نامی اس کی اندھی آنکھوں کے سامنے سر سے پیر تک مکمل تھی۔

نامی اور محبوب نے اطمینان کی سانس لی۔ ان کی بہت بڑی مشکل آسان ہو گئی تھی۔ اندھی نے نامی کا معائنہ کرنے کے بعد کہا۔

"ابھی دو دن اور جائیں گے۔ اللہ نے چاہا تو تیسرے دن تمہاری گود میں بچہ ہو گا۔ میں پرسوں آ جاؤں گی۔"

محبوب نے کہا۔ "تم دو چار روز تک یہیں رہو۔ یہ دو چار روز تم جتنا کما سکتی ہو' میں تمہیں اس سے بہت زیادہ دوں گا۔ ابھی تم پیشگی کے طور پر دو ہزار روپے لے کر میرے چچا کے ساتھ اپنے گھر جاؤ اور اپنے گھر والوں سے کہہ دو کہ تم چار پانچ دن کے بعد واپس آؤ گی۔ میں باپ بننے کے بعد تمہیں تین ہزار روپے اور دوں گا۔"

بوڑھی کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ اس نے کبھی اپنی زندگی میں پانچ ہزار روپے نہیں گنے تھے۔ وہ ان کے ساتھ کوٹھی میں رہنے کے لئے راضی ہو گئی۔ اس وقت اس نے دو ہزار روپے لئے اور دعائیں دیتی ہوئی چلی گئی کہ اللہ انہیں مزید گناہوں کی توفیق دے تاکہ اسی طرح موٹی رقمیں ملتی رہیں۔ حکیم چچا اس کے ساتھ گئے تھے۔

شام تک وہ واپس آ گئی۔ دو دن بڑے اطمینان سے گزرے۔ کبھی کبھی نامی کے درد اٹھتا تھا' پھر آرام آ جاتا تھا۔ اندھی برابر اپنے تجربات کا ثبوت پیش کر رہی تھی۔ وہ اتنی تجربہ کار تھی کہ وہ ماں بننے والی عورت کی نبض تھام کر بتا دیتی تھی کہ کب زچگی ہو گی۔ نامی کے متعلق بھی اس نے درست کہا تھا۔ تیسرے دن صبح ہی اس کی تکلیف بڑھ گئی۔ ایسے وقت یاد آیا کہ ڈیٹول نہیں ہے۔ محبوب فوراً ہی کار میں بیٹھ کر بازار کی طرف گیا۔

وہ ایک میڈیکل اسٹور سے ڈیٹول خرید رہا تھا۔ اسی وقت ساجد نے اسے دیکھ لیا۔ نامی کے والدین کو پچھلے چار ماہ سے بیٹی کی کوئی خبر نہیں ملی تھی کہ وہ کہاں ہے۔ وہ نامی کے لئے پریشان تھے اور ان دنوں نامی کی آنٹی کے ہاں جلال آباد آئے ہوئے تھے۔

ساجد سوچ رہا تھا کہ اگر نامی اور محبوب جلال آباد میں آباد ہیں تو انہوں نے آنٹی سے ملاقات کیوں نہیں کی یا سری پور کیوں نہیں گئے؟ محبوب اپنی کار میں بیٹھ کر جانے لگا

تو ساجد نے اپنی کار میں اس کا پیچھا کیا۔ محبوب بے خبر تھا کہ اس کا تعاقب کیا جا رہا ہے اور اس تعاقب کے بعد نامی کی نادیدہ ہستی کا بھید کھلنے والا ہے۔ وہ کار ڈرائیو کرتا ہوا کوٹھی کے احاطے میں داخل ہو گیا۔ ساجد نے اس کوٹھی کو دیکھا اور پھر سیدھا آنٹی کے ہاں چلا آیا۔

ڈرائنگ روم میں نامی کے والدین بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے آتے ہی کہا۔ "انکل۔ چلئے اٹھئے۔ نامی کا پتہ چل گیا ہے۔ وہ اسی شہر میں ہے۔"

اس کی ممی خوشی سے اچھل کر کھڑی ہو گئی۔

"کہاں ہے میری بیٹی۔ کیا تم اس سے مل کر آ رہے ہو؟"

"نہیں آنٹی۔ میں نے تو نامی کی صورت بھی نہیں دیکھی ہے۔ میں نے محبوب کو ایک کوٹھی میں داخل ہوتے دیکھا ہے۔ جلدی چلئے۔ اگر نامی نہ ہوئی تو ہم محبوب کا گریبان پکڑ کر پوچھیں گے کہ اسے نو ماہ تک کس کال کوٹھڑی میں چھپا رکھا ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے آنٹی! کہ وہ شخص نامی کو تباہ کر رہا ہے۔ ورنہ نامی ایسی لڑکی نہیں تھی کہ شادی کے بعد اپنے والدین کو بالکل ہی بھول جاتی........"

وہ اس کی بکواس سنتے ہوئے کوٹھی سے باہر آئے اور کار میں بیٹھ گئے۔ ساجد کار ڈرائیو کرتے وقت بھی محبوب کو ایک بدمعاش' سنگدل اور مجرم ثابت کرنے کے لئے اپنی زبان قینچی کی طرح چلا رہا تھا۔

محبوب اور حکیم چچا بڑی بے چینی سے نامی کے کمرے کے سامنے ٹہل رہے تھے۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ دور کمرے کے کسی حصے سے کبھی کبھی نامی کی آہیں اور کراہیں سنائی دیتی تھیں۔ انہیں سن کر محبوب بے چین ہو جاتا تھا۔ وہ نامی کی تکلیف پر اس لئے تڑپ رہا تھا کہ بیچاری ایک اندھی کے رحم و کرم پر تھی۔ نہ جانے اس کا انجام کیا ہونے والا تھا۔

اتنے میں کال بیل کی آواز سنائی دی۔ محبوب نے ناگواری سے کہا۔ "یہ اس وقت کون مرنے آ گیا ہے۔ جائیے چچا جان! اسے باہر ہی سے ٹال دیجئے۔"

حکیم چچا بیرونی دروازے پر گئے لیکن اسے کھولتے ہی نامی کے والدین کو دیکھ کر بوکھلا گئے۔ اس کی ممی نے کہا۔

"کہاں ہے میری بیٹی؟ تمہارا بھتیجا اسے ہم سے چھپا کر کیوں رکھتا ہے؟"

اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتے یا بہانہ کرتے' نامی کی ماں انہیں ایک طرف

ہٹاتی ہوئی اندر آ گئی۔ اس کے پیچھے ساجد اور نامی کے ڈیڈی بھی چلے آئے۔ انہیں دیکھ کر محبوب کا رنگ بھی زرد پڑ گیا۔ اسے بھی کچھ کہنے کا موقع نہیں ملا۔ بند کمرے کے پیچھے نامی کی آہیں کراہیں سنتے ہی اس کی ماں نے تڑپ کر کہا۔

"یہ میری بیٹی پر کیا ظلم ہو رہا ہے' وہ کیوں رو رہی ہے' دروازہ کھولو....."

وہ آگے بڑھ کر دروازہ پیٹنے لگی۔ محبوب نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "آپ مجھے غلط سمجھ رہی ہیں۔ میں اس پر ظلم نہیں کر رہا ہوں' وہ ماں بننے والی ہے۔"

"ماں بننے والی ہے؟" اس کے ڈیڈی نے پوچھا۔ "تم نے ہمیں اطلاع کیوں نہیں دی؟"

پھر سوال جواب شروع ہو گئے۔ محبوب کسی طرح انہیں الٹے سیدھے جوابات دے کر قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ان سے کچھ غلطیاں ہوئی ہیں لیکن نامی بخیریت ہے۔

وہ ہر طرح سے قائل کر سکتا تھا۔ مگر یہ سوچ کر اس کے ہوش اڑ رہے تھے کہ دروازہ کھلے گا تو کیا ہو گا؟

ہو گا یہ کہ انہیں ان کی بیٹی نظر نہیں آئے گی۔

اس کا سر چکرانے لگا۔ نامی نظر نہیں آئے گی۔ ایک نادیدہ ہستی کیسے نظر آئے گی؟

اسی وقت ایک نوزائیدہ بچے کے رونے کی آواز آنے لگی۔

اس کی ممی کا چہرہ خوشی سے کھل گیا۔ اس نے دروازے پر دستک دیتے ہوئے کہا۔

"ارے دروازہ کھولو۔ میں اس کی ماں ہوں۔ میں تو اندر آ سکتی ہوں.........."

محبوب نے دل ہی دل میں دعا مانگی کہ اللہ کرے دروازہ کبھی نہ کھلے۔

مگر بیس منٹ کے بعد دروازہ کھل گیا۔ اندھی دروازے پر کھڑی ہو کر کہہ رہی تھی۔

"مبارک ہو۔ بیٹا ہوا ہے۔"

نامی کی ماں تیر کی طرح کمرے کے اندر گئی۔ اس کے ڈیڈی بھی اجازت لے کر اندر گئے۔ محبوب کی جرأت نہ ہوئی کہ وہ اپنے بیٹے کو دیکھنے جا سکے۔ وہ اپنے بیٹے کو دیکھ سکتا تھا۔ مگر اس کے ساس سسر اپنی بیٹی کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔

پھر کمرے سے نامی کی ماں کی آواز سنائی دی۔

"ہائے میری بچی! یہ سب کیا ہے؟ کیا میں اندھی ہو گئی ہوں کہ نظر نہیں

آتا.........."

محبوب نے پلٹ کر جھجکتے ہوئے کمرے میں دیکھا۔ پھر یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ نامی نظر آ رہی تھی۔ اس کی نامی واضح طور سے نظر آ رہی تھی۔ میک اپ کے بغیر نظر آ رہی تھی۔ کوئی چھپنے یا غائب ہو جانے والی بات نہیں تھی۔ اب وہ نادیدہ ہستی نہیں تھی۔ لحاف اوڑھے لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی ماں اپنی بیٹی کے قریب جھکی ہوئی ہاتھ بڑھا کر ایک اندھی کی طرح ٹٹول رہی تھی اور شدید حیرانی سے کہہ رہی تھی۔

"ارے یہ کیا طلسم ہے۔ یہ ہے تو سہی' مگر نظر کیوں نہیں آتا.........؟

☆======☆======☆

چھلپٹیا

اچھوتے موضوع پر اچھوتی کہانی۔
دنیا میں کوئی دیوہیکل نہیں ہوتا اگر ہوتو
موت اسے چٹکی میں اڑا دیتی ہے۔
بھارت میں انسانی ڈھانچوں کی تجارت کرنے
والے مجرموں کی شرمناک کہانی جو قانون کے سائے
میں یہ گھناؤنا کاروبار کر رہے تھے۔
اس چھلپٹیے کی عبرتناک کہانی جو معصوم بچوں کی کھوپڑیاں اتار لیتا تھا۔

وہ درخت ساحل پر تھا لیکن دریا سے گلے ملنے اس قدر جھک گیا تھا کہ اس کی کئی شاخیں پانی کی گہرائی میں ڈوب گئی تھیں۔ گویا وہ ڈوب کر گلے ملنے کی مثال پیش کر رہا تھا۔

کامنا کماری چھجے پر کھڑی دور اس درخت کو دیکھ رہی تھی اور اپنی پالتو بلی کو گلے لگا رہی تھی۔ اگر وہ ایسا نہ کرتی تب بھی بلی اس سے لگی رہتی۔ دونوں میں اتنی محبت تھی جیسے دو سہیلیوں نے کبھی نہ بچھڑنے کی قسم کھالی ہو۔ مزاج کے اعتبار سے وہ سگی بہنیں لگتی تھیں۔ وہ پھول کی طرح ملائم تھیں مگر پتھر کی طرح لگتی تھیں۔ ان کی نرمی اور گرمی قابل قبول سہی لیکن کوئی ان پر ہاتھ رکھتا تو وہ غراتی تھیں۔ پھر بھی کوئی نہ سمجھے تو اسے پنجے مار کر دور رہنے پر مجبور کر دیتی تھیں۔

قدرت کے تماشے عجیب ہوتے ہیں۔ دونوں کی آنکھیں ایک جیسی تھیں۔ ان کی پتلیاں گہری سبز تھیں۔ آنکھوں کی بناوٹ بھی ایک جیسی تھی۔ یعنی بلی کی طرح کامنا کی دائیں آنکھ کا' دایاں گوشہ اور بائیں آنکھ کا بایاں گوشہ قدرے اٹھا ہوا تھا۔ گہری تاریکی میں جب بلی کی آنکھیں چمکتی رہتیں تو گمان ہوتا کامنا بھیانک اندھیرے سے جھانک رہی ہے۔

اندھیرے میں آدمی دیکھ نہیں سکتا' کہتے بلی دیکھ لیتے ہیں۔ وہ بلی گہری تاریکی میں جو کچھ دیکھتی تھی' وہ کامنا کو ضرور دکھاتی تھی۔ کیونکہ کامنا خود جو کھاتی تھی' اسے کھلاتی تھی۔ اسے آغوش میں لے کر سلاتی تھی۔ وہ اسی طرح ایک دوسرے کے کام آتی تھیں' یقیناً محبت بھی اس طرح قائم رہتی ہے۔

وہ جس عمارت کے چھجے پر کھڑی ہوئی تھی' وہ کبھی ایک شاندار محل رہا ہو گا' اب کھنڈر بن چکا تھا۔ شام ہوتے ہی وہاں اُلو بولنے لگتے تھے مگر محاورتاً بولتے تھے۔ جب سے کامنا یہاں آکر آباد ہوئی تھی۔ تب سے اُلوؤں اور چمگادڑوں کا صفایا کر دیا گیا تھا۔ اس کی بلی کسی کو جگہ بنانے کا موقع ہی نہیں دیتی تھی۔

اس نے اپنی پیاری پیاری سی وفادار بلی کا نام کلپنا رکھا تھا۔ ادھر کوئی جانور نکل آتا تو

کامنا گولی مار دیتی تھی اور کوئی پرندہ چلا آئے تو کلپنا اسے دبوچ لیتی تھی۔ دن ہو یا رات، مسافر اس کھنڈر سے کترا کر گزرتے تھے۔

پولیس والے ادھر نہیں آتے تھے۔ صرف اس علاقے کا تھانیدار ٹھاکر گلاب سنگھ آتا تھا۔ اس نے دیوی ماں کے مندر میں جاکر کامنا کماری کو اپنی پتنی تسلیم کیا تھا۔ تب سے کامنا اپنی کلپنا کو لے کر وہاں آگئی تھی لیکن ایک بڑی مشکل تھی۔ کلپنا اپنی محبت میں کسی کو حصے دار نہیں بنانا چاہتی تھی۔ کامنا اسے سمجھاتی تھی۔ "میری کلپنا مان جا۔ یہ میرا پتی ہے، مجھ سے محبت کرتا ہے، جیسے تُو کرتی ہے"۔

کلپنا کبھی مان جاتی تھی، کبھی نہیں مانتی تھی، خصوصاً اس وقت، جب کامنا اپنے پتی سے لڑتی تھی۔ گلاب سنگھ اس کے مزاج کے خلاف کچھ کہتا تو وہ جواب میں غراتی تھی۔ اس کی دیکھا دیکھی کلپنا بھی غراتی تھی۔ وہ اپنی بیوی کو مارنے کے لئے دوڑتا، تو کلپنا غرا کر بیچ میں آجاتی تھی۔ یوں اس کی طرف دیکھتی تھی، جیسے اور آگے بڑھے گا تو پنجے مارے گی۔

وہ غصے کے مارے ہولسٹر پر ہاتھ مار کر کہتا تھا۔ "میں کسی دن تمہاری اس چہیتی کو گولی مار دوں گا۔"

کامنا جواباً کہتی تھی۔ "اسے مارنے سے پہلے سمجھ لینا کہ کلپنا کا دشمن، کامنا کا دشمن ہے۔ تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو، تم سے پہلے دو شوہروں کو شمشان گھاٹ پہنچا چکی ہوں۔"

ٹھاکر گلاب سنگھ کا رعب اور دبدبہ دور دور کے تھانوں اور علاقوں تک تھا۔ وہ جس پولیس اسٹیشن میں ٹرانسفر ہو کر جاتا تھا، وہاں جرائم کم ہو جاتے تھے۔ اس علاقے میں دن دہاڑے ڈاکا ڈالنے والے لیٹرے، بدمعاش اور قاتل وغیرہ ایسے سیدھے ہو جاتے کہ جرائم کی ارتھی اٹھا کر "رام رام ست ہے" کا جاپ کرنے لگتے تھے۔

وہ دو برس پہلے ضلع پورنیہ کے علاقے خشکی باغ میں ٹرانسفر ہو کر آیا تھا۔ تب سے وہاں کوئی واردات نہیں ہوئی تھی۔ محکمے کے اعلیٰ افسران نے اس کی ڈیوٹی وہیں مستقل کردی تھی۔ وہ بھی یہی چاہتا تھا۔ اس کے بیوی بچے پٹنہ شہر میں رہتے تھے۔ انہیں خبر نہیں تھی کہ اس نے کامنا کو بیوی بنا کر خشکی باغ کے ایک کھنڈر میں رکھا ہوا ہے۔ یہ بات جب تک چھپ سکتی تھی، وہ چھپائے رکھنا چاہتا تھا۔

موسم سرما میں چاتھ کا تہوار منایا جاتا ہے۔ خشکی باغ کی نواحی بستیوں سے لوگ آتے تھے اور اس کھنڈر سے ذرا دور اسی ساحلی حصے میں غسل کرتے تھے جہاں وہ درخت جھک کر دریا سے گلے ملتا تھا۔

کامنا کماری، کلپنا کو گلے لگائے ہوئے دور اس درخت کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اسی وقت ایک سپاہی نے چھجے کے نیچے آکر کہا۔ "مالکن داروغہ صاحب نے کہا ہے کہ پورنیہ سے ڈی ایس پی صاحب آئے ہیں، کام بڑھ گیا ہے اس لیے رات کو دیر سے آئیں گے۔"

سپاہی کو صرف اتنا ہی پیغام پہنچانے کے لیے کہا گیا تھا لیکن اس کے پیچھے جو دوسرا پیغام تھا، اسے کامنا نے سمجھ لیا تھا۔ ٹھاکر گلاب سنگھ نے دراصل کہلوا بھیجا تھا کہ ڈی ایس پی دورے پر نکلے گا تو ادھر آسکتا ہے لہٰذا کامنا اور کلپنا کو کھنڈر کے اندرونی حصے میں رہنا چاہیے اور شام ہونے کے بعد لالٹین نہیں جلانا چاہیے۔

وہ چاہتا تھا، کھنڈر ویران اور تاریک نظر آئے۔ ڈی ایس پی دور ہی سے ایک نظر ڈال کر چلا جائے، کھنڈر کو کھنڈر ہی سمجھے، اپنے ماتحت داروغہ کا عیش کدہ نہ سمجھے۔

اگرچہ ہندوستان میں اب یہ بات غیر معمولی نہیں رہی۔ لوگ ایک بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری شادی کرنے لگے ہیں تاہم یہ دستور ابھی عام نہیں ہوا ہے۔ سماج میں اسے برا سمجھا جاتا ہے، لہٰذا ٹھاکر گلاب سنگھ یہ بات چھپائے رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ کامنا کماری سے اس کا رشتہ ظاہر ہوتا تو پھر سوالات کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ کامنا کون ہے؟ وہ دوستوں کو ٹال سکتا تھا۔ بیوی اور بچوں کو چپ کرا سکتا تھا لیکن اپنے افسران سے کیا کہتا کہ اسے کہاں سے اڑا کر لایا ہے اور اس کھنڈر میں کیوں چھپا کر رکھا ہے۔

وہ سپاہی کی زبانی پیغام سننے کے بعد چھجے سے واپس جا کر کھنڈر کے اندرونی حصے میں رہنا چاہتی تھی۔ اسی وقت دور ساحل پر سے ایک چیخ سنائی دی۔ اس نے چونک کر اُدھر دیکھا جدھر وہ درخت جھک کر دریا کے گلے مل رہا تھا۔ وہیں سے ایک شخص دہشت زدہ ہو کر چیختا ہوا بھاگتا جا رہا تھا۔

سپاہی بھی سوالیہ نظروں سے ادھر دیکھ رہا تھا۔ کامنا نے کہا۔ "تم کاٹھ کے اُلو ہو، کھڑے تماشا دیکھ رہے ہو، جاؤ۔ اسے پکڑو، اس سے پوچھو، وہ کون ہے، کیوں اس طرح چیخ رہا ہے؟"

دہشت زدہ ہو کر چیخنے والا اس طرح منہ اٹھائے اندھا دھند بھاگ رہا تھا جیسے پیچھے

کوئی پاگل کتا دوڑا آرہا ہو۔ حالانکہ اس کے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ بستی وہاں سے دو فرلانگ کی دوری پر تھی۔ وہ بستی میں داخل ہونے لگا تب لوگوں نے پوچھا۔ "بھئی رام اوتار کیا ہو گیا؟"

"کیوں بھاگتے جا رہے ہو؟"

"آخر بتاؤ تو سہی' کیوں پاگلوں کی طرح چیخ رہے ہو؟"

بس وہ دوڑتا جا رہا تھا اور ایک ہی بات کہتا جا رہا تھا۔ "گجب ہو گوا' پانی کے اندر لاس۔ لاس کے اوپر لاس' پھر لاس کے اوپر لاس.........."

بستی کی ایک سڑک پر سے ڈی ایس پی کی گاڑی آرہی تھی اس کے پیچھے پولیس والوں کی ایک جیپ تھی۔ انھیں دیکھتے ہی رام اوتار ایک دم سے ٹھٹک گیا۔ دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر اچھلتے ہوئے گاڑیوں کو رکنے کے لیے کہنے لگا۔ گاڑیاں رک گئیں۔ داروغہ ٹھاکر گلاب سنگھ نے کھڑکی سے سر نکال کر ڈانٹتے ہوئے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

اس نے قریب آکر ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ "سرکار' آپ تو جانت ہیں' چاتھ کا تہوار شروع ہونے سے پہلے ہم دریا کی سپھائی کرت ہیں۔ ابھی سپھائی کرت کرت ہمارے ہاتھ ایک لاس کا ہاتھ آگوا۔ کا بتائیں' ہمار ہوس اڑ گوا۔ ایک کے بعد دوسر' دوسر کے بعد تیسر لاس۔ لاس کے اوپر لاس.........."

"ابے کیا بکتا ہے؟"

ڈی ایس پی نے کہا۔ "یہ جو کچھ بک رہا ہے' اس کی تصدیق ہونی چاہیے۔ فوراً سپاہیوں کو اُدھر لے چلو۔"

حکم کی تعمیل کی گئی' دونوں گاڑیاں دریا کے کنارے جانے لگیں' ان کے پیچھے بستی والے بھی دوڑتے ہوئے جانے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہی وہاں ایک میلہ سا لگ گیا تھا۔ داروغہ ٹھاکر گلاب سنگھ نے بستی کے جوانوں کو حکم دیا کہ وہ اپنی دھوتی چڑھا کر دریا میں اتر جائیں۔ جدھر رام اوتار بتا رہا ہے' ادھر سے لاشیں ڈھونڈنے کی کوشش کی جائے۔

کوشش کرنے کی ضرورت نہیں تھی' وہ پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ لوگ دریا میں اترے اور وہاں سے لاشیں کھینچ کر لانے لگے۔ بستی والوں میں سے کئی کی چیخیں نکل گئیں کیونکہ جو لاشیں نکل رہی تھیں' ان کی سر نہیں تھے۔

وہ درخت جو ساحل پر سے جھک کر دریا کو گلے لگا رہا تھا' اس کی کئی شاخوں نے پانی

میں ڈوب کر ان لاشیوں کو اپنے سائے میں دبا رکھا تھا ورنہ وہ جہاں سے بہتی ہوئی آئی تھیں' پانی کی سطح پر تیرتی ہوئی آگے نکل جاتیں۔ وہ پانی میں پھول کر اپنی جسامت سے دگنی ہو گئی تھیں لیکن انداز لگایا جاسکتا تھا کہ وہ بچوں کی لاشیں تھیں۔

یہ معصوم بچوں کی لاشیں کہاں سے آئیں؟ اور یہ لاشیں اپنے سروں سے محروم کیوں ہیں؟ یہ سوالات بہت پرانے ہیں اور ان کے جواب بھی سب کو معلوم ہیں۔ کئی برس سے ہندوستان کے اخبارات چیخ رہے ہیں' بھارت کی لوک سبھا اور راجیہ سبھا میں ان بھیانک وارداتوں کے سلسلے میں ریفرنس پیش کیے جاتے ہیں۔ اس کے باوجود یہ گھناؤنا جرم پھلتا پھولتا جا رہا ہے۔

بھارت کے رسالے بلٹز' ہندوستان ٹائمز اور امرت بازار پتریکا جیسے مقبول ترین روزنامے یہ دعویٰ کرتے ہیں اور سماجی کارکن بہانگ دہل کہتے ہیں کہ اب تو بھارت میں ہر سال اٹھارہ ہزار بچے قتل کیے جا رہے ہیں۔ کلکتہ کے ایک معروف سماجی کارکن انیل بنرجی نے مسز اندرا گاندھی کو کئی خطوط لکھے تھے' کئی طرح سے رابطہ قائم کیا تھا اور مسز اندرا گاندھی کو بتایا تھا کہ عوام میں کس طرح خوف و ہراس پھیلا ہوا ہے اور لوگ صرف بچوں کے سرکاٹ کر نہیں لے جاتے بلکہ دوسرے انسانی ڈھانچے بھی ملک سے باہر بھیجنے کا کاروبار کھلے عام کر رہے ہیں۔

یہ 1976 کی بات ہے۔ مسز اندرا گاندھی نے مرکزی وزارت صنعت و تجارت سے رابطہ قائم کیا۔ اس معاملے کی تحقیقات کرنے کے لیے کہا۔ اس کے بعد حکومت نے ڈھانچے برآمد کرنے کے لائسنس منسوخ کر دیے۔

اس کے کچھ عرصے بعد ہی مسز اندرا گاندھی اقتدار سے محروم ہو گئی تھیں۔ ان کے بعد جو حکومت آئی' اس نے اس تجارت پر سے پابندی اٹھا دی۔ یہ لائسنس آج بھی مسز اندرا گاندھی کے صاحبزادے مسٹر راجیو گاندھی کے دور اقتدار میں جاری ہیں۔

ہر قوم کا اپنا ایک خاص مزاج ہوتا ہے۔ صدیوں سے سیاسی اور مذہبی سطح پر یہ مزاج بنتا چلا آتا ہے۔ ہندوؤں میں صدیوں سے یہ رسم چلی آرہی ہے' دیس کے کسی حصے میں کوئی متعدی مرض پھیل جائے' سیلاب آئے' آندھی طوفان آئے یا زلزلہ آئے یا کوئی بلا آجائے تو انسان کی بلی یعنی قربانی دے کر اس بلا کو ٹالا جاتا ہے۔ جب سے تہذیب نے اس بھیانک فعل کی ممانعت کی ہے تب سے بظاہر ایسا نہیں ہوتا۔ فرنگی دور میں بھی اس پر سختی

سے پابندی عائد کی گئی لیکن چھپ چھپا کر کالی مائی کے چرنوں میں انسانوں کی قربانی دی جاتی رہی۔ اگرچہ کسی بھی قوم کی اکثریت ظالم نہیں ہوتی' ہر قوم اور ہر مذہب کے لوگ' اکثریت میں شریف اور پُرامن شہری ہوتے ہیں لیکن سیاسی اور مذہبی طور پر جو ایک مزاج بن جاتا ہے' وہ منافع خور تاجروں اور مجرموں کے گٹھ جوڑ سے پروان چڑھتا رہتا ہے۔ آج بھارت کے یہ منافع خور سپوت کالی مائی کو بھول گئے تھے اور لکشمی دیوی (دولت) کے چرنوں میں معصوم بچوں کی بلی دے رہے تھے۔

ڈی ایس پی نے میز پر اپنی چھڑی کو زور زور سے مارتے ہوئے' دہاڑتے ہوئے پوچھا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟ ٹھاکر گلاب سنگھ' تمہارا ریکارڈ مثالی ہے۔ ہر تھانے میں کہا جاتا ہے کہ جدھر گلاب سنگھ رخ کرتا ہے' وہاں جرائم آپ ہی آپ ختم ہو جاتے ہیں پھر یہ لاشیں تمہارے علاقے سے کیسے برآمد ہوئیں؟"

داروغہ ٹھاکر گلاب سنگھ اپنے افسر کے سامنے اٹینشن کھڑا ہوا تھا' اس نے ادب سے کہا۔ "مجھے آج بھی فخر ہے کہ میرے علاقے میں جرائم ہو نہیں سکتے۔ آپ نے خود اپنی آنکھوں سے لوکیشن کا معائنہ کیا ہے۔ دریا کے بہتے ہوئے رخ کو دیکھا ہے۔ یہ لاشیں دوسرے علاقے سے آئی تھیں اور اس جھکے ہوئے درخت کے نیچے اٹک گئی تھیں۔"

"تم یہ کہہ رہے ہو لیکن جن علاقوں سے یہ لاشیں یہاں آئی ہیں' وہاں کے تھانیدار کیا کہیں گے؟"

وہ چند لمحوں تک چپ رہ کر داروغہ کو دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔ "ہمارے ہاں کا یہ دستور ہو چلا ہے کہ ایک علاقے کا تھانیدار اپنے ہاں ہونے والے جرائم کو دوسرے تھانوں کے سر تھوپ دیتا ہے' کیا وہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ جرم تمہارے ہی علاقے میں ہوا ہے۔ یہاں بچوں کے سر کاٹ کر دھڑ کو ایسے درخت کے پاس پھینک دیا گیا' جہاں وہ اٹک کر رہ جائیں اور یہ تاثر ہے کہ لاشیں دور دراز علاقوں سے بہتی آئی ہیں۔ جب ایسے الزامات عائد ہوں گے تو تم کیا کر سکو گے؟"

"سر! میں یہ ثابت کروں گا کہ یہ دوسرے علاقوں سے آئی ہیں۔"

"تو پھر جلدی ثابت کرو۔ مجھے ٹھوس ثبوت چاہیے' میں اور کچھ نہیں جانتا۔"

وہ وہاں سے پلٹ گیا۔ غصے سے چلتا ہوا پولیس اسٹیشن سے باہر آیا پھر اپنی گاڑی میں بیٹھ کر اپنے محافظ سپاہیوں کے ساتھ وہاں سے چلا گیا۔ ٹھاکر گلاب اسے جاتے ہوئے دیکھتا

رہا' غصے سے تلملاتا رہا۔ جب وہ گاڑی نظروں سے اوجھل ہو گئی تو اس نے پلٹ کر اپنے ماتحت سے گرجتے ہوئے کہا۔ "جاؤ ابھی جاؤ اور اس چنڈال چوکڑی سے کہو آدھے گھنٹے کے اندر جمع ہو جائیں۔ جو نہ آنا چاہے' اسے گھسیٹ کر لے آؤ۔"

وہ اپنی جیپ میں بیٹھ کر کھنڈر کی طرف جانے لگا۔ ایک سپاہی دوڑتا ہوا آیا اس کے بازوؤں میں ایک بلا تھا جو غرا رہا تھا' اس نے اٹینشن ہو کر کہا۔ "سر! آپ کے حکم کے مطابق اسے اپنے گاؤں سے لایا ہوں۔ یہ بڑا ہی خونخوار بلا ہے' اپنے بچوں کو کھا جاتا ہے۔"

ٹھاکر نے معنی خیز نظروں سے بلے کو دیکھا' پھر سپاہی کو حکم دیا۔ "پیچھے بیٹھ جاؤ۔"

وہ بیٹھ گیا پھر جیپ اسٹارٹ ہوئی اور کھنڈر کی طرف روانہ ہو گئی۔ رات ہو چکی تھی' کھنڈر میں گہری تاریکی تھی۔ کامنا کماری نے پیغام کے مطابق لالٹین نہیں جلائی تھی۔ ٹھاکر کی جیپ وہاں پہنچی تو ہیڈ لائٹس سے کھنڈر کا نچلا حصہ روشن ہو گیا تھا۔ اس کی روشنی میں وہ پرانی شکستہ سیڑھیوں پر چڑھتا ہوا اوپری حصے میں آیا۔ کامنا کی طرح وہ بھی اس کھنڈر کے چپے چپے سے واقف تھا۔ تاریکی میں بھی ٹھوکر کھائے بغیر اپنی منزل تک پہنچ سکتا تھا۔ اس نے کہا۔ "لالٹین نہ جلانا۔ کبھی اندھیرا بھی تو اچھا لگتا ہے' ذرا بتاؤ تو سہی میرے پاس کیا ہے؟"

تاریکی میں کامنا اور ٹھاکر ایک دوسرے کے سامنے کچھ فاصلے پر کھڑے ہوئے تھے۔ کامنا کی بانہوں میں کلپنا تھی۔ اس کی سبز آنکھیں اندھیرے میں چمک رہی تھیں' ایسی ہی دو آنکھیں ٹھاکر کے پاس سے چمکتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ اس نے پوچھا۔ "یہ کیا ہے؟"

"وہی جو تمہارے پاس ہے۔"

بلے نے اپنے مقابل دو چمکتی ہوئی آنکھوں کو دیکھ لیا تھا' اب وہ غرا رہا تھا۔ جواب میں کلپنا بھی غرانے لگی تھی۔ بلی خواہ کتنا ہی غرائے' میاؤں میاؤں کرتی رہ جاتی ہے۔ بلا جب غراتا ہے' تو غاؤں غاؤں کرتا ہے' بڑا بھیانک لگتا ہے۔ کھنڈر کے ویرانے اور سناٹے میں اس کی آواز اور بھیانک لگ رہی تھی۔ تاریکی میں چمکنے والی آنکھیں مچل رہی تھیں۔ وہ ٹھاکر کی بانہوں میں مچل رہا تھا۔ وہاں سے نکل کر کلپنا پر حملہ کرنا چاہتا تھا' ٹھاکر نے کہا۔ "میں تمہاری کلپنا کے لیے ایک جیون ساتھی لایا ہوں۔"

کامنا نے اپنی کلپنا کو فرش پر چھوڑ دیا۔ چند سیکنڈ بعد ہی ان کے لڑنے کی آواز سنائی

دی۔ ایک میاؤں میاؤں کرتی ہوئی بھاگ رہی تھی' دوسرا غاؤں غاؤں کرتا ہوا اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ ٹھاکر گلاب سنگھ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اب تمہاری کلپنا ہمیں پریشان نہیں کرے گی۔ کم از کم اسے بھی تو معلوم ہونا چاہیے کہ محبت کیا ہے اور زندگی کسی کی چاہت میں کس طرح گزرتی ہے۔ دیکھ لینا یہ آج کے بعد تمہیں بھولتی جائے گی اور اپنے جیون ساتھی کو یاد رکھنا سیکھ لے گی۔"

"میری کلپنا مجھے کبھی نہیں چھوڑے گی۔ عورت کی فطرت میں وفا ہوتی ہے۔"

"یہی تو میں کہتا ہوں' تمہاری فطرت میں وفا ہے۔ تم مجھے کبھی نہیں چھوڑو گی۔ تمہارے دعوے کے مطابق کلپنا وفادار ہے۔ وہ بھی اپنے ساتھی کو نہیں چھوڑے گی۔"

وہ غصے سے بولی۔ "میں تمہارے بلے کو گولی مار دوں گی۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "پھر تم میں اور کلپنا میں فرق کیا رہے گا' وہ مجھے پنجے مارتی تھی۔ بھئی' جانور کو جانور اور انسان کو انسان رہنے دو۔ جہاں سے انسان اور جانور کی فطرت ایک ہوتی ہے' وہیں سے جرائم شروع ہوتے ہیں۔"

☆======☆======☆

کھنڈر کے نچلے حصے میں خشکی باغ کے چور' بدمعاش' قاتل اور درندے قسم کے لوگ جمع ہوتے جا رہے تھے اور داروغہ صاحب کا انتظار کر رہے تھے۔ صاحب نے آدھے گھنٹے کے اندر حاضر ہونے کے لیے کہا تھا۔ وہ مختلف علاقوں سے دوڑتے ہوئے آئے تھے۔ اب صاحب' کتنے گھنٹوں بعد حاضر ہونے والے تھے' یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ صاحب پھر صاحب تھے' ان کے لیے وہ رات بھر کچی زمین پر اکڑوں بیٹھے رہ سکتے تھے۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد کھنڈر کا اوپری حصہ ذرا روشن ہوا۔ لالٹین جلائی گئی تھی پھر چند سیکنڈ کے بعد داروغہ صاحب ہاتھ میں لالٹین لیے سیڑھی سے اترتے ہوئے ان کی طرف آنے لگے۔ وہ سب اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ انہوں نے اپنے اپنے ہاتھ باندھ لیے سر کو جھکا لیا۔ ایک سپاہی نے آگے بڑھ کر اپنے صاحب کے ہاتھ سے لالٹین لے لی۔ اب صاحب کے ہاتھ میں ایک پتلی سی بید تھی۔ اس بید کو ہمیشہ تیل پلایا جاتا تھا۔ ڈھیٹ بدمعاش خواہ پتھر کی طرح سخت کیوں نہ ہوں' جب وہ بید ان کے جسم پر پڑتی تھی تو لہو کی ایک لکیر چھوڑ جاتی تھی۔

پہلے ان بدمعاشوں نے ہاتھ باندھ رکھے تھے' اس بید کو دیکھتے ہی انہوں نے اپنے

اپنے ہاتھ جوڑ لیے' ایک نے کہا۔ "مائی باپ' ہمرا کوئی کسور ناہی ہے۔"

دوسرے نے کہا۔ "ہم کا دوئی دن کا مہلت دئی دو۔ ہم اس چھلپٹیے کو ڈھونڈ لائیں گے حجور۔"

بہار میں چھلپٹیا اس درندہ صفت شخص کو کہتے ہیں جو دارو کے نشے میں بچوں کی گردنیں کاٹ کر لائسنس یافتہ بیوپاریوں تک پہنچاتا ہے۔ داروغہ ٹھاکر گلاب سنگھ نے اپنی بید اٹھائی۔ اس کا رخ ایک دبلے پتلے ادھیڑ عمر کے آدمی کی طرف تھا۔ وہ چھلپٹیا تھا۔ اس نے تھر تھر کانپتے ہوئے کہا۔ "مائی باپ کی بید اور ہماری چمڑی۔ مگر ہمارا کسور کا ہے؟"

اس چھلپٹیے کا نام کیشو چنڈال تھا۔ کشمیری زبان میں چنڈال نگہبان کو کہتے ہیں' ہندی میں کسی ادنیٰ ترین کمینے شخص کو کہا جاتا ہے۔ یہ چنڈال کئی طرح کے پیشے اختیار کرتے ہیں۔ تاریخ بدایونی میں ان کی سینکڑوں سالہ تاریخ موجود ہے یہ سؤر پالتے ہیں اور ڈوم چماروں اور دھیڑوں کی بستی میں اس کا گوشت فروخت کرتے ہیں۔ جب یہ ہندوستان کے امرا و سلاطین کے دروازوں پر ملازمتیں کرنے لگے تو خدمتی کہلانے لگے۔ ایک روایت کے مطابق بادشاہ جلال الدین اکبر نے انہیں دربار میں داخل ہونے کی اجازت دی تھی۔ اس کے بعد جو بادشاہ ہوئے' انہوں نے کتوں کی خدمت ان کے سپرد کی۔ انگریزوں کے دور حکومت میں یہ ہندوؤں کے مُردے بھی جلانے لگے۔ کیشو چنڈال شمشان گھاٹ میں رہتا تھا۔ خشکی باغ اور اس کے آس پاس کی بستیوں سے جو مُردے آتے تھے' وہ انہیں جلاتا تھا۔ دن کے وقت کھنڈر کے اوپری حصے میں آ کر صفائی کرتا تھا۔ کلکتہ یا بمبئی کا کوئی ایجنٹ کھوپڑیوں کا آرڈر لے کر آتا تو خوشی سے اس کی باچھیں کھل جاتی تھیں کیونکہ ایسے ہی کاموں کی بدولت اسے دارو پینے کے لیے پیسہ ملتا تھا بلکہ دارو کی بوتلیں بھی اس کے پاس پہنچائی جاتی تھیں۔

ٹھاکر گلاب سنگھ نے اس کی آنکھوں کے سامنے بید نچاتے ہوئے کہا۔ "تو ایک ہفتے سے شکار کھیل رہا ہے' بول ہاں۔"

"ہاں جی حجور۔"

"تُو نے اس ایجنٹ کے پاس چار پہنچائے تھے' بول ہاں۔"

"حجور' مائی باپ سب جانتے ہیں۔"

"میں تو جانتا ہوں' اب ساری بستی دیکھ رہی ہے۔ ڈی ایس پی بھی دیکھ کر گیا ہے

اگرچہ وہ اب تک ہماری حقیقت کو سمجھ نہیں پایا ہے لیکن سمجھنے میں کتنی دیر لگے گی۔ الّو کے پٹھے' جو چار تُو نے ایجنٹ کو سپلائی کیے تھے' ان کے دھڑ یہاں پائے گئے ہیں' بول ہاں۔"

"ناہی سرکار۔ یہ کونو اور لاس ہے۔"

اس کے ساتھ ہی سڑاپ کی آواز کے ساتھ وہ بید اس کے جسم پر پڑی۔ وہ چیخ مار کر زمین پر ڈھیر ہو گیا پھر تڑپنے لگا۔ داروغہ نے کہا۔ "اسے تھوڑی سی پلاؤ' نہیں تو دوسری بید میں مرجائے گا۔"

ایک سپاہی نے کچی دارو کی بوتل اس کے منہ سے لگا دی۔ اس نے دو چار گھونٹ پئے پھر گہری گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔ "ماں کسم حجور ہم چھوٹا چھوٹا سکار کو دکھن کی طرف لے گئے ہیں۔ ہمار دریا کنارے جو لاسیں پائی گئی ہیں' وہ اتر سے بہتے ہوئے آئی ہیں۔"

ٹھاکر گلاب سنگھ نے وہاں سے پلٹ کر غصے سے سب کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں نے کتنی بار سمجھایا ہے' اس چنڈال کو پہلے دارو نہ دیا کرو۔ کام کے بعد دو گے تو صحیح کام کرے گا۔ نمک حرامو! میں نے تھانے کا چارج لیتے ہی اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔ خوب بدمعاشی کرو مگر دوسرے علاقے میں کرو اور یہاں آکر سادھو بن جاؤ۔ اگر تم لوگ میری نیک نامی پر دھبہ لگاؤ گے تو میں ایک ایک کی چمڑی ادھیڑ ڈالوں گا۔"

ایک بدمعاش نے کہا۔ "مائی باپ! میرا خیال ہے یہ کیشو چنڈال نشے میں دکھن کی طرف جانے کے بدلے اتر کی طرف چلا گیا تھا۔ وہیں اس نے کام کیا اور نتیجہ ہم سب کو بھگتنا پڑ رہا ہے۔ اس کی وجہ سے ہم باتیں سن رہے ہیں۔"

دوسرے بدمعاش نے کہا۔ "حجور! ہم کو دوئی دن کی مہلت دے دو۔ ہم سارا الجام کسی اور چھلپٹیے پر لگا دیں گے۔"

اس نے ایک ایک کے سامنے بید نچاتے ہوئے کہا۔ "میں یہی چاہتا ہوں۔ یاد رکھو' تم جو کچھ کرتے ہو' اس کا میں اکیلا بھاگیدار (حصہ دار) نہیں ہوں۔ میں کھاتا ہوں تو تم کو بھی کھانے کا موقع دیتا ہوں اور عزت سے کھانے کا موقع دیتا ہوں۔ آج دو سال سے تم پر کوئی الزام نہیں آیا۔ کسی نے تمہارے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں نہیں پہنائیں۔ تم نے حوالات اور جیل کی صورت نہیں دیکھی۔ جو کام بدنام ہو کر کرتے تھے' آج نیک نام ہو کر کرتے

ہو۔ سماج میں دھیرے دھیرے تمہاری ایسی عزت بنتی جارہی ہے کہ تمہاری بیٹیوں کے رشتے بھی آنے لگیں گے۔ تم ساری زندگی میرے قدموں پر ماتھا رگڑتے رہو تب بھی میرے احسان کا بدلہ نہیں چکا سکو گے' ارے کمبختو! نمک حرامو! کم از کم مجھے بدنام تو نہ کرو۔ میں جس تھانے میں ہوں' وہاں تو مجھے نیک نام رہنے دو۔"

کئی بدمعاش ہاتھ جوڑ کر رونے لگے اور دل کی گہرائیوں سے کہنے لگے۔ "حجور مائی باپ ہیں' ان داتا ہیں ہم کو نیک نامی سے روٹی کھانے کا موقع دے رہے ہیں۔ یہ ہماری بڑی بھول ہوئی کہ ہم نے کیشو چنڈال پر نظر نہیں رکھی۔ اب ہم قسم کھاتے ہیں کہ آپ پر کبھی آنچ نہیں آنے دیں گے۔ جتنی جلدی ہو سکے گا' ان چاروں لاشوں کو کسی اور کے سر تھوپ دیں گے۔"

ٹھاکر گلاب سنگھ کا غصہ جلدی ختم نہیں ہوتا تھا' جب تک وہ دو چار کی اچھی طرح پٹائی نہ کر دیتا' اس وقت تک اسے آرام نہیں آتا تھا لیکن اسی وقت نیل کنٹھ کی آواز سنائی دی۔ وہ سر اٹھا کر کھنڈر کے اوپری حصے کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کھنڈر کی ایک شکستہ چھت پر نیل کنٹھ کہیں سے آکر رہنے لگا تھا۔ یہ بڑا ہی خوبصورت پرندہ ہوتا ہے۔ اس کی گردن اور پر نیلے ہوتے ہیں۔ ہندو اسے سہرے کے روز دیکھنا یا اسے آزاد کرنا مبارک سمجھے ہیں۔ بعض کا اعتقاد ہے کہ جس گھر کی چھت پر نیل کنٹھ آکر بیٹھ جاتا ہے' وہ گھر والا وزیر بن جاتا ہے۔ ٹھاکر گلاب سنگھ وزیر بننا تو نہیں چاہتا تھا مگر پولیس کا بہت بڑا افسر بننے کے خواب دیکھتا تھا۔ جب سے نیل کنٹھ اس کھنڈر کی چھت پر آیا تھا اسے اپنے خواب پورے ہوتے نظر آرہے تھے۔ ڈی ایس پی نے اس کی ترقی کے لیے اعلیٰ حکام تک سفارش کی تھی۔ ادھر آس پاس بیٹھے ہوئے بدمعاش یقین دلا رہے تھے کہ کسی بھی سلسلے میں اس پر کوئی الزام نہیں آئے گا۔ اس کی ترقی میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہو گی۔

☆======☆======☆

کامنا کماری کھنڈر کے اوپری حصے میں ایک چار پائی پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی کلپنا جانے کہاں چلی گئی تھی۔ ابھی اسے کلپنا کا خیال نہیں آرہا تھا۔ نیچے اس کا داروغہ جس رعب اور دبدبے سے گفتگو کر رہا تھا' وہ دبدبہ اس کی دھڑکنوں میں بج رہا تھا۔ کیسا گبرو جوان تھا۔ جب سامنے آتا تو پہاڑ لگتا تھا۔ اس کے حواس پر چھا جاتا تھا۔ یہ درست ہے کہ عورت' زر اور جاگیر کی چاہت زیادہ کرتی ہے لیکن جب کسی گبرو جوان کو پسند کرلے تو

اس کے لیے زر و جواہرات، جاگیر سب کچھ چھوڑ کر کھنڈر میں چلی آتی ہے۔ وہ بچپن ہی سے تیز اور تند مزاج والی تھی۔ جوان ہو کر بھی اس کا اپنا وہی مزاج تھا۔ وہ اینٹ کا جواب پتھر سے دینا جانتی تھی۔ پانچ برس پہلے جس بنک مینجر سے بیاہی گئی، وہ اینٹ کے جواب میں پھول مارتا تھا۔ یہ غصہ دکھاتی تو وہ بڑی خاکساری سے اسے سمجھاتا مناتا تھا۔

ایک بار اس بنک مینجر پر غبن کا الزام لگایا گیا۔ اس سلسلے میں تفتیش کرنے کے لیے ٹھاکر گلاب سنگھ ان کے یہاں پہنچا۔ کامنا اسے دیکھتے ہی اس کی شخصیت میں گم ہو گئی۔ وہ خود کسی سے کم نہیں تھی۔ بنک مینجر اسے اونچی سوسائٹی میں لے کر جاتا تھا جہاں اس کے حسن کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ اس کے حسن کی دل کشی، اس کی بلی نما غراتی ہوئی سبز آنکھوں میں تھی۔ وہ آنکھیں جیسے چیلنج کرتی تھیں، کوئی محبت سے بھی پچکارنے آئے گا تو پنجہ ماریں گی۔ مرد حضرات کے لیے جو چیلنج بن جائے، وہ اسی کی طرف کھنچے جاتے ہیں۔

بنک مینجر نہایت ہی شریف اور ایماندار تھا، اس نے کبھی کوئی غلط کام نہیں کیا تھا۔ اس پر لگایا ہوا غبن کا الزام جھوٹا ثابت ہو گیا۔ اس دوران ٹھاکر گلاب سنگھ نے بنک مینجر سے دوستی کر لی اور کامنا کے قریب ہوتا چلا گیا۔ وہ کوئی نادان بچی نہیں تھی، اپنے مزاج کے مطابق اسے بھی پنجے مارتی تھی اور تنبیہہ کے انداز میں انگلی دکھاتے ہوئے کہتی تھی۔ "خبردار! مجھے ایسی ویسی نہ سمجھنا مجھے اپنانا چاہتے ہو تو میں بنک مینجر کو چھوڑ کر آؤں گی، مجھ سے شادی کر لو۔"

وہ بے بسی سے کہتا۔ "میں بہت مجبور ہوں۔ میری بیوی ہے، چار بچے ہیں۔ میں دوسری شادی کروں گا تو سماج میں وہ عزت نہیں رہے گی۔ میرا کیریئر تباہ ہو جائے گا۔"

"تم اپنا کیریئر بچانے کے لیے میرا کیریئر تباہ کرنا کیوں چاہتے ہو؟ اگر مجھ سے محبت ہے تو سیدھے راستے سے آؤ۔ میری محبت میں میری زندگی میں کوئی چور دروازہ نہیں ہے۔"

وہ کھرا جواب دیتی تھی لیکن دل ہی دل میں ڈرتی تھی، کہیں وہ چھوڑ کر نہ چلا جائے۔ ادھر وہ بھی کم دیوانہ نہیں تھا۔ مجبور ہو کر کہتا تھا۔ "میں تمہیں پاسکوں یا ناکام رہوں مگر تمہاری محبت سے باز نہیں آؤں گا کبھی تمہاری دیوانگی طاری ہوتی ہے تو سوچتا ہوں، اپنی بیوی کو قتل کر دوں، راستہ صاف ہو جائے گا۔ تم میری زندگی میں آجاؤ گی۔ مگر میرے بچے بڑے معصوم، بڑے پیارے ہیں، وہ اپنی ماں کو بہت چاہتے ہیں، میں ایسا نہیں

کر سکتا۔ انہیں ان کی ماں سے محروم نہیں کر سکتا۔"

"میں بھی تمہاری محبت میں اپنے پتی کو قتل کر سکتی ہوں، تمہاری خاطر بڑے سے بڑا جرم کر سکتی ہوں۔ بڑی سے بڑی قربانی دے سکتی ہوں لیکن بہرحال میں اس وقت کا انتظار کروں گی جب تم مجھے اپنی دھرم پتنی بناؤ۔"

وہ تقریباً ڈیڑھ برس تک بنک مینجر کے ساتھ زندگی گزارتی رہی اور ٹھاکر گلاب سنگھ سے محبت کرتی رہی اسے بنک مینجر پر غصہ آتا تھا۔ ایک تو وہ قد میں اس کے برابر تھا۔ صحت کے اعتبار سے وہ انیس تھا، یہ بیس تھی۔ اس میں متاثر کرنے والی کوئی بات نہیں تھی۔ اس پر وہ شریف اور ایماندار تھا۔ کوئی ہیرا پھیری نہیں کرتا تھا۔ اس کے جیسے بنک منیجروں نے بڑی بڑی کوٹھیاں بنائی تھیں، کاریں رکھتے تھے۔ کامنا کو اس کے ساتھ رہتے ہوئے نہ تو گھریلو خوشی اور سکھ ملتا تھا اور نہ سماجی مرتبہ حاصل ہوتا تھا۔ عورت آخر مرد کے ساتھ رہے تو کیا دیکھ کر رہے۔ شادی کا بندھن کوئی لوہے کی زنجیر تو نہیں ہوتی کہ توڑی نہ جا سکے۔ وہ تو ایک جھٹکے سے توڑ کر ٹھاکر کی طرف بڑھ سکتی تھی اور وہ تھا کہ اب تک پس و پیش میں تھا۔ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔

ایسے ہی وقت رائے بہادر امرناتھ سہائے نے اس پر ڈورے ڈالے اپنی دولت کی چمک دمک دکھائی، اس کی شادی کی پہلی سالگرہ میں ہیرے کا جگمگاتا ہوا ایک ہار گلے میں ڈالا اور گلے پڑ گیا۔ کامنا کو بنک مینجر سے چھٹکارا چاہیے تھا اور کسی کا سہارا بھی چاہیے تھا۔ ٹھاکر گلاب سنگھ دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ رائے بہادر امرناتھ سہائے اس کی جگہ نہیں لے سکتا تھا لیکن بنک مینجر کے مقابلے میں رائے بہادر امرناتھ بہتر تھا اور بہت دولت مند تھا۔ اس نے باقاعدہ شادی کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ اسے اپنی دھرم پتنی بنا کر رکھنا چاہتا تھا۔ یہ سلسلہ کچھ دنوں تک چلتا رہا۔ ایسے ہی وقت ایک بہت بڑے بیوپاری نے گھر آکر کامنا سے ملاقات کی، اس نے کہا۔ "وہ گھر پر نہیں ہیں میں کوئی کاروباری بات نہیں کر سکتی۔"

اس نے عاجزی سے کہا۔ "دیوی جی! مجھے تھوڑا سا وقت دیجیے اور اطمینان سے میری باتیں سن لیجیے پھر میں چلا جاؤں گا۔"

اس نے ڈرائنگ روم میں اسے بلایا، وہ بیٹھتے ہوئے بولا۔ "اس بریف کیس میں ایک لاکھ روپے لایا ہوں، آپ کے پتی انہیں قبول نہیں کریں گے۔ میں ان کے مزاج کو

اچھی طرح جانتا ہوں۔ معاملہ صرف پچاس لاکھ روپے کے قرض کا ہے' آپ کے پتی چاہیں تو مجھے بنک سے یہ قرض مل سکتا ہے۔ میں ان کو ایک لاکھ سے زیادہ دوں گا' اسے پیشگی رقم سمجھئے۔"

اس نے بریف کیس کو کھول کر کامنا کے سامنے رکھ دیا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس نے ایک ساتھ کبھی ایک لاکھ روپے نہیں دیکھے تھے۔ بریف کیس میں بڑے بڑے نوٹوں کی گڈیاں بھری ہوئی تھیں' وہ تھوڑی دیر تک گہری گہری سانسیں لیتی رہی اور سوچتی رہی۔ پھر اس نے پوچھا۔ "اگر میں کام کرا دوں تو کتنا دو گے؟"

"دیوی جی! ایک لاکھ اور دوں گا۔"

وہ اوپر ہی اوپر سانس لیتی رہ گئی۔ "بس بس' تمہارا کام ہو جائے گا۔ ابھی میرے پتی سے یہ نہ کہنا کہ ایک لاکھ روپے گھر میں پہنچا دیے گئے ہیں ورنہ وہ بدک جائیں گے' میں انہیں سمجھا منا کر تمہارے کام کے لیے راضی کروں گی۔"

وہ ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ "میں جانتا تھا' آپ ہی میرا کام بنا سکتی ہیں۔ پھر میں کب تک آؤں؟"

"دو دن کا وقت دو' میں سارا کام نمٹا لوں گی۔ یعنی آج سنیوار ہے' تم منگل کے دن آجانا۔"

وہ چلا گیا۔ کامنا نے دروازے کو بند کیا' اپنے بیڈروم میں آئی۔ اس کمرے کے دروازے کو بھی بند کیا پھر بریف کیس کو کھول کر نوٹوں کی ایک ایک گڈی کو اٹھا کر چھونے لگی' اسے سینے سے لگانے لگی۔ کبھی وہ ایک ایک گڈی کو ہتھیلی پر لے کر تولنے کے انداز میں اس کا وزن محسوس کرتی تھی پھر اسے آنکھوں سے لگاتی تھی اور خوش و خرم ہو کر چوم لیتی تھی۔

وہ بڑی دیر تک اس عمل میں گم رہی۔ جانے کیسے کیسے خواب بنتی رہی پھر اسے بند کر کے الماری کو کھول کر اندر رکھ دیا۔ اسی وقت کال بیل کی آواز سنائی دی۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی دروازے تک آئی۔ سوچا' اگر بنک مینجر آگیا ہو تو ابھی سے رجھانا شروع کردے گی۔

اس نے دروازہ کھولا' سامنے داروغہ ٹھاکر گلاب سنگھ کھڑا ہوا مسکرا رہا تھا' کہنے لگا

"تم خیریت سے تو ہو! تمہارا چہرہ تمتما رہا ہے۔ چہرے پر پہلے سے زیادہ سرخی ہے۔ معلوم ہوتا ہے دنیا کی ساری دولت مل گئی ہے۔"

وہ جواباً مسکرا کر بولی۔ "پولیس والے دروازے سے ہی چور پکڑنا شروع کر دیتے ہیں' اندر تو آؤ۔"

وہ اندر آکر بیٹھ گیا۔ کامنا نے ملازم کو چائے لانے کے لیے کہا پھر اسے غور سے دیکھنے لگی۔ اس نے پوچھا۔ "مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہی ہو۔"

"تم میری دیوانگی کو خوب سمجھتی ہو۔ اس کے باوجود سمجھنے کے لیے بہت کچھ رہ جاتا ہے۔ میں اپنے ایک ایک لمحے کا حساب تمہارے سامنے نہیں رکھ سکتا۔ کیا بتاؤں کہ میری کیا حالت ہو گئی ہے۔ راتوں کو سو نہیں سکتا۔ دن ہو یا رات' بیوی میرے سامنے ہوتی ہے تو میں اس کے سامنے بیٹھے بیٹھے تمہارے پاس پہنچ جاتا ہوں۔"

"تم مجھ سے شادی نہیں کر سکتے لیکن مجھے خوش دیکھنے کے لیے کیا کر سکتے ہو؟"

"تم ایک اشارہ کرو' میں اپنی جان دے سکتا ہوں اور دوسروں کی جان لے سکتا ہوں۔ تمہارا ہر برا بھلا کام کرنے کو تیار ہوں۔"

"جانتی ہوں اچھی طرح جانتی ہوں' تم میرے لیے سب کچھ کر سکتے ہو۔ اگر میں اپنی کوئی قیمتی چیز تمہارے پاس امانت رکھوں تو تم اس میں خیانت تو نہیں کرو گے؟"

"کبھی نہیں۔ جو چیز تمہاری ہے' وہ تمہاری رہے گی۔ اس میں میری بیوی یا بچوں کا حق نہیں ہو گا' آخر بات کیا ہے؟"

وہ اسے ایک لاکھ روپے کے متعلق بتانے لگی۔ تمام باتیں سننے کے بعد ٹھاکر نے پوچھا۔ "ابھی تم نے اپنے پتی سے اس معاملے میں کوئی بات نہیں کی پھر وہ ایک لاکھ روپے میرے پاس کیوں رکھوانا چاہتی ہو۔"

"میں اپنے پتی کو اس ایک لاکھ روپے کی ہوا نہیں لگنے دوں گی۔ جب وہ کام کرنے کے لیے راضی ہو جائے گا تو اس کے سامنے وہ ایک لاکھ روپے لاؤں گی۔ جو وہ بیوپاری بعد میں ادا کرنے والا ہے' یعنی اس سودے بازی میں میرے پتی کو صرف ایک لاکھ کا علم ہو گا۔"

"اچھا آئیڈیا ہے' میں تمہارا ساتھ دوں گا۔ تمہاری وہ رقم ہمیشہ میرے پاس امانت کے طور پر رہے گی۔ تم جب چاہو گی' مجھ سے واپس لے سکو گی۔"

اس نے وہ بریف کیس ٹھاکر کے حوالے کر دیا۔ رات کو اس نے بنک مینجر کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ بڑی محبت سے پیش آتی رہی' اسے سمجھاتی رہی کہ اس بیوپاری کا کام کر دینا چاہیے لیکن وہ ایک ہی بات کہتا رہا۔ "میں اصول کے خلاف کوئی کام نہیں کر سکتا۔ تم ان بیوپاریوں کو نہیں جانتی ہو۔ وہ دیوالیہ ہو گیا۔ جو جائیداد بنک والوں کے پاس گروی رکھ کر پچاس لاکھ روپے قرض لینا چاہتا ہے' وہ جائیداد اتنی رقم کی نہیں ہے۔ تم ان معاملات کو نہیں سمجھتی ہو۔"

کامنا صرف اپنی ضد اور حاصل ہونے والی دولت کو سمجھتی تھی۔ اس نے پہلے تو محبت سے خوب سمجھایا پھر اسے برا بھلا کہنے لگی۔ حتیٰ کہ اس پر ہاتھ بھی اٹھایا۔ اسے توقع تھی کہ جواباً بنک مینجر اسے مارنے دوڑے گا لیکن وہ حیران ہو کر پوچھتا رہا۔ "آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ کیا اچھے میاں بیوی کو لڑنا زیب دیتا ہے؟"

وہ غضبناک ہو کر بولی۔ "تم نے مجھے کیا دیا ہے؟ نہ گھریلو سکون' نہ کوئی خوشحالی اور نہ ہی سماج میں کوئی مقام دے سکے۔ میں ایک چھوٹی سی بات کہہ رہی ہوں' اسے بھی ماننے سے انکار کر رہے ہو۔ یاد رکھو' میں جتنی سیدھی دکھائی دیتی ہوں' اس سے زیادہ ٹیڑھی ہوں۔"

وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "کامنا! میں تمہیں بہت چاہتا ہوں لیکن اپنے اصول کی خاطر تمہیں بھی چھوڑ دوں گا۔ اگر تم محبت سے میری بن کر رہ سکتی ہو تو ٹھیک ہے ورنہ تمہاری مرضی۔"

یہ کہہ کر اس نے کروٹ بدلی اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ اسے غرا کر دیکھتی رہی پھر اپنی سنگھار میز کے پاس آگئی۔ اس کی دراز کو کھول کر دیکھا۔ کبھی کبھی وہ خواب آور گولیاں کھا کر سوتی تھی۔ اس کے پتی کو نیند آجاتی تھی۔ اسے ہی کروٹیں بدلنی پڑتی تھیں لیکن شیشی میں صرف دو گولیاں تھیں۔ اس نے کن انکھیوں سے اپنے پتی کی طرف دیکھا اور سوچا' کیا دو گولیاں اس پر اثر کر سکتی ہیں؟

"ہرگز نہیں۔ دو گولیوں سے گہری نیند آسکتی ہے۔ ہمیشہ کی نیند نہیں آسکتی۔"

وہ باورچی خانے میں آئی۔ معمول کے مطابق اس نے گرم دودھ چولہے پر سے اتارا' اسے گلاس میں ڈالا پھر اس میں دونوں گولیاں گھول دیں۔ اس کے بعد اپنے پتی کے پاس آئی۔ سرہانے والی میز پر دودھ کا گلاس پٹختے ہوئے غصے سے کہا۔ "میں دھرم پتنی

ہوں۔ میرا دھرم آپ کی سیوا کرنا ہے۔ آپ میری مانیں یا نہ مانیں' میں تو خدمت کرتی ہی رہوں گی۔ کیوں خواہ مخواہ سونے کی ایکٹنگ کر رہے ہو' اٹھو' دودھ پی لو۔"

"میں نہیں پیوں گا۔"

"میں بھی کچھ نہیں کھاؤں گی۔ رات بھر بھوکی رہوں گی۔"

وہ فوراً اٹھ کر بیٹھ گیا' تعجب سے بولا۔ "ارے تم نے ابھی تک کچھ نہیں کھایا ہے!"

"آج آپ باہر سے کھا کر آگئے تو سمجھ رہے ہیں' میں نے بھی آپ کے بغیر کھا لیا ہے۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "تم کئی بار میرے بغیر کھا چکی ہو۔ آج کیا بات ہے؟"

"آج مجھے کچھ زیادہ ہی محبت آگئی تھی اور یہی میری سب سے بڑی بھول ہے۔ آئندہ میں کبھی آپ سے محبت نہیں جتاؤں گی۔ چلیے دودھ پی لیجیے۔"

اس نے کسی نہ کسی طرح دودھ پلا ہی دیا۔ پھر ایک گھنٹے بعد آکر دیکھا تو وہ گہری نیند میں تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک کھڑی سوچتی رہی اور اسے دیکھتی رہی۔ اندازہ کرتی رہی کہ اس کے مقابلے میں کمزور تو نہیں پڑے گی۔ پھر اس نے ذرا اسے ہلایا۔ وہ بائیں کروٹ سو رہا تھا' چاروں شانے چت ہو گیا۔

اسے اپنے آپ پر بڑا اعتماد تھا۔ کوئی غیر معمولی کام کرنے جائے تو اس کا دل ضرور دھڑکتا ہے لیکن وہ پُرسکون تھی' ہر حال میں اپنی ضد پوری کرنا چاہتی تھی۔ پھر ایک لاکھ کا معاملہ ہو تو وہ کیسے باز آسکتی تھی۔ اس نے پلنگ کے دوسری طرف آکر اپنے سرہانے کا تکیہ اٹھایا۔ پھر سونے والے کے منہ پر اسے رکھ دیا۔ چند سیکنڈ تک گہری خاموشی رہی۔ ابھی سانس آرہی تھی' جارہی تھی۔ پھر یکبارگی اس نے تکیے کے ساتھ اسے دبوچ لیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ سونے والا پھڑپھڑایا' سانس لینے کے لیے مچلنے لگا۔ ایک بار یوں لگا۔ جیسے وہ تکیے کے نیچے سے نکل جائے گا لیکن کیسے نکل جاتا؟ وہ محض ایک آدمی نہیں تھا' محض ایک شوہر نہیں تھا۔ ایک لاکھ کی رقم سے بھرا ہوا بریف کیس تھا' وہ بریف کیس کو کیسے نکل جانے دیتی؟

تھوڑی دیر تک دونوں کے درمیان جدوجہد جاری رہی۔ وہ انیس تھا یہ بیس تھی۔ وہ احمق تھا' ہمیشہ پھول مارتا تھا اور بھول جاتا تھا کہ پھول بار بار پتھر کو لگتا رہے تو پتھر کا کچھ

نہیں جاتا۔ پھول لگتے لگتے زخمی ہوتا رہتا ہے۔ جو ہمیشہ زیر رہا وہ بھلا زبر کیسے ہو سکتا تھا۔ وہ تکیے کے زیر سایہ آخری سانس بھی اپنی مرضی سے نہ لے سکا۔

وہ اسے دبوچ کر بیٹھی رہی۔ دو منٹ گزر گئے' چار منٹ گزر گئے پھر پندرہ منٹ گزر گئے۔ اس کے بعد وہ ہانپتے ہوئے وہاں سے ہٹ گئی۔ تکیے کو ہٹا کر اسے دیکھا' بہت زیادہ دباؤ پڑنے کے باعث ناک ایک طرف دب گئی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ کی چھوٹی انگلی اس کے نتھنے میں ڈالی پھر دوسرے نتھنے میں ڈال کر ناک کو برابر کیا۔ چہرے پر ذرا کرب کے آثار تھے۔ دونوں ہتھیلیوں سے چہرے کی مالش کرنے لگی۔ جب تک لاش میں سختی نہیں آتی' اپنی مرضی کے مطابق اسے سیدھا کیا جاسکتا ہے۔ اس کے ہاتھ موڑ کر سینے پر باندھے جاسکتے ہیں' اس کے چہرے کی مالش کرکے بڑی حد تک کرب کے آثار مٹائے جاسکتے ہیں۔

وہ یہی کرتی رہی۔ جدوجہد کے باعث بستر کی چادر شکن آلود ہو گئی تھی۔ وہ چاروں شانے چت پڑا ہوا تھا۔ کامنا اسے دائیں کروٹ لے آئی۔ اِدھر کی چادر درست کی پھر اسے چاروں شانے چت کیا اور بائیں کروٹ لے آئی' اُدھر کی چادر درست کی آخر اسے چت سونے کی پوزیشن پر لے آئی۔

اس نے دور کھڑے ہو کر جائزہ لیا' وہ سوتا ہوا سا لگ رہا تھا۔ بستر بھی درست تھا پھر وہ سنگھار میز کے سامنے آگئی' آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا۔ پھر ماتھے سے بندیا اتار لی۔ اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ہاتھوں سے چوڑیاں اتارتے وقت وہ آنسو رخساروں پر ڈھلکنے لگے تھے۔ آئینے میں بلی جیسی غراتی ہوئی آنکھیں رو رہی تھیں۔ پھر وہ روتی ہوئی اپنے پتی کے پاس آئی اور اس کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھ کو تھام کر سسکتے ہوئے بولی۔

"تم جیسے بھی تھے میرے دیوتا سمان پتی تھے۔ تم جیسے بھی تھے میرے تھے۔ تم بزدل تھے مگر اپنے تھے۔ احمق تھے مگر اپنے تھے۔ آدمی گدھا پالتا ہے' کیا عورت نہیں پال سکتی؟ مگر تم میری خوش نصیبی کو دولتی مارنے لگے تھے۔ میں نے جواباً تمہیں مار ڈالا۔ اگر تم میری بات مان لیتے تو کل صبح ہمارے پاس دو لاکھ روپے ہوتے۔ میں رو رہی ہوں۔ دیکھو میں تمہارے لیے کتنا رو رہی ہوں۔"

وہ روتی رہی۔ سچ مچ کے آنسوؤں سے روتی رہی۔ یقین سے نہیں کہا جاسکتا تھا کہ

کون سا جذبہ رلا رہا تھا مگر کوئی سا بھی سہی' رلا رہا تھا پھر وہ روتے روتے سو گئی۔

دوسری صبح اس کی موت کی اطلاع متعلقہ لوگوں تک پہنچائی گئی۔ دوست' رشتے دار اور بہت سے کاروباری لوگ اس کے کریا کرم میں شریک ہونے کے لیے آنے لگے۔ ان میں وہ بیوپاری بھی تھا جو پچھلی شام ایک لاکھ روپے دے کر گیا تھا۔ وہ پریشان تھا۔ چہرہ زرد ہو گیا تھا۔ بیٹھے بٹھائے اس کے ایک لاکھ ڈوبنے والے تھے۔

اور وہ تو ڈوب ہی چکے تھے۔ کریا کرم کے بعد جب وہ رات کو کامنا کے پاس آیا اور آہستگی سے بولا۔ "دیوی جی! وہ تو چل بسے میرے روپے واپس کر دیں۔"

اس نے روتے ہوئے حیرانی سے پوچھا۔ "کیسے روپے؟"

"وہی جو میں نے کل دیے تھے۔"

"کل کون سے روپے دیے تھے؟ کیا تمہارا دماغ خراب ہے؟ اگر تم نے میرے پتی کو دیے تھے تو میں کیا جانوں؟"

ٹھاکر گلاب سنگھ نے دروازے پر سے پوچھا۔ "کیا میں اندر آسکتا ہوں؟"

کامنا اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ "اچھے وقت پر آئے ہیں۔ یہ شخص کہہ رہا ہے کہ اس نے مجھے ایک لاکھ روپے دیے تھے۔ میں حیران ہوں' آج میرے پتی سورگ باش ہوئے اور آج سے ہی دنیا والوں نے ستانا شروع کر دیا۔"

ٹھاکر گلاب سنگھ نے اس بیوپاری کے شانے پر اپنی بید سے ہولے ہولے دستک دیتے ہوئے پوچھا۔ "کیوں مسٹر! کیا بات ہے؟ کیسے ایک لاکھ روپے؟ ذرا میں بھی تو سنوں!"

وہ داروغہ کو دیکھ کر پہلے ہی بوکھلا گیا تھا۔ یہ کہہ نہیں سکتا تھا کہ رشوت کے طور پر ایک لاکھ روپے دیے تھے۔ جس کی رسید بھی نہیں ہے۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "کچھ نہیں۔ مجھ سے بھول ہو گئی۔ میرا لین دین ان کے پتی سے تھا' مجھے دیوی جی سے کچھ نہیں کہنا چاہیے تھا۔ میں معافی چاہتا ہوں پھر کبھی نہیں آؤں گا۔"

وہ وہاں سے پلٹ کر تیزی سے جانے لگا۔ ٹھاکر نے کہا۔ "اب اس گھر کا رخ نہ کرنا۔ رشوت نہ پکے کاغذ پر لی جاتی ہے نہ اس کی رسید دی جاتی ہے۔"

وہ چلا گیا۔ کامنا نے کہا۔ "تم اچھے وقت پر آگئے ورنہ یہ مجھے پریشان کرتا۔"

"اب کبھی پریشان نہیں کرے گا۔ تم یہ سفید ساری پہن کر بیوہ کے روپ میں اور

زیادہ حسین لگ رہی ہو۔ کاش مجھے تمہارے آنسو پونچھنے کا حق حاصل ہوتا۔ میں سوچ رہا تھا' یہ حق نہ سہی' تمہیں دور ہی دور سے تسلیاں دینے کے لیے تمہارے سامنے موجود رہوں گا لیکن پٹنہ سے تار آگیا ہے میری پتنی سخت بیمار ہے چھوٹے بچے کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے' مجھے آج ہی جانا ہے۔"

کامنا کے دل کو ٹھیس لگی۔ آج اس کا سہاگ اجڑ گیا تھا آج اسے ایک سہارے کی' ایک ہمدرد کی ضرورت تھی۔ سہارا نہ سہی ہمدرد ہی سہی مگر وہ بھی جا رہا تھا۔ وہ دل برداشتہ ہو کر بولی۔ "میں تمہیں نہیں روک سکتی۔ کیونکہ بیوی کا حق زیادہ ہوتا ہے اور میں تمہاری کون ہوتی ہوں' تم جا سکتے ہو۔"

وہ پیار بھری باتوں سے اپنی محبت کا یقین دلاتے ہوئے اسے منانے لگا۔ وہ بولی۔

"چاہے تم کتنی ہی قسمیں کھالو' اپنی دیوانگی ثابت کرنے کے لیے میری چوکھٹ پر سر پھوڑنا شروع کر دو لیکن محبت صرف اس طرح ثابت ہو سکتی ہے کہ پتنی کی طرف نہ جاؤ۔ میں آج تنہا ہوں' میرے پاس رہو۔ ہم ایک گھر میں نہیں رہ سکتے مگر ایک محلے' ایک شہر میں تو رہ سکتے ہیں۔"

"کامنا پلیز! مجھے آزمائش میں نہ ڈالو۔ میں اپنی بیمار پتنی کے پاس نہیں جاؤں گا تو بچے اپنے باپ کو ظالم سمجھیں گے۔ دنیا والے مجھے طعنے دیں گے۔"

وہ روتی آنکھوں سے ہنستے ہوئے بولی۔ "میں تمہیں آزمائش میں نہیں ڈالوں گی بلکہ تمہیں یہ سمجھانا چاہتی ہوں کہ بیوی اور بچوں کی اہمیت سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ اپنی پتنی کے لیے ایک مرد کو ساری دنیا چھوڑ دینی چاہیے جیسا کہ تم چھوڑ کر جا رہے ہو۔ کچھ سمجھ میں آیا؟"

وہ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ بولی۔ "میں اسی لیے شادی کی ضد کرتی ہوں۔ اگر تم مجھے پتنی بناؤ گے تو میرے لیے بھی ساری دنیا کو چھوڑ سکو گے اور جب ایسا کرنے کا حوصلہ پیدا ہو' تو میرے پاس ضرور آنا۔ میں کم از کم دو چار ماہ تک تمہارا انتظار کروں گی۔"

"تمہارے ایک لاکھ روپے میرے پاس امانت رہیں گے۔ جب چاہو' مجھ سے لے لینا۔"

"مجھے یقین ہے' اسی لیے میں نے تمہارے پاس رکھوائے ہیں۔"

"ایک بات پوچھوں؟"

"کیا انسپکٹر کی حیثیت سے پوچھو گے؟"

"میں انسپکٹر کی حیثیت سے بھی تمہارا ہوں' مجھے سچ سچ بتا دو' وہ کیسے مر گیا؟ کل تو بالکل ٹھیک ٹھاک تھا۔"

"مجھ سے یہ سوال کرنے سے پہلے تم نے اس کا پوسٹ مارٹم کیوں نہیں کروایا؟"

"کسی کو شبہ نہیں تھا۔ میں نے بھی لاش دیکھی ہے۔ مجھے کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آئی۔ چہرے پر ہلکا سا کرب دکھائی دیا۔ شاید حرکت قلب بند ہونے کے وقت وہ کرب میں مبتلا ہو گیا ہو لیکن کوئی بات کھٹک رہی ہے۔"

"جو بھی کانٹا ہے' اسے اپنے دماغ سے نکال ڈالو۔"

"ایک سوال کا جواب دو۔ کیا وہ تمہاری بات مان کر اصول کے خلاف اسے پچاس لاکھ کا قرضہ دلانے کو تیار تھا؟"

"نہیں' وہ میری بات نہیں مان رہا تھا' مجھے غصہ آگیا۔ میں نے بددعا دی' وہ مر گیا۔ اب جاؤ یہاں سے۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ "تمہاری آنکھیں بڑی غضبناک ہیں' جو میں نہ سمجھ سکا' وہ تمہاری آنکھوں نے سمجھا دیا ہے۔ آخر تم نے پنجہ مار ہی دیا۔"

☆======☆======☆

وہ چلا گیا۔ پھر دو ماہ تک واپس نہ آسکا لیکن اپنے خاص سپاہی کے ذریعے پیغام بھیجتا رہتا تھا۔ اپنی مجبوریاں بتاتا رہتا تھا۔ کبھی اس کی بیوی سخت بیمار رہتی تھی' کبھی بچے نہیں چھوڑتے تھے۔ یعنی یہ تاثر ملتا تھا کہ مرد کے ساتھ زندگی گزارنا ہو تو باقاعدہ قانون اور مذہب کے مطابق گزارنی چاہیے اس طرح وہ پابندی میں رہتا ہے اور عورت کو اہمیت دیتا رہتا ہے۔

بیوی بچوں کے علاوہ اس کی ڈیوٹی بھی ایسی تھی کہ کبھی ایک جگہ رہ نہیں سکتا تھا۔ کسی نہ کسی واردات کے سلسلے میں دور دراز کے علاقوں تک سفر کرنا پڑتا تھا۔ اس کی اپنی جو بھی مجبوریاں رہی ہوں' اس دوران رائے بہادر امرناتھ سہائے نے کامنا کو گھیرنا شروع کر دیا تھا۔ اپنی دولت اس پر لٹانے لگا تھا۔ رائے بہادر بڑے رعب اور دبدبے والے آدمی تھے لیکن جو تیور اور حاکمانہ انداز ایک داروغہ کے تھے' وہ جاگیردار کے نہیں ہو سکتے

تھے۔ اس کے دل و دماغ پر ٹھاکر گلاب سنگھ چھایا ہوا تھا۔

کامنا نے اس کا بڑا انتظار کیا۔ دل کہتا تھا' وہ ضرور ایک دن حوصلہ کرے گا اور اسے اپنا بنا کر لے جائے گا لیکن آہستہ آہستہ امیدیں ختم ہو گئیں۔ ادھر رائے بہادر اسے عزت دے رہا تھا' اسے بے انتہا دولت کے ذریعے سوسائٹی میں اونچا مقام حاصل ہونے والا تھا' اس نے رائے بہادر سے شادی کرلی۔

وہ ہنی مون منانے سوئٹزرلینڈ گئے۔ وہاں جانے سے پہلے ایک دن پیرس میں گزارا۔ وہیں کامنا کو کلپنا مل گئی۔ اس نے ایک فرانسیسی بوڑھے سے اسے خرید لیا۔ اس وقت وہ چھوٹی سی تھی ایک ننھی سی بچی کی طرح اس کی آغوش میں رہنے لگی۔ اس کے زیر سایہ پرورش پاتے ہوئے اس سے اتنی گھل مل گئی کہ اس کے ایک ایک اشارے کو' ایک ایک بات کو سمجھنے لگی۔ گھر ہو یا باہر یا بڑی سوسائٹی کی تقریبات ہوں' کلپنا اس کے ساتھ رہتی تھی۔ لوگ دونوں کو دیکھ کر کہتے تھے کہ ایک جیسی آنکھیں ہیں' ایک جیسا مزاج ہے۔ دونوں بہنیں لگتی ہیں۔

رائے بہادر امرناتھ سہائے اپنی خوبصورت دلہن کو لے کر یورپ کے تمام ملکوں میں گھومتا رہا۔ چھ ماہ بعد وہ ہندوستان آیا۔ وہاں بھی اس نے دہلی' بمبئی' کلکتہ میں تین ماہ گزارے۔ پھر کامنا سے کہا۔ "اب ہم اپنی جاگیر میں چلیں گے۔ تمہیں دیکھنا چاہیے کہ تم کتنی بڑی جاگیر کی مالکہ ہو۔"

شہر پٹنہ سے کچھ دور جوگبانی کے علاقے میں اس کی جاگیریں تھیں۔ دور تک کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ رائے بہادر نے اسے بتایا کہ جاگیر اتنے بڑے رقبے پر پھیلی ہوئی ہے کہ وہاں دوسرا پٹنہ شہر آباد ہو سکتا ہے' وہ اس کے ساتھ ایک خوبصورت سی کار میں بیٹھ کر ایک بڑی حویلی میں پہنچی۔ وہاں پہنچتے ہی کچھ ایسے انکشافات ہوئے کہ یکلخت رائے بہادر سے دل پھر گیا۔

پہلا انکشاف تو یہ ہوا کہ اس کی بیوی اور دو بچے پہلے سے موجود ہیں۔ اس کے علاوہ چھ داسیاں ہیں جو حویلی کے مختلف کمروں میں رہتی ہیں۔

اس نے غصے سے پوچھا۔ "آپ نے مجھے دھوکا کیوں دیا؟"

"کیسا دھوکا؟"

"پہلے کیوں نہیں بتایا کہ آپ شادی شدہ ہیں؟"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میری پہلی بیوی تمہارے لیے مصیبت نہیں بنے گی۔ تم اپنی الگ زندگی گزارو گی۔ اس حویلی میں رہنا پسند نہیں کرو گی تو میں تمہارے لیے دوسری بنوادوں گا۔"

"میں اس ویرانے میں کبھی نہیں رہوں گی' میں شہری زندگی گزارنے کی عادی ہوں۔"

"شہری زندگی کو بھول جاؤ۔ میں جسے پسند کر لیتا ہوں' اس کے ساتھ سال چھ مہینے دیس کے باہر ملک ملک کی سیر کرتے ہوئے گزارتا ہوں' اس کے بعد حویلی میں لاکر اسے چھوڑ دیتا ہوں۔"

"میں یہاں ایک منٹ نہیں رہوں گی' ابھی چلی جاؤں گی۔"

"میرے چوکیدار اور گماشتے بہرے ہیں۔ وہ کسی کی نہیں سنتے صرف میری آواز سنتے ہیں اور میرے حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔ تم اس حویلی سے باہر قدم نہیں نکال سکو گی۔"

کامنا نے غرا کر اسے دیکھا۔ پہلی بار کلپنا بھی اس کے ساتھ غراتے ہوئے رائے بہادر کو دیکھنے لگی۔ وہ گھور کر بولے۔ "اگر تمہاری یہ بلی آئندہ کبھی مجھ پر غرائی تو میں اسے گولی مار دوں گا۔"

کامنا نے بڑے تحمل سے کام لیا۔ اس نے کلپنا پر ہاتھ پھیرتے ہوئے' اسے پچکارتے ہوئے کہا۔ "سنا تم نے؟ یہ تمہیں گولی مار دیں گے اور مجھے اس حویلی سے نکلنے نہیں دیں گے۔"

کلپنا نے اپنا ایک پنجہ اٹھا کر کہا۔ "میاؤں۔"

اس نے جواباً کہا۔ "نہیں' ابھی نہیں۔ ابھی کچھ روز یہاں گزار لو۔ اپنے صاحب بہادر کو تھوڑا اور سمجھ لینے دو۔"

رائے بہادر کو سمجھنا اتنا آسان نہیں تھا۔ آسان ہوتا تو وہ اتنی آسانی سے ان کے دام میں نہ آجاتی۔ وہ بڑے صبر سے وقت کا انتظار کرنے لگی۔ اس حویلی کے ایک ایک کمرے کو' ایک ایک فرد کو جانچنے پرکھنے لگی۔ اتنا تو اچھی طرح سمجھ گئی تھی کہ حویلی کے تمام ملازم اس کے حکم کی تعمیل ضرور کرتے ہیں لیکن حویلی کے احاطے سے باہر جانے کی اجازت نہیں دیتے۔

رائے بہادر امرناتھ سہائے نے اس حویلی میں دو ہفتے گزارے' یہ دو ہفتے صرف

اس کے لیے نہیں تھے' دوسروں کے لیے بھی تھے۔ یہ بات اسے اور چبھنے لگی۔ یوں بھی اسے رائے بہادر سے کوئی لگاؤ نہیں رہا تھا۔ وہ ان کی محبت کو انصافاً بھی طلب کرنا نہیں چاہتی تھی۔

جب رائے بہادر اپنی عادت کے مطابق شہر چلے گئے تو وہ ملازموں سے اور خاص خاص گماشتوں سے ربط ضبط بڑھانے لگی۔ انہیں بڑی بڑی رشوتیں دے کر اپنا راز دار بنانے کی کوشش کرنے لگی۔

ایک روز ایک گماشتے نے کہا۔ "مالکن! شہر سے کوئی داروغہ صاحب ملنے آئے تھے۔"

اس نے چونک کر پوچھا۔ "کون ٹھاکر گلاب سنگھ؟"

"ہاں' یہی نام بتایا تھا۔"

"وہ کہاں ہیں؟"

"واپس چلے گئے۔ ہم نے آپ سے ملنے کی اجازت نہیں دی۔"

وہ بھڑک کر بولی۔ "کیوں اجازت نہیں دی؟ تم کون ہوتے ہو انہیں روکنے والے؟"

"ہم مجبور ہیں' اپنے مالک کے نمک خوار ہیں۔ ان کی اجازت کے بغیر ایک کتا بھی حویلی میں نہیں داخل ہو سکتا۔"

وہ سمجھ گئی' وہاں کے ملازموں کو اپنے ہاتھ میں کرنے کے لیے نہ رشوتیں کام آئیں گی۔ نہ محبت سے انہیں رام کر سکے گی۔ کوئی اور صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ ٹھاکر گلاب سنگھ تک اپنا دکھڑا پہنچانا چاہتی تھی۔ رائے بہادر نے حویلی کے اندر چن چن کر وفادار ملازم رکھے تھے۔ وہ اندر کی بات باہر نہیں پہنچاتے تھے۔

جب چھ ماہ گزر گئے تو کامنا ایک دم سے بوکھلا گئی۔ غصے سے تلملانے لگی۔ اس نے غراتے ہوئے کلپنا کو دیکھا۔ کلپنا نے بھی غراتے ہوئے اسے دیکھا۔ دونوں کے دیکھنے کا انداز ایسا تھا جیسے وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی فیصلہ کر رہی ہوں۔

اور اس نے فیصلہ کر لیا۔ اس بار رائے بہادر آئے گا تو تخت یا تختہ ہو گا۔ اگر اس نے حویلی سے باہر جانے کی اجازت نہیں دی تو وہ جان پر کھیل جائے گی اور اسے بھی زندہ نہیں چھوڑے گی۔

تقریباً آٹھ ماہ کے بعد اطلاع ملی' رائے بہادر امرناتھ سہائے تشریف لانے والے

ہیں۔ اس بار انہوں نے ایک دلی والی کو دلہن بنایا ہے' اسے لے کر سوئٹزرلینڈ گئے ہیں' دو مہینے اور گزر گئے۔ اطلاع ملی' اب وہ پیرس' لندن وغیرہ کی سیر کرتے ہوئے ہندوستان آ گئے ہیں اور کسی دن بھی حویلی پہنچنے والے ہیں۔

پتا نہیں وہ کس دن پہنچنے والے تھے۔ وہ دن نہیں آ رہا تھا۔

وہ ایک ایک دن گن رہی تھی صبح سے شام کرنا مشکل ہو جاتا تھا شام کے بعد رات کروٹیں بدلتے ہوئے گزرتی تھی۔ راتوں کو حویلی کے اندر ٹہلتی رہتی تھی' اسی طرح صبح کر دیتی تھی' رہ رہ کر قسمیں کھاتی تھی کہ اسے زندہ نہیں چھوڑے گی' چاہے جیل چلی جائے۔ وہ جیل کیسی بھی ہو' حویلی سے بہتر ہو گی۔

آخر وہ دن آ ہی گیا۔ رائے بہادر امرناتھ سہائے اپنی نئی دلہن کے ساتھ حویلی میں پہنچ گئے۔ دستور کے مطابق پرانی بیویوں نے ان کا اور نئی سوکن کا استقبال کیا۔ اس استقبالیے میں کامنا شریک نہیں ہوئی' دور کھڑی تماشا دیکھتی رہی۔ رائے بہادر نے بھی دور سے اس پر نظر ڈالی' ناگواری سے دیکھا پھر آگے بڑھ کر کہا۔ "دوست ہو یا دشمن' سہیلی ہو یا سوکن' جو بھی دروازے پر آئے' اس کا خوشدلی سے استقبال کرنا چاہیے۔"

"کیا آپ نے مجھے خوش دل رہنے کا موقع دیا ہے؟ آپ عورت کو کیا سمجھتے ہیں؟ پنجرے کی چڑیا کہ باہر سے پکڑ پکڑ کر لائیں اور یہاں بند کر دیں؟"

"میں تمہاری بکواس سننے نہیں آیا ہوں۔ زیادہ بولو گی تو زبان کاٹ کر پھینک دوں گا۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی کلپنا غرائی۔ کامنا نے اسے تھپک کر کہا۔ "نہیں' صبر کرو۔"

رائے بہادر اپنی نئی دلہن کو لے کر اس کے سامنے سے گزر گئے۔ وہ نئی سوکن کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے مقابلے میں وہ زیادہ حسین تو نہیں تھی لیکن اداؤں بھری تھی' بہت ناز نخرے والی تھی۔ اپنی چال سے اور دیکھنے کے انداز سے مغرور دکھائی دیتی تھی۔

دستور کے مطابق حویلی کے اندر اور باہر خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔ لذیذ کھانے پکوائے گئے تھے' ناچ گانوں کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔ باہر غریب کسانوں میں کپڑا اور اناج تقسیم کیا جا رہا تھا۔ وہ دن کسی طرح گزر گیا۔ شام ہوئی تو کلپنا رات کا انتظار کرنے لگی۔ رات ہوئی تو پھر آدھی رات کا انتظار رہا۔ بیشک وقت پہاڑ کی طرح کاٹے نہیں کٹتا' اس

کے باوجود ایک ایک لمحے کے حساب سے دھیرے دھیرے کٹ ہی جاتا ہے۔ وہ آدھی رات بھی گزر گئی۔ وہ اپنی کلپنا کو آغوش میں لیے اپنی خوابگاہ سے باہر آئی۔ اس نے ایک لانبا سا چاقو چھپا رکھا تھا۔ پچھلے دس مہینوں میں اس نے راتیں جاگ جاگ کر اور حویلی کے اندر گھومتے گھوتے اچھی طرح معلوم کر لیا تھا کہ کون رات کو جاگتا ہے اور کون گہری نیند سوتا ہے۔ رائے بہادر نے حویلی کے باہر اتنا سخت پہرہ لگا رکھا تھا کہ اندر سے اطمینان تھا۔ رات کو دو چوکیدار باری باری اپنے وقت کے مطابق آتے تھے۔ حویلی کے اندر ایک چکر لگاتے تھے پھر باہر چلے جاتے تھے۔ ان کے آنے اور جانے کا جو وقت مقرر تھا' اسے کامنا نے اچھی طرح نوٹ کر لیا تھا۔

رات کا ایک بجا تھا' وہ اپنی خواب گاہ سے نکلتے ہی ٹھٹک گئی۔ ذرا فاصلے پر رائے بہادر کا بیڈ روم تھا۔ اس کا دروازہ کھل رہا تھا اور وہاں سے ان کی نئی دلہن نکل رہی تھی۔ اس کی زلفیں بکھری ہوئی تھیں' اس نے شلوار اور کرتا پہن رکھا تھا۔ اس کی دونوں مٹھیاں یوں بھنچی ہوئی تھیں جیسے کوئی چیز پکڑے ہوئے ہو۔ وہ سیدھی چلتے ہوئے سامنے والی دیوار کے پاس آکر رک گئی تھی۔ پھر وہ وہاں سے گھوم کر سیدھی ادھر آنے لگی جدھر کامنا کھڑی ہوئی تھی۔ وہ جیسے جیسے قریب آنے لگی کامنا ایک طرف ہٹ کر اسے غور سے دیکھنے لگی۔ نئی دلہن کی آنکھیں ادھ کھلی تھیں۔ یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ نیند کی حالت میں چل رہی ہے۔

وہ اسی طرح چلتی ہوئی حویلی کے بیرونی دروازے تک پہنچ گئی۔ وہ حویلی کے ایک ستون کے پیچھے کھڑی دیکھ رہی تھی۔ حویلی کا بیرونی دروازہ پہلے ہی سے کھلا ہوا تھا۔ ایک چوکیدار آواز لگا رہا تھا۔ "ہریا ارے او ہریا کہاں مر گیا۔ مالک نے بتایا ہے۔ نئی مالکن کو نیند میں چلنے کی عادت ہے۔ باہر پھاٹک پر تالا لگا دے۔"

کامنا ستون کے پیچھے سے نکل کر سیدھی اپنے کمرے میں آئی۔ دروازے کو اندر سے بند کیا۔ پھر اس کھڑکی کو کھول کر دیکھا جہاں سے حویلی کا سامنے والا حصہ نظر آتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ نئی دلہن نظر آئی۔ وہ اسی طرح چلتی ہوئی آہنی پھاٹک کی طرف جا رہی تھی۔ پھر اس پھاٹک سے ٹکرا کر رک گئی۔ وہاں سے گھوم کر دوسری طرف جانے لگی۔ چاروں طرف احاطے کی بلند دیواریں تھیں۔ وہ جہاں جاتی تھی' دیوار سے لگ کر واپس آجاتی تھی حتیٰ کہ وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

کامنا پھر اپنے کمرے سے نکلی' اسی ستون کی آڑ میں آگئی۔ نئی دلہن کی واپسی کا انتظار کرنے لگی۔ اس کے دماغ میں سنسناہٹ سی ہو رہی تھی۔ وہ تیزی سے کچھ سوچتی جا رہی تھی۔ ایک بات ذہن میں آتے ہی وہ پھر اپنے کمرے میں پہنچی۔ وہاں ایک ٹرے میں موسم کے تازہ پھل رکھے تھے۔ اس نے ایک سیب کو اٹھایا۔ پھر اپنے دروازے پر آگئی۔ اس وقت تک نئی دلہن باہر کا ایک چکر لگا کر واپس حویلی میں پہنچ گئی تھی۔ چوکیدار نے بیرونی دروازے کو بند کر دیا تھا۔ اب باہر کا کوئی آدمی نہیں تھا۔ دلہن اکیلی نیند کی حالت میں چلتی ہوئی رائے بہادر کی خواب گاہ کی طرف جا رہی تھی۔

جب وہ کامنا کے قریب سے گزرنے لگی تو اس نے اپنے ہاتھ کا سیب نئی دلہن کی مٹھی میں پکڑا دیا۔ اس نے سیب کو پکڑ لیا لیکن نیند سے چونکنے کا کوئی عمل نہیں تھا۔ وہ بدستور خوابیدہ تھی اور اسی طرح چلتی جا رہی تھی۔

بات سمجھ میں آگئی۔ اس نے اپنی خواب گاہ کے دروازے کو اندر سے بند کیا۔ کلپنا کو اٹھا کر سینے سے لگایا پھر اسے چومتی ہوئی بولی۔ "کام بن گیا۔"

دوسری صبح رائے بہادر نے اپنے دستور کے مطابق ڈائننگ ٹیبل پر تمام بیویوں کو بلایا اور ان کے ساتھ ناشتہ کرنے لگے پھر ناشتے کے دوران ہنستے ہوئے بتایا کہ ان کی نئی دلہن کو نیند میں چلنے کی عادت ہے' نئی دلہن جھینپ رہی تھی اور مسکرا رہی تھی اور بڑی محبت سے رائے بہادر کو دیکھتی جا رہی تھی۔ انہوں نے ایک لقمہ چباتے ہوئے پوچھا۔ "لیکن میری آنکھ کھلی تو تم میرے قریب سو رہی تھیں اور تمہارے ہاتھ میں سیب تھا بھلا یہ سیب کہاں سے آگیا تھا؟"

کامنا نے چونک کر انہیں دیکھا پھر سوالیہ نظروں سے نئی دلہن کو دیکھنے لگی' دلہن نے کہا۔ "میں سپنے میں دیکھ رہی تھی' کسی بہت بڑے باغ میں پہنچ گئی ہوں ہر طرف سیب کے درخت ہیں میں نے وہاں سے ایک توڑ لیا۔"

رائے بہادر نے کہا۔ "لیکن ہمارے علاقے میں کہیں بھی سیب کا درخت نہیں ہے تم یہ سیب باہر سے توڑ کر نہیں لائی ہو' میرا خیال ہے تم نیند کی حالت میں چلتی ہوئی اس ڈائننگ ٹیبل کی طرف آئی تھیں یہاں ٹرے میں پھل رکھے ہوئے تھے یہیں سے تم نے ایک سیب اٹھا لیا ہو گا۔"

وہ جواباً کچھ نہ کہہ سکی کیونکہ نیند کی حالت میں اسے اپنا ہوش نہیں رہتا تھا وہ نہیں

جانتی تھی کہ کہاں جا رہی ہے اور کہاں سے گزرتی ہوئی پھر واپس آ رہی ہے اس کا دماغ نیند کی حالت میں نیم بیدار رہتا تھا اور وہ نیم بیداری کی حالت میں بھی دنیا سے غافل رہتی تھی۔ کسی دوسرے کی آواز نہیں سنتی تھی' کوئی سامنے آتا تو آنکھیں ادھ کھلی ہونے کے باوجود اسے نہیں دیکھ سکتی تھی یا پھر دیکھ کر پہچان نہیں سکتی تھی۔ جیسا کہ اس نے پچھلی رات کامنا کو نہیں پہچانا تھا اور اس کے ہاتھ کا سیب اپنی مٹھی میں لے لیا تھا۔

اب کام بننے والا تھا وہ دوسری رات جاگتی رہی' آدھی رات کے بعد دروازے کو کھول کر نئی دلہن کا انتظار کرتی رہی وہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ ایک بج گیا دو بج گئے پھر تین بھی بج گئے۔ وہ اپنے کمرے سے نکل کر دبے قدموں چلتے ہوئے رائے بہادر کی خواب گاہ کی طرف آئی دروازے پر ہلکا سا دباؤ ڈالا' وہ اندر سے بند نہیں تھا۔ پھر اس نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا' پردے پڑے ہوئے تھے کھڑکی کی سلاخوں سے ہاتھ ڈال کر پردے کو ہٹایا جا سکتا تھا نئی دلہن بے خبر سو رہی تھی پتا نہیں کیا بات تھی کہ آج وہ نیند میں نہیں چل رہی تھی۔

وہ مایوس ہو کر وہاں سے واپس آ گئی اپنی خواب گاہ کے دروازے پر پہنچ کر کھڑی رہی' دل کہتا تھا شاید وہ کسی لمحے اٹھ جائے لیکن وہ تو صبح تک گہری نیند سوتی رہی تھی اور کامنا کی نیند اڑاتی رہی تھی۔ اس رات سے نئی آس بندھنے اور آس ٹوٹنے کا سلسلہ شروع ہو گیا' دوسری رات بھی وہ جاگتی رہی لیکن جو کام بننے والا تھا وہ بگڑتا جا رہا تھا۔ نئی دلہن کو جانے کیا ہوا تھا وہ گہری نیند سو جاتی تھی اپنی خواب گاہ سے اٹھ کر باہر نہیں آتی تھی' اسی طرح چار راتیں گزر گئیں۔ ایک صبح کامنا نے باتوں ہی باتوں میں پوچھا۔ "کیا تم ہر رات نیند میں چلتی ہو؟"

جواب میں نئی دلہن نے ناگواری سے دیکھا' وہ رائے بہادر کے منہ لگی ہوئی تھی اس لئے سب کو حقارت سے دیکھتی تھی' اس نے پوچھا۔ "تم میری کھوج میں کیوں رہتی ہو' مجھ سے کیا لینا ہے؟"

"تم سے تو بہت کچھ لینا ہے' جب رائے بہادر یہاں سے چلے جائیں گے تو ہم اس حویلی میں ایک دوسرے کے دکھ درد کی شریک رہیں گی۔"

وہ بڑے غرور سے بولی۔ "میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ کسی کے دکھ درد میں شریک ہوتی پھروں' رائے بہادر مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتے اور اگر جائیں گے تو ساتھ لے

جائیں گے۔"

اس نے جواباً حقارت سے کہا۔ "کشمیر کی کلی ہو یا پیرس کی خوشبو' مرد زیادہ نہیں لگاتا شاید اسے زکام ہو جاتا ہے۔"

وہ غصے سے اٹھ کر بولی۔ "زیادہ بات کرو گی تو منہ توڑ دوں گی۔"

کلپنا اچانک ہی غرائی' اس پر جھپٹنا چاہتی تھی۔ کامنا نے اسے آغوش میں سمیٹ لیا پھر اسے سہلاتے ہوئے پچکارتے ہوئے پیار سے بولی۔ "نہیں کلپنا ابھی نہیں صبر کرو۔"

وہ بلی کی طرح صابر تھی' بلی میں اتنا صبر ہوتا ہے کہ وہ گھنٹوں چوہے کے بل کے سامنے تاک لگائے بیٹھی رہتی ہے تھکتی نہیں' انتظار سے مایوس بھی نہیں ہوتی صبر کرتی ہے۔ پانچویں رات اس کی مراد بر آئی۔ اس نے دیکھا' رات کے ایک بجے پھر رائے بہادر کی خواب گاہ کا دروازہ کھلا تھا اور نئی دلہن نیند کی حالت میں باہر نکل رہی تھی۔ اس نے اپنے کمرے کی طرف گھوم کر آہستہ سے کہا۔ "کلپنا باہر نہ نکلنا میں ابھی آ رہی ہوں۔"

وہ تیزی سے چلتی ہوئی نئی دلہن کی طرف گئی' نیند میں چلنے والی کو ہوش نہیں تھا وہ اسے پہچان نہیں سکتی تھی وہ اس کے قریب سے گزرتے ہوئے رائے بہادر کے بیڈ روم میں چلی گئی۔ چند ہی سیکنڈ بعد ایک کراہ سنائی دی پھر دوسری کراہ سنائی دی اور اس کے بعد سناٹا چھا گیا۔ وہ نیند میں چلنے والی اب کامنا کے بیڈ روم کے سامنے سے گزر رہی تھی اور تھوڑی دیر بعد بیرونی دروازے تک پہنچنے والی تھی۔ چوکیدار اس کی آہٹ پا کر یا اس کے دروازے سے ٹکرانے پر بیرونی دروازہ کھول سکتے تھے۔

اس سے پہلے ہی کامنا بیڈ روم سے باہر آ گئی اس کے ہاتھ میں خون آلود خنجر تھا اور لہو ٹپک رہا تھا۔ وہ نئی دلہن کے دائیں ہاتھ کی طرف آئی پھر اس نے خنجر کو اس کی مٹھی میں تھما دیا واپس اپنے بیڈ روم میں آئی' دروازہ بند کیا' آئینے کے سامنے پہنچ کر اپنے لباس کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ ایک آدھ جگہ لہو کے چھینٹے نظر آ رہے تھے' وہ باتھ روم میں جا کر انہیں دھونے لگی اتنی دیر میں باہر سے شور بلند ہونے لگا تھا۔ چوکیدار اور گماشتے چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے۔ "نئی مالکن کے ہاتھ میں خنجر ہے اور خون میں ڈوبا ہوا ہے مالکن ہوش میں آ جائیے' یہ کیا ہے' یہ کس کا خون ہے؟"

کامنا جب باتھ روم سے باہر آئی تو حویلی کے اندر بھگدڑ سی مچ گئی تھی' لوگ آ رہے تھے جا رہے تھے' دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دے رہی تھی پھر یہ شور بلند

ہوا کہ رائے بہادر امرناتھ سہائے کو قتل کر دیا گیا ہے۔

حویلی کے ایک ایک دروازے کو پیٹا جا رہا تھا اور یہ اطلاع دی جا رہی تھی۔ تمام عورتیں نکل رہی تھیں' رائے بہادر کی موت پر یقین کرنا مشکل تھا' وہ بھاگی بھاگی ان کے بیڈ روم کی طرف جا رہی تھیں۔ ان میں سے کوئی ایسی تھی جو رائے بہادر کو خون میں لت پت دیکھتے ہی چکرا کر گر پڑی تھی اور کوئی سینہ پیٹ کر رونے لگی تھی۔ کامنا اس لاش کے پاس آ کر گم صم کھڑی ہو گئی تھی جیسے اس پر سکتہ طاری ہو گیا تھا۔

رائے بہادر کے گماشتوں نے نئی دلہن کو پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا تھا وہ ہوش میں آ گئی تھی اور اپنے ہاتھ میں خون آلود خنجر کو دیکھ کر چیخ رہی تھی اور کہہ رہی تھی میں نے کسی کا خون نہیں کیا ہے۔ کوئی اس کی بات کا یقین نہیں کر سکتا تھا رنگے ہاتھوں پکڑے جانا ایک محاورہ ہے جس کا مطلب ہے جرم سرزد ہونے کے دوران گرفت میں آنا لیکن رنگے ہاتھوں کا مطلب خون کے رنگ میں رنگنا ہے تو وہ خون آلود خنجر کے ساتھ پکڑی گئی تھی گویا رنگے ہاتھوں پکڑی گئی تھی۔

اسے رسیوں سے باندھ کر ایک کمرے میں بند کر دیا گیا تھا' دروازے کو باہر سے تالا لگا دیا گیا تھا۔ کتنے ہی گماشتے گاڑیاں لے کر قریبی پولیس سٹیشن کی طرف گئے اور کچھ شہر کی طرف چلے گئے تاکہ فون کے ذریعے رائے بہادر کے قریبی دوستوں اور عزیزوں کو اس واردات کے متعلق اطلاع دے سکیں۔ گاؤں میں تو دور دور تک یہ خبر پہنچ گئی تھی اور سبھی اپنے گھروں سے اٹھ کر چلے آ رہے تھے۔

ایک گھنٹے کے اندر قریبی تھانے کا انچارج چند سپاہیوں کے ساتھ وہاں پہنچ گیا اس نے آتے ہی حکم دیا کہ جس کمرے میں واردات ہوئی ہے وہاں کوئی نہ رہے' عورتیں اپنے اپنے کمروں میں چلی جائیں۔

کامنا اپنے کمرے میں آ گئی اس نے دروازے کو بند کیا پھر سنگھار میز کے سامنے پہنچ کر آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا' اس نے ہاتھ بڑھا کر اپنے ماتھے پر سے بندیا نوچ کر ایک طرف رکھ دی' ایسا کرتے وقت اس کی آنکھ میں آنسو آ گئے جب وہ اپنے ہاتھ سے چوڑیاں اتار رہی تھی تو وہ آنسو اس کے رخساروں پر آ کر ڈھلک رہے تھے۔ وہ روتی ہوئی رائے بہادر امرناتھ سہائے کی بڑی سی تصویر کے پاس آئی اسے دیوار سے اتارا' سینے سے لگا کر پلنگ کے پاس آئی پھر اسے پلنگ پر یوں رکھ دیا جیسے رائے بہادر کو آرام سے لٹا رہی

ہو اس کے بعد وہ تصویر کے پاس آ کر لیٹ گئی اس پر ہاتھ رکھ کر سسکتے ہوئے کہنے لگی

"میرے پتی دیو' دنیا میں کوئی دیو ہیکل نہیں رہتا' تیر ہمیشہ ایک چٹکی میں دبا کر چلایا جاتا ہے یعنی موت ایک چٹکی میں آ جاتی ہے۔ تم عورت کو کمزور سمجھ کر اپنے گھر میں سلانے سے پہلے یہ بھول گئے تھے کہ وہ تمہیں ہمیشہ کیلئے سلا سکتی ہے۔

دیکھو' میں رو رہی ہوں' تمہارے لئے رو رہی ہوں تم کچھ بھی تھے' میرے سہاگ تھے عورت اپنے ظالم شوہر کو روئے یا نہ روئے اپنے سہاگ کے لئے ضرور روتی ہے' وہ بہت ساری قانونی اور مذہبی پابندیوں میں تمہیں جکڑنے کے بعد خود کو تمہارے حوالے کرتی ہے اور تم اسے کھیل سمجھ لیتے ہو اب تمہی بتاؤ تم مجھ سے کھیلتے رہے یا میں تم سے کھیل گئی؟

میرے رائے بہادر' دیوتا سمان پتی دیو' یہ نہ سمجھنا کہ میں سنگدل ہوں' تمہیں قتل کیا ہے تو کیا ہوا' تمہارے لئے آنسو بھی تو بہا رہی ہوں۔"

وہ سسک رہی تھی' رو رہی تھی' ہولے ہولے بڑبڑا رہی تھی پھر اسی طرح روتے روتے اس کی آواز دھیمی پڑ گئی' آنکھیں بند ہوتی گئیں اس کے بعد وہ سو گئی۔

☆======☆======☆

دوسرے دن بہت سے اخبارات نے رائے بہادر کی ہلاکت کی خبر نمایاں انداز میں شائع کی' اشاعت کے دوسرے دن ٹھاکر گلاب سنگھ' کامنا کی خیریت معلوم کرنے پہنچ گیا اب اسے کوئی روکنے والا نہیں تھا۔ جاگیرداری اور دنیاوی رعب اور دبدبہ رکھنے والا دنیا سے اٹھ گیا تھا' حاکم کے ساتھ اس کے احکامات بھی اٹھ جاتے ہیں۔ وہاں کے ملازموں' گماشتوں اور کسانوں کے لئے رائے بہادر کے خاندان کے دستور کے مطابق پہلی دھرم پتنی کا حکم قابل قبول تھا' اب وہی سب سے برتر تھی کیونکہ وہ رائے بہادر کے بچوں کی ماں بھی تھی۔

بچوں کی ماں نے حکم دیا تھا۔ "حویلی کی تمام عورتیں اپنے رشتے داروں اور عزیزوں سے مل سکتی ہیں۔ اگر حویلی کے باہر جانا چاہیں تو ان پر پابندی نہیں ہو گی اگر وہ جاگیر سے نکل کر اپنے میکے جانا چاہیں' اپنا دوسرا گھر بسانا چاہیں تو انہیں کوئی نہیں روکے گا۔"

لیکن حویلی سے کوئی عورت ابھی نہیں جانا چاہتی تھی' یہ اعلان ہو چکا تھا کہ ایک ماہ بعد رائے بہادر صاحب کی لکھی ہوئی وصیت پڑھی جائے گی اس وصیت میں جائیداد کی

تقسیم تھی کہ کس بیوی کو کتنا دیا گیا ہے۔ یہ معلوم کرنے کے لئے سب رک گئی تھیں، کامنا نے ٹھاکر گلاب سنگھ کو دیکھتے ہی کہا۔ "میں یہاں ایک منٹ رہنا نہیں چاہتی، مجھے ابھی لے چلو تم میں حوصلہ پیدا نہ ہوا تو پھر ٹھوکر کھانے کے لئے کوئی دوسرا گھر بساؤں گی۔"

وہ اسے سر سے پیر تک دیکھتے ہوئے بولا۔ "تم سے پورے ایک سال کی دوری رہی، اس دوری نے تمہاری محبت اور بڑھا دی ہے آج پھر تمہیں سفید ساڑھی میں دیکھ رہا ہوں، بیوہ کے روپ میں تم اور زیادہ حسین اور پرکشش لگتی ہو میں تمہیں کہیں بھٹکنے نہیں دوں گا۔"

"پھر کیا کرو گے؟"

"اگر تم مجبوریوں کو سمجھ کر میرا ساتھ دو تو ہم ہمیشہ ساتھ رہ سکتے ہیں۔"

"صاف صاف کہو، کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"میں نے سوچا ہے، جہاں میری ڈیوٹی ہے اسی تھانے کے علاقے میں تمہیں ساتھ رکھوں گا مگر دنیا والوں پر ظاہر نہیں کروں گا۔ تمہارے ساتھ شادی کروں گا جب تک ہماری شادی کی بات چھپی رہے ہم چھپا کر رکھیں گے، ظاہر ہو جائے گی تو پھر یہ میرا مسئلہ ہو گا، میں دنیا والوں سے نمٹ لوں گا۔"

اسے دھرم پتنی بنانے کے بعد چھپائے رکھنے کے لئے کھنڈر سے بہتر کوئی جگہ نہیں تھی۔ جب اس نے کامنا سے کھنڈر کا ذکر کیا تو اس نے بڑی محبت سے کہا۔ "آج تک یہی سنتے آئے ہو گے کہ عورت گھر کو جنت بنا دیتی ہے میں تمہارے لئے کھنڈر کو محل بنا دوں گی۔"

ایک ماہ بعد انہوں نے اخبارات میں رائے بہادر کی وصیت کا خلاصہ پڑھا وہ مرنے سے پہلے اپنی تمام جائیداد اور جاگیر نقد رقم سبھی اپنی پہلی بیوی اور بچوں کے نام لکھ گئے تھے۔ جو دوسری بیویاں تھیں ان سب کو دس دس ہزار روپے دینے کی وصیت کی گئی تھی اور یہ بھی لکھا تھا کہ وہ چاہیں تو اپنا دوسرا گھر بسا سکتی ہیں۔

کامنا نے اخبار کو ایک طرف پھینکتے ہوئے سوچا۔ "اہمیت ہمیشہ پہلی بیوی کی ہوتی ہے، خاص طور پر اس بیوی کی جس سے بچے ہو جائیں، مرد ہزار ان سے دور بھاگیں لیکن بچے پاؤں کی زنجیر ہوتے ہیں وہ جہاں بھی جاتا ہے لوٹ کر بچوں والی کے پاس آتا ہے۔"

یہ بات اس کے دل میں، دماغ میں بلکہ روح تک بیٹھ گئی کہ اسے اپنے گلاب سنگھ کے بچوں کی ماں بننا ہے اور وہ ماں بننے کا انتظار کر رہی تھی، وہ ایک ایک دن، ایک ایک مہینے کا انتظار کرتی تھی کبھی بڑی محبت سے پوچھتی تھی ٹھاکر میں تمہارے بچے کی ماں کب بنوں گی۔

وہ اسے ٹالنے کی کوشش کرتا تھا، سمجھاتا تھا۔ "بچوں کی کیا ضرورت ہے، ہم تم کتنی پرسکون محبت بھری زندگی گزار رہے ہیں۔"

"تمہاری پہلی بیوی سے بچے ہیں اس لئے تمہیں ضرورت نہیں ہے مگر مجھے تو ہے۔"

"ہماری تمہاری ضرورت کو وہ تقدیر والا زیادہ بہتر سمجھتا ہے جب وہ چاہے گا تو اولاد ہو گی، تم مجھے پریشان نہ کیا کرو۔"

لیکن وہ پریشان کرتی تھی، ایک برس چار ماہ اس کے ساتھ گزر گئے تھے وہ کہتی تھی۔ "میں تمہارے ساتھ کھنڈر میں رہتی ہوں مجھے اس محبت کا صلہ ملنا چاہئے۔"

"میں تمہیں ہمیشہ کھنڈر میں نہیں رکھوں گا، تمہارے ایک لاکھ روپے میرے پاس ہیں میں تم سے کہہ چکا ہوں اس رقم سے تمہارے لئے ایک اچھا مکان بنا رہا ہوں۔"

وہ ایک اچھا مکان بنا رہا تھا اور یہ ایک اچھی زنجیر بنانے کی سوچ رہی تھی۔ ایک بچے کی زنجیر، جو اس کے گلاب سنگھ کو ہمیشہ اس سے باندھ کر رکھے۔

ایک بچے کی تمنا اتنی شدت سے تھی کہ اس کے تصور میں وہ بالکل گم ہو جاتی تھی۔ خیالوں میں ایک ننھے منے چاند سے ٹکڑے کو دیکھ کر خوش ہوتی رہتی تھی، ایسے ہی وقت کیشو چنڈال وہاں صفائی کے لیے آجاتا تو اسے دیکھتے ہی چونک جاتی تھی۔ جھرجھری سی پیدا ہوتی تھی۔ وہ چھلپٹیا تھا۔ معصوم بچوں کی زندگی سے کھیلتا تھا، ننھے منے سرماؤں کی گود میں ہوتے ہیں اور وہ انہیں بیرونی ممالک کی منڈی میں پہنچاتا تھا۔

اسے دیکھتے ہی پہلے تو کلپنا غراتی تھی پھر کامنا غراتے ہوئے بولتی تھی۔ "کمینے چنڈال! کیا تیرے بچے نہیں ہیں؟"

وہ ہاتھ جوڑ کر گھگیاتے ہوئے کہتا۔ "نہیں مالکن؟"

"اگر ہوتے تو کیا کرتا؟"

"یہ میں نے کبھی نہیں سوچا۔"

"نہیں سوچا تو اب سوچا کر۔ دور کہیں دیکھتے ہوئے اپنے بچوں کا خیال کرے گا تو ننھے منے سے کتنے ہی بچے نظر آئیں گے۔ وہ سب باپو کہتے ہوئے تیری طرف دوڑیں گے، تیرے گلے سے لگ جائیں گے' تجھ سے پیار مانگیں گے' ایسے میں کیا تو ان کے گلے پر چھری چلا سکے گا؟"

وہ پھر ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "مالکن کا حکم ہو گا اور ایک بوتل دارو مل جائے گی تو چلادوں گا۔"

کامنا غراتے ہوئے اس پر لپکی۔ اس کے بال پکڑ کر اِدھر سے اُدھر کھینچا' اسے طمانچے مارے' وہ زمین پر بیٹھ گیا تاکہ اور مار کھا سکے۔ وہ جانتا تھا' مالکن اس کی بری طرح پٹائی کرے گی اور داروغہ صاحب کو معلوم ہو گا تو وہ اس کے زخموں پر مرہم رکھنے کے لیے کلال کو حکم دے گا کہ چنڈال کو ایک بوتل دے دی جائے۔

اب کلپنا بھی غراتے ہوئے اس پر جھپٹ رہی تھی اور اسے پنجے مار رہی تھی۔ کامنا نے پاس پڑی ہوئی ایک لکڑی اٹھائی اور اس سے پٹائی شروع کر دی۔ جب اس پر اچھی طرح غصہ اتار لیا تو اسے ایک ٹھوکر مارتے ہوئے بولی۔ "جا بھاگ جا۔ خبردار' یہاں صفائی کے لیے کبھی نہ آنا۔ میں تیری صورت نہیں دیکھنا چاہتی۔"

وہ ابھی ماں نہیں بنی تھی۔ پتا نہیں کب تقدیر اس کی گود ہری کرتی لیکن ہندوستان کی ہزاروں' لاکھوں اور کروڑوں مائیں چیخ رہی تھیں' اخبارات میں بیان دے رہی تھیں۔ صوبہ بہار میں ایسی ماؤں کی اکثریت تھی جو ہندوستانی نیتاؤں سے' پٹنہ اور پورنیہ ضلع کی انتظامیہ سے اور پولیس والوں سے پوچھتی تھیں۔ "ہم کب تک سہمی رہیں گی؟ کسی تقریب میں' کسی بازار میں' کسی تفریح گاہ میں اپنی اولاد کو لے جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے کہ انہیں کوئی اغوا کر کے نہ لے جائے۔ ہم اپنے بچوں کو اسکول بھیجتے ہیں تو ہمیں ہر آنے جانے والا شخص چھلپیا نظر آتا ہے۔ ہمیں راتوں کو نیند نہیں آتی اور آجاتی ہے تو ہم چونک چونک کر اٹھ جاتی ہیں۔ خواب میں بھی ہمارے بچوں کی گردنیں کاٹی جاتی ہیں۔"

ان ماؤں کی فریادیں بہار کی اسمبلی میں پہنچائی گئیں اور مطالبہ کیا گیا کہ انسانی ڈھانچوں کو برآمد کرنے کے لائسنس منسوخ کیے جائیں۔ اس پر پارلیمانی امور کے وزیر رامیشوری پی ڈی سنگھ نے حیرانی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ انہیں تو اس بات کا علم نہیں ہے کہ حکومت نے انسانی ڈھانچوں کو برآمد کرنے کا اجازت نامہ دیا ہو۔ اس قسم کی تجارت

ان وزیر صاحب کے علم میں نہیں تھی۔

کتنی حیرانی کی بات ہے' ایک ذمے دار وزیر' پارلیمنٹ میں بیٹھ کر تغافل عارفانہ سے کام لیتا ہے جب کہ حقیقتاً بھارتی حکومت نے کم از کم سترہ کمپنیوں کو اس قسم کے لائسنس جاری کیے ہوئے ہیں۔ بمبئی اور کلکتہ میں دو بڑی کمپنیاں یہ کاروبار کر رہی ہیں' ان میں سے ایک کا نام رکناس لمیٹڈ فاسینو اور دوسری کا نام رام کرشنا اسٹور ہے۔

داروغہ ٹھاکر گلاب سنگھ کی چنڈال چوکڑی نے بہت دور دراز کے علاقے میں جا ایک چھلپئیے کو پکڑ لیا تھا۔ اس کی خوب پٹائی کی تھی' اسے پلاتے بھی رہے تھے اور مارتے بھی رہے تھے۔ اس نے بیان دیا تھا کہ وہ ایسا کام کرتا ہے لیکن اسے یاد نہیں ہے کہ اس نے کتنی لاشیں پانی میں بہائی تھیں اور کون سی لاشیں خشکی باغ کے علاقے میں پائی گئی ہیں۔

ڈی ایس پی نے خود اس معاملے پر توجہ دی اور اس چھلپئیے کو بلا کر پوچھا۔ "تم معصوم بچوں کی کھوپڑیاں کہاں پہنچاتے ہو؟"

چھلپئیے نے ایک ایجنٹ کا نام بتایا۔ اس کا نام چندریکا مولک تھا اور اس کا تعلق رکناس لمیٹڈ فاسینو سے تھا۔ "چندریکا مولک اس چھلپئیے سے مال لے کر جا چکا تھا۔ اس کی گرفتاری کا وارنٹ حاصل کیا گیا لیکن جب اسے گرفتار کرنے کے لیے پولیس پارٹی کلکتہ پہنچی تو بے اثر ہو کر رہ گئی۔ اس ایجنٹ چندریکا مولک کے پیچھے بڑی بڑی شخصیتیں تھیں جن کے نام ظاہر نہیں کیے جاسکتے تھے۔ وہاں کے پولیس افسران نے کہا۔ چندریکا مولک سے جو کچھ پوچھنا ہے' وہ تھانے میں بلا کر پوچھ لیا جائے لیکن اس کے خلاف کوئی رپورٹ درج نہیں کی جائے گی۔"

گویا اس گھناؤنے کاروبار کے پیچھے صرف ایک معمولی داروغہ ٹھاکر گلاب سنگھ ہی کا ہاتھ نہیں تھا' اس کے پیچھے اور بڑے بڑے ہاتھ تھے جنہیں کوئی پکڑ نہیں سکتا تھا۔ بس ان سے سوالات کیے جاتے تھے اور ان کے جوابات اخبارات میں شائع کر کے لوگوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔

اس رات کامنا نے ٹھاکر گلاب سنگھ سے کہا۔ "میں کیشو چنڈال کو ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتی اسے یہاں نہ آنے کے لیے کہہ دو۔ تم کیوں ایسا گھناؤنا کام کرتے ہو؟"

"میں نہیں کروں گا' دوسرے کرتے رہیں گے۔ کیا فرق پڑتا ہے۔"

"دوسرے کرتے رہیں' تم نہ کرو۔ کیا ایسے وقت تمہیں اپنے بچوں کا خیال نہیں آتا؟"

ٹھاکر نے غرا کر اسے دیکھا۔ "بکواس نہ کرو۔"

"اور تم آنکھیں نہ دکھاؤ' آج نہیں تو کل میں تمہارے بچے کی ماں بنوں گی' مجھے حق پہنچتا ہے' میں یہ سوال کر سکتی ہوں۔"

"کیا بچہ بچہ لگا رکھا ہے۔ ابھی بچہ ہوا نہیں ہے اور تم اتنے حقوق جتاتی ہو۔ میں ایک نہیں ہزار بار سمجھا چکا ہوں' مجھے بچے نہیں چاہئیں۔"

"مجھے تو چاہئیں۔"

"تمہارے چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ میں یقین سے کہتا ہوں' تم بانجھ ہو پہلے شوہر سے کچھ نہ ہوا' دوسرے سے بھی کچھ نہ ہوا' میں تیسرا تمہیں آسمان سے لاکر نہیں دے سکتا۔"

"بھگوان صرف آسمان پر ہی نہیں زمین پر بھی ہوتا ہے اور وہ مجھے اسی زمین پر دے گا مگر تم نہیں چاہتے۔ میں اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ تم چاہتے ہو' ہم اسی طرح چوری چھپے ملتے رہیں' دنیا والے تمہیں بدنام نہ کریں۔ بچہ ہو گا تو وہ زیادہ عرصے چھپا نہیں رہ سکے گا۔ اسے تمہارے نام کی ضرورت ہو گی۔ وہ اسکول جائے گا اس کھنڈر میں چھپ کر نہیں رہ سکے گا۔ تمہارے دوسرے بچوں کی طرح شہر میں خوشحال اور آزادانہ زندگی گزارے گا۔ یہ باتیں تم اچھی طرح سمجھتے ہو' اسی لیے بچے سے انکار کرتے ہو۔"

"جب تم سمجھتی ہو کہ میں کیا سمجھتا ہوں اور کیا چاہتا ہوں تو پھر بحث کیوں کرتی ہو؟"

"اس لیے کہ تم اپنی عورت کو سمجھ سکو۔ جو عورت کو نہیں سمجھتا' وہ اپنا گھر اور اپنی زندگی تباہ کر لیتا ہے۔ پہلے مجھے وہ بنک مینیجر ملا۔ وہ میرے ارمانوں کو میرے جذبوں کو نہیں سمجھتا تھا پھر بھی میں سمجھوتا کرتی رہی۔ میں نے اسے سمجھایا' بیشک وہ میرے جذبوں کو نہ سمجھے' لیکن مال و دولت سے تو خوش رکھے' عجیب احمق تھا۔ نہ میری جائز ضرورتوں کو پورا کرتا تھا اور نہ ہی ناجائز طور پر دولت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ جب وہ ایسے بھی نہیں سمجھتا تھا' ویسے بھی نہیں سمجھتا تھا تو آخر اس گھر کو تباہ ہونا ہی تھا۔ میرے دوسرے شوہر رائے بہادر نے مجھے حویلی میں قید کر کے مجھ پر زیادتی کی۔ اس کے بارے میں تمہیں سب

کچھ بتا چکی ہوں' کیا اس سے تم سبق حاصل نہیں کر سکتے کہ میاں بیوی ہم مزاج نہیں بن سکتے تو نہ سہی کبھی کبھی ایک دوسرے کی جائز ضرورتوں کو سمجھ لینا چاہیے۔ خواہ وہ جائز ضرورتیں بیوی کے مزاج کے خلاف ہوں یا شوہر کے مزاج کے خلاف۔ جب میں تمہاری نیک نامی کی خاطر ساری دنیا کو چھوڑ کر اس کھنڈر میں رہ سکتی ہوں تو کیا تم اولاد کے سلسلے میں میری جائز ضرورت پوری نہیں کر سکتے؟"

وہ ٹھاکر سے لڑ رہی تھی' اپنا حق مانگ رہی تھی' اسی وقت کلپنا اس کی گود میں آکر بیٹھ گئی۔ کامنا نے محسوس کیا' وہ کچھ بھاری بھرکم سی ہو گئی ہے۔ یہی بات ٹھاکر گلاب سنگھ نے اسے دیکھتے ہوئی کہی۔ "تمہاری کلپنا تو بڑی صحت مند ہوتی جارہی ہے!" "معلوم ہوتا ہے' یہاں کا پانی لگ گیا ہے۔"

بات کچھ اور تھی' کچھ دنوں بعد ہی پتا چلا' وہ ماں بننے والی ہے۔ کامنا کو اس پر اور زیادہ پیار آنے لگا۔ وہ اس کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھنے لگی' اس کے لیے بلاناغہ دودھ منگواتی تھی۔ کبھی کبھی بلا وہ دودھ پی جاتا تھا۔ ایسے وقت کامنا اسے مارنے کے لیے دوڑتی تھی۔ دور بھگا دیتی تھی۔ اس کا سارا وقت کلپنا کی دیکھ بھال میں گزرتا تھا۔ دن کی روشنی میں جب کلپنا ممتا کا بوجھ اٹھائے اِدھر سے اُدھر چلتی رہتی تو کامنا اسے بڑی حسرت سے دیکھتی تھی پھر مسکرا کر کہتی تھی۔ "کمینی! کیسے اترا کر چلتی ہے۔ مجھے چڑاتی رہتی ہے۔"

آخر ایک دن وہ چار بچوں کی ماں بن گئی۔ ننھے منے سے پیارے پیارے بچے تھے۔ کامنا نے پہلے ہی ان کے لیے ایک بڑے سے ٹب کا بندوبست کر لیا تھا۔ اس میں اپنے ہاتھوں سے روئی کا گدا سلائی کر کے رکھ دیا۔ جس پر بچے اِدھر اُدھر رینگتے رہتے تھے۔ کلپنا انہیں دودھ پلاتی تھی۔ کبھی کبھی سر اٹھا کر محتاط نظروں سے چاروں طرف دیکھتی تھی۔ کامنا نے ایک بار اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر پچکارتے ہوئے پوچھا۔ "آخر تجھے کیا ہو گیا؟ تو اس طرح رہ رہ کر کیوں چونک جاتی ہے؟ کیا دیکھتی ہے؟ کسے تلاش کرتی ہے؟ اری' یہ تیرے بچے ہیں۔ بلی کے بچے۔ یہاں کوئی چھلپٹیا نہیں آئے گا۔"

کیسے نہیں آئے گا؟ کامنا ایک رات سو رہی تھی کہ کلپنا کی میاؤں میاؤں سن کر اٹھ گئی۔ وہ آہستہ آہستہ اسے پنجے مار رہی تھی' اٹھنے کے لیے کہہ رہی تھی۔ میاؤں میاؤں کہنے کا انداز ایسا تھا جیسے رو رہی ہو۔ وہ فوراً ہی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ "کلپنا! کیا ہو گیا ہے تجھے! کیا کہنا چاہتی ہے؟"

وہ بستر سے کود کر فرش پر آئی۔ پھر اس ٹب کی طرف جانے لگی جس میں بچے تھے۔ کامنا نے لالٹین کی لو کو ذرا اونچا کیا' پھر دیکھا' وہاں تین نظر آ رہے تھے' چوتھا غائب تھا۔ کسی نے اسے اغوا کر لیا تھا۔

وہ ٹب میں جا کر اپنے تینوں بچوں کو سمیٹ کر بیٹھ گئی تھی۔ سر اٹھا کر میاؤں کہتے ہوئے بڑے دکھ سے کامنا کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر تسلی دینے کے انداز میں کہا۔ "تو اطمینان رکھ' میں دیکھتی ہوں' بچہ یہیں کہیں ہو گا۔"

وہ لالٹین اٹھا کر اسے تلاش کرنے لگی۔ کھنڈر کے اوپری حصے میں ایک ہال نما کمرہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک زینہ نیچے کی طرف گیا ہوا تھا۔ وہ پرانی شکستہ دیوار سے زینے پر آئی' آہستہ آہستہ اتر کر دور نیچے تک دیکھنے لگی۔ پھر وہ ذرا اور نیچے اتر کر آئی۔ زینے کے آخری نچلے حصے میں روشنی پہنچتے ہی اچانک بلا غرایا۔ "غاؤں غاؤں۔"

کامنا کا سر چکرانے لگا۔ وہ کھڑی نہ رہ سکی' زینے پر بیٹھ کر بڑے دکھ سے بولی۔ "بھگوان! یہ تو نے بلے کی کیا فطرت بنائی ہے' یہ کمبخت اپنے ہی بچوں کو کھا جاتا ہے۔"

پھر وہ یک بہ یک غصے سے اٹھی۔ پاس پڑے ہوئے پتھر کو اٹھا کر اس کی طرف کھینچ مارا۔ "چل بھاگ ذلیل! کمینے! اگر اِدھر آیا تو میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔"

وہ غراتا ہوا بھاگ رہا تھا۔ اس نے دوسرا پتھر کھینچ کر مارا مگر وہ نکل چکا تھا۔ ٹھاکر گلاب سنگھ نے نیند میں کروٹ بدلتے ہوئے پوچھا۔ "کیوں آدھی رات کو شور مچا رہی ہو' آ جاؤ' مجھے سونے دو۔"

وہ لالٹین اٹھا کر اوپر آتے ہوئے بولی۔ "غضب ہو گیا' وہ راکشش اپنے بچے کو کھا گیا ہے۔"

"کھانے دو۔ چپ چاپ سو جاؤ۔"

وہ بستر کے پاس آ کر غصے سے کہنا چاہتی تھی۔ "تم کیسے داروغہ ہو؟ تمہیں کیسے نیند آ جاتی ہے؟ انسان' انسان کے بچوں کو اٹھا کر لے جاتا ہے' انہیں ہلاک کر دیتا ہے' بلا اپنے بچوں کو کھا جاتا ہے تم کچھ کر نہیں سکتے مگر ہمدردی کے دو بول تو بول سکتے ہو۔"

وہ کیا بولتا' گہری نیند میں ڈوب گیا تھا' خراٹے لے رہا تھا۔ وہ کلپنا کے پاس آ گئی۔ لالٹین کو ایک طرف رکھ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ کلپنا خاموش زبان سے کچھ بول رہی تھی۔ بڑے ہی رونے کے انداز میں بول رہی تھی۔ اس کی سبز آنکھیں کامنا کی

سبز آنکھوں سے چار ہو رہی تھیں۔ وہ جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں کرنے اور ایک دوسرے کی باتیں سمجھنے کی عادی ہو گئی تھیں' اس نے کہا۔ "تو کیوں سو گئی تھی' کس بے فکری نے سلا دیا تھا تجھے! کیا تو نہیں جانتی کہ ہندوستانی ماؤں نے راتوں کو سونا چھوڑ دیا ہے؟"

کلپنا نے سر کو جھکا لیا۔ وہ اپنا منہ کبھی ایک بچے پر آہستہ آہستہ رگڑتی تھی' کبھی دوسرے بچے کو اپنے چہرے سے سہلاتی تھی۔ پھر کسی کو زبان سے چاٹنے لگتی تھی۔ ہر طرح سے ممتا کا اظہار کرتی جا رہی تھی۔ اس نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "یہ بتی جلتی رہے گی' تو جاگتی رہنا۔ صبح میں بچوں کی نگرانی کروں گی' تو آرام سے سو جانا۔"

وہ اپنے بستر پر آ کر لیٹ گئی۔ تھوڑی دیر کھنڈر کی شکستہ چھت کو تکتی رہی پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ نیند کو آنا ہو تو آنکھیں خود بخود بند ہو جاتی ہیں۔ اپنی مرضی سے بند کرو تو نیند نہیں آتی۔ تھوڑی دیر بعد کروٹیں بدلتے ہوئے اس نے محسوس کیا' نیند اڑ چکی ہے۔ اس کے سینے میں دل کی جگہ ایک بچہ دھڑک رہا ہے۔ ایک بچہ جسے وہ نہیں جانتی مگر اندر سے پہچانتی ہے۔

یک بیک اسے اپنی سانس رکتی ہوئی سی محسوس ہوئی وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ دونوں ہاتھ گردن پر رکھ کر گہری گہری سانسیں لینے کی کوشش کرنے لگی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی گردن دبوچ رہا ہو اور چاروں طرف سے شکنجے میں کس رہا ہو۔ اس نے اپنی مٹھی میں سونے کی چین کو جکڑ لیا پھر اسے کھینچ کر توڑتے ہوئے ایک طرف پھینک دیا تب اس کی سانس آنے لگی۔

وہ سونے کی چین فرش پر پڑی ہوئی تھی' ہلکی پھلکی سی چین اس کا گلا نہیں دبا سکتی تھی لیکن یونہی محسوس ہو رہا تھا جیسے دو ننھے ننھے ہاتھ گردن دبوچ رہے ہوں۔ جو سونے کے زیورات وہ پہنتی تھی' وہ سب ناجائز کمائی کے تھے' اس ناجائز آمدنی میں معصوم بچوں کی کٹی ہوئی گردنوں کا لہو بھی تھا۔

دوسری صبح ٹھاکر گلاب سنگھ نے ڈیوٹی پر جاتے ہوئے اسے پیار سے دیکھا پھر تعجب سے کہا۔ "تم کچھ اجڑی اجڑی سی لگ رہی ہو' آج آنکھوں میں کاجل کیوں نہیں لگایا؟"

"بس یونہی' دل نہیں چاہتا۔"

"تم تو کہا کرتی تھیں کہ مرد ڈیوٹی پر جاتا ہو تو عورت کو بن سنور کر رخصت کرنا

چاہیے تاکہ شام تک وہ اس کے تصور میں سمائی رہے۔ آج تمہیں کیا ہو گیا ہے' چلو فوراً میک اپ کرو۔"

اس نے جبراً ہلکا سا میک اپ کر لیا۔ آنکھوں میں کاجل لگایا' وہ خوش ہو کر بولا۔ "یہ ہوئی نا بات۔ گلاب کے سامنے کھلا ہوا گلاب لگ رہی ہو۔"

"شام کو جلدی آؤ گے۔"

"ہاں۔ کوشش کروں گا لیکن تم کچھ خالی خالی سی لگ رہی ہو۔ ہاں یاد آیا' آج تمہارے گلے میں زنجیر نہیں ہے۔ کان کی بالی تک نہیں ہے۔"

"میں وہ زیورات نہیں پہنوں گی۔ مجھے معصوم بچوں کے خون کی بو آتی ہے۔"

"کیا بکواس کر رہی ہو؟"

"سچ کہہ رہی ہوں۔ میں ایسی کمائی نہیں چاہتی۔ تمہیں بھی منع کرتی ہوں' بھگوان کے لیے ایسے کاروبار میں شریک نہ رہو جس میں بچوں کی زندگی سے کھیلا جاتا ہے۔"

"میں ایسے کسی کاروبار میں شریک نہیں رہتا' میں نے آج تک کسی معصوم بچے کی جان نہیں لی۔"

"لیکن جان لینے والوں کے جرائم کو چھپاتے ہو۔ ان کا ساتھ دیتے ہو۔ وہ حرام کی کمائی حاصل کرتے ہیں' اس میں سے تم اپنا حصہ لیتے ہو۔"

اسی وقت بلے کے غرانے کی آواز سنائی دی۔ صرف وہی نہیں کلپنا بھی چونک کر دیکھنے لگی' جواباً غرانے لگی۔ بلا ٹوٹی ہوئی چھت سے جھانک رہا تھا۔ کامنا نے فرش پر پڑے چھوٹے سے پتھر کو اٹھا کر اس کا نشان باندھتے ہوئے کہا۔ "چل بھاگ جا یہاں سے' میں تیری جان لے لوں گی' ادھر کبھی نہ آنا۔"

اس نے پتھر کھینچ کر مارا۔ بلا نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ دوسری طرف سے غرانے کی آواز آ رہی تھی' کامنا نے کہا۔ "مجھے ریوالور دو' میں اسے گولی مار دوں گی۔"

"دماغ خراب ہو گیا ہے۔ ایک بلے کو گولی مارو گی؟"

"ہاں۔ اس نے اپنے بچے کو کھا لیا ہے۔"

"تو کیا ہوا' ایسا تو ہوتا ہی ہے۔"

"کیا تمہاری نظروں میں یہ جرم نہیں ہے؟ کیا باپ اپنے بچوں کو کھا لیتا ہے۔"

"میں بلے کی بات کر رہا ہوں۔"

"میں تمہاری بات کر رہی ہوں۔ اس عورت سے سال دو سال میں اولاد ہوتی رہتی ہے' مجھ سے کیوں نہیں ہوتی؟ یہاں تمہاری تدبیر میرے بچوں کو کھا لیتی ہے؟"

"آج سچ مچ تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔"

وہ اپنی وردی درست کرتے ہوئے زینے کی طرف جانے لگا۔ کامنا نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔ "کیا تم ناجائز آمدنی چھوڑ نہیں سکتے؟"

"میں اکیلا کمانے والا ہوں۔ میری ایک کمائی سے دو چولہے جلتے ہیں۔ ایک تمہارے ہاں' دوسرا شہر میں۔ مجھے دونوں طرف کے اخراجات پورے کرنے کے لیے کیا کچھ کرنا پڑتا ہے' یہ میں جانتا ہوں' تم نہیں سمجھ سکتیں۔"

"میں سمجھتی ہوں۔ چلو' میں رشوت لینے سے منع نہیں کرتی' لیکن بچوں کا خون اپنی گردن پر مت لو۔ میرا دل کہتا ہے' مجھے ان بچوں کی آہ لگتی ہے' ان کی مائیں بددعائیں دیتی ہوں گی۔ میں ماں نہیں بن رہی ہوں۔ میرے پہلے پتی سے حاصل کیے ہوئے ایک لاکھ روپے تمہارے پاس اب تک رکھے ہوئے ہیں' تم.........."

وہ بات پوری نہ کر سکی۔ ابھی وہ زینے کے نصف حصے میں پہنچے تھے کہ اوپری حصے سے بلی اور بلے کی غراہٹیں سنائی دینے لگیں۔ ان آوازوں سے پتا چل رہا تھا کہ دونوں آپس میں لڑنے لگے ہیں۔ وہ تیزی سے پلٹ کر زینے پر تقریباً دوڑتی ہوئی اوپر پہنچی۔ اس وقت تک بلا ایک بچے کو منہ دبائے وہاں سے بھاگ رہا تھا اور ممتا کی ماری بلی اس کا پیچھا کر رہی تھی۔ کامنا بھی اس کے پیچھے دوڑنے لگی تھی۔ بلے کو گالیاں دینے لگی۔ پتھر اٹھا کر اسے مارنے لگی لیکن وہ اوپر کے حصے میں کود کر نیچے پہنچ چکا تھا۔ جب تک کامنا وہاں پہنچ کر اسے دیکھتی' وہ جا چکا تھا۔ نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ وہ تیزی سے دوڑتی ہوئی اسی طرح گالیاں دیتی ہوئی زینے سے اترتے ہوئے جانے لگی' ٹھاکر گلاب سنگھ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روکنے کی کوشش کی اور پوچھا۔ "کہاں جا رہی ہو' کیا ہو گیا ہے؟"

وہ ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑاتے ہوئے جنونی انداز میں بڑبڑاتے ہوئے جانے لگی۔ اس کی بڑبڑاہٹ نے سمجھا دیا کہ بلے نے دوسرے بچے کو بھی دبوچ لیا ہے۔ وہ بھی اس کے پیچھے دوڑتا ہوا جانے لگا آوازیں دینے لگا۔ "رک جاؤ۔ پاگل نہ بنو' یہ کیا حماقت ہے۔"

وہ نیچے پہنچنے کے بعد پتھر اٹھا اٹھا کر بلے کی طرف مار رہی تھی اور وہ بھاگتا جا رہا تھا۔

آخر ایک پتھر اسے لگ ہی گیا۔ بچہ اس کے منہ سے چھوٹ گیا تھا' وہ اسے چھوڑ کر بھاگتا چلا گیا۔ کامنا اور کلپنا ایک ساتھ اس بچے کے پاس پہنچیں۔ ان کا خیال تھا' وہ صرف زخمی ہوا ہو گا۔ قریب پہنچ کر دیکھا تو بلے کے تیز دانتوں کے درمیان آکر اس کی گردن الگ ہو گئی تھی۔

کامنا نے بے اختیار اپنا دل پکڑ لیا۔ کلپنا کے منہ سے ایسی اداس اور ماتمی غراہٹ نکل رہی تھی جسے سن کر کسی بھی ماں کا کلیجہ کانپ جاتا۔ وہ چپ چاپ سر جھکائے بیٹھی رہی' گم صم تھی' کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا' کیا سوچے' کیا کرے۔ دماغ کچھ سوچنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ دل جیسے دھڑکنا بھول گیا تھا۔

جیپ کے اسٹارٹ ہونے اور وہاں سے جانے کی آواز سن کر وہ چونک گئی۔ ٹھاکر گلاب سنگھ ڈیوٹی پر چلا گیا تھا' اسے کیا پڑی تھی کہ کلپنا اور کامنا کے پاس تسلی دینے کے لیے رک جاتا۔ بلی کے بچے کے مرنے کی اہمیت ہی کیا تھی جب کہ انسان کے بچے کٹ مر رہے تھے۔

☆======☆======☆

اس روز سے کامنا نے کلپنا کے دونوں بچوں کو خود سنبھال لیا تھا۔ وہ اٹھتے بیٹھتے' سوتے جاگتے دونوں کو اپنے پاس رکھتی تھی اور دور دور تک نظریں دوڑاتی رہتی تھی۔ اب وہ بلا نظر نہیں آتا تھا۔ شاید ایک پتھر کھانے کے بعد ہمیشہ کے لیے کہیں چلا گیا تھا۔

دو دن گزر گئے۔ جانوروں میں بھی چالاکی ہوتی ہے۔ وہ وقت اور حالات کے مطابق مختلف انداز میں اپنے شکار پر جھپٹتے ہیں۔ بلے کو یہ سمجھ آگئی تھی کہ وہ غراتے ہوئے جائے گا تو کامنا اور کلپنا دونوں ہی ہوشیار ہو جائیں گی' اس لیے وہ دبے پاؤں آیا۔ ٹوٹی ہوئی چھت کے اوپر رات بھر بیٹھا رہا۔ موقعے کا انتظار کرتا رہا۔ کامنا نے دونوں بچوں کو اپنے پاس سلا رکھا تھا۔ ٹھاکر گلاب سنگھ اس بات پر اعتراض کرتا تو وہ دونوں بچوں کو لے کر نیچے بستر بچھا کر سو جاتی تھی۔

صبح پانچ بجے ہلکی ہلکی سی روشنی ہونے لگی۔ اسی وقت کامنا نے نیند میں کروٹ بدلی۔ دونوں بچے جہاں سوئے تھے' وہاں سے منہ پھیر لیا۔ یہ سب کچھ نیند میں ہوا تھا لیکن بلے کو موقع مل گیا۔ اس نے چھت کے شگاف میں سے چھلانگ لگائی نیچے بچوں کے پاس پہنچا۔ پھر ایک کو دبوچ کر جیسے ہی بھاگنے لگا' کلپنا زور سے غرائی۔ اس پر جھپٹنے کے لیے دوڑی' اس کے ساتھ ہی کامنا کی بھی آنکھ کھل گئی۔

اس کی غراہٹ بتا رہی تھی کہ چھلپٹیا آگیا ہے۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھی' بلے کے پیچھے دوڑی مگر پچھلے تجربات نے سمجھا دیا تھا کہ صرف اس کے پیچھے دوڑنے سے کچھ نہیں ہو گا' وہ رک گئی۔ فوراً ہی پلٹ کر دیوار کی اس کھونٹی کی طرف آئی جہاں گلاب سنگھ کی وردی اور ہولسٹر لٹک رہا تھا۔ اس نے فوراً ہی ہولسٹر سے ریوالور نکالا اور دوڑتی ہوئی زور زور سے گالیاں دیتی ہوئی زینے سے اتر کر جانے لگی۔ گلاب سنگھ کی آنکھ کھل گئی تھی' اس نے جھنجلا کر پوچھا۔ "یہ اتنی صبح کیا ہو رہا ہے' کہاں بھاگی جارہی ہو؟"

اسے جواب نہیں ملا۔ چند لمحوں کے بعد ہی ٹھائیں سے گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔

وہ ایک دم سے اچھل کر بستر سے نیچے آیا۔

پھر ننگے پاؤں دوڑتا ہوا زینے کی طرف بھاگتے ہوئے چیخنے لگا۔ "کامنا! میرا ریوالور دے دو۔ خواہ مخواہ گولی نہ چلاؤ‘ ہمیں ایک گولی کا حساب دینا پڑتا ہے۔"

وہ بچوں کے ایک ایک سر کا حساب کرنے نکلی تھی‘ وہ دوڑتی چلی جارہی تھی۔ جب ٹھاکر گلاب سنگھ نچلے حصے میں پہنچا‘ تو وہ بہت دور نکل چکی تھی اور بلا اس سے بھی زیادہ دور بھاگتا ہوا نظر آرہا تھا۔ ٹھائیں کی آواز کے ساتھ ہی پھر ایک گولی چلی۔ ٹھاکر نے چیخ کر کہا۔ "رک جاؤ۔ میں کہتا ہوں‘ رک جاؤ۔ اب تم نے گولی چلائی تو ٹھیک نہیں ہو گا۔"

پہلے ہی کون سا ٹھیک ہو رہا تھا کہ وہ رک جاتی۔ وہ دوڑتی جا رہی تھی۔ اب سلسلہ یہ تھا کہ سب سے آگے بلا تھا‘ بلے کے پیچھے کامنا اور کامنا کے پیچھے ٹھاکر گلاب سنگھ۔ وہ تینوں ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر تھے۔ کھنڈر سے تقریباً فرلانگ کی دوری پر دریا کنارے مسان گھاٹ تھا۔ وہیں ایک چھوٹی سی جھونپڑی میں کیشو چنڈال رہا کرتا تھا۔ اپنا پیٹ بھرنے اور دارو پینے کے لئے بستی کی طرف ہاتھ جوڑ کر کہتا تھا۔ "ہے بھگوان! ایک مُردہ بھیج دے۔" اس کی روزی مرنے والوں سے وابستہ تھی۔

فائرنگ کی آواز سن کر وہ جھونپڑی سے نکل آیا تھا۔ پہلے تو اسے صرف بلا نظر آیا۔ اس نے دونوں بازو پھیلائے تو بلا اس کی آغوش میں چلا گیا۔ اس کے انداز سے پتا چلتا تھا کہ دونوں میں گہری دوستی ہے۔

ٹھائیں کی آواز کے ساتھ ہی بلا اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ پھر بھاگنے لگا۔ چنڈال نے کامنا کو دیکھتے ہی ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "مالکن! آپ‘ آپ گولی چلا رہی ہیں۔ تم سے میں نے کچھ نہیں کیا ہے میں تو.........."

وہ اپنی بات پوری نہ کر سکا‘ کیونکہ ریوالور کا رخ اسی کی طرف تھا۔ وہ فوراً ہی زمین پر اوندھے منہ گر پڑا اور گڑگڑا کر اپنی زندگی کی بھیک مانگنے لگا۔ دریا کنارے‘ مسان گھاٹ کے سناٹے میں پھر ایک بار فائرنگ کی زوردار آواز گونجی۔ اس کے ساتھ ہی بلا کئی فٹ اچھل کر پھر زمین پر آگیا۔ وہ ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔

کیشو چنڈال نے ایک ذرا سر اٹھا کر دیکھا ٹھاکر گلاب سنگھ نے کامنا کو پکڑ لیا تھا اور اس کے ہاتھ سے ریوالور چھیننے کے بعد اس کی پٹائی کر رہا تھا۔ وہ مار کھا رہی تھی اور ہنستی جا رہی تھی۔ ہنستے ہنستے کہتی جا رہی تھی۔ "میں نے مار ڈالا۔ اس ذلیل چھلپٹیے کو مار ڈالا۔

سن لے کیشو! ایک دن تیرا بھی کام تمام کردوں گی۔ زندہ رہنا چاہتا ہے تو کبھی کسی بچے کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھنا۔"

ٹھاکر گلاب سنگھ اسے مارتا جارہا تھا اور وہ بڑی خوشی سے مار کھاتی ہوئی کھنڈر کی طرف جارہی تھی۔ یہ اطمینان ہو گیا تھا کہ اب کوئی بلا کھنڈر میں نہیں آئے گا۔ کلپنا کا ایک بچہ زندہ سلامت رہ گیا تھا۔ اب اس پر کوئی آنچ نہیں آسکتی تھی۔

اطمینان تو ہو گیا تھا لیکن اب وہ پہلی جیسی خوشیاں نہیں رہی تھیں۔ نہ کامنا پہلے کی طرح ہنستی بولتی تھی‘ نہ ہی اس کے ہنسنے بولنے کے ردعمل میں کلپنا اچھلتی کودتی تھی‘ نہ شوخی دکھاتی تھی‘ نہ چہلیں کرتی تھی۔

اب کھنڈر کا ماحول واقعی کھنڈر ہو گیا تھا۔ اُداس اُداس اور پھیکا پھیکا سا۔ وہ ٹھاکر گلاب سنگھ سے ضد کرنے لگی تھی۔ "میں یہاں نہیں رہوں گی۔ مجھے کسی دوسرے شہر لے چلو۔ میرے ایک لاکھ روپے ہیں۔ ہمیشہ کہتے ہو کہ میرے لیے مکان بنوا رہے ہو‘ کہاں ہے مکان؟"

"ہم یہاں خشکی باغ میں ہی زمین لے کر بنوائیں گے۔"

"خشکی باغ میں ہی کیوں؟ پٹنہ میں کیوں نہیں؟"

"تم جانتی ہو‘ میرے بیوی بچے وہاں رہتے ہیں۔ میں ایک ہی شہر میں دو بیویوں کو نہیں رکھ سکتا۔ بھید کھل جائے گا۔"

"کب تک بھید بنا کر رکھو گے۔ آخر انتہا ہوتی ہے۔"

"میں دنیا والوں سے تمہیں چھپا کر رکھوں یا اشتہار بنا کر پھرتا رہوں‘ تمہیں بس اتنا سمجھنا چاہیے کہ تم سے بھرپور محبت کرتا ہوں۔ بلکہ اپنی دھرم پتنی سے زیادہ چاہتا ہوں۔ اپنے بچوں کو چھوڑ کر تمہارے پاس زیادہ رہتا ہوں۔"

"اس لیے رہتے ہو کہ یہاں تمہاری ڈیوٹی ہوتی ہے۔ تم محبت سے نہیں‘ ملازمت سے مجبور ہو کر رہتے ہو۔"

"تم ایسا سمجھتی ہو تو پھر سمجھتی رہو۔"

"میں بات بڑھانا نہیں چاہتی۔ چلیے‘ پٹنہ میں نہ سہی‘ کسی دوسرے شہر میں مکان بنوالیں۔"

"میں دو مختلف شہروں میں دو بیویوں کو نہیں رکھ سکتا۔ مجھے ہر ہفتے‘ ہر مہینے دونوں

شہروں کے چکر لگانے ہوں گے پھر تیسری جگہ جہاں ڈیوٹی ہو گی وہاں بھی رہنا ہو گا۔ تم مجھے دماغی سکون پہنچانے کے بجائے اور الجھا دینا چاہتی ہو۔"

"الجھاوے تم پیدا کر رہے ہو۔ سیدھا سا راستہ ہے' میں تمہاری پتنی ہوں۔ دنیا والوں سے نہ چھپاؤ' آخر اس میں برائی کیا ہے۔ ہم کوئی پاپ تو نہیں کر رہے ہیں۔"

وہ جھنجلا کر بولا۔ "ہم کوئی پاپ نہیں کر رہے ہیں لیکن فلمی شادیوں والی زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ بات ہم محبت کرنے والے تسلیم کرتے ہیں کہ دیوی ماں کے مندر میں جا کر اپنی شادی کر لینے سے شادی ہو جاتی ہے لیکن ہمارے پاس قانونی کاغذات نہیں ہیں۔ ہمارے پاس قانونی تحفظ نہیں ہے۔ ہمارے پاس سماج والوں کی رضا مندی کی سند نہیں ہے۔"

وہ ایک ٹک اسے دیکھ رہی تھی اور اس کی خوش فہمیاں ختم ہو رہی تھیں۔ اسے بڑا ناز تھا کہ وہ ٹھاکر گلاب سنگھ کی دھرم پتنی ہے۔ کوئی اس پر انگلی نہیں اٹھا سکتا۔ ایک دن ساری دنیا کو معلوم ہو گا۔ وہ ٹھاکر کے بچے کو گود میں لے کر بڑی سے بڑی سوسائٹی میں بڑے فخر سے کہہ سکے گی کہ وہ داروغہ ٹھاکر گلاب سنگھ کی دھرم پتنی اور اس کے بچے کی ماں ہے۔

آنکھوں پر خوش فہمی کی پٹی بندھی رہے تو حقیقت نظر نہیں آتی۔ اپنے دھرم کے مطابق مندر میں شادی کر لینے سے شادی بے شک ہو سکتی تھی لیکن قانونی تحفظ نہیں تھا۔ کامنا کے پاس ایسے قانونی کاغذات نہیں تھے۔ جن سے وہ خود کو داروغہ ٹھاکر گلاب سنگھ کی بیوی ظاہر کر سکتی۔ ایسے گواہ نہیں تھے جو بے جھجک کہہ سکتے کہ اس نے اپنے داروغہ کے ساتھ لگن منڈپ میں سات پھیرے لگائے ہیں اور دھرم کے مطابق اس کی دھرم پتنی بن گئی ہے۔

وہ غصے سے بولی۔ "میں تمہاری محبت میں اندھی ہو گئی تھی۔ مجھے خیال ہی نہ رہا کہ قانونی طور پر اپنا تحفظ کر لینا چاہیے۔ اب میں اس وقت تک تمہارے قریب نہیں آؤں گی' نہ ہی تمہیں آنے دوں گی جب تک قانونی طور پر شادی نہیں کرو گے۔"

اس نے یہ فیصلہ کرنے میں دیر کر دی کیونکہ جس رات اس نے یہ فیصلہ ٹھاکر کو سنایا' اس کی دوسری صبح اسے متلی ہونے لگی۔ سر چکرانے لگا۔ ذرا کمزوری سی محسوس ہوئی۔ اچھی خاصی طبیعت بگڑنے لگے تو پریشانی ہوتی ہے مگر وہ خوشی سے دیوانی ہو گئی۔

اسی دن کے لیے تو اس نے دعائیں مانگی تھیں۔

ٹھاکر گلاب سنگھ نے کہا۔ "میں تمہیں بستی میں نہیں لے جاتا' کسی ڈاکٹر کا سامنا کرانا نہیں چاہتا۔ تم اپنی حالت بتاؤ' میں دوا لے آؤں گا۔"

وہ سر پر آنچل رکھ کر شرمانے لگی۔ اس سے نظریں نہیں ملا رہی تھی۔ سر جھکائے ہوئے تھی۔ وہ حیرانی سے بولا۔ "یہ کیا بات ہوئی تم تو شرما رہی ہو۔"

وہ اس کی طرف آتے ہوئے' اسے چھونا چاہتا تھا۔ وہ کترا کر دور چلی گئی۔ بستر کے سرے پر بیٹھ گئی۔ وہاں بھی شرمانے کا انداز تھا۔ تب وہ چونک گیا۔ اس نے بے اختیار بلی کے بچے کو دیکھا۔ اس کا دل ڈوبنے لگا حالانکہ کامنا کی طبیعت بگڑ رہی تھی مگر وہ خود کو برسوں کا بیمار محسوس کرنے لگا۔ دوسری عورت سے اولاد ہونے کا مطلب یہ تھا کہ اب دوسری عورت کھنڈر والی زندگی پسند نہیں کرے گی۔ اپنے بچے کے لیے' اس کے مستقبل کی خاطر مطالبات شروع کر دے گی وہی جو پہلی بیوی کے مطالبات ہوتے چلے آئے ہیں۔

وہ خوب سمجھتا تھا کہ جب تک کامنا تنہا ہے' وہ زیادہ ہاتھ پاؤں نہیں پھیلائے گی۔ اس کی ضروریات محدود ہوں گی' تنہا عورت اپنے مرد کے پیار میں ساری عمر جنگل میں گزار سکتی ہے لیکن اولاد والی ہو تو انسانوں کی دنیا میں رہنے کی ضد کرتی ہے تاکہ اپنے آپ کو ایک ماں کی حیثیت سے منوا سکے اور اپنی اولاد کے لیے تمام دنیاوی حقوق حاصل کر سکے۔

ٹھاکر گلاب سنگھ کے لیے مشکل تھی۔ وہ اپنا نام اس کی اولاد کو نہیں دے سکتا تھا۔ وہ بیوی ہوتے ہوئے بھی بیوی نہیں تھی' ایسے مردوں کی زندگی میں یہ عجیب موڑ آتا ہے۔ وہ بیوی سے زیادہ اپنی دوسری عورت کو چاہتا ہے لیکن اولاد کی بات آئے تو پہلی بیوی کو ترجیح دیتا ہے' دوسری کو صرف حسین ماڈل اور پارٹ ٹائم محبت بنا کر رکھنا چاہتا ہے۔

وہ ڈیوٹی پر جانے کے لیے وردی پہن چکا تھا۔ اس نے ہولسٹر سے ریوالور کو نکالا۔ پھر اس کے چیمبر میں ایک ایک گولی ڈالنے لگا۔ جب سے کامنا نے اس کے ریوالور سے گولیاں چلائی تھیں' تب سے وہ کامنا کے پاس آنے کے بعد وردی کو کھونٹی سے لٹکاتا تھا۔ پھر ریوالور کے چیمبر کو بھی خالی کر دیتا تھا اور دوسری صبح ڈیوٹی پر جاتے وقت اسے لوڈ کر لیتا تھا۔

اس ریوالور کو لوڈ کرتے ہوئے اس نے کامنا کی طرف گہری نظروں سے دیکھا' پھر کہا۔ "اس کی کیا ضرورت ہے۔ میں کئی بار سمجھا چکا ہوں' عورت جب تک ماں نہیں بنتی' اس وقت ایک حسین مورت ہوتی ہے۔ مرد اس کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے۔ میری پہلی بیوی کی مثال تمہارے سامنے ہے' وہ ہر دوسرے تیسرے برس بچے پیدا کرتی ہے اور اپنے آپ کو تباہ کرتی چلی جاتی ہے' اس کا جسم ڈھانچہ بن گیا ہے۔ صحت نام کو نہیں ہے۔ حسن کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' جو عورت اپنے حسن و شباب کو سنبھال کر نہیں رکھتی' اس کا گھر والا دوسری طرف ضرور بہکتا ہے' جیسا کہ میں بہک کر تمہاری طرف آگیا۔ کیا تم چاہتی ہو کہ تم سے منہ موڑ کر کسی اور طرف بہک جاؤں؟"

"تم جتنی بھی لمبی تقریر کر لو۔ عورت کی عظمت صرف شریک حیات بننے میں نہیں' اپنے جیون ساتھی کے بچوں کی ماں بننے میں بھی ہے۔ تم مجھے حسن و شباب سے تسخیر کرنے کا سبق پڑھا رہے ہو' جبکہ ہر عورت اپنے بچوں کو زنجیر بنا کر مرد کے پاؤں میں ڈال دیتی ہے۔ بے شک تم میرے دیوانے بن کر چلے آتے ہو لیکن یہ حسن' یہ شباب کس کام کا' جبکہ وہ زنجیریں تمہیں پہلی دھرم پتنی کی طرف کھینچ لیتی ہیں۔ میرے بھی نصیب جاگ رہے ہیں۔ مجھے بھی ایک ایسی زنجیر ملنے والی ہے۔ تم اس پر اعتراض نہ کرنا' ورنہ اچھا نہیں ہو گا۔"

"تم مجھے دھمکی دے رہی ہو؟"

"نہیں' میں محبت سے سمجھا رہی ہوں اور یہ تم اچھی طرح جانتے ہو' میں ان عورتوں میں سے نہیں ہوں جو صرف محبت سے سمجھا کر رہ جاتی ہیں۔"

وہ غصے سے پاؤں پٹختا ہوا اس کے سامنے آیا۔ پھر ریوالور کی نال کو اس کی پیشانی سے لگاتے ہوئے بولا۔ "تم مجھے یہ سمجھانا چاہتی ہو کر دوشوہروں کی طرح مجھے بھی ٹھکانے لگا دوگی۔ تم بہت خوش فہمی میں مبتلا ہو۔"

اس نے ریوالور کی نال کو ایک چٹکی میں پکڑا۔ پھر اسے پیشانی کے پاس سے ہٹا کر ذرا دور کیا۔ اس کے بعد مستحکم لہجے میں کہا۔ "تم میری محبت ہو' میری زندگی ہو' میرا سہاگ ہو۔ میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گی لیکن میرے بچے کی زندگی میں اگر کوئی چھلپٹیا آیا تو........"

اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی اور جس چٹکی سے ریوالور کی نال کو ہٹایا تھا' وہ

چٹکی بجادی۔ اس انداز نے سمجھا دیا کہ وہ کسی بھی چھلپٹیے کو چٹکی میں اُڑادے گی۔ ایسا اشارتی انداز اختیار کرتے وقت اس کی نظروں میں بھرپور محبت اور وفا تھی اور اس کے پیچھے چھپا چھپا سا ایک چیلنج بھی تھا۔

داروغہ ٹھاکر گلاب سنگھ نے دانت پیستے ہوئے اسے دیکھا پھر ریوالور کو ہولسٹر میں رکھتے ہوئے زینے کے پاس آیا' وہاں سے پلٹ کر بولا۔ "اپنا خیال رکھنا' میں بستی سے دائی ماں کو بھیج دوں گا۔"

وہ پاؤں پٹختا ہوا' زینے سے اترتا ہوا جانے لگا۔ کامنا نے کلپنا کو اس کے بچے کے پاس سے اٹھایا۔ اپنی آغوش میں لے کر اسے سہلاتے ہوئے اور پچکارتے ہوئے بولی۔ "کیا یہ میرے لیے بستی سے دائی ماں کو بھیجے گا؟ تو بول نہیں سکتی مگر میری باتوں کو' میرے ارادوں کو سمجھتی ہے۔ جا کم از کم اس دائی ماں کا گھر دیکھ آ۔ میں تیرے بچے کا خیال رکھوں گی۔"

اس نے کلپنا کو چھوڑ دیا۔ وہ دوڑتی ہوئی دوسری منزل کے چھجے پر آئی' پھر وہاں سے چھلانگ لگا کر نیچے پہنچ گئی۔ اس سے پہلے کہ ٹھاکر گلاب سنگھ جیپ کی اسٹیرنگ سیٹ پر آکر بیٹھتا' وہ پچھلی سیٹ پر آئی اور دو سیٹوں کے درمیان دبک کر بیٹھ گئی۔

کامنا اس کے بچے کو گود میں لے کر چھجے کے پاس آگئی تھی اور دور جاتی ہوئی جیپ کو دیکھ رہی تھی۔ بستی وہاں سے زیادہ دور نہیں تھی۔ تقریباً چالیس منٹ میں ہی کلپنا واپس آگئی۔ اس نے بچے کو اس کے سامنے فرش پر چھوڑتے ہوئے پوچھا۔ "ہمارے صاحب کہاں گئے تھے؟ کسی دائی ماں سے بات کی ہے؟"

اس نے میاؤں کہا۔ کامنا مسکرا کر اس کے سر کو سہلانے لگی' پھر اسے چوم کر بولی۔ "بس اتنا ہی کافی ہے۔ وہ دائی ماں کے بدلے ڈائن نکلی تو میں اس کا گھر سے نکلنا ہی مشکل کردوں گی۔"

تھوڑی دیر بعد ہی نیچے سے ایک بوڑھی عورت کی آواز سنائی دی۔ "مالکن بیٹی کہاں ہو تم! داروغہ صاحب نے مجھے بھیجا ہے۔"

وہ چھجے پر آئی۔ دیکھا تو ایک بوڑھی عورت لاٹھی ٹیکے کھڑی ہوئی تھی۔ پیشانی پر دوسرے ہاتھ کا چھجہ بنا کر اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ کامنا نے کہا۔ "تم دائی ماں ہو تو سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آجاؤ۔"

اس بڑھیا کو سیڑھیاں چڑھنے میں پندرہ منٹ لگ گئے۔ وہ اوپر پہنچ کر ہانپتے کانپتے ہوئے بولی۔ "ارے بیٹا! تو سچ مچ چاند کا ٹکڑا ہے۔ معلوم ہوتا ہے' اس ویرانے میں ایک اپسرا آکاش سے اتر آئی ہے۔ معلوم ہے' بستی کے لوگ تیرے بارے میں خوب باتیں کرتے ہیں مگر کسی کی مجال نہیں ہوتی جو اونچی آواز میں کچھ کہہ دے۔ سب داروغہ صاحب سے ڈرتے ہیں۔"

کامنا نے تجسس سے پوچھا۔ "بستی والے میرے متعلق کیا کہتے ہیں؟"

"اے بیٹی! اور کیا کہیں گے۔ جتنے منہ اتنی باتیں' کوئی کہتا ہے' داروغہ صاحب نے تجھ سے شادی کی ہے۔ کوئی کہتا ہے' بس یونہی رکھ چھوڑا ہے مگر ایک بات سبھی کہتے ہیں کہ تیری ایسی سندر ناری نہ تو گنگا کے اس پار دیکھی نہ اُس پار۔"

کامنا نے حیرانی سے پوچھا۔ "مگر کس نے مجھے دیکھا ہے؟ اِدھر تو کوئی نہیں آتا۔ سب داروغہ صاحب سے ڈرتے ہیں۔"

"ڈرتے ضرور ہیں مگر جس بات کو بھید بنا کر رکھو' بھیدی وہاں تک پہنچ ہی جاتے ہیں۔ یہاں دور دور تک کتنے ہی درخت ہیں۔ بڑی بڑی گھنی جھاڑیاں ہیں۔ چھپ کر دیکھنے والوں نے تجھے کتنی ہی بار دیکھا ہے۔ مگر جس سے پوچھو' وہ یہی کہے گا کہ اس نے کچھ نہیں دیکھا۔"

کامنا نے خوش ہو کر کہا۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ داروغہ صاحب نے مجھے یہاں چھپا کر رکھا ہے مگر دنیا والے جانتے ہیں۔"

"جانتے ہیں' سب جانتے ہیں۔ تو فکر نہ کر' تیرے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں ہوگی۔ چل بستر پر لیٹ جا۔"

وہ بستر پر لیٹ گئی' جب دائی ماں اس کا معائنہ کرنے کے لیے قریب آنے لگی تو اچانک کلپنا غرائی۔ اپنے بدن میں ایسا کھنچاؤ پیدا کیا جیسے اب تب میں چھلانگ لگا کر بڑھیا کو پنجہ مارنے والی ہو۔ اس سے پہلے ہی کامنا نے کروٹ بدل کر اسے دبوچ لیا۔ پھر اس سے پوچھا۔ "یہ کیوں غرا رہی ہے؟"

دائی ماں نے سہم کر کہا۔ "بیٹی! مجھے اس ڈر لگ رہا ہے۔"

"اگر تم دشمن بن کر نہیں آئی ہو تو ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ تمہیں نقصان نہیں پہنچائے گی لیکن یاد رکھو' تم نے مجھے یا میرے ہونے والے بچے کو نقصان

پہنچانے کی کوشش کی تو میں داروغہ سے کچھ کم نہیں ہوں۔"

"پہلے مجھے دیکھ لینے دو۔ تم گربھ وتی ہو یا نہیں۔ پھر تمہاری بات کا جواب دوں گی۔"

اس نے کہا۔ "کلپنا! اپنے بچے کے پاس جا۔ کوئی شرارت نہ کرنا۔"

وہ بچے کے پاس چلی گئی۔ اس سے دل بہلانے لگی۔ کبھی کبھی سر گھما کر تیز نظروں سے دائی ماں کو بھی دیکھ لیتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد بڑھیا نے کہا۔ "ہاں بیٹا! تُو ماں بننے والی ہے' بھگوان کرے' چاند سا بیٹا ہو۔"

وہ خوشی سے کھل گئی۔ آہستگی سے اٹھ کر بولی۔ "تُو سچ کہہ رہی ہے دائی ماں؟"

"میں جھوٹ نہیں کہوں گی مگر بیٹی' میری جان سُولی پر لٹکی ہوئی ہے۔ مجھے جھوٹ کہنے پر مجبور کیا جارہا ہے۔"

"کیسا جھوٹ؟ کیا ابھی جو کچھ تم نے کہا ہے' وہ جھوٹ ہے؟"

"نہیں بیٹی نہیں۔ ابھی میں نے سچ کہا ہے لیکن ہاتھ جوڑ کر التجا کرتی ہوں' جو کچھ کہہ رہی ہوں وہ داروغہ صاحب کو نہ بتانا۔"

"میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔ تجھ پر کوئی آنچ نہیں آنے دوں گی' جو سچ ہے' وہ اُگل دے۔ دیر نہ کر۔ کوئی بات میرے مزاج کے خلاف ہو اور وہ منہ سے نکلتے نکلتے رہ جائے تو مجھے غصہ بہت آتا ہے' جلدی سے بول۔"

"داروغہ صاحب نے کہا ہے' میں تجھے اچھی طرح دیکھ بھال کے کہہ دوں کہ تم ماں بننے والی نہیں ہو۔"

"وہ ایسا کیوں چاہتے ہیں؟"

"وہ چاہتے ہیں' پہلے میں تمہیں دھوکے میں رکھوں کہ ماں نہیں بنوگی۔ پھر میں تمہیں سبز باغ دکھاؤں گی' کچھ ایسی دوائیں کھانے کے لیے دوں گی جن کے اثر سے تمہارا بانجھ پن ختم ہو جائے گا اور تم ماں بن جاؤ گی۔"

"اور وہ دوائیں کیسی ہوں گی؟"

"وہ بہت گرم دوائیں ہیں۔ تم سمجھ سکتی ہو' انہیں کھانے سے کیا ہو گا؟ وہ معصوم جو تمہاری گود میں آنے والا ہے' کبھی نہیں آئے گا۔"

اس نے غصے سے دونوں مٹھیاں بھینچ لیں۔ غضب ناک نظروں سے خلا میں تکنے

لگی۔ دائی ماں نے اس کے پاؤں پکڑ لیے' گڑگڑا کر کہنے لگی۔ "داروغہ صاحب کو معلوم ہو گا کہ میں نے ان کی بات نہیں مانی ہے اور تمہیں سچ سچ بتا دیا ہے تو مار ڈالی جاؤں گی۔ اس بڑھاپے میں مرنے سے تو نہیں ڈرتی مگر وہ لوگ جو ظلم کریں گے' وہ اس عمر میں برداشت نہیں کر سکوں گی۔ بیٹی! ہم غریب آدھا کھاتے ہیں' آدھا پہنتے ہیں۔ زندہ رہتے ہیں مگر آدھی زندگی گزارتے ہیں۔ صرف مرتے وقت سکون سے مرنا چاہتے ہیں۔"

کامنا نے غصے کو ضبط کرتے ہوئے ایک گہری سانس لی' پھر کہا۔ "تعجب ہے' تم ڈرتی بھی ہو اور سچ بھی بولتی ہو۔ آخر تم نے مجھ سے اتنی ہمدردی کیوں کی۔ تم جھوٹ بھی بول سکتی تھیں۔ میرے بچے کو نقصان پہنچا سکتی تھیں؟"

اس بوڑھی عورت نے ایک سرد آہ بھری۔ پھر فرش پر بیٹھ گئی۔ اس کے بعد سر جھکا کر بولی۔ "میری بیٹی نے ایک بیٹے کو جنم دیا تھا۔ یہ کوئی سال بھر پہلے کی بات ہے۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"ایک روز مسان گھاٹ کے قریب اس معصوم بچے کی لاش ملی۔ اس لاش کا سر نہیں تھا۔ کوئی چھلپٹیا لے گیا تھا۔"

اس نے سر اٹھا کر کامنا کی طرف دیکھا۔ اس کی بوڑھی آنکھیں ویران اور خشک تھیں۔ سارے آنسو ختم ہو چکے تھے۔ وہ بوڑھی لرزتی ہوئی آواز میں بول رہی تھی۔ "بیٹی! چھلپٹیا صرف اس کو نہیں کہتے جو دارو کے نشے میں بچوں کی گردنیں اتارتا ہے اور ان کی کھوپڑیوں کی تجارت کرتا ہے۔ چھلپٹیا وہ بھی ہے جو اپنی بدنامی سے ڈرتا ہے اور اپنے بچے کو اپنا نام نہیں دینا چاہتا ہے' چھلپٹیا وہ بھی ہے بیٹی۔"

وہ بوڑھے کمزور ہاتھ جوڑ کر التجا کرنے کے لہجے میں بولی۔ "میری ایک بات مان لے۔ یہ جگہ چھوڑ دے' کہیں دور چلی جا۔"

اس نے بوڑھی عورت کے دونوں ہاتھ تھام کر کہا۔ "میں ان عورتوں میں سے نہیں ہوں جو کسی مرد کے خوف سے اپنی جگہ چھوڑ دیتی ہیں یا ڈر کے مارے پیچھے ہٹ جاتی ہیں۔ میں یہیں رہوں گی۔ تم پر بھی کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ انہوں نے تم سے کیا کہا ہے' وہ دوائیں کب کھانے کے لیے دو گی؟"

"انہوں نے مجھ سے کہا تھا' پہلے تمہیں خوب یقین دلاؤں کہ میری دواؤں سے بانجھ پن ختم ہو جائے گا۔ جب تم دوائیں کھانے کے لیے راضی ہو جاؤ گی تو میں کہوں گی' بستی

جا رہی ہوں۔ دوائیں میرے گھر میں رکھی ہوئی ہیں۔ وہ داروغہ صاحب کے ہاتھ بھیج دوں گی۔"

"تم یہی کرنا۔ وہ دوائیں داروغہ صاحب کے ہاتھ میں دے دینا' تمہارا کام ختم ہو جائے گا۔"

"میں کس دل سے وہ دوائیں دوں۔ کیا تم انہیں استعمال کرو گی؟"

اس نے کلپنا کو بازوؤں میں اٹھا کر اسے سہلاتے ہوئے کہا۔ "میری سہیلی میری جان! داروغہ صاحب مجھے اپنے ہاتھوں سے دوا کھانے کے لیے دیں گے۔ کیا تو مجھے کھانے دے گی اور اگر نہیں دے گی تو کیا کرے گی؟"

اس نے "میاؤں" کہا اور اپنے جسم میں کھنچاؤ پیدا کرنے لگی۔ کامنا نے کہا۔ "دائی ماں' اُدھر وہ ایک پیالہ رکھا ہوا ہے' اسے لے آؤ۔ پھر میرے پاس آ کر اس پیالے کو میری طرف بڑھاتے ہوئے بولو کہ یہ دوا ہے اور مجھے کھا لینا چاہیے۔"

دائی ماں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر وہی کیا جس کی ہدایت کی گئی تھی۔ وہ ایک پیالہ اٹھا کر لے آئی۔ اس کے سامنے پہنچ کر پیالے کو بڑھاتے ہوئے بولی۔ "یہ دوا ہے۔ لو اسے پی لو۔"

کامنا نے کہا۔ "کلپنا! یہ داروغہ صاحب مجھے دوا دے رہے ہیں۔"

یہ کہتے ہی اس نے کلپنا کو چھوڑ دیا۔ اس نے یکبارگی چھلانگ لگائی۔ فضا میں جیسے پرواز کرتی ہوئی پیالے تک پہنچی۔ پنجہ مار کر اسے گرایا۔ پھر دوسری طرف فرش پر جا کر بیٹھ گئی۔

☆======☆======☆

وہ پیالہ زمین پر گرا پڑا تھا۔ اس میں جو دوا تھی' وہ فرش پر بہہ رہی تھی۔ داروغہ ٹھاکر گلاب سنگھ نے غصے سے پاؤں پٹختے ہوئے کلپنا کی طرف دیکھا۔ پھر کامنا سے جھنجلا کر کہا۔ "میں اس بلی کو گولی مار دوں گا۔"

"تعجب ہے' ایک ذرا سی دوا گرا دینے پر تم گولی مار دو گے۔ اس نے کون سا جرم کیا ہے؟"

"دائی ماں نے بڑی محنت سے یہ دوا تیار کی ہے' کہہ رہی تھی' اسے برابر استعمال کرتی رہو گی تو بانجھ پن ختم ہو جائے گا۔ اب اس میں سے ایک خوراک ضائع ہو چکی

ہے۔"

"دوسری، تیسری خوراک تو موجود ہے۔"

اس نے پیالے کو اٹھالیا۔ غصے سے کلپنا کی طرف دیکھا۔ پھر مٹکے کے پاس جاکر پیالے میں تھوڑا سا پانی لیا۔ اس پانی میں دوسری دوا کا سفوف حل کیا، پھر اسے لے کر کامنا کی طرف آنے لگا۔ اسی وقت کلپنا غرانے لگی۔ اپنے جسم میں کھنچاؤ پیدا کرنے لگی۔ وہ ایک دم سے ٹھٹک کر بولا۔ "دیکھو، دیکھو، یہ پھر وہی حرکت کرنے والی ہے۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

کامنا نے بڑے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ "ٹھاکر! جانوروں کی حس ہم سے تیز ہوتی ہے، جس خطرے کو ہم سمجھ نہیں پاتے، یہ فوراً سمجھ لیتے ہیں۔ وہ بوڑھی دائی مجھے ایک ذرا اچھی نہیں لگی۔ میں کلپنا کی یہ حرکتیں دیکھنے کے بعد یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ یہ دوا میرے لیے مناسب نہیں ہے یا پھر اس میں ایسی کوئی بات ہے جسے کلپنا پسند نہیں کرتی اور جب یہ پسند نہیں کرتی تو پھر میں کیسے پسند کر سکتی ہوں، میں اسے استعمال نہیں کروں گی۔"

وہ غصے میں آگے بڑھا۔ "کیا تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے؟"

اس کے بعد اور آگے بڑھ کر کچھ نہ بول سکا۔ کلپنا نے فوراً ہی چھلانگ لگائی تھی۔ فضا میں جیسے اڑتے ہوئے اس نے پیالے پر پنجہ مارا اور دوسری طرف فرش پر جاکر بیٹھ گئی۔ ٹھاکر گلاب سنگھ کے منہ سے گالیاں نکلنے لگیں۔ وہ ایک دم سے اس کی طرف لپکا مگر وہ کہاں ہاتھ آنے والی تھی۔ فوراً ہی پلٹ کر وہاں سے بھاگی۔ ٹھاکر نے فوراً ہی ہولسٹر کی طرف ہاتھ لے جاکر ریوالور نکالنا چاہا مگر کامنا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "ٹھاکر! میری کلپنا کو نقصان پہنچانے سے پہلے ایک بات سن لو۔"

وہ جھنجلا کر بولا۔ "کیا ہے؟"

"میں ماں نہیں بننا چاہتی۔"

وہ ایک دم سے ٹھنڈا پڑ گیا۔ تعجب سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "یہ کیا کہہ رہی ہو؟"

"تم بھی تو ہمیشہ یہی سمجھایا کرتے تھے، مجھ سے اولاد ہوگی تو وہ تمہاری بدنامی کا سبب ہوگی۔ تم نے مجھے دنیا والوں سے چھپا کر رکھا ہے، اولاد کا چھپانا مشکل ہو جائے گا۔ میں تمہاری بات مانتی ہوں۔ جب دائی ماں کہہ چکی ہے کہ میں بانجھ ہوں، ماں نہیں بن سکتی تو

پھر ماں بننے کے لیے دوائیں کھانے کی کیا ضرورت ہے۔ میں بانجھ رہوں گی۔ غصہ تھوک دو۔"

ٹھاکر گلاب سنگھ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اب وہ کیا کہے اس نے گرے ہوئے پیالے کو اور بہتی ہوئی دوا کو دیکھا۔ اگر وہ کہتا کہ بچے کی ضرورت ہے تو اب وہ بچے سے انکار کر رہی تھی اور اگر وہ کہتا کہ ٹھیک ہے، تم بانجھ رہو، بچے کی ضرورت نہیں ہے تو وہ درحقیقت بانجھ کہاں تھی، وہ تو اس کے بچے کی ماں بننے والی تھی اور اس دوا کو استعمال کرانا لازمی تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا بستر کے پاس آگیا۔ اس کے سرے پر بیٹھ کر سر جھکائے ہوئے بولا۔ "پہلے میں غلطی پر تھا، تم مجھ سے اتنی محبت کرتی ہو۔ میں تمہاری گود میں اپنی محبت کی نشانی دیکھنا چاہتا ہوں۔ رات کو کلپنا سو جائے گی تو میں چپکے سے دوا بنا کر لاؤں گا، تم اسے پی لینا۔"

"میں اس دوا کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گی، میری کلپنا اسے دوبار گرا چکی ہے۔ ضرور اس میں کوئی بھید ہے۔"

وہ پھر غصے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ میں تم سے دشمنی کر رہا ہوں، تمہیں نقصان پہنچانا چاہتا ہوں؟"

"تم مجھے نقصان نہیں پہنچاؤ گے لیکن انجانے پن میں ایسا کر سکتے ہو۔ وہ بڑھیا کوئی غلط دوا دے سکتی ہے، بلکہ اس نے دی ہے۔"

اس نے طیش میں آکر اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ پھر تمام دواؤں کی پڑیاں دور پھینکتے ہوئے کہا۔ "تم اور تمہاری بلی جہنم میں جاؤ۔ میں تمہاری بھلائی چاہتا تھا۔ تم میرے بچے کی ماں نہیں بننا چاہتیں، اچھا ہے نہ بنو۔"

وہ تلملاتا رہا، غصہ دکھاتا رہا۔ وردی اتار کر اس نے دوسرا لباس پہنا۔ اس نے رات کو کھانے کے لیے پوچھا۔ اس نے جھڑک دیا۔ اس کے باوجود وہ کھانے کے برتن اٹھا کر اس کے پاس آئی۔ پھر کہا۔ "تم نہیں کھاؤ گے تو میں بھوکی رہوں گی۔ اب غصہ تھوک دو، آؤ کھالو۔"

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر ایک زور کی ٹھوکر کھانے کے برتنوں پر مار دی۔ وہ برتن دور تک اڑتے ہوئے گئے اور اِدھر اُدھر ہو گئے۔ کلپنا اپنے بچے کے ساتھ بیٹھی ہوئی یہ تماشا دیکھ رہی تھی۔ داروغہ نے غصے سے جھنجلا کر کہا۔ "دیکھو، اب کس طرح چپ چاپ

بیٹھی ہوئی ہے۔ میں تم پر غصہ دکھا رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے، تم پر ہاتھ بھی اٹھاؤں لیکن وہ غرا کر مجھ پر حملہ نہیں کرے گی۔ جب یہ تمہیں کوئی نقصان پہنچتے نہیں دیکھ سکتی اور دوا سے تمہیں بچانا چاہتی ہے تو میرے غصے اور میری مار سے بچانے کیوں نہیں آتی؟"

"یہ بڑا بھلا خوب سمجھتی ہے۔ شاید ہمارے رشتے اور ہماری محبت کو بھی سمجھتی ہے اور جانتی ہے کہ مرد اپنی عورت کو غصے میں مارتے ہیں تو اس مار میں پیار بھی ہوتا ہے۔ یہ بے چاری تمہارے خلاف نہیں ہے۔ یہ تو اس بوڑھی دائی ماں کے خلاف ہے۔ اس نے ضرور کوئی خطرہ محسوس کیا ہے۔ اسی لیے مجھے دوا پینے سے روک رہی ہے۔"

اس نے حقارت سے کلپنا کو دیکھا پھر بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ رات کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ بڑی دیر تک جاگتا رہا، کروٹیں بدلتا رہا۔ پھر اچانک ہی اس کا غصہ ختم ہو گیا۔ اس نے محبت سے کامنا کو مخاطب کیا۔ "میں تمہارے پاس رہ کر زیادہ دیر غصے میں نہیں رہ سکتا۔ تم میں جادو بھرا ہوا ہے۔"

اس نے دل ہی دل میں کہا۔ "میں نادان نہیں ہوں۔ مگر ہاں، مجھ میں جادو بھرا ہوا ہے۔ یہ جادو نو ماہ کے بعد سر چڑھ کر بولے گا۔"

دوسری شام وہ ڈیوٹی سے واپس آیا تو اس کے ہاتھوں میں ایک چھوٹی سی مٹی کی ہانڈی تھی۔ اس ہانڈی کو کیلے کے پتے سے ڈھانپ کر لایا تھا۔ اس نے اوپر پہنچتے ہی کہا۔ "بڑی مزے دار ربڑی لایا ہوں، کھاؤ گی تو انگلیاں چاٹتی رہ جاؤ گی۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی غراہٹ کی آواز سنائی دی۔ کلپنا آہستہ آہستہ فرش پر چلتے ہوئے ایک طرف یوں جا رہی تھی جیسے اس ہانڈی پر چھلانگ لگانے کے لیے کوئی مناسب جگہ یا مناسب موقع دیکھ رہی تھی۔

داروغہ ٹھاکر گلاب سنگھ نے غصے سے دہاڑتے ہوئے کہا۔ "آج میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اگر اس نے میری ہانڈی کو گرایا۔ ربڑی کو نقصان پہنچایا تو میں، میں..........."

"ٹھاکر! غصہ نہ دکھاؤ، بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔"

"کیا سمجھنے کی کوشش کروں؟"

"یہی کہ میں میٹھا نہیں کھاؤں گی۔"

"تم تو بڑے شوق سے کھایا کرتی ہو۔"

"لیکن ان حالات میں میٹھا کھانے سے اور متلی ہوتی ہے۔"

وہ حیرانی سے بولا۔ "کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ تمہاری وہ دائی ماں فراڈ ہے۔ اس نے مجھ سے اور تم سے غلط کہا کہ میں ماں بننے والی نہیں ہوں۔ آج صبح سے تین بار متلی محسوس ہوئی۔ میں جو کھاتی ہوں، الٹ کر باہر آ جاتا ہے۔ میرا سر چکرانے لگتا ہے، میں کمزوری محسوس کر رہی ہوں۔ یہ تمام آثار بتا رہے ہیں کہ تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔ اس لیے ایسی چیزیں نہ لایا کرو۔"

وہ غصے سے پاؤں پٹختا ہوا چھجے کے پاس گیا۔ پھر وہاں سے ہانڈی کو اٹھا کر زور سے باہر پھینک دیا۔ اس کے بعد پلٹ کر بولا۔ "میں تمہارے لیے زہر لایا تھا۔ اچھا ہوا، تم نے نہیں کھایا۔ اب تو تمہیں اطمینان ہو گیا۔"

کامنا نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ اسے ہی کہنے اور بڑبڑاتے رہنے دیا تاکہ غبار نکل جائے۔ یوں بھی مرد کا غصہ گرجتے ہوئے بادل کی طرح ہوتا جو بہت کم برستا ہے۔

اب تو ٹھاکر گلاب سنگھ کا یہ معمول بن گیا تھا۔ کبھی غصہ دکھاتا تھا اور کبھی نرم پڑ جاتا تھا۔ دوسرے، تیسرے دن کامنا کے لیے کچھ کھانے کے لیے ضرور لاتا تھا اور کہتا تھا۔ "تمہیں میٹھی چیزیں پسند نہیں ہیں تو آلو مصالحے کی چاٹ کھا لو۔ دہی بڑے کھاؤ۔ میں تمہارے لیے بڑی محبت سے لایا ہوں۔"

اب کامنا بھی صاف صاف کہنے لگی تھی۔ "میں تمہاری لائی ہوئی کوئی چیز استعمال نہیں کروں گی۔ کلپنا کو یہ پسند نہیں ہے۔ جو اسے پسند نہیں ہے، وہ مجھے پسند نہیں ہے، یہ جس پر اعتماد نہ کرے، میں اس پر اعتماد نہیں کر سکتی۔"

"تو پھر میرے پاس کیوں ہو۔ جاؤ اسی بلی کے ساتھ زندگی گزارو۔"

"تم میرے سب کچھ ہو، میں نے تمہیں جتنا چاہا ہے، شاید کسی کو اتنی چاہت نہیں دی۔ اب تو تم میرے ہونے والے بچے کے باپ بھی ہو، میں تمہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتی۔"

"میں تمہیں چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔"

"کہاں جا سکو گے، کتنی دور جا سکو گے۔ میرا بچہ تمہارے ہی نام سے پرورش پاتا رہے گا۔ کہیں بھی جا کر دیکھ لو۔"

اس رات ٹھاکر اپنے بستر پر گم صم لیٹا رہا۔ آنکھیں پھاڑے چھت کے ٹوٹے ہوئے حصے کو دیکھتا رہا جس کے آرپار آسمان دکھائی دے رہا تھا۔ وہ چپ چاپ اپنے جذبوں کو تول رہا تھا۔ "کیا کامنا کو چھوڑ سکتا ہے۔ اسے ہمیشہ کے لیے ختم کر سکتا ہے۔ یہ مٹ جائے گی تو وہ ہونے والا بچہ بھی مٹ جائے گا۔ بدنامی کا خوف نہیں رہے گا' پہلے کی طرح عزت بنی رہے گی۔"

لیکن نہیں' وہ کامنا کو مٹا نہیں سکتا تھا۔ کیا رنگ تھا' کیا روپ تھا کہ وہ کھنڈر اندر سجا لگتا تھا۔ اس کے بعد کوئی عورت دل کو بھاتی نہیں تھی' کسی پر دل نہیں آتا تھا۔ وہ دو چار روز کے لیے پہلی پتنی کے پاس جاتا تو اپنا دل اور دماغ کامنا کے پاس ہی چھوڑ کر جاتا۔ خواہ وہ اپنی دھرم پتنی کے پاس رہے یا ڈیوٹی کے وقت کام زیادہ رہے' ہر کام میں کامنا یاد آتی رہتی تھی۔ وہ اسے چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ اس حسین مجسمے کو توڑ نہیں سکتا تھا۔

کوئی چیز پسند ہو اور وہ بگڑتی جا رہی ہو تو اسے توڑا نہیں جاتا بس بگڑنے والی کی مرمت کی جاتی ہے' اسے تھوڑا سا نقصان پہنچایا جاتا ہے تاکہ اپنا بچاؤ ہو سکے اور کامنا کو بس اتنا ہی نقصان پہنچانا تھا کہ وہ ماں نہ بن سکے۔

اس کے دماغ میں ایک ہی بات بنی ہوئی تھی کہ بچہ پیدا نہ ہونے پائے۔ وہ پیدا ہو گا' دنیا میں آئے گا تو یہ باپ کی حیثیت سے اپنے بچے کو مار نہیں سکے گا۔ اس سے کسی طرح بھی دشمنی نہیں کر سکے گا۔ ہاں' پیدا ہونے سے پہلے کی بات اور ہے۔ جب قانونی طور پر منصوبہ بندی کے ذریعے اور غیر قانونی طور پر دواؤں کے ذریعے بچوں کو پیدا ہونے سے پہلے روکا جا سکتا ہے تو وہ اپنے ہونے والے بچے کو کیوں نہ روکتا۔

اس کے اندر کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ وہ جلد سے جلد یہ معاملہ ختم کرنا چاہتا تھا۔ جس بچے کی ضرورت نہ ہو' اسے کسی طرح بھی روکا جا سکتا ہے اور روکنے کے لیے فوری طور پر کوئی قدم اٹھانا ضروری تھا۔

اس نے اب تک جو اقدامات کیے تھے' ان میں ناکام رہا تھا۔ اب کامنا کا سامنا کچھ یوں نظر آتا تھا جیسے خطرے کا سگنل دکھائی دے رہا ہو۔ دوسری صبح وہ ڈیوٹی پر جانے کے لیے کھنڈر سے روانہ ہوا۔ راستے میں چنڈال چوکڑی کے دو بدمعاش نظر آئے۔ انہوں نے جھک کر سلام کیا۔ اس نے جیپ روک کر اترتے ہوئے پوچھا۔ "کہاں سے آ رہے ہو اور کہاں جا رہے ہو؟"

"حجور! ہم پرسوں پورنیہ گئے رہیں' سیٹھ کیلاش چند کے ہاں ڈاکا ڈالے رہیں۔ اوبس دیکھنے سننے بھر کا سیٹھ رہا۔ دوئی ہجار نقد اور کچھ سونے کا زیور ہمرے ہاتھ لگا ہے۔"

"زیورات کی مالیت کیا ہو گی؟"

"ہم ٹھیک سے کہہ نہیں سکتے۔ یہی کوئی دس بھری سونا ہوئی گا۔"

"کسی نے تم لوگوں کو پہچانا تو نہیں؟"

"نہیں سرکار! ہم کونوں کچی گولی ناہی کھیلت ہیں۔"

"اچھی بات ہے۔ تمام زیورات گلا دو۔ آٹھ بھری سونا میرے ہاں پہنچا دو۔ باقی سونا اور نقد رقم آپس میں بانٹ لو۔ جھگڑا نہ کرنا ورنہ ایک ایک کی چمڑی ادھیڑ ڈالوں گا۔ آپسی کے جھگڑے سے بات باہر جاتی ہے۔"

وہ پلٹ کر جیپ کے پاس جانے لگا' پھر کچھ سوچ کر رک گیا۔ سر گھما کر اس نے دونوں بدمعاشوں کو گہری نظروں سے دیکھا' وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے' ایک نے پوچھا۔ "کا ہوا سرکار! کو نو گلتی ہو گی ہے۔"

وہ قریب آ کر بولا۔ "میں بہت پریشان ہوں۔ میرا ایک کام کر سکو گے؟"

وہ دونوں جھک کر اس کے قدموں کو چھوتے ہوئے بولے۔ "سرکار کے لیے جان حاجر ہے۔ کام بتائی دو' پھر سمجھو سرکار' کام ہوئی گوا۔"

"میرے اپنے گھر کا معاملہ ہے۔ پہلی بار تم لوگوں کو اپنے معاملے میں شریک کر رہا ہوں' بات تم دونوں تک رہے گی۔ کسی تیسرے کے کانوں تک نہیں پہنچے گی۔"

دونوں نے کان پکڑتے ہوئے کہا۔ "نہیں پہنچے گی سرکار۔"

داروغہ نے دور کھنڈر کی طرف دیکھا۔ وہ واضح طور پر نظر نہیں آ رہا تھا۔ بیچ میں اونچی جھاڑیاں اور درخت تھے۔ پھر اس نے دونوں بدمعاشوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "کامنا ماں بننے والی ہے لیکن میں باپ نہیں بننا چاہتا۔"

وہ دونوں داروغہ صاحب کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ وہ بتا رہا تھا کہ وہ بچے کی پیدائش کو روکنے کے سلسلے میں کیا کچھ کر چکا ہے اور ناکام رہا ہے۔ کامنا بہت ہی ضدی ہے' اگر یونہی ناکامی رہی تو وہ ماں بن جائے گی۔

ایک نے پوچھا۔ "ہم کا حکم دو۔ ہم کا کر سکت ہیں؟"

"میں آج شام کو کھنڈر میں جاؤں گا۔ اسے بتاؤں گا کہ مجھے ایک کیس کے سلسلے

میں منگلی گھاٹ کی طرف جانا ہے۔ رات کو واپس نہیں آؤں گا۔ وہ پھول سا چہرہ اور پتھر سا دل رکھنے والی عورت ہے۔ میرے بغیر کھنڈر میں رات گزار لیتی ہے' لیکن کل رات تم دونوں ڈاکو بن کر وہاں جاؤ گے۔ میں بتاؤں گا کہ کھنڈر کے اوپری حصے میں کہاں صندوق رکھا ہوا ہے اور اس صندوق میں کتنے زیورات اور نقد روپے ہیں۔ کامنا کو یہی معلوم ہونا چاہیے کہ تم لوگ اسے لوٹنے آئے ہو۔ وہ تمام چیزیں لوٹ کر لے آنا۔ ایسے میں وہ راستہ روکنے کی ضرور کوشش کرے گی' جانتے ہو تم کیا کرو گے؟"

وہ پھر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ داروغہ نے کہا۔ "وہ میری عورت ہے۔ میں نہیں چاہتا' کوئی اسے ہاتھ بھی لگائے لیکن مجبوری کی حالت میں اس کی کمر پر ایک ایسی لات رسید کر سکتے ہو' جس کے بعد وہ ماں بننے کے قابل نہ رہے یا مناسب سمجھو تو اسے سیڑھی پر سے نیچے گرا دینا۔ کچھ چوٹیں آئیں گی۔ کوئی بات نہیں' اس کا علاج ہو جائے گا۔"

دونوں نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "ہم سمجھ گئے سرکار۔"

وہ مطمئن ہو کر جیپ کی طرف جانے لگا۔ پھر اچانک ٹھٹک گیا۔ قریب ہی ایک جھاڑی میں ذرا ہلچل سی ہوئی تھی۔ کوئی چھپا ہوا تھا۔ اس نے ڈپٹ کر پوچھا۔ "کون ہے؟"

اِدھر اس کا ہاتھ ہولسٹر پر گیا' اُدھر جھاڑی میں سے کسی نے چھلانگ لگائی۔ دوسرے ہی لمحے وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ پھر اس کے منہ سے گالیاں نکلنے لگیں۔ کلپنا وہاں چھپی ہوئی تھی اور اب چھلانگیں لگا کر جھاڑی سے نکلتے ہوئے کھنڈر کی طرف بھاگ رہی تھی۔ اسے یوں لگا جیسے وہ کامنا کے پاس جا کر چغلی کھائے گی اور اس کا سارا منصوبہ طشت ازبام ہو جائے گا۔ دوسرے ہی لمحے ریوالور اس کے ہاتھ میں آیا۔ پھر ایک فائر کی آواز دور سناٹے میں گونجتی چلی گئی۔ بھاگنے والی کلپنا اچانک ہی اچھل کر زمین پر گر پڑی تھی اور تڑپ رہی تھی۔

اس کا نشان مشکل ہی سے خطا ہوتا تھا۔ وہ دوڑتے ہوئے اُدھر جانے لگا۔ اس کے پیچھے وہ چنڈال چوکڑی کے بدمعاش بھی دوڑتے ہوئے آئے۔ پھر کلپنا کے پاس رک گئے۔ اس وقت تک وہ سرد پڑ چکی تھی۔ ٹھاکر گلاب سنگھ اس کے سامنے اکڑوں بیٹھ گیا۔ اسے چھو کر اطمینان کرنے لگا۔

وہ مر چکی تھی۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ گہری سبز آنکھیں' بالکل کامنا جیسی آنکھیں۔ اگرچہ آنکھوں میں زندگی کی چمک نہیں رہی تھی پھر بھی ٹھاکر کو جھرجھری سی محسوس ہوئی۔ یوں لگا جیسے کلپنا کی آنکھوں کے پیچھے سے کامنا جھانک رہی ہے' اس واردات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہے۔

وہ فوراً ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا' دور کھنڈر کی جانب دیکھنے لگا' اب بھی وہ کھنڈر واضح طور پر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بیچ میں گھنے درخت اور جھاڑیاں تھیں۔ وہ کہیں کہیں سے جھلک رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "اسے چپ چاپ اٹھا کر لے جاؤ اور دریا میں بہا دو۔ کامنا کو کسی طرح شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ ہم نے اسے مارا ہے۔"

☆======☆======☆

وہ حکم دے کر جیپ کی طرف آیا۔ ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی پھر اسے ڈرائیو کرتا ہوا بستی کے تھانے میں پہنچ گیا۔ دیوالی کی خوشیاں منائی جارہی تھیں۔ گھر' آنگن کو سجایا جارہا تھا۔ شام ہوتے ہی تمام گھروں کے اندر اور باہر دیے روشن ہونے والے تھے۔ رات کو آتش بازی قابل دید ہوتی تھی۔ عورت' مرد' بچے' بوڑھے سبھی اپنے اپنے طور پر خوشیاں منا رہے تھے۔ مردوں کی خوشی شراب نوشی میں تھی۔ دیوالی کی رات بڑے پیمانے پر جگہ جگہ جوا کھیلا جاتا تھا اور شراب پانی کی طرح بہائی جاتی تھی۔

ٹھاکر گلاب سنگھ پینے کا عادی نہیں تھا۔ کبھی ولایتی مل جاتی تو پی لیتا تھا ورنہ سنگی ساتھیوں کے اصرار کرنے پر ہولی میں بھنگ اور دیوالی میں شراب سے شغل کرلیتا تھا۔ اس رات جب وہ کھنڈر پہنچا تو نشے میں دھت ہو رہا تھا۔ اسے دیوالی کے بہانے پینے کا موقع مل گیا تھا۔ وہ چاہتا تھا' نشے میں مست رہے گا تو کامنا کے سوالوں کا جواب ڈھٹائی سے دے سکے گا۔ وہ کلپنا کے متعلق سوال کرے گی۔ اِدھر اس کی زبان لڑکھڑائے گی۔ تو شبہ نہیں ہو گا۔ وہ سمجھے گی کہ نشے میں زبان لڑکھڑا رہی ہے۔

وہ احتیاطاً ایک بوتل اور لے آیا تھا تاکہ نشہ کم پڑے تو تھوڑی تھوڑی پیتا رہے۔ شراب کا نشہ آدمی کو اُلو بنا دیتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے' نشے میں نہیں ہے۔ یہ خوش فہمی اسے اور نشے میں مبتلا کرتی ہے۔ اس نے جیپ کو کھنڈر کے سائے میں اسی جگہ روکا جہاں ہمیشہ روکتا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ جگہ کو سمجھ رہا ہے' تبھی تو ڈرائیو کرتا ہوا وہاں تک پہنچا تھا۔ اس نے جیپ کی لائٹ آف کی' چابی نکالی' اسے جیب میں رکھا پھر شراب کی بوتل لے کر جیپ سے باہر آیا۔ لڑکھڑاتے ہوئے' گنگناتے ہوئے سیڑھی کی طرف جانے لگا۔

وہ جانتا تھا کہ سب کچھ سمجھ رہا ہے۔ تبھی تو اس نے پورے دھیان سے لائٹ کو آف کیا اور چابی جیب میں رکھی اور اب سیڑھی کی طرف جارہا ہے اور اسی طرح سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر پہنچ جائے گا۔ مگر نصف زینے تک پہنچ کر وہ لڑکھڑایا۔ کامنا تیزی سے چلتی

ہوئی آئی۔ پھر اس کے ہاتھ کو تھام کر بولی۔ "اتنی زیادہ کیوں پی لیتے ہو؟"

وہ ہنستے ہوئے' وہاں سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "میں نشے میں نہیں ہوں۔ میرا ہاتھ چھوڑ دو۔"

اس نے ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑا لیا۔ ذرا ڈگمگایا پھر سنبھل گیا۔ زینے پر چڑھتے ہوئے بولا۔ "دیکھو' میں خود چل رہا ہوں۔"

وہ اوپر پہنچ گیا۔ اپنی وردی اتارنے لگا۔ یہ بات دماغ میں گونج رہی تھی کہ کامنا اس سے کلپنا کے متعلق کچھ نہیں کہہ رہی ہے' کیوں نہیں کہہ رہی ہے؟

وہ خاموش تھی۔ اس نے لباس بدلنے کے لیے اسے دھوتی لا کر دی۔ اس کی وردی لے جا کر کھونٹی سے لٹکائی لیکن ہولسٹر کو کھونٹی سے نہیں لٹکایا۔ پہلے کن انکھیوں سے داروغہ کی طرف دیکھا۔ وہ مستی میں گنگنا رہا تھا اور بوتل کھولتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "وہ کم ظرف ہوتے ہیں جو تھوڑی سی پی کر بہک جاتے ہیں۔ میں پیتا چلا جاتا ہوں اور اپنے ہوش میں رہتا ہوں۔ ابھی مجھے تمام پروگرام یاد ہیں۔ کل میں منگلی گھاٹ جا رہا ہوں۔"

وہ بڑبڑا رہا تھا اور کامنا ریوالور کے چیمبر کو دیکھ رہی تھی۔ اس میں پانچ گولیاں تھیں' جب کہ وہ روزانہ اسے پوری طرح لوڈ کرکے لے جاتا تھا۔ آج اس چیمبر میں ایک گولی کم تھی۔ اس نے ریوالور کو پہلے کی طرح ہولسٹر میں رکھا۔ پھر اسے کھونٹی سے لٹکاتے ہوئے پوچھا۔ "کیا آج کسی مجرم کا پیچھا کیا تھا؟"

وہ جھومتے ہوئے بولا۔ "ارے نہیں' کس کا پیچھا کرنا ہے' کیوں پیچھا کرنا ہے؟ ہماری ڈیوٹی بھی عجیب ہے۔ ہم پولیس والوں کے لیے کوئی تہوار نہیں ہوتا۔ ہولی ہو' دیوالی ہو' ڈیوٹی پر رہنا پڑتا ہے مگر آج کوئی ایسا کیس نہیں تھا۔"

کامنا اسے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ کوئی کیس نہ ہو' کسی مجرم کا پیچھا نہ کرنا ہو' تب بھی ریوالور سے گولی چل پڑتی ہے۔ آخر تم نے اسے گولی مار دی۔"

"ہاں' وہ ذلیل' کمینی............"

وہ کہتے کہتے رک گیا۔ چونک کر اسے دیکھا۔ پھر اپنی جگہ سے اٹھ کر لڑکھڑاتے ہوئے بولا۔ "تم میرے اندر کی بات باہر لانا چاہتی ہو' مجھے اُلو سمجھتی ہو۔ میں نشے میں نہیں ہوں۔"

وہ دانت پیس کر بولی۔ ”آخر تم نے اسے مار ہی ڈالا۔“

”تم کس کی بات کر رہی ہو؟ کیا تم مجھے کتے بلیاں مارنے والا سپاہی سمجھتی ہو؟“

”میں نے تم سے یہ تو نہیں کہا کہ تم نے میری بلی کو مار ڈالا ہے۔ میں نے اب تک کلپنا کا نام بھی نہیں لیا ہے۔“

وہ گڑبڑا گیا۔ پھر اس نے کہا۔ ”تو تم کسے مار ڈالنے کی بات کر رہی تھیں؟“

میں کچھ نہیں کہہ رہی تھی۔ پتا نہیں، تم نشے میں کیا سن رہے ہو اور کیا کہہ رہے ہو؟“

وہ ڈگمگاتے ہوئے پیچھے گیا۔ ”تم جھوٹ کہتی ہو۔ تم نے ابھی کہا تھا، میں نے اسے مار ڈالا ہے۔ تم مجھ پر الزام لگا رہی ہو۔“

”میں نے کہا نا، تم بہت زیادہ نشے میں ہو۔ میں بھلا کیا الزام لگاؤں گی، جبکہ کلپنا زندہ ہے۔“

وہ ایک دم سے چونک کر ساکت ہو گیا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے کامنا کو دیکھنے لگا۔ پھر اس نے بے یقینی سے پلٹ کر ٹب کی طرف دیکھا جہاں کلپنا اپنے بچے کے ساتھ رہتی تھی لیکن وہ ٹب خالی تھا۔ اس کا بچہ کامنا کے بستر پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”کہاں ہے کلپنا؟“

”تمہارے آنے سے ذرا پہلے ہی ایک چوہے کے پیچھے دوڑتی ہوئی گئی ہے، ابھی آجائے گی۔“

وہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا، وہ زندہ کیسے بچ گئی۔ وہ یا تو بہت نشے میں ہے۔ کامنا کی باتوں کو اچھی طرح سمجھ نہیں پا رہا ہے۔ وہ کچھ کہہ رہی ہے، یہ کچھ سمجھ رہا ہے یا پھر وہ کچھ بھی نہیں کہہ رہی ہے، یہ کچھ بھی نہیں سن رہا ہے۔ در و دیوار گھوم رہے ہیں۔ ”تم جھوٹ بولتی ہو۔“

کامنا نے چبھتے ہوئے پوچھا۔ ”سچ کیا ہے؟“

”آں؟“ وہ کچھ کہہ نہ سکا پھر بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی بوتل ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ وہ بستر پر چاروں شانے چت ہو گیا تھا۔ تب کامنا کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

وہ بڑبڑا رہی تھی۔ اپنے دل کو سمجھا رہی تھی، کلپنا جہاں بھی گئی ہے، ضرور واپس آئے گی مگر صبح سے دوپہر ہوئی، دوپہر سے شام ہو گئی، اس کا دل ڈوبنے لگا۔ طرح

طرح کے شک و شبہات دل میں، دماغ میں جڑیں پکڑنے لگے۔ انسانوں کی دنیا میں جس نے اس سے سچی محبت کی تھی، وہ ایک بلی تھی۔ ایک بہت مضبوط ڈھال بھی تھی۔ اس کی موجودگی میں ٹھاکر گلاب سنگھ کا کوئی حربہ کام نہیں آیا تھا۔ اب وہ راستے سے ہٹ گئی تھی یا ہٹا دی گئی تھی اور ہٹانے والا وہی ہو سکتا تھا جو اسے اپنے راستے کی دیوار سمجھتا تھا۔

وہ ٹھاکر گلاب سنگھ کی طرف دیکھتے ہوئے زیر لب بڑبڑائی۔ ”تو تم نے اسے مار ڈالا۔“

وہ مدہوش پڑا ہوا تھا۔ اسے اپنی خبر نہیں تھی۔ کامنا نے بستر کے پاس آکر اسے سیدھا کیا، اوپر کی طرف کھینچ کر تکیے پر سر رکھا۔ اسے سیدھی طرح لٹا دیا۔ وہ نشے کی حالت میں اوں آں کہتا رہا۔ اس سے زیادہ اس میں سکت نہیں رہی تھی۔

وہ وہاں سے چلتے ہوئے لکڑی کے صندوق کے پاس آئی۔ اس میں کپڑے، زیورات اور نقد روپے رکھے ہوئے تھے۔ کپڑوں کی تہہ میں ایک لفافہ رکھا ہوا تھا۔ اس نے لفافے کو نکال لیا۔ لالٹین کی لو تیز کی پھر اسے کھول کر اس میں سے تہہ کیا ہوا ایک خط نکالا۔

ٹھاکر گلاب سنگھ نے وہ خط دو ماہ پہلے اپنی پہلی دھرم پتنی کو لکھا تھا لیکن وہ خط پوسٹ نہیں کیا گیا تھا۔ شاید اس نے یہ سوچ کر جیب میں رکھا ہو کہ دوسرے دن ڈاک سے روانہ کر دے گا لیکن کامنا کی عادت تھی، جب بھی داروغہ آتا تھا، اپنی وردی اتار کر رات کو سو جاتا تھا تو وہ اس کی جیبوں کی تلاشی لیتی تھی۔ ایسے ہی وقت وہ خط اس کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ بعد میں ٹھاکر نے پوچھا تھا۔ ”میرا خط کہاں ہے۔ میں نے اسے جیب میں رکھا تھا۔“

کامنا نے انجان بن کر کہا۔ ”مجھے کیا معلوم، کون سا خط ہے۔ کیا میں تمہاری جیبوں کی تلاشی لیتی ہوں۔ ذرا دماغ پر زور ڈالو۔ ہو سکتا ہے۔ جہاں تم نے خط لکھا ہو، وہیں میز کی دراز میں اسے بھول گئے ہو۔“

بات آئی گئی ہو گئی۔ وہ خط کامنا کے پاس محفوظ تھا۔ اس نے اسے کھول کر ایک بار پھر پڑھا۔ ٹھاکر گلاب سنگھ نے اپنی پہلی دھرم پتنی کو لکھا تھا۔

”میری پیاری لکشمی! تمہارا خط ملا۔ یہ تم نے کیا لکھ دیا کہ میں خشکی باغ میں کسی رکھیل کے ساتھ رہتا ہوں۔ رام رام، ایسا تو وہ کرتے ہیں جنہیں تمہارے جیسی محبت کرنے والی وفادار بیوی نہیں ملتی۔ تمہارے ہوتے ہوئے میں ایسا سوچنا بھی پاپ سمجھتا

ہوں۔

مجھے افسوس ہے' تم اپنے پتی پر بھروسا نہیں کرتی ہو۔ یہاں خشکی باغ میں آکر کسی وقت بھی دیکھ سکتی ہو' میں تھانے میں رہتا ہوں۔ اس کے پیچھے ایک چھوٹا سا کوارٹر ہے' وہاں میرا سامان ہے' وہیں میں رات گزارتا ہوں۔

پتا نہیں' کس نے تمہیں بہکا دیا ہے' ذرا عقل سے سوچو' میں تھانے سے اتنی دور دریا کے کنارے کسی کھنڈر میں رہ سکتا ہوں؟ وہ کھنڈر مسان گھاٹ کے پاس ہے۔ بہت ہی ویران اور ہیبت ناک ہے' بستی کے لوگ دن کے وقت بھی اُدھر سے نہیں گزرتے۔ اکثر لوگ کہتے ہیں' انہوں نے چاندنی رات میں ایک چڑیل کو وہاں ٹہلتے ہوئے دیکھا ہے۔ کیا تم سمجھتی ہو' میں کسی چڑیل کے ساتھ کھنڈر میں رہتا ہوں۔

لکشمی! میں کئی مہینوں سے یہ بات نوٹ کر رہا ہوں کہ میرے بچے مجھ سے دور دور رہنے لگے ہیں۔ تم نے ان کے دلوں میں باپ کے خلاف نفرت پیدا کر دی ہے۔ تم انہیں بہکاتی ہو کہ میں انہیں چھوڑ کر کسی دوسری عورت کے پاس جاتا ہوں یا میں نے دوسری شادی کرلی ہے۔ میرے لیے یہ بڑے شرم کی بات ہے کہ میرے بچے مجھے برا سمجھنے لگیں میں یہ کبھی برداشت نہیں کروں گا۔

اتنی بڑی دنیا میں ہماری اولاد ہمارا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ ہماری محبت کی سب سے مضبوط زنجیریں ہیں۔ اگر یہ پیارے پیارے' معصوم بچے نہ ہوتے تو ہو سکتا ہے' میں بہک جاتا۔ کسی دوسری عورت سے اپنی اولاد کی خواہش کرتا لیکن مجھے بھگوان نے سب کچھ دیا ہے۔ میں کیوں کسی عورت سے تعلق رکھوں گا۔ تھوڑی دیر کے لیے مان لو کہ میں دوسروں کی طرح بہکتا ہوں۔' کسی سے رشتہ جوڑ لیتا ہوں' تب بھی میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اپنی اولاد کے لیے کوئی دوسری سوتیلی اولاد پیدا نہیں ہونے دوں گا۔

کہیں تم سچ نہ سمجھ لینا کہ میں نے واقعی کسی سے رشتہ جوڑ رکھا ہے۔ بھئی' یہ تمہیں سمجھانے کے لیے کہہ رہا ہوں۔ مجھے تم سے اور اپنے بچوں سے اتنا پیار ہے کہ مجھ سے کبھی کوئی بھول چوک ہوئی اور ایسی بھول کے نتیجے میں کسی عورت نے میرے بچے کی ماں بننے کا دعویٰ کیا تو میں شرم سے مرجاؤں گا۔ سچ کہتا ہوں' اسی وقت اپنی جان دے دوں گا۔ آتما ہتیا کرلوں گا۔

اس تھوڑے لکھے کو بہت سمجھو۔ میں اس سے زیادہ نہیں سمجھا سکتا۔ وقت آنے پر

ثابت کردوں گا کہ زبان کا دھنی ہوں اور کیا لکھوں' تمہارا اور صرف تمہارا۔ ٹھاکر گلاب سنگھ۔"

اس خط میں تاریخ نہیں لکھی ہوئی تھی۔ یہ پتا نہیں چلتا تھا کہ دو ماہ پہلے لکھا گیا ہے یا دو دن پہلے بہرحال وہ جب بھی لکھا گیا ہو' اسے پوسٹ کرنے کا موقع نہیں ملا ہوگا۔ تب ہی وہ ٹھاکر گلاب سنگھ کی جیب میں رہ گیا تھا۔

کامنا نے اس خط کو تہہ کر کے لفافے میں رکھا۔ پھر اس لفافے کو وردی کی اوپری جیب میں رکھ دیا۔ دور بستی میں دیوالی منائی جارہی تھی۔ گھر آنگنوں میں دیئے جھلملا رہے تھے۔ ان کی روشنی کھنڈر تک نہیں پہنچ رہی تھی لیکن پٹاخوں کی آوازیں رہ رہ کر سنائی دیتی تھیں۔

اس نے ہولسٹر سے ریوالور کو نکال لیا۔ بلی کا بچہ اپنی کمزور سی آواز میں میاؤں میاؤں کر رہا تھا۔ بستر سے اتر کر اپنی ماں کو ڈھونڈ رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے بستر پر آئی۔ پھر اپنے محبوب پتی کے برابر لیٹ گئی۔ ریوالور کے دستے کو ساڑھی کے آنچل سے تھام لیا۔ اس کی نال کنپٹی پر رکھتے ہوئے دکھ بھرے لہجے میں بولی۔

"میرے پتی دیو! دنیا میں کوئی دیوہیکل نہیں ہوتا۔ اگر ہو تو موت اسے ایک چٹکی میں اُڑا دیتی ہے۔"

وہ خراٹے لے رہا تھا۔

"اگر اٹھ سکتے ہو تو آنکھیں کھول لو' ورنہ آنکھیں بند ہیں' بند ہی رہیں گی۔ ابھی یہ ریوالور میرے ہاتھ میں ہے' تھوڑی دیر بعد تمہارے ہاتھ میں ہوگا اور وہ خط تمہاری وردی کی جیب میں رہے گا۔ وہ خط بتائے گا کہ تمہاری آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند کیوں ہو گئیں۔

میں تمہیں عزت کی موت مار رہی ہوں۔ ایک غیرت مند باپ کی حیثیت سے تمہارا خاتمہ ہو رہا ہے۔ تمہیں یہ خبر ملی تھی کہ میرے بچے کے باپ بننے والے ہو اور تم زبان کے دھنی نکلے خط میں جو کچھ لکھا' اس پر عمل کیا۔

تمہارا وہ خط میرے ہونے والے بچے کے لیے ایک سند ہے۔ وہ خط ثابت کرتا ہے کہ میں تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔ تم نہیں رہو گے تو کیا ہوا' تمہارا نام میرے بچے کے ساتھ زندہ رہے گا۔ آدمی کو نام کمانا ہے اور تم اپنی پہلی بیوی کے بچوں کے ساتھ

اور میرے بچے کے ساتھ نام کما کر جا رہے ہو۔"

وہ رونے لگتی۔ سسکتے ہوئے کہنے لگی۔ "میرے پتی' میرے محبوب' میں رو رہی ہوں۔ تم نہیں سمجھ سکتے' ایک عورت جو بار بار اپنے مرد کے ہاتھوں مکمل ہونا چاہتی ہے اور بار بار ٹوٹنے لگتی ہے اور ٹوٹ ٹوٹ کر رونے لگتی ہے تو اس کے آنسو سچے ہوتے ہیں۔

میرا دل جانتا ہے کہ میں صرف اپنے بچے کی حفاظت کر رہی ہوں اور میرا بھگوان جانتا ہے کہ میں تمہیں نہیں مار رہی ہوں۔ میں تمہیں کبھی مار ہی نہیں سکتی۔ میں تو صرف ایک چھلیٹے کو ختم کر رہی ہوں۔"

ٹھائیں اچانک ہی چھت کے شگاف کی طرف سے پروں کے پھڑپھڑانے کی آوازیں سنائی دیں۔ نیل کنٹھ جانے پھر کب چلا آیا تھا۔ چھت پر آکر بیٹھ گیا تھا۔ ان کے عقیدے کے مطابق وہ ہونے والے بچے کے لیے مبارک ثابت ہو رہا تھا۔

☆======☆======☆

آسیب زدہ

محی الدین نواب کی ایک لازوال کہانی۔
انہوں نے یہ کہانی لکھ کر ثابت کر دیا ہے کہ
وہ کسی بھی طرح غیر ملکی مصنفین سے کم نہیں ہیں
بلکہ کچھ آگے ہی ہیں۔
اس کہانی کا شمار اپنے وقت کی شاہکار کہانیوں میں کیا جاتا ہے۔

قاسم کا یہی معمول تھا' رات کو بارہ ایک بجے سے پہلے کبھی نہیں سوتا تھا۔ اس رات بھی ایک بجے سونے کے لیے اپنی خوابگاہ کی طرف جانے لگا تو اچانک بارش شروع ہو گئی۔ احاطے میں رکھے ہوئے ڈربوں سے مرغے اور مرغیوں کے کڑکڑانے کی آوازیں آنے لگیں ایسے وقت ڈربوں کی چھتوں سے پانی رستا رہتا تھا۔ بے زبان جانوروں کو بارش سے محفوظ رکھنا ضروری تھا۔ لہٰذا وہ اسٹور روم سے ترپال اٹھا کر احاطے میں آگیا۔

آسمان سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ان کی سیاہی زمین پر بھی پھیلی ہوئی تھی۔ کوٹھی کی اوپری منزل بھی تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس منزل کی بالکونی میں ایک عورت کا سایہ نظر آرہا تھا۔ بجلی کی چمک اور بادلوں کی گرج کے درمیان اس کی رس بھری آواز سنائی دی۔

"تم جانوروں کی حفاظت کر رہے ہو۔ اپنا بھی تو خیال کرو۔ بارش میں اس طرح بھیگو گے تو بیمار پڑ جاؤ گے۔"

"نہیں۔ میں زیادہ نہیں بھیگوں گا۔ بس ایک منٹ میں آرہا ہوں۔"

"کیا میں بالکونی کی لائٹ آن کر دوں؟" عورت نے پوچھا۔

اس نے ایک ڈربے کو ترپال سے ڈھانپتے ہوئے بالکونی کی جانب دیکھا اور مسکرا کر کہا۔

"نہیں رہنے دو۔ یہاں سے تم اندھیرے میں بڑی پُراسرار نظر آرہی ہو۔ تاریکی میں صرف عورت کا سایہ نظر آئے تو یہ سوچنے میں بڑا مزہ آتا ہے کہ اس کا جسم کیسا ہو گا؟ یہ تم بھی نہیں جانتیں کہ تم نگاہوں کو للچانے کے کتنے خزانے چھپائے کھڑی ہو۔"

"وہ ہنستی ہوئی بولی۔ "سایہ کسی آسیب کو بھی کہتے ہیں۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے۔" اس نے مذاقاً کہا۔ "اگر میں تمہاری جمالیاتی خوبیوں کو نظر انداز کر دوں تو اس وقت تم اندھیری بالکونی میں ایک چڑیل نظر آؤ گی۔" بالکونی کی طرف

سے کوئی جواب نہیں آیا۔ قاسم نے سر اٹھا کر دوبارہ دیکھا تو وہ غائب ہو گئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اندھیرے میں تحلیل ہو گئی ہے۔ قاسم کی پیشانی پر شکنیں پھیل گئیں۔ پھر دوسرے ہی لمحے اس نے قہقہہ لگا کر کہا۔

"یہ عورت بڑی خود پرست ہوتی ہے۔ مذاق میں بھی چڑیل کہو تو برا مان جاتی ہے۔ کوئی بات نہیں جان من! میں ابھی آکر تمہیں منالوں گا۔"

وہ تمام ڈربوں کو ترپال سے اچھی طرح ڈھانپنے کے بعد کوٹھی کے برآمدے کی طرف واپس جانے لگا۔ اسی وقت مین گیٹ پر کھٹکا سا ہوا۔ قاسم کے قدم رک گئے۔ اس نے گھوم کر دیکھا۔ کوئی سائے کی طرح آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔

وہ اندھیرے میں تھا اور قاسم برآمدے کی روشنی میں کھڑا تھا۔ اس نے گرج کر پوچھا۔

"کون ہو تم؟"

"میں ہوں!" ایک کمزور سی آواز ابھری پھر بادلوں کی گرج میں ڈوب گئی۔

وہ آواز جانی پہچانی سی تھی۔ قاسم اندھیرے میں گھورتے ہوئے ذہن پر زور ڈال کر سوچنے لگا۔ اتنے میں وہ بھی برآمدے کی روشنی میں آگیا وہ کوئی تیس بتیس برس کا جوان تھا۔ وہ اپنی ظاہری حالت سے بوڑھا لگ رہا تھا۔ اس کی داڑھی بڑی ہوئی تھی۔ رخساروں کی ہڈیاں ابھر گئی تھیں اور آنکھیں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ اگر قاسم اسے پہچان نہ لیتا تو اس اندھیری رات میں اسے بھوت سمجھ کر اپنے گھر کا دروازہ بند کر لیتا۔

"راحیل۔ تم؟" اس نے حیرانی سے کہا۔ "یہ تمہاری کیا حالت ہو گئی ہے میرے دوست............"

وہ آگے بڑھ کر اس سے لپٹ گیا۔ "ہم شاید پانچ سال کے بعد مل رہے ہیں۔ میں تو ویسا ہی ہوں۔ مگر تم بدل گئے ہو۔ تم شاید کچھ بیمار ہو میں بھی عجیب احمق ہوں۔ اپنے ساتھ تمہیں بھی بارش میں بھگو رہا ہوں۔ آؤ اندر چلیں"

وہ اس کا ہاتھ کر پکڑ کر کھینچتا ہوا ڈرائنگ روم میں لے آیا۔

"تمہارا سامان کہاں ہے؟"

"ڈاک بنگلہ میں!"

"عجیب احمق ہو۔ تم میرے گاؤں میں آکر ڈاک بنگلہ میں ٹھہرے ہو؟ تمہارا بھی

جواب نہیں ہے۔ اب آئے بھی ہو تو آدھی رات کے بعد' کہیں تمہارے دماغ کا کوئی پیچ ڈھیلا تو نہیں ہے؟"

راحیل اپنی پیشانی تھام کر بڑی سنجیدگی سے بولا۔

"میں بہت پریشان ہوں۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ واقعی میرے دماغ کا کوئی پیچ ڈھیلا ہو گیا ہے۔ میں جو کچھ سوچتا ہوں اور سمجھتا ہوں وہ غلط ہے۔ مگر وہ میری سالگرہ کی ہر صبح چار بجے آکر یہ ثابت کر دیتی ہے کہ میں غلطی پر نہیں ہوں۔ جس دن بھی اس کا داؤ چلے گا' وہ میرے لہو سے اپنے خنجر کی پیاس بجھالے گی.........."

قاسم شدید حیرانی سے اسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا پھر وہ آگے بڑھ کر ہمدردی سے اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر بولا۔

"تم کیسی باتیں کر رہے راحیل؟ کون ایسی عورت ہے جو تمہاری جان کی دشمن ہے۔ تعجب ہے تمہارے جیسا دلیر مرد۔" وہ کہتے کہتے رک گیا۔ پھر اس کے چہرے کو چھوتے ہوئے بولا۔ "ارے تمہیں تو بخار ہے۔ چلو جلدی سے کپڑے بدلو۔ میں تمہارے لیے اسپرین کی ٹکیہ اور دودھ لے کر آتا ہوں۔ منٹوں میں بخار اتر جائے گا۔"

وہ اسے ایک کمرے میں لے آیا اور الماری کھول کر ایک جوڑا اسے دیتے ہوئے بولا۔

"اسے بدل کر لحاف میں دبک جاؤ۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

وہ کمرے سے باہر چلا گیا' جس دروازے سے وہ گیا تھا راحیل اسے تھوڑی دیر تک دیکھتا رہا۔ چند لمحوں بعد وہ دروازہ آہستہ آہستہ آپ ہی آپ کھلنے لگا۔ وہ سہم کر الماری سے لگ گیا۔

"کون ہے؟" اس نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

کوئی نہیں تھا۔ طوفانی ہواؤں کا اثر کوٹھی کے اندر بھی تھا۔ وہ دروازہ ہوا سے آہستہ آہستہ کھل رہا تھا اور ہوا کا زور کم ہونے پر پھر بند ہونے جا رہا تھا۔ وہ الماری سے لگا ہوا اسے دیکھتا رہا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ وہاں کوئی نہیں ہے تو وہ لباس بدل کر بستر پر آگیا اور لحاف اوڑھ کر لیٹ گیا۔

کچھ دیر کے بعد قاسم اسپرین کی ٹکیہ اور گرم دودھ سے بھرا ہوا گلاس لے آیا اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

"سوری ذرا دیر ہو گئی۔ میں لباس بدل رہا تھا۔ تمہاری نئی بھابی نے دودھ گرم کیا ہے۔"

"نئی بھابی؟" اس نے دودھ کا گلاس لیتے ہوئے پوچھا۔ پھر اس نے ٹکیہ منہ میں رکھ لی اور دودھ پینے لگا۔

"ہاں۔ پہلی والی اللہ کو پیاری ہو گئی۔ تین سال تک اس کوٹھی میں تنہا زندگی گذارتا رہا۔ پھر یہ میری زندگی میں آگئی۔ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اسی لئے میں نے تم سے ملانا مناسب نہیں سمجھا۔ تم صبح اسے دیکھنا میرے انتخاب کی داد دو گے۔ ایمان سے اتنی حسین ہے۔ اتنی حسین ہے کہ میں نے کوٹھی سے باہر نکلنا چھوڑ دیا ہے۔"

راحیل نے دودھ کا گلاس خالی کر کے اسے دیا اور لحاف کو اپنے اطراف اچھی طرح لپیٹنے لگا۔ قاسم نے خالی گلاس کو میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"تم بیٹھو نہیں' آرام سے لیٹ جاؤ۔ جب تمہارا بخار اتر جائے گا اور تمہیں نیند آجائے گی تو میں یہاں سے جاؤں گا۔"

"مجھے نیند نہیں آئے گی۔" اس نے لحاف کے اندر سے سر نکال کر کہا۔ "نیند میرے نصیب میں نہیں ہے اور آج' آج کی رات تو میں ہزار تھکن کے باوجود نہیں سو سکتا۔ آج چار تاریخ ہے نا؟ آدھی رات کے بعد تاریخ بدل جاتی ہے۔"

"ہاں۔ آج چار تاریخ ہے۔ خوب یاد آیا۔ آج تمہارا جنم دن ہے۔"

"ہاں اور اب صبح چار بجے وہ آئے گی۔"

"کون۔ ارے میں تو بھول ہی گیا تھا۔ ابھی تم کسی دشمن عورت کا ذکر رہے تھے۔ کیا واقعی کوئی تمہاری دشمن ہے؟"

"ہاں۔ وہ یہاں۔ تمہاری کوٹھی میں۔ اسی کمرے میں آئے گی۔"

قاسم نے فلک شگاف قہقہہ لگایا۔

"میرے دوست آج تک کسی ڈاکو کی جرأت نہیں ہوئی کہ اس چھوٹے سے گاؤں میں آئے اور قاسم کی کوٹھی میں قدم رکھے۔ کسی عورت کی کیا مجال کہ وہ یہاں تم سے دشمنی کے لئے آئے۔ بائی دی وے قصہ کیا ہے یار! میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم بیمار اور کمزور ہونے کے بعد ایک عورت سے خوف کھاؤ گے۔"

وہ کھوکھلی سی آواز میں بولا۔

"وہ عورت نہیں ہے۔ ایک بدروح ہے۔"

"اُونہہ!" اس نے ناگواری سے کہا۔ "اس ترقی یافتہ دور میں بھی تم کسی بدروح، چڑیل اور جن بھوتوں پر عقیدہ رکھتے ہو۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے۔"

راحیل گھڑی کی جانب دیکھنے لگا۔

"ٹن۔ ٹن" دیوار گھڑی دو بجا رہی تھی۔ اس نے بڑے ہی مستحکم لہجے میں کہا۔

"دو گھنٹے اور رہ گئے ہیں۔ چار بجتے ہی تمہیں یقین آجائے گا۔ میں اسی لئے تمہارے پاس آیا ہوں کہ تم اسے آنکھوں سے دیکھو اور چشم دید گواہ بن جاؤ۔ دوسرے میری باتوں کا یقین نہیں کرتے ہیں وہ مجھے پاگل سمجھتے ہیں۔"

قاسم آنکھیں سکیڑ کر تھوڑی دیر تک اسے دیکھتا رہا پھر ایک کرسی کھینچ کر پلنگ کے قریب اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"راحیل! تمہاری سنجیدگی دیکھ کر میں حیران بھی ہوں اور پریشان بھی۔ پہلے تو تم ایسے نہیں تھے۔ یہ تم نے بدروحوں کی باتیں کب سے سیکھ لی ہیں۔ اگر کوئی عجیب و غریب محیرالعقول واقعہ بار بار تمہیں پیش آتا رہے تو اس کی مادی وجوہات ضرور ہوں گی۔ تم مجھے بتاؤ۔ میں اسے اپنے نظریئے سے سمجھوں گا اور تمہیں سمجھاؤں گا۔"

"اونہہ!" راحیل کی۔ "اُونہہ" میں مختصر ترین ہنسی تھی۔ ایسا تمسخر تھا جیسے وہ قاسم کو ایک نادان بچہ سمجھ رہا ہو۔ اس نے کہا۔

"انسان جب تک ایسے واقعات سے دوچار نہیں ہوتا یا انہیں کسی پر گزرتے نہیں دیکھ لیتا' اس وقت تک اسے یقین نہیں آتا۔ پہلے میں بھی یقین نہیں کرتا تھا۔ پہلے میری زندگی بھی سلجھی ہوئی تھی مگر دو سال پہلے وہ میرے لیے الجھن بن کر آگئی۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ مجھ پر کیا بیت چکی ہے۔"

یہ کہہ کر وہ ذرا دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ اس نے اپنے بیٹھنے کی پوزیشن بدل دی۔ وہاں سے ذرا کھسک کر بستر کے سرہانے آیا۔ تکیہ سے ٹیک لگا کر بیٹھنے کے بعد اس نے لحاف کو اپنے پیروں پر ڈال لیا اور دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔

دروازہ اسی انداز میں کبھی آہستہ آہستہ کھلتا تھا اور ہوا کا زور کم ہونے پر پھر بند ہونے لگتا تھا۔ کھڑکیوں کے شیشوں پر بارش کے چھینٹے ٹپا ٹپ بج رہے تھے۔ کمرے میں دیوار گھڑی کی ٹک ٹک دل کی دھڑکنوں کی طرح گونجتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ قاسم

نے اسے مسلسل دروازے کی طرف گھورتے ہوئے دیکھا تو کہا۔

"یہاں کوئی نہیں آسکتا۔ تمام کھڑکیاں اور باہر کے دروازے بند ہیں۔ اوپر کی منزل میں تمہاری بھابی ہمیشہ دروازے بند کر کے سوتی ہیں۔ میں دیکھوں گا کوئی بدروح بند دروازوں سے گزر کر کیسے آتی ہے۔ تم اپنی آپ بیتی سناؤ۔ ہم پانچ سال کے بعد ملے ہیں۔ نہ جانے اس عرصے میں تم پر کیا گذری ہے۔"

اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

"پانچ سال پہلے تمہیں یاد ہے۔ میں اکثر کہا کرتا تھا کہ میں اس دنیا سے کنوارا ہی اٹھ جاؤں گا۔ امی کو کوئی لڑکی اس قابل نظر نہیں آتی تھی کہ جو ان کی بہو بن سکے۔ وہ چاہتی تھیں کہ کوئی ایسی بہو ملے جو تمام زندگی میری طرح ان کے اشاروں پر چلے۔ میں تو بچپن ہی سے ان کا فرمانبردار رہا۔ ابا جان کے مرنے کے بعد جس طرح لاڈ پیار سے انہوں نے میری پرورش کی تھی' میں اس ممتا اور محبت کو نہیں بھول سکتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ میری بھلائی کے لئے بہت سوچ سمجھ کر لڑکی تلاش کر رہی ہیں۔

مگر انتظار کی بھی حد ہوتی ہے۔ میں بتیس برس کا ہو گیا اور انہیں لڑکی نہیں ملی مجھے بھی صبر کرنے کی عادت سی پڑ گئی تھی۔ مگر انہی دنوں میری آنکھوں سے ایک گناہ سرزد ہو گیا۔"

"آنکھوں سے گناہ؟" قاسم نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں۔ جیسا کہ تم جانتے ہو۔ میری پرورش خالص مذہبی ماحول میں ہوئی ہے۔ مجھے یہ تعلیم دی گئی تھی کہ دوسروں کی بہو بیٹیوں کے سامنے سے نظریں جھکا کر گزر جانا چاہئے۔ مگر میں سچ کہتا ہوں کہ میں نے اسے جان بوجھ کر نہیں دیکھا تھا۔ میں تو اپنے ایک کرایہ دار سے کرایہ وصول کرنے گیا تھا۔ اس نے دو ماہ سے کرایہ ادا نہیں کیا تھا۔ میں جب بھی وہاں جاتا تو مکان کے اندر سے یہی جواب ملتا کہ وہ گھر پر نہیں ہے۔

اس روز میں نے ارادہ کیا کہ اس کے دروازے پر دستک نہیں دوں گا بلکہ چپ چاپ کان لگا کر سنوں گا کہ گھر کے اندر اس کی آواز ملتی ہے یا نہیں۔ یہی سوچ کر میں سامنے کے دروازے پر نہیں گیا۔ اس کے ساتھ کی پتلی سی گلی میں جاکر دوسرے کمرے کے دروازے پر پہنچ گیا اور کان لگا کر اپنے کرایہ دار احمد دین کی آواز سننے کی کوشش کرنے لگا۔

جہاں میں نے کان لگایا وہاں دروازے کی لکڑی ذرا سا تڑخ گئی تھی اور ایک پتلا سا شگاف پڑ گیا تھا۔ مجھے آواز نہیں ملی تو میں نے ایک آنکھ اس شگاف پر رکھ دی۔ پھر اچانک ہی میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔ ایک نوجوان لڑکی لباس بدل رہی تھی۔ اس کی ساڑھی کا آنچل گرا ہوا تھا۔ اس نے بلاؤز اتار کر ایک طرف رکھ دیا تھا اور پشت پر ہاتھ لیجا کر انگیا کے بند کھول رہی تھی۔

میرے دل میں ایک ذرا سی دیر کے لئے یہ خیال آیا کہ یہ گناہ ہے میری آنکھیں گناہ گار بن رہی ہیں۔ مجھے فوراً ہی وہاں سے بھاگ جانا چاہئے مگر میری سوچ اور میرے ارادے کے خلاف میری وہ آنکھ شگاف سے چپک کر رہ گئی تھی۔ مجھ بتیس برس کے کنوارے نے پہلی بار ایسا حسن اور بدن کی ایسی دلکشی دیکھی تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے ایک دہکتا ہوا شعلہ مجسم ہوگیا تھا اور جب انگیا کے بند کھلے تو دو آتشہ۔ مجھ پر دو آتشہ کا مفہوم واضح ہوگیا کہ کس طرح شراب عمر کی آنچ پر رہ کر کندن بن جاتی ہے۔

میں بہک رہا ہوں۔ مجھے کسی کے سامنے کسی کنواری کے جسم کی تفسیر نہیں کرنی چاہیے۔ مگر میں مجبور ہوں۔ میری آپ بیتی کا ایک اہم حصہ اس تفسیر کا محتاج ہے۔ انگیا کھلنے پر ہی اس داستان کا نیا باب کھلتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ اس کے سینے پر دونوں ابھاروں کے درمیان پیسہ کے برابر ایک سیاہ داغ تھا۔ مجھے ایسا لگا کہ وہ سوراخ ہے۔ بندوق کی گولی آر پار ہو کر ایک سوراخ چھوڑ گئی......"

قاسم بڑی بے چینی سے کرسی پر پہلو بدل رہا تھا۔ اس نے قطع کلامی کرتے ہوئے پوچھا۔

ایک زندہ لڑکی کے سینے میں سوراخ کیسے ہوگا۔ وہ۔ وہ سیاہ داغ ہی ہو سکتا ہے۔"

"ہاں۔ میں نے بھی یہی سوچا کہ سیاہ داغ ہے۔ یا پھر وہاں کوئی زخم ہے' جس پر سیاہ رنگ کا مرہم لگایا گیا ہے یا سیاہ رنگ کی گول پٹی چپکائی گئی ہے۔ بہرحال مجھ جیسے بوکھلائے ہوئے نوجوان نے اس سیاہ داغ کو اس وقت زیادہ اہمت نہیں دی۔ میں تو کسی اور جہان میں کھویا ہوا تھا مجھے یہ احساس بھی نہ ہوا کہ میں جذبات کی شدت سے کانپنے لگا ہوں۔ بعد میں احساس ہوا کہ جب میرے کانپتے ہوئے گھٹنے دروازے سے مس ہوئے اور دروازہ ہلکی سی آواز سے کھڑکھڑا گیا۔

وہ لڑکی دوسرا لباس پہن رہی تھی۔ اس نے چونک کر بلکہ گھور کر دروازے کی

جانب دیکھا۔ اف! ان آنکھوں کی شعلہ زنی بیان نہیں کر سکتا۔ بس یوں لگا کہ وہ آنکھیں مجھے پہچان کر دھمکی دے رہی ہوں کہ اچھا میں تم سے سمجھ لوں گی......

میں وہاں سے سرپٹ بھاگا۔ ایک گلی سے دوسری گلی پھر تیسری گلی۔ پھر گھر پہنچ کر ہی دم لیا۔ مجھے اس طرح ہانپتے کانپتے دیکھ کر امی پریشان ہوگئیں۔ میں اور بھی پریشان ہوگیا کہ ان سے کیا کہوں۔ میں نے مجبوراً پہلی بار ان سے جھوٹ کہا کہ وہاں تین نمبر کی گلی میں بہت اندھیرا تھا۔ ایک عورت بال کھولے وہاں کھڑی ہوئی تھی اور مجھے بلا رہی تھی۔ میں نے اس کے پیروں کو دیکھا تو اس کے پاؤں کے دونوں پنجے پیچھے کو مڑے ہوئے تھے۔ یہ تو چڑیلوں کی پہچان ہے۔ میں فوراً سے بھاگ کر چلا آیا۔

امی جلدی سے سر پر آنچل رکھ کر آیت الکرسی پڑھنے لگیں۔ انہوں نے مجھے اپنے پاس بٹھا کر کئی بار دم کیا۔ اللہ کے کلام کا ضرور اثر ہوتا اگر میں جھوٹ نہ کہتا۔ اگر میری آنکھوں میں شرم ہوتی اور میں چوری چھپے اسے نہ دیکھتا۔ مجھے تو ایسا لگ رہا تھا کہ وہ شعلہ بار نگاہیں اب تک مجھے گھور رہی ہیں اور مجھ سے کہہ رہی ہیں کہ میں تم سے انتقام لوں گی۔ ضرور انتقام لوں گی۔

میرے دن اور میری راتیں اضطراب کی حالت میں گذرنے لگیں۔ میں پانچوں وقت کی نمازیں بلاناغہ پڑھنے لگا۔ اس طرح کچھ سکون مل گیا۔ بس کبھی کبھی رات کو تنہائی میں وہ آنکھیں یاد آجاتی تھیں۔

پھر ایک روز مجھے مداری پور جانا پڑا۔ وہاں میری خالہ بیمار تھیں امی نے کہا کہ اگر وہاں علاج کی سہولتیں میسر نہ ہوں تو میں خالہ کو لے کر یہاں آجاؤں لیکن دوسرے دن واپسی ضروری تھی۔ کیونکہ تیسرے دن میری سالگرہ تھی امی عجیب طرز سے میری سالگرہ مناتی تھیں۔ اس روز وہ مجھ سے روزہ رکھواتی تھیں۔ میں صبح چار بجے پیدا ہوا تھا۔ یعنی فجر کی اذان کے وقت۔ ان کا کہنا تھا کہ مجھے صبح کی نماز سے اپنے نئے سال کا آغاز کرنا چاہئے۔ افطاری کے لئے انواع واقسام کے کھانے پکوائے جاتے تھے اور عزیزوں اور رشتے داروں کو دعوت دی جاتی تھی۔ مختصر یہ کہ مجھے رات کو لاری میں جانا تھا اور دوسری شام کو واپس آجانا تھا۔

ہمارے جلال آباد سے مداری پور بیس میل کے فاصلے پر ہے میں رات کو خالہ کے ہاں پہنچ گیا۔ ان کی علالت تشویشناک نہیں تھی۔ اس وقت وہ گہری نیند سو رہی تھیں۔

میں نے انہیں اٹھانا مناسب نہیں سمجھا۔ میری خالہ زاد بہن رضیہ نے میرے لئے کھانا لگایا پھر وہ میرے لئے بستر بچھانے چلی گئی۔ وہ ایک ہی کمرے کا مکان تھا۔ اس مکان سے خالہ کی غربت ظاہر ہو جاتی تھی۔ امی نے ایک بار ارادہ ظاہر کیا تھا کہ وہ رضیہ کو بہو بنائیں گی۔ اس وقت میں نے انکار کر دیا تھا۔ رضیہ کی بس یہی خوبصورتی تھی کہ وہ جوان تھی اور جوانی میں تو گدھی بھی خوبصورت نظر آتی ہے۔ اس لئے میں اس طرف مائل نہ ہو سکا۔

جب میں کھانے کے بعد سونے کے لئے آیا تو میرا بستر برآمدے میں بچھا ہوا تھا۔ چھوٹے سے آنگن میں چاندنی کھلی ہوئی تھی۔ میں ایک سگریٹ سلگا کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ کمرے میں خالہ اپنی بیماری سے تھک ہار کر گہری نیند سو رہی تھیں۔ ان سے ذرا فاصلے پر رضیہ کی چارپائی تھی۔ میں نے کروٹ بدل کر کھلے ہوئے دروازے سے اسے دیکھا تو میرے دیکھنے کا انداز بدل گیا میں کیا بتاؤں۔ جب سے میں نے دروازے کے شگاف سے اس حسینہ کو دیکھا تھا تب سے یہ حالت تھی کہ ہر نوجوان لڑکی ملبوس ہونے کے باوجود میرے تصور میں لباس سے بے نیاز ہو جاتی تھی۔ میں غیر شعوری طور پر سینے کے اس سیاہ داغ کو تلاش کرتا تھا اور جب اس سیاہی سے دو آنکھیں گھورنے لگتیں تو میں فوراً ہی گھبرا کر آنکھیں بند کر لیتا۔

مگر داغ اُجلے چاند پر یا گورے بدن پر نمایاں ہوتا ہے اور رضیہ گہرے سانولے رنگ کی تھی۔ اس لئے وہاں کوئی داغ نمایاں نہیں ہو سکا۔ میں اس کے جسم کے سانس لیتے ہوئے نشیب و فراز میں گم ہو گیا اس وقت مجھے احساس نہیں ہوا کہ میں آنکھوں سے گناہ گار بن رہا ہوں۔ کیونکہ ان آنکھوں کا پہلا گناہ اتنا سنگین تھا کہ اس کے پیش نظر ملبوس رضیہ کو دیکھتے ہوئے قطعی احساس نہیں ہو رہا تھا کہ یہ معمولی سی جرأتِ دید بھی گناہ میں شامل ہو سکتی ہے۔

اتنے میں اس نے کروٹ لی۔ چارپائی کراہنے لگی۔ پھر اس نے میری جانب دیکھا۔ یک بیک میرا دل خوف سے دھڑکنے لگا۔ اس اجنبی حسینہ کی آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں۔ میں سچ کہتا ہوں کہ وہ بستر رضیہ کا تھا۔ وہ جسم بھی وہ چہرہ بھی رضیہ کا تھا۔ مگر وہ آنکھیں رضیہ کی نہیں تھیں۔ دروازے کے شگاف سے نکل کر رضیہ کے چہرے پر آ کر بیٹھ گئی تھیں اور مجھے غرا کر دیکھ رہی تھیں۔ میں نے فوراً ہی آنکھیں بند کر لیں۔ اس کروٹ لیٹے رہنا میرے لئے محال ہو گیا۔ میں کروٹ بدل کر آنگن میں پھیلی ہوئی چاندنی

کو دیکھنے لگا۔

اجلی ٹھنڈی چاندنی میں وہ آنکھیں گم ہو گئیں۔ مگر ذرا دیر کے لئے پھر جیسے ہی چاند بدلی میں چھپنے لگا اور ملگجا سا اندھیرا پھیلنے لگا مجھے کسی کی سانسوں کی گرمی محسوس ہوئی۔ اسی کے ساتھ ہی ایک پُراسرار سرگوشی اُبھری۔

"ڈرا۔ حی۔ی۔یل"

"ارے باپ رے!" میں اچھل کر چارپائی کی پائینتی چلا گیا اور سرہانے کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ رضیہ تھی۔

قاسم نے ایک زور دار قہقہہ لگایا۔ پھر اس نے کہا۔

"لاحول ولا قوہ۔ بزدلی کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ ایک لڑکی خود ہی تمہارے پاس چل کر آئی اور تم نے اسے آسیب سمجھ لیا۔"

"ہاں!" راحیل نے کہا۔ "اس وقت مجھے بڑی شرمندگی محسوس ہوئی۔ میرے اس طرح خوفزدہ ہو کر اچھل پڑنے سے رضیہ بھی سہم گئی تھی۔ اس نے کمرے کی جانب دیکھا کہ کہیں خالہ نہ اٹھ گئی ہوں۔ وہ بیچاری بدستور گہری نیند سو رہی تھیں۔ ان کی طرف سے مطمئن ہو کر وہ میرے پاس آ گئی اور میرے دہشت زدہ ہونے کی وجہ پوچھنے لگی۔ میں بھلا کیا جواب دیتا۔ ایک عورت کے سامنے اپنی کمزوری کیسے ظاہر کرتا مجھے اپنی خفت مٹانے کا یہی ایک راستہ نظر آیا کہ میں پوری مردانگی سے اس پر چھا جاؤں۔ میں نے اسے کھینچ کر اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا اور اسے جھنجھوڑتے ہوئے چارپائی پر گر پڑا۔ اس نے ذرا بھی مزاحمت نہ کی۔ میرے ہر عمل کا ایک جذباتی ردعمل پیش کرنے لگی۔ میں جانتا تھا کہ وہ مجھے چاہتی ہے اور ہمیشہ میری بن کر رہنے کے خواب دیکھتی ہے۔

عورت کو نظر انداز کرو تو وہ کسی نہ کسی طرح اپنی اہمیت جتا کر رہتی ہے۔ اسے بھی یہی راستہ سجھائی دیا تھا کہ وہ اپنے شباب کی جلوہ سامانی اور فتنہ انگیزیوں سے مجھے متاثر کردے۔ میں واقعی متاثر ہو گیا۔ اس نے میرے دماغ سے اس اجنبی حسینہ کو مٹا دیا تھا۔ وہ تمام رات میرے پہلو کو گرماتی رہی اور اپنی رنگین و سنگین اداؤں سے احساس دلاتی رہی کہ وہ شریکِ زندگی بن کر مجھے تمام الجھنوں سے نجات دلا سکتی ہے۔

صبح ہونے سے پہلے وہ اپنے بستر پر چلی گئی اور میں تھکے ہوئے کھلاڑی کی طرح نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ ایسی گہری نیند آئی تھی کہ دن کے ایک بجے آنکھ کھلی۔ خالہ اپنی

چارپائی پر بیٹھی مجھے آوازیں دے رہی تھیں۔ میں اٹھ کر ان کے پاس گیا اور ان خیریت دریافت کرنے لگا۔ ان سے باتیں کرنے کے دوران میں رضیہ کو بھی کنکھیوں سے دیکھتا جارہا تھا۔ وہ صبح ہی غسل سے فارغ ہو کر لباس بدل چکی تھی۔ اس کلی میں ایسا نکھار آگیا تھا کہ بار بار اسے دیکھنے کے بعد بھی جی نہیں بھرتا تھا۔ اب میں اسے چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا مگر امی کا حکم تھا کہ آج شام تک میں واپس پہنچ جاؤں۔ میں نے خالہ کو اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہا لیکن انھوں نے انکار کر دیا۔ کہنے لگیں کہ میں امی کو وہاں بھیج دوں وہ انہیں دیکھ کر چلی جائیں گی۔ میں نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ امی وہاں جائیں گی اور اس بار رضیہ کو اپنی بہو بنانے کی بات پکی کرلیں گی۔

میں نے غسل کیا۔ کھانا کھایا اور تین بجے رضیہ سے اس وعدے کے ساتھ رخصت ہو گیا کہ میں چند ہی دنوں میں اسے دلہن بنا کر وہاں سے لے جاؤں گا۔ اس سے رخصت ہو کر میں لاری اڈے پہنچا تو وہاں لانگ روٹ پر چلنے والی لاریوں کی ہڑتال شروع ہو گئی تھی۔ جلال آباد تک پہنچے کا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں تھا اور وہاں پہنچنا بھی ضروری تھا۔ ایک ٹرک نشاپور جا رہا تھا۔ ٹرک ڈرائیور نے مجھ سے کہا کہ وہ چھ میل تک جلال آباد کی سڑک پر جائے گا۔ اس کے بعد اس کا راستہ بدل جائے گا۔ چھ میل پر ایک دوراہا تھا۔ وہیں سے ایک اور کچی سڑک جلال آباد کو جاتی تھی۔ پیدل چلنے یا چھکڑے پر جانے والوں کے لئے قریب ترین راستہ تھا۔ یعنی جلال آباد وہاں سے صرف نو میل کے فاصلے پر تھا۔

ڈرائیور نے مجھ سے دو روپے لئے اور مجھے وہاں تک پہنچا دیا جس وقت میں نے کچے راستے پر سفر شروع کیا تو اس وقت شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ آسمان پر سیاہ بادل امنڈ امنڈ کر بارش کی پیش گوئی کر رہے تھے۔ میں اس امید پر آگے بڑھنے لگا کہ شاید کوئی چھکڑا یا کوئی ہم سفر مل جائے تو راستہ آسانی سے طے ہو جائے گا۔

دو میل کے بعد مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ راستے میں ایک بھی متنفس نہیں ملا۔ رات کی گہری تاریکی ہر طرف مسلط ہو گئی تھی۔ میں بزدل نہیں ہوں۔ تم اگر یہ سمجھتے ہو کہ میں ایک اجنبی حسینہ کی غراتی ہوئی آنکھوں سے خوفزدہ تھا تو تم غلط سمجھ رہے ہو۔ کیونکہ پھر کبھی اس کا سامنا نہیں ہوا تھا اور نہ ہی اس حسینہ نے اپنی دھمکی پر عمل کرتے ہوئے مجھے نامعلوم ذرائع سے نقصان پہنچایا تھا۔ پھر میں خوفزدہ کیسے ہوتا؟ دراصل میرے اندر ایک احساس جرم تھا کہ میں نے کسی کو کپڑوں سے بے نیاز دیکھ کر ایک گناہ کیا

ہے۔ یہ گناہ مجھے تڑپاتا تھا اور میں چونک چونک کر ان گھورتی ہوئی آنکھوں کو یاد کرنے لگتا تھا۔ اب تو رضیہ کے وجود نے میرے سوچنے کا انداز ہی بدل دیا تھا اور میں دل ہی دل میں ہنستے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اس حسینہ نے گھور کر صرف دروازے کی جانب دیکھا تھا۔ اس نے مجھے دھمکی نہیں دی تھی۔ مجھے اس گناہ کے احساس کو ذہن سے جھٹک دینا چاہیے۔

میں اندھیرے راستے پر آگے بڑھتا جارہا تھا۔ اسی وقت بارش شروع ہو گئی۔ میں تیزی سے قدم بڑھانے لگا۔ میری رفتار کے ساتھ ساتھ ہوائیں بھی تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ آس پاس کے درختوں کی پتیاں شور مچا رہی تھیں میں آگے بڑھتے ہوئے دور دور تک اِدھر اُدھر دیکھتا جا رہا تھا کہ شاید کسی آبادی یا کسی مکان کی روشنی نظر آجائے۔ تین میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اچانک بجلی کوندی تو ایک ڈاک بنگلہ نظر آگیا۔

اس ڈاک بنگلے میں دو کمرے تھے۔ چوکیدار نے میرے لئے ایک کمرہ کھولتے ہوئے بتایا کہ دوسرے کمرے میں ایک صاحب اور بیگم صاحب آ کر ٹھہرے ہوئے ہیں۔ وہ میرے کمرے میں ایک لالٹین چھوڑ کر چلا گیا۔ میں نے دروازے کو بند کر کے اندر سے چٹخنی چڑھا دی۔ اس کے بعد پلنگ پر بچھی ہوئی چادر اٹھا کر اسے تہہ بند کی طرح باندھ لیا اور گیلے کپڑے نچوڑ کر کرسیوں پر پھیلا دیئے۔ پھر بستر پر آکر لیٹ گیا۔

باہر بارش کا زور بڑھتا جا رہا تھا۔ درختوں سے ٹکرانے والی ہوائیں یوں شور مچا رہی تھیں جیسے بہت ساری بدروحیں چیخ رہی ہوں۔ میں کسی بدروح کے متعلق سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے آنکھیں بند کر کے رضیہ کو یاد کرنے لگا۔ اس ٹھنڈی رات میں اس کے جسم کی گرمی مجھے تڑپانے لگی۔ میں بڑی دیر تک اس کی ایک ایک ادا کو' اس کی خود سپردگی کے انداز کو اپنے ذہن میں تازہ کرتا رہا۔ پھر میری آنکھ لگ گئی۔ آنکھ لگ جائے تو پھر وقت گذرنے کا پتہ نہیں چلتا کہ ہم کتنی دیر تک سوتے رہے۔ اچانک ہی مجھے اپنے سینے پر ایک بوجھ سا محسوس ہوا۔ یوں جیسے کوئی بھاری پتھر سا رکھا ہو۔ میں نے فوراً ہی آنکھیں کھول دیں۔

وہ دروازے کے پاس کھڑی ہوئی تھی۔

سرہانے میز پر رکھی ہوئی لالٹین کی لو بھڑک رہی تھی۔ شاید تیل ختم ہو گیا تھا اور اس کی روشنی ساتھ چھوڑنا چاہتی تھی۔ اس بھڑکتی ہوئی جلتی بجھتی روشنی میں' میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ وہی اجنبی حسینہ تھی۔ اس کے دائیں ہاتھ کی مٹھی میں ایک تیز چمکتا ہوا خنجر

تھا۔ وہ ملبوس تھی۔ مگر اس کا سینہ کھلا ہوا تھا اور وہ سوراخ۔ اس سوراخ میں سے آہستہ آہستہ خون رس رہا تھا۔

میں ہکا بکا سا اسے دیکھ رہا تھا۔ شدید حیرانی سے میری آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا تو وہ کھلا کا کھلا ہی رہ گیا۔ وہ نفرت سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ لالٹین کی بھڑکتی ہوئی روشنی کبھی اسے اجاگر کر رہی تھی اور کبھی پل بھر کے لیے تاریکی میں چھپا رہی تھی۔ پھر وہ آہستہ آہستہ پلنگ کی طرف بڑھنے لگی۔ میرے پیروں کی طرف سے گھوم کر بائیں طرف آنے لگی۔

میرے کانوں میں بارش کی ٹپاٹپ اور بدروحوں کی چیخیں گونج رہی تھیں۔ مجھ پر لرزہ سا طاری ہو رہا تھا۔ وہ قریب آگئی تھی۔ اپنی ہتھیلی پر خنجر تول رہی تھی۔ جہاں اس کے سینے میں سوراخ تھا' ٹھیک اسی جگہ وہ میرے سینے کو نشانے کے لئے تاک رہی تھی۔ پھر اس نے خنجر کے دستے کو مٹھی میں بھینچ لیا اور مجھ پر حملہ کر دیا۔

میں فوراً ہی کروٹ بدل کر پلنگ کے دوسرے سرے پر چلا گیا خنجر دستے تک بستر کے گدے میں پیوست ہو گیا تھا۔ وہ خنجر میری آنکھوں کے اتنے قریب تھا کہ میں اس کے ہاتھی دانت کے سفید دستے کو واضح طور سے دیکھ سکتا تھا اور ہاتھ بڑھا کر اس خنجر کو چھین سکتا تھا۔ مگر میرے پلٹ کر دیکھتے ہی اس نے خنجر کو بستر سے کھینچ لیا اور واپس گھوم کر میرے پیروں کی طرف سے دائیں طرف آنے لگی۔ کیونکہ میں پلنگ کے دائیں طرف تھا۔

میرے پیروں کی جانب پہنچ کر وہ ایک لمحے کے لئے رک گئی' پل بھر کی تاریکی نے اسے چھپا لیا۔ پھر لالٹین کی لو بھڑک کر اسے واضح کرنے لگی شانوں پر بکھری ہوئی سنہری زلفیں ہوا کی زد پر رہ رہ کر اڑتی جا رہی تھیں اس کی نگاہیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ پھر آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی۔

میرے قریب پہنچ کر وہ رک گئی۔ حملہ کرنے کا وہی انداز تھا۔ وہ اپنی ہتھیلی پر خنجر تول رہی تھی اور میرے ننگے سینے کو نشانے کے لئے تاک رہی تھی۔ پھر اس نے خنجر کے دستے کو مٹھی میں جکڑ کر مجھے نشانے پر رکھا۔ دوسری بار بھی بال بال بچا۔ پھرتی سے کروٹ بدل کر دوسری طرف چلا آیا۔

وہ پیوست ہونے والے خنجر کو واپس کھینچ کر مجھے دیکھنے لگی۔ اب اس کی آنکھوں

ان میں نفرت نہیں تھی۔ گہری سنجیدگی تھی۔ آہ! وہ خوبصورت مقناطیسی آنکھیں۔ وہی آنکھیں مجھے سحرزدہ کر رہی تھیں مجھے کمزور بنا رہی تھیں۔ میں ہاتھ بڑھا کر اس کی کلائی نہیں پکڑ سکتا تھا یوں لگتا تھا جیسے میں بے دست و پا ہو کر رہ گیا ہوں۔

پھر اس کے لب ہلنے لگے۔ بادلوں کی گرج میں اس کی رس بھری آواز گڈمڈ ہو رہی تھی۔ وہ بہت آہستہ آہستہ بول رہی تھی۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہہ رہی ہے۔ اسی وقت لالٹین کی لو آخری بار بھڑک کر بجھ گئی۔

کمرے میں گہری تاریکی چھا گئی۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں اچھل کر بیٹھ گیا۔ پتہ نہیں وہ کس طرف سے حملہ کرے جہاں وہ آخری بار نظر آئی تھی۔ وہاں میں نے لات چلا دی تاکہ وہ دور چلی جائے لیکن وہ اس طرف نہیں تھی۔ شاید کسی دوسری طرف چلی گئی تھی۔ اس اندھا کر دینے والی تاریکی میں نہ دیکھا جا سکتا تھا اور نہ ہی اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ وہ اس بار کس طرف سے خنجر کی دھار آزمانے آئے گی۔

میں بوکھلا کر پلنگ پر بیٹھے بیٹھے چاروں سمت گھومنے لگا اور اِدھر اُدھر تاریکی میں مکے بازی کرنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی میں چیختا بھی جا رہا تھا۔

"خبردار! میرے قریب نہ آنا۔ تم مجھے دہشت زدہ نہیں کر سکتیں۔ میں بزدل نہیں ہوں۔ مجھے بچاؤ۔ بچاؤ۔ میں تمہیں مار ڈالوں گا۔ ارے دوڑو یہ مجھے مار ڈالنا چاہتی ہے۔ بچاؤ۔ خدا کے لئے مجھے اس چڑیل سے بچاؤ.........."

میری چیخوں سے سارا ڈاک بنگلہ گونجنے لگا۔ برآمدے میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں آرہی تھیں۔ پھر چوکیدار دروازہ پیٹنے لگا۔

"دروازہ کھولو۔ صاحب جی دروازہ کھولو۔"

"کیا بات ہے؟" کسی شخص کی جھلائی ہوئی آواز سنائی دی۔ "تم کون ہو؟ کیوں چیخ رہے ہو؟ چیخنا ہی ہے تو دروازہ کھول کر کہیں دور چلے جاؤ۔"

ان کی آوازیں سن کر مجھ میں حوصلہ پیدا ہوا۔ ان کے ہاتھوں میں لالٹین بھی تھی۔ جس کی روشنی کھڑکی سے اندر آرہی تھی۔ میں پلنگ سے چھلانگ لگا کر نیچے آیا اور دوڑتا ہوا دروازے کے پاس پہنچ کر اسے کھولنے لگا۔ جھٹکا دے کر اسے اپنی طرف کھینچنے لگا۔ ذرا دیر بعد اپنی بوکھلاہٹ کا احساس ہوا کہ دروازے کو تو میں نے اندر سے چٹخنی لگا کر بند کیا تھا۔ میں نے چٹخنی گرا دی۔ دروازہ کھلتے ہی چوکیدار ہاتھ میں لالٹین لیے ایک شخص کے

ساتھ اندر آیا۔

وہ شخص مجھے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ میں بھی اسے حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔ وہ احمد دین تھا۔ میرا کرایہ دار۔ وہی کرایہ دار جس کے ہاں جا کر میں نے دروازے کے شگاف سے جھانک کر اس ستمگر حسینہ کو دیکھا تھا اور جو ابھی ابھی میرے کمرے میں خنجر بکف آئی تھی۔

مگر اب وہ کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ لالٹین کے بھڑک کر بجھتے ہی غائب ہو گئی تھی۔ میں انہیں بتانے لگا کہ کس طرح ایک دوشیزہ ہاتھ میں خنجر لئے میرے کمرے میں آئی تھی۔

"صاحب جی! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ آپ نے دروازہ اندر سے بند کر رکھا تھا۔ کھڑکیوں پر لوہے کی سلاخیں لگی ہیں۔ پھر کوئی لڑکی کمرے کے اندر کیسے آسکتی ہے؟"

احمد دین لالٹین لے کر پلنگ کے قریب آیا۔ پلنگ کے گدے پر دوبار خنجر پیوست ہو چکا تھا۔ مگر وہاں خنجر کے پیوست ہونے کا نشان تک نہ تھا۔ احمد دین نے کہا۔

"آپ نے خواب دیکھا ہے۔ دیکھئے یہاں خنجر کا کوئی نشان نہیں ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ اس کے سینے میں ایک سوراخ تھا۔ یہ بات کیسے تسلیم کر لی جائے۔ کیا سوراخ ہونے کے بعد کوئی انسان زندہ رہ سکتا ہے۔ آپ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس سوراخ سے خون رس رہا تھا۔ بتائیے یہاں کہیں خون دھبہ نظر آ رہا ہے۔"

میں پریشان ہو کر فرش پر خون کے دھبے تلاش کرنے لگا۔ مگر وہ پُراسرار دوشیزہ اپنی موجودگی کا کوئی نشان چھوڑ کر نہیں گئی تھی۔ میں یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھا کہ جو کچھ مجھ پر بیتی ہے وہ محض ایک خواب تھا۔ میں نے اسے بہت قریب سے دیکھا تھا۔ ایک بار وہ حملہ کرنے کے دوران اس قدر قریب آئی تھی کہ میں نے اس سانسوں کی گرمی کو بھی محسوس کیا تھا۔ میں کیسے مان لیتا کہ وہ ایک خواب تھا۔

احمد دین نے اپنی رسٹ واچ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"سوا چار ہو گئے۔ اب تھوڑی دیر میں صبح ہونے والی ہے اگر آپ خوفزدہ ہیں تو یہ چوکیدار صبح تک اس کمرے میں آپ کے ساتھ رہے گا۔ میں آپ کا ساتھ دیتا۔ مگر میرے ساتھ کی عورتیں آپ کی چیخیں سن کر خوفزدہ ہو گئی ہوں گی۔"

اس کے ساتھ عورتیں ہیں۔ یہ سن کر میرا ذہن اس لڑکی کی طرف چلا گیا۔ اگر وہ

دین کی کوئی عزیزہ ہے تو یقیناً وہ بھی یہاں موجود ہو گی میں نے پوچھا۔

"آپ کے ساتھ کتنی عورتیں ہیں؟"

"دو۔ ایک میری بیوی اور دوسری میری سالی۔ ہم جلال آباد جا رہے تھے۔ راستے بارش کے آثار دیکھ کر اس ڈاک بنگلے میں ٹھہر گئے۔"

اتنے میں پاس والے کمرے سے کسی عورت کی گھبرائی ہوئی سی آواز آئی۔ وہ احمد کو آوازیں دے رہی تھی۔ احمد دین تیزی سے پلٹ کر کمرے سے باہر جانے لگا۔ میرا الجھا ہوا تھا۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ جو لڑکی میرے بند کمرے میں آئی تھی، وہی والے کمرے میں موجود ہے یا نہیں۔ میں بھی احمد دین کے پیچھے کمرے سے باہر آیا۔

دوسرے کمرے سے ایک عورت بھاگی آ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں خنجر تھا۔ میں ٹک کر حیرانی سے دیکھنے لگا۔

اس کا دستہ ہاتھی دانت کا تھا۔ وہ وہی خنجر تھا۔ میں اسے ہزاروں میں پہچان سکتا تھا۔

ہ عورت احمد دین کے قریب آ کر رک گئی اور ہانپتی ہوئی بولی۔

"ہاجرہ اپنے بستر پر نہیں ہے۔ یہ۔ یہ خنجر اس کے بستر کے نیچے پڑا ہوا تھا۔ وہ کہاں لی گئی اس اندھیری رات میں وہ کہاں جا سکتی ہے۔ میں جانتی ہوں۔ تم نے اسے پریشان کیا ہے۔ تم نے اس کہیں بھاگنے پر مجبور کر دیا۔"

"بکواس مت کرو۔" احمد دین نے ڈانٹ کر کہا۔ "میں تو گہری نیند سو رہا تھا راحیل صاحب کی چیخیں سن کر یہاں بھاگا آیا۔ میں نے اس کے بستر کی جانب دیکھا تک نہیں کہ وہ سو رہی ہے، جاگ رہی ہے یا کہیں اپنا منہ کالا کرنے گئی ہے۔"

وہ دونوں میاں بیوی آپس میں تو تو میں میں کرنے لگے۔ میں وحشت زدہ نظروں سے اس خنجر کو دیکھ رہا تھا۔ میں چیخ چیخ کر کہنا چاہتا تھا یہ وہی خنجر ہے۔ جسے تم لوگ ہاجرہ کہہ رہے ہو۔ وہی لڑکی یہ خنجر لے کر مجھے قتل کرنے آئی تھی۔ مگر۔ مگر اس ہاجرہ پر الزام لگانے سے پہلے میں اس کی صورت دیکھنا چاہتا تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ کوئی دوسری ہی لڑکی ہو اور بعد میں مجھے شرمندگی اٹھانی پڑے۔

احمد دین کی بیوی کہہ رہی تھی۔

"میں کچھ نہیں جانتی۔ میری بہن کو تلاش کرو۔ نہ جانے وہ اس ویرانے میں کہاں بھٹک رہی ہو گی۔ میرے اللہ، وہ بھی کیسی نڈر ہے اس اندھیرے میں نہ جانے کہاں چلی

گئی ہے۔"

میں اسے دیکھنے کے لئے بے چین تھا۔ میں نے فوراً ہی کہا۔

"احمد بھائی۔ ہمیں فوراً ہی انہیں تلاش کرنا چاہئے وہ زیادہ دور نہیں گئی ہوں گی۔" میں کمرے میں آکر اپنے کپڑے پہننے لگا۔

چوکیدار نے میرے پاس آکر کہا۔ "صاحب جی! کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ کہتے ہیں کہ اس کمرے میں ایک لڑکی خنجر لے کر آئی تھی۔ اُدھر دوسرے کمرے میں بھی ایک لڑکی خنجر چھوڑ کر گئی ہے۔"

میں نے کہا۔"میں خود حیران ہوں۔ اس لڑکی کو دیکھنے کے بعد ہی کوئی رائے قائم کروں گا۔"

میں نے بوڑھے چوکیدار سے لالٹین لے لی۔ احمد دین نے اس سے لاٹھی مانگ لی۔ پھر ہم دونوں اس کی تلاش میں نکل گئے۔

بارش تھم گئی تھی۔ آسمان اب تک ابر آلود تھا۔ جس کی وجہ سے گہری تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ ہم لالٹین کی روشنی میں کیچڑ آلود راستوں سے گذر رہے تھے۔ کہیں کہیں گھاس کے قطعے تھے۔ ورنہ پتھریلی زمین اور اونچے اونچے ٹیلے نظر آرہے تھے۔ احمد دین رہ رہ کر ہاجرہ کو پکار رہا تھا۔ جنگل کے سناٹے میں ہاجرہ کا نام گونج رہا تھا اور ٹیلوں اور پہاڑیوں سے ٹکرا کر لرزتا ہوا ہماری طرف واپس آرہا تھا۔ احمد دین نے پریشان ہو کر کہا۔

"لعنت ہے اس لڑکی پر۔ نہ جانے کہاں جاکر مرگئی ہے' آپ ایسا کریں کہ اس طرف جائیں۔ میں اِدھر جاتا ہوں۔ مگر آپ تو پہلے ہی سہمے ہوئے ہیں۔"

مجھے اپنی توہین کا احساس ہوا۔ میں نے جھلا کر کہا۔

"میں بزدل نہیں ہوں۔ میرے ساتھ جو واقعہ پیش آیا ہے اگر وہ آپ کے ساتھ پیش آتا تو آپ بھی اس اندھیرے میں دہشت سے چیخنے لگتے۔ بہرحال آپ اُدھر جائیے۔ میں اِدھر تلاش کرتا ہوں۔"

میں لالٹین لے کر جانے لگا۔ اس نے کہا۔

"مگر آپ ہاجرہ کو کیسے پہچانیں گے؟"

"میں پہچانتا ہوں!" بے اختیار میں نے کہہ دیا۔ دراصل میرے دماغ میں بھی یہ بات تھی کہ ہاجرہ پُراسرار حسینہ ہے۔ میں نے بات بناتے ہوئے کہا۔

"ہاجرہ کو پہچاننا کیا مشکل ہے؟ اس ویرانے میں دس بیس لڑکیاں تو نہیں ہوں گی۔ ملنا ہو گا تو وہی ایک ملے گی۔ میں پہچان لوں گا۔"

یہ کہہ کر میں دوسری طرف چلا گیا۔ اس وقت میرے دل میں کسی طرح کا خوف نہیں تھا۔ اس کا خنجر ڈاک بنگلے میں رہ گیا تھا۔ ایک کمزور لڑکی کو قابو میں کرنا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ اگرچہ وہ پُراسرار قوتوں کی مالک تھی۔ بند کمرے میں چلی آئی تھی۔ سینے میں پیسہ برابر سوراخ تھا' وہاں سے خون رستا رہتا تھا پھر بھی وہ زندہ تھی۔ مگر حیرت زدہ کرنے والی بات یہ تھی کہ وہ احمد دین کی عزیزہ تھی۔ کیا انہوں نے نہیں دیکھا ہو گا کہ اس سینے سے خون رستا ہے یا نہیں؟ یہ تو صریحاً بچکانہ باتیں تھیں۔ دوسروں سے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ ان کی نظروں میں خود کو پاگل ثابت کیا جائے۔

میں لالٹین ہاتھ میں لیے ایک ٹیلے کے بعد دوسرے ٹیلے کے پیچھے اسے تلاش کرتا رہا۔ پھر وہ مجھے مل گئی۔ اب میں سوچتا ہوں کہ وہ انسانی روپ میں آکر بڑے ہی ڈرامائی انداز میں مجھے متاثر کرنا اور میرے قریب آنا چاہتی تھی۔ اس وقت میں سمجھا کہ وہ اچانک ہی مل گئی ہے۔

وہ ایک چھوٹی سی پہاڑی پر چڑھ رہی تھی۔ لالٹین کی روشنی دیکھ کر ٹھٹک گئی اور مجھے ایسے دیکھنے لگی جیسے پہلے کبھی دیکھا نہ ہو۔ میں چند لمحوں تک اسے دیکھتا رہا۔ وہ ہو بہو وہی تھی۔ میرے خون کی پیاسی۔ مگر اس کے چہرے پر بلا کی معصومیت تھی۔ وہ کچھ دیر پہلے کی جفاشعار حسینہ نہیں تھی۔ میں نے کہا۔

"کیا تم مجھے پہچان رہی ہو۔ لو اچھی طرح پہچانو" میں نے لالٹین کو اونچی کرکے اپنے چہرے کے قریب کرلیا۔

اس نے ایک نگاہ غلط انداز سے مجھے دیکھا اور پھر پلٹ کر پہاڑی کی بلندی کی طرف بھاگنے لگی۔ میں نے للکار کر کہا۔

"رک جاؤ۔ ہاجرہ رک جاؤ۔ تم مجھ سے بھاگ کر نہیں جاسکو گی۔"

میں بھی اس کے پیچھے دوڑنے لگا۔ وہ بلندی پر جانے والی ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈی پر بھاگتی جا رہی تھی۔ کبھی کبھی پلٹ کر میری طرف دیکھتی تھی اور مجھے قریب پہنچتے دیکھ کر پھر بھاگنے لگتی تھی۔ میں اس سے تیز دوڑ رہا تھا مگر کیچڑ اور پھسلن کی وجہ سے کہیں کہیں میری رفتار سست پڑ جاتی تھی۔ وہ تو ایسے بھاگ رہی تھی جیسے اسے گرنے مرنے کی

قطعی پرواہ نہ ہو۔ کچھ اونچائی پر پہنچ کر زمین ہموار ہو گئی۔ وہ آگے بھاگتے کیچڑ میں پھسل کر گر گئی۔ اس کے حلق سے ایک کراہ نکلی۔ پھر وہ پکڑی جانے کے خوف سے فوراً ہی اٹھ گئی۔ میں ہاتھ بڑھا کر اس کی طرف جھپٹا۔ وہ گرفت میں آتے آتے رہ گئی۔ میں نے جھلا کر پھسلنے اور گرنے کے اندیشوں کو فراموش کر دیا۔ ایک بار تیزی سے دوڑ لگائی اور چند قدموں کے فاصلے پر پہنچ کر اسے پکڑ ہی لیا۔

اُف! میں نے لالٹین کی روشنی میں دیکھا۔ ہم سے ایک قدم آگے گہری کھائی تھی۔ اگر میں اسے پکڑ نہ لیتا تو پھر اس کی ہڈی پسلیاں بھی نہ ملتیں۔ وہ اپنے بازو کو جھٹکے دے کر خود کو میری گرفت سے چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔

"چھوڑو۔ چھوڑو مجھے۔ میں مرجاؤں گی۔ میں زندہ نہیں رہوں گی۔ مجھے مرجانے دو۔ مجھے چھوڑ دو.........."

میں نے اس کے بازو کو اور مضبوطی سے پکڑ لیا اور اسے اپنی طرف کھینچ کر بولا۔

"ابھی تو تم مجھے مار ڈالنا چاہتی تھیں۔ اب خود مرنا چاہتی ہو۔ کیا تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔"

"تمہارا دماغ خراب ہے' میں تمہیں کیوں مارنا چاہتی ہوں گی؟ تم کون ہو؟ کیوں میرا پیچھا کرتے ہوئے آئے ہو؟ چھوڑ دو مجھے۔ میں اپنی مرضی کی مالک ہوں۔ اپنی مرضی سے جان دینا چاہتی ہوں۔ تم مجھے روکنے والے کون ہوتے ہو؟"

"کیا تم مجھے نہیں پہچانتی ہو؟ کیا تم تھوڑی دیر پہلے ایک خنجر لے کر میرے کمرے میں نہیں آئی تھیں؟"

وہ خود کو چھڑانے کی جدوجہد کرنا بھول گئی۔ مجھے شدید حیرانی سے دیکھتی ہوئی بولی۔

"تم۔ تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟ میں تمہیں نہیں جانتی کہ تم کہاں رہتے ہو۔ پھر میں تمہارے کمرے میں کیسے آگئی۔ تمہیں دھوکہ ہو رہا ہے۔ تم کہاں رہتے ہو۔ میں تو ڈاک بنگلے سے آرہی ہوں۔"

"میں بھی ڈاک بنگلے سے آرہا ہوں۔ معصوم بننے کی کوشش نہ کرو۔ میں نے وہ خنجر بھی دیکھا ہے جس سے تم نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی۔ پھر ناکام ہونے کے بعد اسے اپنے بستر پر چھوڑ کر چلی آئیں۔"

"تم پاگل ہو!" وہ چیخ کر بولی۔ "وہ۔ وہ میں نے۔ اپنے بہنوئی کو مار ڈالنے کے لیے

وہ خنجر اپنے پاس رکھا تھا۔"

"احمد دین کو؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں!" وہ ایک جھٹکے سے بولی اور پھر خود کو میری گرفت سے چھڑانے لگی۔

"تم اسے کیوں مارنا چاہتی تھیں؟"

"مجھے مرجانے دو۔ پھر اسی بے غیرت سے جا کر پوچھنا۔"

"نہیں۔ میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں بتاؤ؟ میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا۔"

اس نے بے بس ہو کر مجھے دیکھا۔ شاید اسے یقین ہو گیا تھا کہ میری مضبوط گرفت سے اسے نجات نہیں ملے گی۔ وہ سر جھکا کر ایک ہتھیلی اپنی آنکھوں پر رکھ کر رونے لگی۔

☆======☆======☆

راحیل اتنا کہہ کر رک گیا اور قاسم کو دیکھنے لگا۔ قاسم بھی سر جھکائے ایک ہتھیلی اپنی آنکھوں پر رکھے کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔

"کیا بات ہے؟" راحیل نے پوچھا۔ "کیا تم بور ہو رہے ہو قاسم؟"

قاسم نے چونک کر سر اٹھایا اور جبراً مسکراتے ہوئے بولا۔

"نہیں۔ یہ کہانی اتنی .... سوری کہانی نہیں' تمہاری آپ بیتی اتنی دلچسپ ہے کہ کوئی بور نہیں ہو سکتا۔ میں دراصل ہاجرہ کے متعلق سوچ رہا تھا۔ ابھی تمہاری آپ بیتی جاری ہے لیکن میں پہلے ہی فیصلہ سنا دوں کہ وہ آخر کار ایک مظلوم لڑکی ثابت ہو گی۔ یہ تمہارا وہم ہے کہ وہ تمہیں قتل کرنا چاہتی تھی۔"

وہ بڑی اداسی سے طنزیہ انداز میں مسکرایا۔ پھر کھانسنے لگا۔ بیماری اور نقاہت کی وجہ سے اسے کھانسنے میں ایسی تکلیف ہو رہی تھی کہ وہ بار بار اپنے سینے اور گردن کو سہلانے لگتا تھا۔

"ٹن۔ ٹن۔ ٹن.........." دیوار گھڑی تین بجا رہی تھی۔

راحیل نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کراہتے ہوئے کہا۔

"چار بجے۔ ڈاک بنگلے میں احمد دین نے اپنی رسٹ واچ کو دیکھ کر کہا تھا کہ سوا چار ہو چکے ہیں۔ اس طرح وقت کا حساب لگایا جائے تو ہاجرہ نے ٹھیک چار بجے مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ میں چار بجے پیدا ہوا تھا۔ اس عورت نے میری موت کا بھی وہی وقت مقرر کیا ہے۔"

"تم کہتے ہو کہ وہ مظلوم ہے۔ ہاں' میں بھی یہی سمجھ رہا تھا کیونکہ وہ رو رہی تھی۔ عورت جہاں خنجر سے نہیں مار سکتی وہاں اپنے آنسوؤں سے مار دیتی ہے۔ اتنی حسین لڑکی کو روتے دیکھ کر میں پگھل گیا۔ میرے ایک ہاتھ میں لالٹین تھی۔ دوسرے ہاتھ میں' میں نے اس کے گداز بازو کو پکڑ رکھا تھا۔ اس کا بھرا بھرا نرم و گرم بازو مجھے سمجھا رہا تھا کہ اس کے آگے بھی وہ بہت سی قیامتیں چھپائے ہوئے ہے۔ چند لمحوں تک میرا ذہن دروازے کے شگاف سے جھانکتا رہا اور ہولے ہولے لرزتا رہا۔ خوف سے نہیں' جذبات کی ہلچل سے لرزتا رہا۔ اسے دیکھ کر یقین نہیں آرہا تھا کہ اس کی غراتی ہوئی آنکھوں نے کبھی مجھے دھمکی دی تھی اور کچھ دیر پہلے وہ اس دھمکی پر عمل بھی کر چکی تھی۔

میں سب کو بھول گیا۔ اس روتی ہوئی مظلوم لڑکی کو کھینچتے ہوئے ایک بڑے سے پتھر کے پاس لایا اور اس پر جبراً اسے بٹھاتے ہوئے بولا۔

"مجھے بتاؤ کیا بات ہے؟ میں تمہارے کسی کام آسکتا ہوں تو مجھے بتاؤ؟"

"نہیں۔ کوئی میرے کام نہیں آسکتا۔ میں اس دنیا میں اکیلی ہوں۔ کوئی میری تنہائی اور بدنصیبی کو سمجھنے والا نہیں ہے۔"

"ایسا نہ کہو۔ تمہاری ایک بہن ہے۔"

"ہاں۔ وہ بہن بھی ہے اور دشمن بھی۔ وہ مجھ سے محبت بھی کرتی ہے اور نفرت بھی اور وہ ایسا کرنے پر مجبور ہے۔ والدین کی وفات کے بعد وہی میرا بوجھ اٹھا رہی ہے۔ مگر میرے بہنوئی کی نیت خراب ہے' پہلے پہل بہنوئی کے رشتے سے اس نے چھیڑ چھاڑ کر تو میں مذاق سمجھ کر ٹال گئی۔ یوں بھی مجھ پر امی کی دعائیں ہیں۔ انہوں نے مرتے وقت دعا دی تھی کہ میں ہمیشہ عزت آبرو سے رہوں گی۔ وہ اکثر کہا کرتی تھیں کہ شریف اور پاکباز لڑکیوں کی ایک ہمزاد ہوتی ہے۔ ہمیں کسی کے شیطانی ارادوں کا علم ہو یا نہ ہو۔ مگر ہماری ہمزاد کو تمام باتوں کا علم ہوتا ہے وہ ہماری لاعلمی میں ہماری حفاظت کرتی ہیں۔ اگر کوئی ہمیں بری نیت سے دیکھے تو وہ ہمارے اس دشمن سے ضرور انتقام لیتی ہے........"

میں اس کے قریب بیٹھا تھا۔ فوراً ہی ذرا پیچھے ہٹ کر بیٹھ گیا اور گھبرا کر اسے دیکھنے لگا۔ وہ اپنی ماں کی زبان سے سنی ہوئی باتیں کہہ رہی تھی۔ میں اس کی تصدیق کر سکتا تھا لیکن کیسے کرتا؟ یہ کیسے کہتا کہ میں نے چھپ کر اسے دیکھا ہے اور جب سے دیکھا ہے' تب سے ایک گناہ پر پچھتا رہا ہوں۔ پچھتاوا تو ایک رسمی چیز ہے۔ ورنہ گناہ کی حقیقت یہ

ہے کہ جتنی بار ہم پچھتاتے ہیں اتنی ہی بار پچھتانے کے دوران وہ گناہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ ہمارے سامنے مجسم ہوتا ہے۔ کپڑوں سے بے نیاز ہو کر ہمارے تحت الشعور میں چھپی چھپی انگڑائیاں لیتا رہتا ہے۔ میں اس کے سامنے اعتراف نہ کر سکا کہ میں نے اسے کس حال میں دیکھا ہے۔ وہ اب بھی لباس میں ہو کر بھی میرے سامنے بے لباس تھی۔

بہر حال میں نے بھی ہمزاد کے متعلق بزرگوں سے سنا ہے۔ پھر یہ کہ چشم دید واقعات سے میں انکار نہیں کر سکتا تھا۔ ہاجرہ بالکل معصوم اور بے ضرر تھی لیکن اس کی ہمزاد مجھے نقصان پہنچانا چاہتی تھی۔ ہاجرہ کی لاعلمی میں وہ نادیدہ ہستی میرے بند کمرے میں چلی آئی تھی۔

ویسے میں تنہا گناہگار نہیں تھا۔ ہاجرہ کے بیان کے مطابق احمد دین بھی مجرم تھا۔ اس پر بھی ہاجرہ کی ہمزاد کا عتاب نازل ہونا چاہئے تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"پھر تم خودکشی کیوں کر رہی ہو۔ کیا تمہاری ہمزاد احمد دین سے انتقام نہیں لے سکتی؟"

وہ ذرا دیر تک سر جھکائے خاموش رہی۔ پھر اس نے جواب دیا۔ "ہاں۔ انتقام لے رہی ہے۔ جب سے میں آپا کے ہاں آئی ہوں اور جب سے اس کی نیت بدلی ہے اس وقت سے وہ اختلاج قلب میں مبتلا ہو گیا ہے۔ کبھی کبھی اس پر دورہ پڑتا ہے۔ میں نے اسے سمجھایا کہ برے خیال کو دل میں جگہ نہ دو۔ ورنہ میرا صبر تمہیں اس سے بھی زیادہ اذیت میں مبتلا کرے گا۔ وہ ہنس کر کہنے لگا کہ یہ سب جاہلوں کی سی باتیں ہیں۔ ڈاکٹر نے بتایا ہے کہ اسے لو بلڈ پریشر ہے۔ شراب کا ایک پیگ پینے کے بعد خون کا سرکولیشن اعتدال پر آجاتا ہے۔ پھر مہینوں اسے اختلاج قلب کی شکایت نہیں ہوتی۔"

یہ تو اپنا اپنا نظریہ اور اپنی اپنی سوچ ہے۔ میں نے جب دیکھا کہ وہ اس طرح راہِ راست پر نہیں آرہا ہے تو میں نے آپا سے شکایت کر دی آپا محتاط ہو گئیں۔ اپنے خاوند کی طرف سے بھی اور میری طرف سے بھی۔ میں جو ایک بہن تھی۔ اب انہیں سوکن نظر آنے لگی۔ میری وجہ سے آئے دن میاں بیوی کے درمیان جھگڑے ہونے لگے۔ وہ کچھ دنوں کے لئے سیدھا ہو گیا۔ گھر میں آتا تو مجھ سے باتیں کرتا نہ نظریں ملاتا۔ میں نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ چلو جان چھوٹی۔

لیکن وہ میری بھول تھی۔ ایک دن میں نے اس کی چوری پکڑلی ایک شام میں اپنے

کمرے میں لباس بدل رہی تھی کہ وہ گلی کے دروازے پر ایک شگاف سے جھانکنے لگا۔"

میں بوکھلا کر ہاجرہ کو دیکھنے لگا۔ وہ کہتی جارہی تھی۔

"میں نے دروازے پر آہٹ سن کر اس طرف دیکھا تو مجھے بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ میں سمجھ گئی کہ وہی ذلیل آدمی ہے کسی دوسرے کو کیا معلوم کہ میرا کمرہ کون سا ہے۔ وہی جانتا تھا کہ میں شام کو لباس بدل کر اپنی سہیلی کے ہاں دعوت میں جانے والی ہوں۔ مجھے اس کی اس ذلیل حرکت پر بے اختیار رونا آگیا۔ میں اسے کوسنے اور بددعائیں دینے لگی۔ میں نے دل کی گہرائی سے کہا کہ اگر امی کی بات سچ ہے اگر ہمزاد کوئی خیالی ہستی نہیں ہے تو اللہ کرے کہ میری ہمزاد اس سے انتقام لے۔ ایسا انتقام لے کہ اس کی زندگی اس کے لئے عذاب بن جائے"۔

ہاجرہ کی باتیں سن کر مجھے پسینہ آنے لگا۔ احمد دین محفوظ تھا۔ اس کی بددعاؤں کا اثر مجھ پر ہوتا تھا اسی لئے اس کی ہمزاد میرے پیچھے پڑ گئی تھی۔ میں سوچنے لگا کہ کس طرح اپنی غلطی کی تلافی کر سکتا ہوں۔ کس طرح ایک پاکباز لڑکی کی بددعا کو دعا میں بدل سکتا ہوں۔ اس کے کسی کام آکر اس کی زندگی بچاکر۔ ہاں' وہ میری احسان مند ہو گی۔ میرے متعلق اچھی رائے رکھے گی تو اس کی ہمزاد میرا پیچھا چھوڑ دے گی۔

میں سوچ رہا تھا اور اس کی باتیں بھی سن رہا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"اس دن کے بعد میں بہت محتاط رہنے لگی۔ دعا کے ساتھ دوا بھی ضروری ہوتی ہے۔ اس لئے میں صرف بددعا دے کر مطمئن نہیں رہ سکتی تھی۔ کچھ احتیاطی تدابیر بھی ضروری تھیں۔ ایسے آدمی کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ ہزار عذاب نازل ہونے کے باوجود نصیحت حاصل نہیں کرتا۔ احمد دین بھی کبھی تنہائی میں مجھ جیسی کمزور لڑکی پر غالب آسکتا تھا۔ یہ سوچ کر میں اپنے پاس ایک خنجر چھپا کر رکھنے لگی۔

☆=====☆=====☆

آج ڈاک بنگلے میں ہم پہنچے تو کمرہ ایک تھا اور ہم تین تھے۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ جس کمرے میں' میں رات گذاروں۔ وہاں احمد دین موجود رہے۔ آپا بھی یہ نہیں چاہتی تھیں۔ انہوں نے اپنے خاوند سے کہا کہ وہ دوسرے کمرے میں جاکر سو جائے۔ مگر شاید اس نے چوکیدار کو پہلے سے سکھا پڑھا دیا تھا۔ چوکیدار نے کہا کہ اگر آدھی رات تک کوئی دوسرا مسافر نہ آیا تھا تو وہ کمرا احمد دین کو سونے کے لئے مل جائے گا۔ دو گھنٹے کے بعد ہی پتہ چلا کہ وہاں کوئی دوسرا مسافر آگیا ہے۔

ہم دونوں بہنیں مجبور ہو گئیں۔ آپا نے مجھے پلنگ پر سونے کے لئے کہا۔ انہوں نے اپنا اور احمد دین کا بستر فرش پر بچھا لیا۔ ہم تینوں ہی تھکے ہوئے تھے۔ آپا نے ایک پہرے دار کی طرح جاگنے کی کوشش کی مگر انہیں نیند آگئی۔ احمد دین بھی شاید سو گیا تھا۔ مگر میں اس کی موجودگی میں نہیں سو سکتی تھی۔ میری آنکھیں بند ہوتیں تو میں پھر چونک کر اسے دیکھنے لگتی تھی۔ آدھی رات کے بعد میں نے دیکھا کہ وہ شیطان جاگ رہا ہے اور میری طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔

میں نے سوچا کہ آپا کو اٹھا دوں۔ مگر ان کے تھکے ہوئے چہرے اور گہری نیند کو دیکھ کر میرا دل محبت سے بھر گیا۔ میں نے انہیں پریشان کرنے کی بجائے تکیہ کے نیچے سے خنجر نکال کر احمد دین کو خاموش دھمکی دی کہ میرے قریب آؤ گے تو جان سے جاؤ گے۔ میرے تیور دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ دال نہیں گلے گی لہٰذا وہ چپ چاپ دوسری طرف کروٹ بدل کر سو گیا۔

میں خنجر کو بستر پر اپنے ہاتھ کے قریب رکھ کر سوچنے لگی کہ ایسا کب تک ہو گا؟ اس طرح کیسے زندگی گذرے گی؟ کیا میں احمد دین کو اس خنجر سے مار سکتی ہوں۔ کیا میں اپنی بہن کا سہاگ اُجاڑ سکتی ہوں؟ نہیں' میں اپنے ہاتھوں سے اپنی اس بہن کو بیوہ نہیں بنا سکتی۔ جو ماں بن کر میری پرورش کر رہی ہے اور نہ بہن کے ساتھ رہ کر اس گھر کو تباہ کر

سکتی ہوں۔ احمد دین نے صبح ہی موقع پاکر مجھ سے کہا تھا کہ اگر میں اس سے شادی کے لئے راضی ہو جاؤں تو وہ آپا کو طلاق دیدے گا۔ اللہ! وہ کتنی کمینگی سے سوچ رہا تھا اور وہ محض اس لیے سوچ رہا تھا کہ میں اس کے گھر میں رہتی تھی۔ مجھے دیکھ دیکھ کر وہ للچاتا رہتا تھا۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کرلیا کہ اب اس گھر میں نہیں رہوں گی۔ یہاں سے چلی جاؤں گی۔ کہیں ڈوب مروں گی۔ موت کو گلے لگانے کے سوا کوئی راستہ نہ تھا۔ کیونکہ اس دنیا میں عزت آبرو سے پناہ دینے والا کوئی نہیں ہے۔ میں جہاں بھی جاؤں گی مجھے سینکڑوں احمد دین ملیں گے۔

میں سوچ رہی تھی۔ میرے دل میں مرجانے کی خواہش آندھی طوفان کی طرح زور پکڑ رہی تھی۔ میں اسی وقت بستر سے اٹھ کر بھاگ جاتی، مگر میں سمجھ رہی تھی کہ وہ جاگ رہا ہے۔ مجھے بھاگتے دیکھ کر وہ آپا کو جگادے گا۔ یا باہر رات کے اندھیرے میں جا مجھے پکڑے گا۔ میں اسے کوئی موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔ اس لئے میں چپکی پڑی رہی اور اسے دیکھتی رہی کہ جب وہ خراٹے لے گا تو میں وہاں اٹھ کر چلی جاؤں گی۔

اس کے خراٹوں کا انتظار کرتے کرتے میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔ میں سونا نہیں چاہتی تھی یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی نادیدہ ہستی تھپک تھپک کر مجھے سلا رہی ہے۔ آہستہ آہستہ میں اپنے ارادے کے خلاف سو گئی۔

نہ جانے کتنا وقت گذر گیا تھا۔ اچانک ہی میری آنکھ کھل گئی اپنی غفلت کا احساس ہوتے ہی سب سے پہلے میرے ہاتھ نے خنجر کو تلاش کیا وہ تو میرے ہاتھ کے نیچے ہی رکھا تھا مگر اس وقت نہیں تھا۔ میں نے تکیہ کے نیچے دیکھا۔ پھر اپنے آس پاس تلاش کیا۔ مگر وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ میں ہونٹوں کو سختی سے بھینچ کر احمد دین کی جانب دیکھنے لگی۔ مجھے یقین تھا کہ خنجر اسی نے غائب کیا ہے لیکن بظاہر وہ گہری نیند میں ڈوبا ہوا نظر آرہا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ سینے پر رکھا ہوا تھا۔ میں نے لالٹین کی روشنی میں اس کی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کو دیکھا۔ اس وقت چار بج کر پانچ منٹ ہوئے تھے.........."

میں نے چونک کر ہاجرہ کو دیکھا۔ چار بج کر پانچ منٹ ۔ یہ وہی وقت تھا جب اس کی ہمزاد خنجر لے کر میرے کمرے میں آئی تھی اور وہی خنجر ہاجرہ کے پاس سے غائب ہو گیا تھا۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ اس وقت میری کیا حالت تھی میں اندر سے لرز رہا تھا۔ بہت ساری حقیقتیں مجھ پر واضح ہو گئی تھیں۔ خنجر کا غائب ہونا۔ اس کی ہمزاد کا بند کمرے میں

چلے آنا۔ یہ تمام ایسی سچائیاں تھیں کہ ان پر کوئی دوسرا یقین نہ کرتا۔ مگر میں ان سچائیوں پر ایمان لے آیا ہوں۔

وہ کہہ رہی تھی۔ "وقت دیکھ کر مجھے پتہ چلا کہ رات گذرنے والی ہے اگر اب میں نے یہاں سے نکلنے میں دیر کی تو جلال آباد پہنچ کر مجھے ایسا موقع پھر کبھی نہیں ملے گا۔ میں اسی وقت بستر سے اٹھ گئی اور دبے پاؤں چلتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی.........."

قاسم نے ہاتھ اٹھا کر راحیل سے کہا۔

"سوری۔ میں مداخلت کر رہا ہوں۔ تم یہ کہہ رہے ہو کہ ہاجرہ کے بستر سے جو خنجر غائب ہوا تھا۔ اسی خنجر سے اس کی ہمزاد تمہیں ہلاک کرنے آئی تھی۔ بعد میں وہ اسے ہاجرہ کے پلنگ کے نیچے پھینک کر چلی گئی۔ احمد دین کی بیوی نے اسے پلنگ کے نیچے ہی سے اٹھایا تھا لیکن راحیل، میں کہتا ہوں کہ ہر عمل اور ردعمل کی مادی وجوہات ہوتی ہیں۔ غور کرنے کی بات ہے۔ ہاجرہ نے سوتے وقت خنجر کو اپنے ہاتھ کے پاس رکھا تھا۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ نیند کی حالت میں ہاتھ اِدھر سے اُدھر کرتے وقت وہ خنجر پلنگ کے نیچے گر پڑا ہو؟"

راحیل نے جواب دیا۔ "ہونے کو تو بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ ہمزاد کے وجود کو تو ایک طرف رکھو۔ لوگ تو خدا کے وجود پر بھی بحث کرتے ہیں اور اگر کوئی محیرالعقول واقعہ پیش آجائے تو اس کے مادی اسباب تلاش کرتے ہیں۔ تم اپنے طور پر سوچ رہے ہو کہ نیند کی حالت میں ہاجرہ کے ہاتھ سے وہ خنجر پلنگ کے نیچے گر گیا تھا لیکن میں نے اپنی آنکھوں سے اس خنجر کو اس کے ہمزاد کے ہاتھ میں دیکھا ہے۔ تم اسے وہم' خواب پریشاں یا کابوس کا نام دو گے۔ مگر ذرا صبر کرو۔ چار بجنے دو۔ تمہاری کوٹھی کی کھڑکیاں اور دروازے بند ہونے کے باوجود جب وہ یہاں آئے گی تو تم تمام اعتراضات کو بھول جاؤ گے۔

آہ قاسم! میرا دل بیٹھ رہا ہے۔ میں اس حقیقت کو سمجھ رہا ہوں کہ آج اس کے خنجر کی زد سے خود کو نہیں بچا سکوں گا۔ یہ آخری چالیس منٹ رہ گئے ہیں۔ اس کے بعد میری ہستی کا چراغ گل ہو جائے گا۔"

قاسم نے گھڑی کی جانب دیکھا تین بج کر بیس منٹ ہوئے تھے۔ اس نے تسلی دی۔

"تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہو۔ بیماری نے تمہیں کمزور کر دیا ہے لیکن میں تو کمزور نہیں ہوں۔ خطرے کے وقت میں تمہارے لئے ڈھال بن جاؤں گا۔"

اس نے مایوسی سے سر ہلا کر کہا۔ ”نہیں‘ میں ایسے مقام پر پہنچ گیا ہوں جہاں کسی کی دوستی اور قربانی کام نہیں آتی۔ میں تم سے کہہ چکا ہوں‘ میرے یہاں آنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ جو کچھ مجھ پر بیتی ہے تم اسے غور سے سن لو اور آخری بار مجھ پر جو بیتے گی‘ اس کے تم چشم دید گواہ بن جاؤ۔“

باہر زور سے بادلوں کے گرجنے کی آواز سنائی دی۔ کھڑکیوں کے شیشوں پر بارش کا جلترنگ بج رہا تھا۔ قاسم نے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے پوچھا۔

”تم تو اپنی غلطی کی تلافی کے لئے ہاجرہ کے کسی کام آنا چاہتے تھے کیا اس ہمزاد سے پیچھا چھڑانے کے لئے تم نے ہاجرہ سے نیکی نہیں کی؟“

”کی تھی؟“ اس نے کہا۔ ”ہاجرہ کی آپ بیتی سننے کے بعد میں اس کے ذرا قریب آگیا اور فیصلہ کن لہجے میں بولا کہ میں اسے مرنے نہیں دوں گا میں نے اس کا ہاتھ تھام کر اس کی توقع کے خلاف ایک چونکا دینے والی بات کہی۔

ہاجرہ! میں تم سے شادی کروں گا۔

اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ شاید وہ یہ سمجھنا چاہتی تھی کہ کہیں میں اسے خودکشی سے باز رکھنے کے لئے بہلا تو نہیں رہا ہوں؟ وہ نظریں جھکا کر بولی.........

”اب میں کسی امید سے خود کو نہیں بہلا سکتی۔ تم مجھ سے ایسی باتیں نہ کرو۔“

”میں تمہیں بہلانا یا دھوکہ دینا نہیں چاہتا۔ صاف اور سیدھی بات کہہ رہا ہوں تم عزت آبرو سے رہنا چاہتی ہو۔ میں تمہیں اپنی شریک حیات بناؤں گا۔ آج سے ٹھیک ایک ہفتے بعد میں تمہیں اپنی دلہن بنا کر اپنے گھر لے جاؤں گا۔ تم اپنی آپا اور بہنوئی کی محتاج نہیں رہو گی۔ تمہارا اپنا ایک گھر ہو گا یہ باتیں میں پوری سچائی سے کہہ رہا ہوں۔ اگر تمہیں انکار ہے۔ اگر میں تمہیں پسند نہیں ہوں تو میرے ہاتھوں سے اپنا ہاتھ چھڑا لو۔“

اس کا نازک سا ملائم ہاتھ میرے ہاتھوں میں کانپنے لگا میں چند لمحوں تک انتظار کرتا رہا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ اس نے اپنا ہاتھ مجھے پورے اعتماد سے سونپ دیا ہے تو میں نے اسے اپنے بازوؤں کے احاطے میں لے لیا وہ خود بخود آگے کو جھکی اور اپنا سر میرے سینے پر رکھ کر رونے لگی۔ وہ خوشی کے آنسو تھے۔

میں نے زندگی میں پہلی بار بڑی دلیری سے کسی لڑکی کو اپنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ ویسے تو رضیہ کے سلسلے میں بھی یہی فیصلہ کیا تھا۔ اس کے لئے میں جانتا تھا کہ امی فوراً راضی ہو

جائیں گے۔ کیونکہ وہ ان کی بہن کی بیٹی ہے لیکن ہاجرہ کے لئے مجھے ان کی مخالفتوں کا سامنا کرنا تھا۔ اس وقت وہ میری آغوش میں تھی اور میں دل ہی دل میں عہد کر رہا تھا کہ اس نازنین کے لیے ساری دنیا چھوڑ دوں گا۔ مگر اسے چھوڑنے کا خیال تک دل میں نہ لاؤں گا۔

سورج کے سامنے چراغ کو کون پوچھتا ہے۔ میں بھی اس ماہ پیکر کے سامنے اس سانولی لڑکی کو بھول گیا اور اسے لے کر ڈاک بنگلے میں آگیا۔ وہاں میں نے احمد دین کو خوب باتیں سنائیں‘ خوب شرمندہ کیا۔ تاکہ وہ آئندہ اپنی وفادار بیوی کے ہوتے ہوئے کسی دوسری لڑکی کا خیال دل میں نہ لائے۔ حالانکہ میں بھی رضیہ جیسی وفادار لڑکی کی عزت سے کھیل کر اب ہاجرہ کی طرف مائل ہو گیا تھا۔ مگر دوسروں کو شرمندہ کرتے وقت انسان کو اپنی غلطیاں یاد نہیں آتیں اور یاد بھی آتی ہیں تو وہ انہیں قربانی کے عظیم جذبے سے تعبیر کرتا ہے۔ جیسا کہ میں سمجھ رہا تھا کہ میں ہاجرہ کو زندگی کے مصائب سے بچانے‘ خودکشی سے باز رکھنے اور اس کی زندگی سنوارنے کے لئے اسے اپنا رہا ہوں۔

میں نے ہاجرہ کی بہن سے تمام باتیں طے کر لیں اور ان سے صاف کہہ دیا کہ میری امی اس شادی کی مخالفت کر سکتی ہیں۔ مگر میں صاحب جائیداد ہوں امی کی مخالفت کے باوجود اگلے جمعہ کو ہاجرہ سے نکاح پڑھاؤں گا‘ اور اسے لے جا کر عیش و آرام سے رکھوں گا۔

ہاجرہ کی بہن برسوں سے اسی انتظار میں تھی کہ کوئی رشتہ آئے تو دو بول پڑھا کر ہاجرہ کو اپنے خاوند کی نظروں سے دور کر دے۔ وہ راضی ہو گئی اور ہم جلال آباد آگئے۔

اس روز شام تک میں یہی کوشش کرتا رہا کہ امی کے سامنے کسی طرح ہاجرہ کا ذکر کروں۔ مگر میری جرأت نہ ہوئی۔ میں نے سوچا کہ رات کو ان کے پاؤں دباتے ہوئے بات چھیڑوں گا۔ رات کو ایسا ہوا کہ وہ خلاف معمول جلدی سو گئیں۔ دوسری صبح مداری پور سے اطلاع آئی کہ خالہ کا انتقال ہو گیا ہے۔ اب تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ سگی خالہ کا انتقال ہو جائے اور میں اپنی شادی کی بات کروں۔ اس روز ہم مداری پور چلے گئے۔ خالہ کی تجہیز و تکفین سے فارغ ہو کر میں نے رضیہ کی طرف دھیان دیا۔ اب وہ اس دنیا میں تنہا اور بے سہارا رہ گئی تھی۔ اس کا رو رو کر برا حال تھا۔ اس کے آنسو دیکھ کر مجھے اپنے جرم کا احساس ہوا کہ میں اس بے سہارا لڑکی کو پہلے ہی برباد کر چکا ہوں۔ اس کی آہ و

زاری فریاد بن کر مجھ سے انصاف طلب کر رہی تھی اور انصاف کا تقاضہ یہ تھا کہ میں اس لڑکی کو اپناؤں' جس کے جذبات سے میں کھیل چکا تھا۔

امی اسے اپنے ساتھ جلال آباد لے آئیں۔ میں دوراہے پر کھڑا ہو گیا تھا۔ ہاجرہ سے منہ موڑتا تو اپنی غلطی کی تلافی کرنے کا موقع ہاتھ سے نکل جاتا۔ دوسری طرف رضیہ دن رات میری نگاہوں کے سامنے رہتی تھی۔ ماں کی موت کا غم تازہ تھا اس لیے وہ میری تنہائی میں نہیں آتی تھی۔ ویسے سوگ منانے کے دوران بھی وہ مجھے ایسی نظروں سے دیکھتی تھی جیسے پوچھ رہی ہو۔ "اب میرا کیا ہوگا؟"

میں اپنا زیادہ وقت گھر سے باہر گذارنے لگا۔ اصل بات یہ تھی کہ ہاجرہ میں زیادہ کشش تھی۔ وہ جوان تھی اور حسین بھی۔ اس کے برعکس رضیہ ایک باسی پھول تھی۔ ایسے وقت انسان حق وانصاف کو نظر انداز کر کے اپنے جذبات کو ترجیح دیتا ہے۔ میں نے اپنے وعدے کے مطابق ہاجرہ سے شادی کرلی۔

ہم نے جو مکانات کرائے پر اٹھا رکھے تھے ان میں سے ایک مکان خالی تھا۔ بعد نماز جمعہ ہمارا نکاح ہوا اور میں شام سے پہلے ہی ہاجرہ کو اس مکان میں لے آیا۔ یہ بات چھپی نہیں رہ سکتی تھی' آج یا کل ظاہر ہو جاتی۔ مگر اسی وقت امی کو خبر ہو گئی۔ شاید احمد دین نے رقیب بننے کا فرض ادا کیا تھا۔ ابھی میں نئی دلہن کو خواب گاہ لے جا ہی رہا تھا کہ وہ پہنچ گئیں میں اسے خواب گاہ میں چھوڑ کر دوسرے کمرے میں آیا۔ ان کا سامنا ہوتے ہی میں نے ندامت سے گردن جھکالی۔ وہ کچھ دیر تک مجھے غم و غصہ سے دیکھتی رہیں پھر انہوں نے کہا۔

"مجھے خبر ملی تو یقین نہیں آیا کہ تم ماں سے چھپ کر زندگی کی اتنی بڑی خوشی پوری کرو گے اور اس خوشی میں ماں کو دودھ کی مکھی سمجھ کر ایک طرف پھینک دو گے۔ پھر یہ خوشی کیسی؟ میری بہن کو مرے کل چھ دن ہوئے ہیں۔ تم نے کیا سوچ کر شادی کی ہے؟ کیا تم اسی انتظار میں بیٹھے تھے کہ میری بہن مرے گی تو تم جشن مناؤ گے؟"

وہ ایسے طعنے دے رہی تھیں کہ میں جواباً کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ انہوں نے کہا۔

"شادی بیاہ بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ اچھی طرح دیکھ سمجھ کر لڑکی پسند کی جاتی ہے۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ جسے تم بیاہ کر لائے ہو' وہ آسیب زدہ ہے؟"

میں نے گھبرا کر امی کو دیکھا' پھر ہکلاتے ہوئے کہا۔

"نن۔ نہیں۔ آ۔ آپ سے کسی نے غلط کہا ہے۔ میں جانتا ہوں احمد دین نے آپ کے پاس آکر الٹی سیدھی لگائی ہے۔ وہ ہاجرہ کا دشمن ہے۔"

"بکواس مت کرو۔" وہ ڈانٹ کر بولیں۔ "کسی احمد دین سے میرا کیا واسطہ؟ کیا میں ہاجرہ کو نہیں جانتی ہوں؟ ہاجرہ ہی کیا میں اپنے ہر کرایہ دار کے حالات سے واقف ہوں۔ تم تو جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے کہ کرایہ وصول کرنے جاتے ہو۔ میں تو برسوں سے ان کے ہاں جاتی ہوں اور کرایہ وصول کرتی ہوں۔ آج دو سال سے ہاجرہ پر جن آتے ہیں۔ میں نے ایک بار اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ایک عامل صاحب جن اتارنے کے لئے کچھ پڑھ رہے تھے اور وہ وحشیانہ انداز میں چیخیں مار رہی تھی۔ اپنے بالوں کو نوچ رہی تھی اور اپنے لباس کو پھاڑ ڈالنا چاہتی تھی۔ عامل صاحب کے چیلوں نے اسے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ یہ تماشہ محلے کی دوسری عورتوں نے بھی دیکھا ہے۔ تم خود ہی سوچو اتنی حسین لڑکی سالوں سے بن بیاہی کیوں بیٹھی تھی؟ کوئی اس کا رشتہ مانگنے کیوں نہیں آتا تھا؟ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم اس کے جال میں پھنسو گے تو میں پہلے ہی تمہیں اس کی اصلیت بتا دیتی۔ میں تو محض اس لئے خاموش تھی کہ جوان لڑکوں کے سامنے پرائی بہو بیٹیوں کی باتیں نہیں کی جاتیں۔"

میرے دل پر ایک خوف سا طاری ہو رہا تھا۔ میرا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا کہ ہاجرہ نے مجھے دھوکہ دیا ہے۔ مجھ سے بات چھپائی ہے۔ یعنی جن والی بات چھپا کر ایک ہمزاد کی کہانی گھڑلی تھی۔ ڈاک بنگلے میں اس کے بستر سے خنجر غائب نہیں ہوا تھا۔ وہ جھوٹ بولتی ہے۔ وہ خود ہی جناتی قوت کے سہارے میرے بند کمرے میں آئی تھی۔"

قاسم نے پھر مداخلت کی۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"ٹھہرو ٹھہرو۔ تم تو عجیب آدمی ہو۔ ابھی تو کسی ہمزاد کے وجود پر ایمان لے آئے تھے اور اب کہہ رہے ہو کہ کسی جناتی قوت کے سہارے وہ تمہارے بند کمرے میں آئی تھی۔ میرا خیال ہے کہ تمہارا ذہن بری طرح الجھا ہوا ہے اس لئے تم جو کچھ کہتے ہو' اس کی تردید بھی کر دیتے ہو۔"

"ہاں!" راحیل نے کہا۔ "کچھ ایسی ہی بات ہے۔ ہاجرہ جتنی بار نئے روپ میں آئی' اتنی ہی بار میرے سوچنے کا انداز بدل گیا۔ ویسے مجھے امی کی باتیں زیادہ ٹھوس اور مستحکم معلوم ہوئیں۔ تم نے سنا ہوگا کہ جس لڑکی پر جن آتے ہیں اسے کوئی انسان بیوی کے طور

پر حاصل نہیں کر سکتا اور نہ ہی چھپ کر نظر بازی کر سکتا ہے لیکن میں ایسا کر چکا تھا۔ تم نے یہ بھی دیکھا ہو گا یا سنا ہو گا کہ جس پر جن آتے ہیں اس لڑکی کے حلق سے بھاری بھر کم مردانہ آواز نکلتی ہے جیسے کوئی جن بول رہا ہو۔"

"ہاں میں نے سنا ہے۔ کبھی دیکھا نہیں ہے۔" قاسم نے کہا۔

راحیل نے کہا۔ "میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جن اسی لڑکی کے ذریعے بولتے ہیں اور اسی لڑکی کو معمول بنا کر انتقام لیتے ہیں۔ ہاجرہ ایک جن کی امانت تھی۔ میں نے اسے کپڑوں سے بے نیاز دیکھ لیا تھا۔ اس لئے وہ جن ہاجرہ کو معمول بنا کر مجھ سے انتقام لے رہا تھا۔

اور وہ ہاجرہ جو بڑے ڈرامائی انداز میں۔ اتنی کم مدت میں میری دلہن بن کر آ گئی تھی تو اس میں بھی کوئی راز تھا۔ کوئی خطرہ تھا جس کا اشارہ مجھے ایک ماں کی زبان سے مل رہا تھا۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔

"راحیل! تم نے میرا دل دکھایا ہے۔ پھر بھی میں تمہاری سلامتی چاہتی ہوں۔ میری باتوں کا یقین کرو۔ اس روز عامل صاحب بھی اس جن کے سامنے بے بس ہو گئے تھے۔ ہاجرہ نے دو آدمیوں کی گرفت میں ہونے کے باوجود اپنا گریبان پھاڑ ڈالا تھا اور تب اس کے جسم کے ایک حصے میں پیسہ برابر سیاہ داغ نظر آیا۔ اسے دیکھتے ہی عامل صاحب نے کہا کہ وہ مجبور ہیں۔ جن اس سیاہ داغ کے ذریعہ یہ اشارہ چھوڑ گیا ہے کہ ہاجرہ اس کے لیے مخصوص ہو چکی ہے۔ بعض لڑکیوں کے جسم پر بچپن سے ایسا داغ ہوتا ہے اور وہ بچپن ہی سے کسی جن سے منسوب ہو جاتی ہیں۔"

میں سر تھام کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ سیاہ داغ میرے دماغ سے چپک گیا تھا۔ جس طرح ایک دکان کا سائن بورڈ بتاتا ہے کہ اس دکان کا مالک فلاں شخص ہے۔ اسی طرح وہ سیاہ داغ بتا رہا تھا کہ وہ لڑکی فلاں کی ملکیت ہے۔ امی نے کہا۔

"میں جا رہی ہوں۔ اگر اپنی سلامتی چاہتے ہو تو میرے ساتھ چلو اب تم بچے نہیں ہو کہ میں تمہیں زبردستی کھینچ کر لے جاؤں۔ تم تو ماشاء اللہ بہت سمجھدار ہو گئے ہو۔ اسی لئے تو ماں کو احمق سمجھ کر اپنی مرضی سے شادی کی ہے۔"

میں شش وپنج میں رہ گیا۔ امی کے ساتھ جاؤں یا نئی دلہن کی آغوش میں؟ میں نے پلٹ کر خواب گاہ کی جانب دیکھا۔ وہ دروازے کی اوٹ میں کھڑی تھی۔ نئی دلہن کچھ کہہ

نہیں سکتی۔ اس لیے بڑی ہی التجا آمیز نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے ہچکچاتے ہوئے امی سے کہا۔

"ہاجرہ کو یہاں لا کر تنہا چھوڑ دینا مناسب نہیں ہے۔ آپ چلئے میں تھوڑی دیر بعد آ جاؤں گا۔"

انہوں نے کہا۔ "تم نہیں آؤ گے۔ میں جانتی ہوں۔ تم پر اس کا جادو چل گیا ہے۔ میں ابھی جا کر تمہارے لئے دعا مانگوں گی کہ تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچے مگر کوئی ایسی عبرت حاصل ہو کہ آئندہ تم اس لڑکی کا نام لینا چھوڑ دو میں دعا کروں گی۔"

یہ کہہ کر وہ چلی گئیں۔ میں بہت دیر تک سر جھکائے بیٹھا رہا سہاگ رات میں مچلنے والی آرزوؤں کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔ نہ شادی کی خوشی تھی، نہ مہکتے ہوئے حنائی بدن کی کشش تھی۔ ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔ اسی وقت میرے شانے پر ہاجرہ کا ہاتھ آیا۔ پھر اس کی اُداسی میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی۔

"یہ جھوٹ ہے۔ مجھ پر کسی کا سایہ نہیں ہے۔ یہ سچ ہے کہ مجھ پر کبھی کبھی دورہ پڑتا ہے۔ پہلے آپا بھی یہی سمجھتی تھیں کہ مجھ پر کسی غیبی قوت کا سایہ ہے۔ میں شرم سے انہیں حقیقت نہ بتا سکی۔ وہ جھاڑ پھونک اور تعویذ گنڈے کراتی رہیں۔ آخر کار ایک ڈاکٹر نے انہیں حقیقت بتا دی۔ مجھے ہسٹریا کا مرض ہے۔ بعض لڑکیوں کو عین شباب کے عالم میں ایسا ہوتا ہے میں شادی سے پہلے تمہیں یہ بات کیسے بتا سکتی تھی۔ شرم و حیا بھی تو کوئی چیز ہے۔ آپا سمجھ گئی تھیں کہ شادی ہوتے ہی یہ مرض ختم ہو جائے گا اور مجھ پر کبھی دورہ نہیں پڑے گا۔"

میں اس کی باتیں سن رہا تھا اور الجھ رہا تھا۔ وہ لڑکی اپنی ذات میں ایک عجائب گھر تھی۔ ہر پہلو سے ایک نیا چہرہ۔ ایک نئی پریشانی لے کر آتی تھی اور سوچنے کا انداز بدل دیتی تھی۔ اس وقت میں نے سوچا کہ اس کا دل نہیں توڑنا چاہئے۔ وہ بڑے ارمانوں سے دلہن بن کر آئی ہے۔ مجھے اس کے جذبات کو سمجھنا چاہئے۔

میں کرسی سے اٹھ گیا اور اتنی دیر میں پہلی بار پلٹ کر اسے دیکھنے لگا۔ میں سچ کہتا ہوں، اس وقت وہ مجھے پرائی لگی۔ جیسے وہ میری نہیں ہے کسی دوسرے کی ہے۔ اس کے باوجود میرے اندر ایک جذبہ بول رہا تھا کہ یہ حسن اور یہ پُر شباب جسم میرا اور صرف میرا ہونا چاہئے۔ میں نے آگے بڑھ کر ایک ہاتھ کے دائرے میں اسے سمیٹ لیا اور اسے اسی

طرح سمیٹے ہوئے خواب گاہ کی طرف لے جانے لگا۔ ایسے وقت میرے اندر ایک کپکپی سی محسوس ہوئی۔ وہ جذباتی کپکپاہٹ نہیں تھی' کوئی اور بات تھی۔ کوئی انجانا سا مبہم سا خوف تھا۔ میں سہاگ کی سیج پر ایسے جارہا تھا جیسے کسی انجانے دشمن سے نبرد آزما ہونے جارہا ہوں۔

وہ سیج پر لجاتی ہوئی بیٹھ گئی۔ میں نے اس کے قریب بیٹھ کر اسے بازوؤں میں لینا چاہا تو وہ ذرا کترا کر روشن بلب کی طرف دیکھنے لگی۔ اشارہ تھا کہ میں بتی بجھادوں۔ اندھیرا کردوں۔

اندھیرا؟ میں اتنا احمق نہیں تھا کہ اندھیرا کر کے کسی خطرے کو دعوت دیتا۔ جب تک روشنی تھی وہ میرے لئے معصوم اور بے ضرر تھی صرف روشنی میں ہی میں اس پر اعتماد کر سکتا تھا۔ میں نے اسے اپنی آغوش میں کھینچ کر کہا۔

"روشنی رہے گی۔ مجھے تاریکی پسند نہیں ہے۔" یہ کہہ کر میں اس پر جھک گیا۔ میرے ہونٹ اس کے لبوں سے متعارف ہونے لگے۔ میں جذبات سے مغلوب نہیں تھا۔ کیونکہ محتاط رہنے کا جذبہ زیادہ حاوی تھا مگر اس کی سانسیں سلگنے لگیں۔ آہستہ آہستہ اس کی دونوں بانہیں میری گردن میں حمائل ہو گئیں۔ وہ ہر آن لہرلہرا بھر رہی تھی۔ بپھر رہی تھی' مجھے جھنجھوڑ رہی تھی۔ پھر اچانک ہی میری سانسیں رکنے لگیں۔ میری گردن آہنی شکنجے میں تھی۔ میں کیسے یقین کر لیتا کہ ایک عورت کی بانہوں میں اتنی قوت ہو گی۔ مجھے خطرے کا احساس ہوا۔ میں نے پوری قوت سے اس کی بانہوں کو اپنی گردن سے الگ کیا اور اسے پرے دھکیل دیا اور اپنی گردن سہلانے لگا۔

اف! عورت جو بظاہر کمزور نظر آتی ہے۔ کیا اس کے اندر اتنی قوت چھپی ہوتی ہے؟ میں نے بے یقینی سے اس جانب دیکھا۔ وہ بستر پر پڑی تھی۔ اپنا ایک ہاتھ آنکھوں پر رکھے شرمانے کے انداز میں خود کو چھپا رہی تھی۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے میری قمیص کے دامن کو پکڑ رکھا تھا۔ یعنی دامن تھام کر فریاد کرنے کا انداز تھا کہ تم نے مجھے چھوڑ کیوں دیا؟

پھر اس نے بڑی آہستگی سے میرے دامن کو اپنی طرف کھینچا وہ خاموش ہاتھ کی خاموش ادا مجھے پکار رہی تھی۔ اوہ! ایک عورت میرے لئے چیلنج بن گئی تھی اور۔ اور میں بالکل نفس ہو گیا تھا۔ میرے اندر تمام جذبے سو گئے تھے اور وہ خاموشی سے ایک مرد کو

للکار رہی تھی۔ میں نے پھر جرأت کی۔ پھر ایک بار خطرہ مول لے کر اس کے قریب چلا گیا۔ تقریباً اس پر چھا گیا۔ کچھ اس طرح کہ میرا ہاتھ اس کے جسم پر بھٹک رہا تھا اور دماغ کہیں اور بھٹکتا جارہا تھا۔ ہاتھ کی انگلیوں اور دماغ دونوں کے راستے الگ الگ تھے۔ بڑی دیر کے بعد میرا ہاتھ اس مقام پر پہنچا جہاں وہ سیاہ داغ تھا۔ میں تو پہلے ہی سرد تھا۔ میرے اعصاب بھی ڈھیلے پڑ گئے۔ میں نے فوراً ہی ہاتھ وہاں سے ایسے کھینچ لیا جیسے وہ داغ ایک جلتا ہوا انگارہ ہو۔ ایک دہکتا ہوا سائن بورڈ جو کہہ رہا تھا کہ وہ کسی دوسرے کی ملکیت ہے۔ ہاں کچھ ایسی ہی بات تھی۔ میں ہزار کوششوں کے باوجود اس کے جسم کے حصول سے محروم ہوتا جارہا تھا۔

پھر اچانک ہی وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ اس کے تنفس میں ایسی تیزی تھی۔ ایسی آواز تھی جیسے غرا رہی ہو۔ اس کے ناخن میرے جسم میں پیوست ہو گئے تھے۔ پھر وہ جیسے ہی میرے شانے کو دانتوں سے چبانے لگی' میں مارے دہشت کے چیخ پڑا.........

"چھوڑو مجھے۔ چھوڑو۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ ہاجرہ تمہاری ہے خدا کے لئے مجھے چھوڑ دو۔ اب میں اس کے قریب نہیں آؤں گا۔ میں قسم کھاتا ہوں۔ اسے کبھی ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔"

میں نے اپنی پوری اور آخری قوت صرف کرتے ہوئے اسے پرے ہٹایا اور اچھل کر پلنگ سے نیچے آگیا۔

وہ چیخیں مارتی ہوئی بیٹھ گئی اور اپنے بال نوچنے لگی۔ کسی درندے کے منہ سے شکار نکل جائے تو وہ کیسے جھلاتا ہے۔ ویسے ہی وہ جھلا رہی تھی۔ پھر اس نے اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے اور وحشت زدہ نظروں سے دیکھتی ہوئی میری طرف لپکی۔ میں وہاں سے اچھل کر بھاگا۔ بھاگتے وقت مجھے اتنا ہوش تھا کہ دروازے کو بند کر دوں۔ خواب گاہ سے نکلتے ہی میں نے دروازے کو باہر سے بند کر دیا اور جتنی تیزی سے دوڑ سکتا تھا وہاں سے دوڑ لگاتا چلا گیا۔ مکان سے نکلتے وقت اس کے چیخنے اور دروازہ پیٹنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ مگر اب میں اس سے ہمدردی کرنے کے لئے واپس نہیں جاسکتا تھا۔ میں قسمیں کھا رہا تھا کہ اب کبھی اس کے قریب نہیں جاؤں گا.........."

☆======☆======☆

قاسم نے کرسی پر ذرا سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"کیا تم پھر اس کے قریب کبھی نہیں گئے؟"

"نہیں۔ ہمارا سامنا ہوا۔ مگر وہ میاں بیوی کا ازدواجی رشتہ قائم نہ ہوا۔"

قاسم ایک گہری سانس لے کر کرسی کی پشت سے ٹک گیا۔ پھر ہنسنے لگا۔

"کیوں ہنس رہے ہو؟" راحیل نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں مجھے ہنسنا نہیں چاہئے۔ تمہاری بدنصیبی پر رونا چاہئے اتنی حسین لڑکی کے قریب جاکر بھی اس کی قربت سے محروم ہو گئے۔ تم اچھے خاصے پڑھے لکھے جاہل ہو۔ اس نے تمہیں بتا دیا تھا کہ اس پر ہسٹریا کا دورہ پڑتا ہے اور ایسی لڑکیاں شادی کے بعد یکلخت نارمل ہو جاتی ہیں۔ کیا شادی کے بعد کا مطلب تم نہیں سمجھے تھے؟ اگر تم ازدواجی وظیفہ ادا کر دیتے تو اسے سہاگ کی سیج پر دورہ نہ پڑتا۔ میری بات تمہاری سمجھ میں آ رہی ہے یا نہیں؟"

"میں سمجھ رہا ہوں۔ مگر تم یہ بتاؤ کہ اگر اس کی ہمزاد یا اس پر قابض ہونے والا جن مجھ سے انتقام نہیں لینا چاہتا تھا۔ اگر وہ محض ہسٹریا کا دورہ تھا تو پھر وہ اپنے ساتھ خنجر کیوں لائی تھی؟"

"خنجر؟" قاسم نے تعجب سے کہا۔ "تم نے خنجر کا ذکر تو نہیں کیا تھا۔ کیا وہ خنجر چھپائے ہوئے تھی؟"

"ہاں۔ رخصتی کے وقت جو اٹیچی وہ اپنے ساتھ لائی تھی اور اسے خواب گاہ میں لے جا کر رکھا تھا اس میں وہ خنجر رکھا تھا۔ وہ وحشیانہ انداز میں کپڑے پھاڑتی میری طرف نہیں' بلکہ میرے پیچھے رکھی ہوئی اٹیچی کی طرف جا رہی تھی۔ اگر میں وہاں سے بھاگ نہ جاتا تو اس رات وہ پھر خنجر سے حملہ کرتی۔ اس وقت مجھے اس خنجر کا علم نہیں تھا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا۔ میں واقعات کی ترتیب سے بتاتا ہوں۔ اگر تم اِدھر اُدھر کے سوالات کرو گے تو میں بہت سی باتیں بھول جاؤں گا۔

دیکھو قاسم! تم بار بار مادی اسباب پیش کر کے یہ ثابت کرنا چاہتے ہو کہ ہاجرہ کسی پُر اسرار قوت کے زیر اثر میرا پیچھا نہیں کر رہی ہے اور میں کہتا ہوں کہ ذرا صبر کرو۔ جب وہ چار بجے تمہاری کوٹھی کے بند دروازوں سے گزر کر یہاں آئے گی تو تم ساری مادیت بھول جاؤ گے۔"

قاسم نے کہا۔ "اچھی بات ہے۔ تمہاری آپ بیتی ختم ہونے تک اب میں کچھ نہیں

کہوں گا۔ تم بتاؤ کہ اس کے بعد کیا ہوا؟ ہاجرہ کو خواب گاہ میں قید کرنے کے بعد تم کہاں گئے؟"

"مجھے کہاں جانا چاہئے۔ یہ میں خود نہیں جانتا تھا۔ بس' میں تیزی سے دوڑنے کے انداز میں چلتا جا رہا تھا۔ ایسے راستے اختیار کر رہا تھا جہاں زیادہ سے زیادہ لوگ ہوں۔ کیونکہ تنہا ویران راستوں میں اس بات کا خدشہ تھا کہ وہ پھر کہیں سے چلی آئے گی۔ میں نے تو یوں ہی گھبراہٹ میں خواب گاہ کا دروازہ بند کر دیا تھا۔ ورنہ یہ تماشہ تو میں دیکھ ہی چکا تھا کہ وہ بند دروازے سے بھی گذر کر چلی آتی ہے۔

دکانیں بند ہو رہی تھیں۔ راستے ویران ہوتے جا رہے تھے میں ایک ہوٹل میں آ کر بیٹھ گیا۔ وہاں گاہکوں کی بھیڑ تھی۔ میں چائے کا آرڈر دے کر ایک کونے کی میز پر چلا گیا۔ مجھے یاد نہیں کہ وہاں بیٹھ کر کتنی پیالیاں چائے پی اور کتنے سگریٹ پھونکتا رہا۔ جب ذہن صحیح معنوں میں ذرا سوچنے کے قابل ہوا تو مجھے یہ تدبیر سوجھی کہ کسی جن کے انتقام سے محفوظ رہنے کے لئے مجھے ایک باکمال عامل کا سہارا لینا چاہئے۔ میں نے فوراً ہی وہاں سے اٹھ کر چائے کا بل ادا کیا۔ باہر آیا تو راستے کی ویرانی دیکھ کر پتہ چلا کہ میں گھنٹوں ہوٹل میں بیٹھا رہ گیا تھا۔ اس وقت تقریباً بارہ بج رہے تھے۔ میں ایک رکشے پر بیٹھ کر ایک مشہور و معروف عامل کے پاس پہنچ گیا۔

میں نے عامل کو شروع سے اب تک کے حالات بتائے۔ یعنی اس وقت سے جب پہلی بار میں نے دروازے کے شگاف سے جھانک کر اسے دیکھا تھا۔ پھر ڈاک بنگلے کا واقعہ بتایا۔ اس کے بعد سہاگ رات کی تفصیل بیان کی اور امی نے جو باتیں کہی تھیں وہ بھی من و عن دہرا دیں۔ عامل نے کہا۔

"آپ کی امی درست کہتی ہیں اور آپ کو پیش آنے والے حالات بھی یہ ثابت کرتے ہیں کہ اس لڑکی پر کسی جن کا سایہ ہے اور وہ جن لڑکی کو معمول بنا کر تمہیں نقصان پہنچانے کی کوشش کر رہا ہے۔ تمہارے ستارے اچھے ہیں یا پھر تمہاری امی کی دعائیں تمہارے ساتھ ہیں' اسی لئے تم اب تک محفوظ ہو' جب تک تم اس جن کو یقین نہیں دلاؤ گے کہ تم نے اس لڑکی کا خیال چھوڑ دیا ہے' وہ تمہارا پیچھا کرتا رہے گا۔ اس کا یہی ایک راستہ ہے کہ تم اسے طلاق دے دو' اور مزید یقین دہانی کے لئے جتنی جلدی ہو سکے کسی دوسری لڑکی سے شادی کر لو۔"

عامل نے نہایت معقول مشورہ دیا تھا۔ جب میں اس کے پاس سے واپس ہوا تو خیال ہی خیال میں ہاجرہ کو طلاق دیتے ہوئے بڑی تقویت حاصل ہو رہی تھی کہ اب یقیناً تمام بلائیں مجھ سے دور ہو جائیں گی اور میں کسی دوسری لڑکی سے شادی کر کے ایک خوشگوار زندگی گزاروں گا۔

دوسری لڑکی کے متعلق سوچتے وقت رضیہ کا خیال آیا لیکن نہ جانے کیوں اس کے لئے کوئی جذبہ نہیں ابھرا۔ اس لڑکی کو اپنی دلہن بنانے کی خوشی کا ذرا سا بھی احساس نہ ہوا۔ شاید اس لئے کہ وہ معمولی شکل وصورت کی لڑکی تھی۔ غریب بھی تھی۔ بے شہارا بھی تھی۔ ایسی لڑکیاں جو آسانی سے حاصل ہوجاتی ہیں۔ ان کے ساتھ صرف وقتی دلچسپی ہوتی ہے۔ پھر ان کے متعلق سوچنے کو جی نہیں چاہتا۔

میں اپنے معیار کے مطابق کسی حسین لڑکی کے بارے میں سوچنے لگا۔ ایسی حسین لڑکی جیسی ہاجرہ تھی۔ یعنی میں ہاجرہ کا بدل تلاش کر رہا تھا۔ میرے تصور میں کتنے ہی حسین چہرے آئے۔ میں نے خیال ہی خیال میں کتنی ہی حسین لڑکیوں کو اپنی آغوش کی زینت بنایا لیکن۔ لیکن ان کے لئے بھی جذبات نہیں مچل رہے تھے۔ جس طرح سہاگ کی سیج پر ہاجرہ کے قریب سرد تھا۔ اسی طرح اب بھی میرے اندر برف جمی ہوئی تھی۔

میں گھبرا کر چلتے چلتے رک گیا۔ رضیہ، ہاجرہ اور تمام خیالی لڑکیاں میرے لئے مٹی کا ڈھیر بن گئی تھیں۔ میرے احساسات و جذبات ایسے مردہ ہو گئے تھے کہ مجھے ان میں کوئی دلچسپی، کوئی رنگینی یا کسی طرح کی کشش محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

کوئی بھی مرد کیا ایسی کمزوری برداشت کر سکتا ہے؟

میرے اندر جو تبدیلی آئی تھی وہ بڑی توہین آمیز تھی، مجھ میں ایسا انقلاب کیسے آگیا؟"

آہ۔ اگر وہ ہاجرہ پر قابض ہونے والا مجھے زندہ مگر مردہ، مرد مگر سرد بنا رہا تھا تو یہ عجیب و غریب ظالمانہ انتقام تھا۔ میں کسی کو منہ نہیں دکھا سکتا تھا۔ کسی سے آنکھیں نہیں ملا سکتا تھا۔ اس سے تو اچھا تھا کہ ہاجرہ اٹیچی سے خنجر نکال کر اسے میرے سینے میں اُتار دیتی۔

نہیں۔ میں یہ شرمندگی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ میں خود کو آزمانے کے لئے سوچ کی سستی گلیوں میں چلا گیا۔ خیالی گناہوں کے بازار میں ایک گناہگار کا کردار ادا کرنے لگا۔

کچھ تو حرارت محسوس ہو۔ کہیں تو جا کے وہ برف پگھلے۔ مگر کچھ بھی نہ ہوا۔ ایسی بے حسی تھی، ایسی بے حسی تھی کہ میں شرم سے پانی پانی ہو گیا۔

یکبارگی میرے سارے جسم میں لرزہ سا طاری ہو گیا۔ میں تیزی سے چلنے لگا بلکہ دوڑنے لگا۔ فٹ پاتھ سے دوڑتا ہوا ایک گلی میں آیا۔ ایک گلی کے بعد کئی گلیاں پیچھے چھوڑ گیا۔ کتنے ہی محلوں سے گزر گیا۔ مگر میرے قدم نہیں رکے۔ میں بھاگتا رہا۔ ہانپتا رہا اور کانپتا رہا۔ پھر اپنے مکان کے دروازے پر آ کر رک گیا۔ نہ جانے کتنی رات گزر گئی تھی۔ امی کے کمرے کی تاریکی بتا رہی تھی کہ وہ سو رہی ہیں۔ میرے کمرے میں روشنی تھی۔

میں نے کھڑکی کے پاس آ کر دیکھا۔ رضیہ اتنی رات گزرنے پر بھی جاگ رہی تھی۔ میرے پلنگ پر لیٹی، میرے تکئے کو سینے سے لگائے چپ چاپ رو رہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ اسے میری بے وفائی رلا رہی ہے، میں نے کھڑکی پر ہولے سے دستک دی۔ اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ پھر مجھے دیکھتے ہی حیرت سے اچھل پڑی۔ دوڑتی ہوئی کھڑکی کے پاس آئی تو فرط حیرت سے کچھ بول نہ سکی۔

"آ۔ آپ........"

"دروازہ کھولو!" میں حکم دے کر دروازے پر آ گیا۔ وہ فوراً ہی کھل گیا۔ میں اتنی دیر تک دوڑنے کی وجہ سے ہانپ رہا تھا اور پسینہ پسینہ ہو رہا تھا لیکن تھکن کا ذرا بھی احساس نہ تھا۔ میں نے اندر آتے ہی دروازے کو بند کر دیا اور پلٹ کر اسے سر سے پیر تک دیکھنے لگا۔ بڑے ہی جنونی انداز میں اس کے جسم کے ایک ایک حصے کو دیکھ کر اپنی آنکھیں سینکنے لگا۔ وہ طنزیہ انداز میں بولی۔

"آپ۔ آپ کو تو اپنی نئی نویلی دلہن کے پاس ہونا چاہیے تھا۔" میرے پاس کچھ کہنے سننے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے اس کے گریبان کی طرف ہاتھ بڑھایا اور ایک جھٹکے سے اس کے بلاؤز کو پھاڑ دیا وہ جھجکتی ہوئی ایک قدم پیچھے گئی۔ میں اس کے بازو کو پکڑ کر کئی قدم آگے بڑھ گیا اور اسے بستر پر لا کر گرا دیا۔

وہ حیران تھی۔ ذرا پریشان بھی تھی۔ مگر خوفزدہ نہیں تھی۔

جسے وہ بے وفا سمجھ رہی تھی۔ وہ باوفا ہو گیا تھا۔ لہٰذا میں اس کے لئے ظالم بھی تھا اور مہربان تھا۔ ایک بھیڑیا بھی تھا اور راحت جان بھی۔ پھر یہ کہ جو ہاجرہ کا حصہ تھا، وہ

اسے مل رہا تھا۔ ایسے مقام پر ایک عورت دوسری عورت کی خوشی جیت کر فخر کرتی ہے۔ رضیہ کو بھی یہ فخر تھا کہ میں اسی کی خاطر دوڑتا' ہانپتا' کانپتا اس کے پاس آیا ہوں۔

خوش فہمی میں مبتلا ہونے والی اس عورت کے ساتھ کوئی آسیبی چکر نہیں تھا۔ کوئی خطرہ' اندیشہ' خوف اور ذہنی الجھنیں نہیں تھیں۔ اس کی بانہوں میں محبت تھی۔ آستین میں خنجر نہیں تھا۔ اس لئے برف پگھل گئی۔

میرے دماغ سے ایک بوجھ اتر گیا۔ میں نارمل تھا۔ مجھ میں کوئی خامی نہیں تھی۔ وہ ہاجرہ کا آسیب مجھے خواہ مخواہ پریشانیوں میں مبتلا کر رہا تھا۔ میں تمام رات رضیہ کے پاس رہا۔ اسے یہ خوشخبری سنائی کہ کل میں ہاجرہ کو طلاق دے دوں گا اور اس سے شادی کرلوں گا۔

دوسری صبح میں ہاجرہ کی بہن کے پاس گیا اور اس سے صاف صاف کہہ دیا۔ "میں ایک آسیب زدہ لڑکی کے ساتھ زندگی نہیں گذار سکتا۔ آپ میرے ساتھ چلئے میں ابھی اسے طلاق دوں گا۔"

پہلے تو وہ بگڑنے لگی اور کہنے لگی کہ وہ اپنی بہن کی زندگی برباد نہیں ہونے دے گی۔ جب میں نے اسے رات کا واقعہ بتایا کہ کس طرح وہ وحشیانہ انداز میں مجھ پر حملہ کرنا چاہتی تھی تو اس کی بہن پریشان ہو گئی اور قسمیں کھا کر مجھے یقین دلانے لگی کہ ہاجرہ آسیب زدہ نہیں ہے۔ وہ میرے ساتھ اس مکان میں آئی جہاں میں ہاجرہ کو چھوڑ گیا تھا۔ راستے میں وہ مجھے سمجھاتی رہی' التجائیں کرتی رہی کہ اس وقت اگر میں نے سوچ سمجھ کر فیصلہ نہ کیا تو ایک معصوم لڑکی کی زندگی تباہ ہو جائے گی۔

ہم مکان میں پہنچے تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ خواب گاہ کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ہاجرہ نہائی دھوئی نئے لباس میں بن سنور کر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ ایسی حسین' ایسی دلنشین لگ رہی تھی کہ سیدھی دل میں آکر' دل میں بیٹھ کر دل نشینی کا مفہوم ادا کر رہی تھی۔ دن کی روشنی میں اسے دیکھ کر کسی طرح کا خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ مگر وہ کھلا ہوا دروازہ؟

میں نے اس کی بہن سے کہا۔ "دیکھئے آپ کہتی ہیں کہ یہ آسیب زدہ نہیں ہے۔ اب آپ ہی بتایئے کہ جو دروازہ باہر سے بند تھا' اسے کھول کر یہ باہر کیسے آگئی؟"

اس کی بہن نے کہا۔ "ہاجرہ! جواب دو۔ اپنے خاوند کو مطمئن کرو کہ تم کس طرح

باہر آئیں؟ کیا کسی نے آکر دروازہ کھولا تھا؟"

"نہیں' میں نے خود ہی کھولا ہے۔" وہ طنزیہ انداز میں بولی۔ "راحیل تو اچھی طرح جانتے ہیں۔ میرے جن نے آکر مجھے بند کمرے سے آزاد کر دیا تھا۔"

"ہاجرہ! پاگلوں جیسی باتیں نہ کرو۔ راحیل کو اس کی امی نے سمجھایا ہے کہ تم پر جن کا سایہ ہے۔ کل سے یہ اس قدر گھبرائے ہوئے ہیں کہ تمہیں طلاق دینے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔"

ہاجرہ نے گھبرا کر مجھے دیکھا۔ اس کا غصہ اور اس کا طنزیہ انداز سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ اب وہ پریشان نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ بڑی آہستگی سے ایک فریادی کی طرح بولنے لگی۔

"کیا یہ انصاف ہے راحیل؟ تم میرے مجازی خدا ہو کر میری بدنصیبی کو نہیں سمجھتے۔ دنیا والوں نے مجھے آسیب زدہ کہا تو تم نے یقین کر لیا اور مجھے جنون کی حالت میں سنبھالنے اور سہارا دینے کی بجائے یہاں تنہا بے یار و مددگار چھوڑ کر چلے گئے۔ کیا یہ انصاف ہے؟"

اس کے لہجے میں ایسا درد تھا۔ ایسی فریاد اور ایسی التجا تھی کہ میں اس کے متعلق دوسرے پہلو سے سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ یعنی یہی کہ اس پر ہسٹریا کا دورہ پڑا تھا۔ دن کی روشنی میں وہ ایک ذرا بھی آسیب زدہ نظر نہیں آرہی تھی۔ دل نہیں مانتا تھا کہ وہ حسین مہ جبیں' قیامت خیز شباب کی منہ بولتی تصویر میری دشمن ہو سکتی ہے۔ مجھ پر قاتلانہ حملہ کر سکتی ہے۔ نہیں۔ کم از کم اس وقت اسے دیکھ کر اس پر کوئی الزام لگانے کی جی نہیں چاہتا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"میں اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھی۔ نہ جانے میں کتنی دیر تک بے ہوش پڑی رہی۔ ہوش آیا تو تو رفتہ رفتہ یہ بات سمجھ میں آگئی کہ مجھ پر دورہ پڑا تھا اور سب سے زیادہ تکلیف دہ احساس یہ تھا کہ تم مجھے چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ میں نے باہر نکل کر تمہیں بلانا چاہا تو دروازہ باہر سے بند تھا میں تمہیں آوازیں دیتی رہی' تنہا کمرے میں روتی اور چیختی رہی۔ پھر مجھے یقین ہو گیا کہ تم اس مکان سے ہی چلے گئے ہو۔

صبح میں نے باہر نکلنے کے لئے تدبیر کی۔ میں نے سوچا کہ دروازے کے جس حصے میں چٹخنی لگی ہے اگر اس حصے کو کسی چیز سے کاٹ دیا جائے تو دروازہ کھل جائے گا۔ یہ

تدبیر ذہن میں آتے ہی میں نے خنجر نکال کر اس کی نوک سے چٹخنی کے اطراف لکڑی کے حصے کو کھود کھود کر دروازے کو..........“

”خنجر!“ میں اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی گھبرا کر بولا۔ ”تم۔ یہاں بھی تم خنجر لے کر آئی ہو؟ خود کو اتنی معصوم ظاہر کرتی ہو۔ کیا کوئی معصوم اور شریف لڑکی اپنے ساتھ خنجر لئے پھرتی ہے؟ وہ بھی شادی کی رات۔ سہاگ کے کمرے میں۔ میں۔ میں نے تو کبھی نہیں سنا کہ کبھی کوئی دلہن اپنے میکے سے خنجر لے کر آئی ہو۔“

اس کی بہن نے اسے ڈانٹ کر کہا۔ ”یہ کیا حماقت ہے ہاجرہ؟ تم وہ خنجر اپنے ساتھ یہاں کیوں لائی ہو؟“

اس نے جواب دیا۔ ”اگر مجھے معلوم ہوتا کہ راحیل اپنی امی کی باتوں میں آکر مجھے آسیب زدہ سمجھنے لگیں گے تو میں اسے اپنے ساتھ نہ لاتی۔“

”مگر تم اسے اپنے ساتھ کیوں رکھتی ہو؟“

وہ چند لمحوں تک خاموش رہی۔ اپنی بہن کو الجھی ہوئی نظروں سے دیکھتی رہی۔ پھر آہستگی سے بولی۔

”آپا! میں آپ سے نہیں کہنا چاہتی تھی۔ مگر اب اس لئے کہہ رہی ہوں کہ مجھے اپنے خاوند کی غلط فہمی دور کرنی ہے۔ شادی سے ایک دن پہلے احمد بھائی نے دھمکی دی تھی کہ مجھے شادی کے بعد بھی چین سے نہیں رہنے دیں گے۔ جب بھی انہیں موقع ملا۔ وہ میری عزت.......... میں۔ میں کیا بتاؤں؟ آپ کو بتا کر میں آپ کو مزید پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ شادی کے بعد راحیل کو سب کچھ بتادوں گی اور وہ خنجر ہمیشہ اپنے ساتھ رکھوں گی۔ احمد بھائی کو قتل کرنے کے لئے نہیں بلکہ اپنے لئے۔ کبھی عزت پر بن آتی اور بچاؤ کا راستہ نہ ملتا تو میں وہ خنجر اپنے سینے میں اتار لیتی۔ آپا میں آپ کا سہاگ اُجاڑنے کے لئے احمد بھائی کو نہیں مار سکتی تھی۔ پھر میں اپنا سہاگ اُجاڑنے کے لئے راحیل پر قاتلانہ حملہ کیسے کر سکتی ہوں؟ وہ تو میں نے اپنی موت کا سامان کیا ہے۔ کیا اتنی سی بات راحیل کی سمجھ میں نہیں آسکتی ہے؟“

تھوڑی دیر کے لئے مجھے چپ سی لگ گئی۔ میں اس کی باتوں پر غور کر رہا تھا۔ اس کی بہن نے کہا۔

”راحیل! اب تمہاری غلط فہمی دور ہو جانی چاہئے طلاق کا خیال دل سے نکال دو۔

ہاجرہ تمہیں دل و جان سے چاہتی ہے وہ تمہاری جان کی دشمن نہیں بن سکتی۔ تمام شکوک و شبہات دل سے نکال کر ایک خوشگوار ازدواجی زندگی گزارو۔ میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ ہاجرہ کو ہسٹریا کے مرض سے جلدی نجات مل جائے گی۔“

میں نے جواب دیا۔ ”وہ خنجر تیسری بار میرے سامنے آیا ہے۔ پہلی بار ڈاک بنگلے کے بند کمرے میں۔ دوسری بار اسی ڈاک بنگلے میں ہاجرہ کے بستر کے نیچے۔ تیسری بار سہاگ کے کمرے میں۔ اب میں وہ خنجر اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور اسے اپنے پاس چھپا کر رکھوں گا۔ اگر ہاجرہ آسیب زدہ نہیں ہے تو پھر وہ خنجر ہمارے درمیان کبھی نہیں آئے گا اور اگر وہ کسی آسیبی اثر کے تحت پھر کبھی وہ ہتھیار لے کر میرے سامنے آئے گی تو میں کسی پس و پیش کے بغیر اسے طلاق دے دوں گا۔ میں کچھ عرصے تک ہاجرہ کو آزماؤں گا۔ دو مہینے۔ چار مہینے‘ چھ مہینے‘ جب تک مجھے اطمینان نہیں ہوگا اس وقت تک میں اس کے ساتھ ازدواجی زندگی نہیں گزاروں گا۔ یہ اسی مکان میں رہے گی اور میں وہاں امی کے ساتھ رہوں گا۔ اگر ہاجرہ کو یہ منظور ہے تو یہاں رہے۔ منظور نہیں ہے تو ابھی مجھ سے رشتہ توڑ کر چلی جائے۔ یہاں رہنے کی صورت میں‘ میں اس کے تمام اخراجات برداشت کروں گا۔“

یہ کہہ کر میں نے کچھ دیر اس کے جواب کا انتظار کیا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپائے رو رہی تھی لیکن میں اس کے آنسوؤں سے متاثر ہو کر فیصلہ نہیں بدل سکتا تھا۔ اسے آزمانا بے حد ضروری تھا۔ وہ آزمائش سے گزر کر ہی اپنی سچائی ثابت کر سکتی تھی۔ اس کی بہن نے مجھے سمجھایا کہ میں ہاجرہ کے ساتھ اس مکان میں ازدواجی زندگی گزارتے ہوئے بھی اسے آزما سکتا ہوں۔ مگر اب میں کسی خطرے سے دو چار نہیں ہونا چاہتا تھا۔ میں وہاں سے چلا آیا۔ ہاجرہ ایک بوڑھی ملازمہ کے ساتھ اس مکان میں رہنے لگی۔ میں کبھی کبھی دن کی روشنی میں وہاں جاتا تھا وہ پیار و محبت سے التجائیں کر کے مجھے روکنے کی کوششیں کرتی تھی مگر میں چلا آتا تھا۔ اسے دیکھ کر پیاس بڑھتی تھی۔ مگر وہ پیاس رضیہ بجھا دیا کرتی تھی۔ وہ مجھ سے شادی کے خواب دیکھ رہی تھی اور میں اسے ٹال رہا تھا۔ اسے یہ کہہ کر سمجھا دیا کرتا تھا کہ ہاجرہ کی کوئی کمزوری ہاتھ آئے گی تو میں اسے طلاق دے کر اس سے شادی کرلوں گا۔

تین ماہ کے بعد امی کا انتقال ہوگیا۔ رضیہ نے اور دو ماہ تک صبر کیا۔ پھر وہ لڑنے

جھگڑنے لگی کہ جلدی شادی کرو۔ کیونکہ ایک جوان مرد اور ایک جوان عورت کا ایک مکان میں تنہا رہنا معیوب سی بات ہے محلے پڑوس کے لوگ باتیں بناتے ہیں۔ مگر میں جانتا تھا کہ وہ باتیں بنانا اور لڑنا جھگڑنا سیکھ گئی ہے۔ عورت اپنی آخری پونجی دے کر مرد سے لڑنے کا حق حاصل کر لیتی ہے۔ اس لئے وہ بیاہتا نہ ہونے کے باوجود بیوی کے تمام حقوق استعمال کر رہی تھی۔

دوسری طرف ہاجرہ بڑے صبر و ضبط کا مظاہرہ کر رہی تھی ان دنوں صوم وصلوٰۃ کی پابند ہو گئی تھی۔ کئی بار میں نے اسے کلام پاک کی تلاوت کرتے اور نماز پڑھتے دیکھا تھا۔ دس ماہ کے عرصے میں بوڑھی ملازمہ نے بتایا کہ صرف دوبار اس پر جن آیا تھا۔ میں نے سوچا کہ دو ماہ اور انتظار کر لوں۔ اگر اب بھی اس پر جن آیا تو مجھے کوئی نقصان نہ پہنچا تو میں اس کے ساتھ ازدواجی رشتہ قائم کر لوں گا۔

میں دو ماہ تک رضیہ سے پیچھا چھڑانے کے لئے جلال آباد سے باہر چلا گیا میری تاریخ پیدائش اٹھائیس جنوری ہے میں چھبیس جنوری کو واپس آ گیا' اس رات رضیہ نے مجھ سے خوب جھگڑا کیا۔ مجھے جھوٹا اور فریبی کہنے لگی' میں نے اسے دو چار ہاتھ جما دیئے۔ میرا خیال تھا وہ پہلے کی طرح مرعوب ہو کر بستر پر چلی آئے گی لیکن وہ تو شیرنی بن گئی تھی' مار کھا کر لڑاکا عورتوں کی طرح مجھے نوچنے کھسوٹنے لگی' مجھے دھمکیاں دینے لگی کہ اگر میں نے اس سے شادی نہیں کی تو وہ مجھے جان سے مار ڈالے گی۔ میں نے اس کی اچھی طرح مرمت کر دی' ایسے کرارے ہاتھ لگائے کہ وہ چکرا کر گر پڑی۔

آدھی رات گزر چکی تھی' ستائیس تاریخ شروع ہو گئی تھی میں اپنا سوٹ کیس کھول کر اس خنجر کو تلاش کرنے لگا جس کا دستہ ہاتھی دانت کا تھا اور جسے میں ہاجرہ سے مانگ کر لایا تھا وہ سوٹ کیس میں نہیں تھا۔ میں اسے دوسرے سامان میں تلاش کرنے لگا' آدھے گھنٹے کی تلاش کے باوجود وہ نہیں ملا۔ میں پریشان ہو کر سوچنے لگا کہ آخر وہ کہاں غائب ہو گیا ہے۔ میرے جنم دن کو صرف چوبیس گھنٹے رہ گئے تھے' ٹھیک ایک سال پہلے وہ خنجر میری زندگی کو للکارنے آیا تھا۔ ٹھیک چار بجے میں نے زندگی کی پہلی سانس لی تھی اور وہ خنجر چار بجے ہی میری زندگی کی آخری سانسوں میں اترنا چاہتا تھا' میں نے گھبرا کر رضیہ سے پوچھا۔

"وہ خنجر کہاں ہے جو اس سوٹ کیس میں رکھا تھا۔"

وہ مار کھانے کے بعد فرش پر اوندھے منہ پڑی کراہتی جا رہی تھی' اس نے نفرت سے دیکھتے ہوئے کہا

"مجھے کیا معلوم' اپنی سگی سے جا کر پوچھو۔"

"اس سے کیا پوچھوں؟ یہاں تم رہتی ہو' وہ تو یہاں کبھی نہیں آئی۔"

"آئی تھی' پرسوں تمہیں پوچھنے آئی تھی۔ میں اسے یہاں بٹھا کر چائے بنانے گئی تھی' وہ تو تمہاری بیاہتا ہے نا۔ یہاں تمہاری کسی بھی چیز کو ہاتھ لگائے گی تو میں اسے کیسے روکوں گی۔ اچھا ہے اللہ کرے وہ خنجر لے گئی ہو' تمہارے لئے وہی ٹھیک ہے جو تمہارا قیمہ بنانا چاہتی ہے۔"

میں نے غصے سے آگے بڑھ کر اسے ایک ٹھوکر مار دی۔ وہ دوسری طرف کراہتی ہوئی الٹ گئی۔ میں اسے اس کے حال پر چھوڑ کر ایک دوست کے ہاں چلا آیا' اگلی رات میں نے اپنے دوست کے ہاں گزاری۔ تم شبیر علی کو جانتے ہو نا؟ کبھی وہ ہمارا کلاس فیلو تھا۔ میں نے اسے تمام باتیں بتا دیں اس نے بھی تمہاری طرح یہ دعویٰ کیا کہ ہاجرہ آسیب زدہ نہیں ہے۔ وہ خنجر میرے ہی ہاتھوں سے کہیں گم ہو گیا ہے۔ پرسوں ہاجرہ اور رضیہ دونوں ہی شبیر علی کے ہاں آ کر میرے متعلق پوچھ رہی تھیں' دونوں ہی جانتی تھیں۔ شبیر میرا گہرا دوست ہے۔ شبیر نے انہیں تسلی دی تھی کہ میں دو ایک دن میں واپس آ جاؤں گا۔ میں نے اس سے کہا کہ دروازے اور کھڑکیاں اچھی طرح بند کر دو تاکہ ہاجرہ یہاں قدم نہ رکھ سکے۔ شبیر مجھے نادان اور احمق سمجھ کر مسکرانے لگا' میرے اطمینان کے لئے اس نے دروازے اور کھڑکیاں بند کر دیں۔ میرے ساتھ بیٹھ کر آدھی رات تک تاش کھیلتا رہا پھر اپنے بستر پر جا کر سو گیا' ہم دونوں کے پلنگ کے درمیان چار قدم کا فاصلہ تھا اس کے سونے کے بعد بھی مجھے نیند نہیں آئی۔ کمرے میں سو کینڈل پاور کا بلب روشن تھا' رات کو بھی دن کا سا اجالا تھا پھر بھی میں سونا نہیں چاہتا تھا۔

جب نصیب سونے لگتے ہیں تو انسان بھی سونے لگتا ہے' کبھی کبھی میری آنکھیں جھپک جاتی تھیں' غنودگی غالب آ جاتی تھی پھر میں چونک کر دروازے کی طرف دیکھنے لگتا تھا۔ ایسا کئی بار ہوا' اس کے بعد میری آنکھ لگ گئی۔

اس کے بعد وہی سینے کا بوجھ' جیسے پہلی بار ڈاک بنگلے کے کمرے میں کسی کی آمد پر محسوس ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی بھاری پتھر رکھ دیا گیا ہے یا کوئی میرے سینے پر چڑھ کر

بیٹھ گیا ہے۔ یکلخت میری آنکھ کھل گئی' کمرے میں تاریکی تھی' ایک کھڑکی کے آدھے شیشے پر چاند کی زرد روشنی تھی اس روشنی کی دھندلاہٹ میں' میں نے ہاجرہ کو دیکھا' وہ ہاتھ میں خنجر لئے کھڑی تھی' وہی ہاتھی دانت کے دستے والا خنجر تھا' وہی آدھ کھلے سینے پر سیاہ داغ تھا۔ اب وہ سوراخ نہیں تھا' اب وہ داغ بھی نہیں تھا بلکہ اس سینے پر کسی کے نام کی مہر لگی ہوئی تھی' اس کی گھورتی ہوئی آنکھیں دہکتے ہوئے انگاروں کی طرح نظر آ رہی تھیں۔

پھر وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی' میرے پیروں کی طرف سے گھوم کر بائیں طرف آنے لگی' میں دہشت زدہ سا آنکھیں پھیلائے اسے دیکھ رہا تھا۔ میں اسے کہنا چاہتا تھا۔ "ہاجرہ' ہاجرہ ہوش میں آؤ۔ میں تمہارا خاوند ہوں' تمہارا مجازی خدا ہوں' باز آ جاؤ میرے قتل سے باز آ جاؤ.........."

لیکن میں کچھ نہ کہہ سکا' میرا حلق خشک ہو گیا تھا' زبان تالو سے چپک گئی تھی اور وہ بالکل قریب آ گئی تھی۔ اپنی ہتھیلی پر خنجر کو تول رہی تھی پھر اس نے ہاتھی دانت کے دستے کو مضبوطی سے جکڑ لیا اور مجھ پر حملہ کر دیا۔

میں چیختا ہوا پلٹ گیا' پلٹ کر لڑھکتا ہوا پلنگ سے نیچے گر گیا اور ذبح ہونے والے بکرے کی طرح ہاتھ پاؤں جھٹک جھٹک کر چیخنے لگا۔

"کیا ہوا راحیل' کہاں ہو تم؟"

اندھیرے میں شبیر کی آواز سنائی دے رہی تھی پھر وہ میرے قریب آ گیا اور مجھے جھنجھوڑنے لگا۔

"ہوش میں آؤ راحیل' گھبراؤ نہیں میں تمہارے پاس ہوں۔"

"وہ' وہ آئی ہے' اس کمرے میں ہے' بتی جلاؤ۔ میں نے تمہیں منع کیا تھا بتی نہ بجھانا۔"

"میں نے تو نہیں بجھائی تھی۔" شبیر نے کہا۔ "پتہ نہیں کیسے اندھیرا ہو گیا' ٹھہرو میں لائٹ آن کرتا ہوں۔"

وہ ماچس کی تیلی جلا کر سوئچ بورڈ کی طرف گیا' میں بھی اس کے ساتھ ہی تھا اور جلتی ہوئی تیلی کی روشنی میں اپنے آس پاس دیکھ رہا تھا۔ وہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ ایک تیلی نے کمرے کو اس حد تک روشن کر دیا تھا کہ وہ نظروں سے چھپ نہیں سکتی تھی۔

سوئچ آن کرنے کے بعد بھی بلب روشن نہیں ہوا' شاید باہر سے کسی نے مین سوئچ آف کر دیا تھا' شبیر نے دوسری تیلی جلا کر کہا۔

"دیکھو' دروازہ اندر سے بند ہے وہ کس طرح آ سکتی ہے اور یہاں سے جا سکتی ہے۔ تم نے یقیناً خواب دیکھا ہے' تمہارے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ وہ تمہارے جنم دن کی ہر صبح چار بجے تمہیں قتل کرنے آیا کرے گی۔"

اس کی باتیں ختم ہوتے ہی باہر دوڑتے ہوتے قدموں کی آواز سنائی دی' پھر کسی عورت کی ہلکی سی چیخ ابھری اور ڈوب گئی۔

"کون ہے؟" شبیر دروازہ کھولتے ہوئے باہر نکلا' میں دوڑتا ہوا مین سوئچ کے پاس گیا اسی وقت شبیر کی آواز آئی۔ "میں نے پکڑ لیا ہے' کہاں جائے گی بچ کے۔"

میں نے سوئچ آن کر دیا پھر برآمدے کی روشنی میں' میں نے ہاجرہ کو دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں وہی خنجر تھا مگر اس کے دونوں ہاتھ شبیر کی گرفت میں تھے' وہ اسے کھینچتا ہوا کمرے میں لے جا رہا تھا وہ چیخ رہی تھی۔

"چھوڑ دو مجھے' میں راحیل کی دشمن نہیں ہوں میں اپنے سہاگ کی سلامتی کے لئے یہاں آئی تھی۔"

میں نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر ایک الٹا ہاتھ رسید کیا' شبیر نے کہا۔ "ٹھہرو راحیل' پہلے اس کی باتیں سن لو۔"

"باتیں کیا خاک سنوں' کیا اب بھی تم یہ کہو گے کہ یہ عورت آسیب زدہ نہیں ہے؟"

شبیر نے اسے پلنگ پر بیٹھنے کے لئے کہا مگر ہاجرہ مار کھا کر غصے سے مجھے دیکھ رہی تھی پھر وہ جھلا کر بولی۔

"آسیب زدہ میں نہیں ہوں وہ تمہاری داشتہ ہے جس کے ساتھ تم اپنا منہ کالا کرتے ہو' اس کے ساتھ شادی کے جھوٹے وعدے کرتے ہو۔ پرسوں اس نے میرے سامنے قسم کھائی تھی کہ اب اگر تم نے شادی سے انکار کیا تو وہ تمہیں قتل کر دے گی۔ اس نے تمہارے سوٹ کیس سے یہ خنجر نکال کر رکھ لیا تھا' میں اس کے خطرناک ارادے سے تمہیں آگاہ کرنا چاہتی تھی۔ آج دس بجے مجھے پتہ چلا کہ تم واپس آ گئے ہو۔ بوڑھی ملازمہ تمہارے ہاں گئی تو معلوم ہوا کہ تم رضیہ سے لڑ جھگڑ کر گئے ہو' میں سمجھ گئی کہ تم شبیر

بھائی کے ہاں جاؤ گے۔ میں تمہیں بتانا چاہتی تھی کہ وہ خنجر رضیہ کے پاس ہے پھر میں نے سوچا کہ تم میری بات کا یقین نہیں کرو گے' بہتر یہی ہے کہ رضیہ اپنے ارادے پر عمل کرے تو میں اسے موقع پا کر پکڑ لوں۔ یہ سوچ کر میں تمہارے گھر کے باہر ایک درخت کے نیچے کھڑی رہی' چار بجے سے کچھ دیر پہلے رضیہ گھر سے نکلی میں بھی اس کا پیچھا کرتی ہوئی یہاں تک آئی۔ وہ یہاں کی کھڑکیوں اور دروازوں کو بند دیکھ کر ناکام لوٹ رہی تھی مگر میں نے اسے پکڑ لیا' وہ خنجر پھینک کر مجھے مارنے لگی۔ میں کیا کروں' اس کے مقابلے میں کمزور تھی اس لئے وہ مجھے دھکا دے کر بھاگ گئی میرا سر ایک دیوار سے ٹکرایا تو حلق سے چیخ نکل گئی اسی وقت شبیر بھائی کے للکارنے کی آواز آئی میں زمین پر پڑا ہوا خنجر اٹھا رہی تھی کہ انہوں نے مجھے پکڑ لیا۔"

"بہت عمدہ کہانی ہے۔" میں نے طنزیہ انداز میں حقارت سے کہا۔ "تم سمجھتی ہو کہ میں تمہاری بات کا یقین کرلوں گا پہلے تم اپنے پاس خنجر رکھنے کا یہ جواز پیش کرتی تھیں کہ تمہیں احمد دین کی طرف سے خطرہ ہے' آج یہاں احمد دین تمہاری عزت سے کھیلنے کے لئے نہیں آیا اس لئے اس خنجر کو رضیہ کے سر تھوپ رہی ہو۔"

"میں پہلے ہی سمجھتی تھی کہ تم مجھ پر کبھی اعتبار نہیں کرو گے ایک ثبوت حاصل کرنے کے لئے میں یہاں آئی تو پھر مجھ پر الزام لگ گیا۔ میں ہار گئی راحیل' میں اپنی بدنصیبی سے ہار گئی ہوں۔ اتنے صبر اور انتظار کے بعد بھی میرے نصیب نہیں بدلے۔"

"بدلیں گے۔" میں نے کہا۔ "اسی آسیب کے سائے میں رہ کر تمہارے نصیب بدلیں گے۔ میں چاہوں تو اس خنجر کے ساتھ تمہیں پولیس کے حوالے کر سکتا ہوں لیکن اس طرح عدالت میں بار بار پیشی ہو گی تو بار بار تمہارا سامنا ہو گا اور اب میں تمہاری صورت دیکھنا نہیں چاہتا اس لئے تمہیں طلاق دیتا ہوں' میں پورے ہوش و حواس میں رہ کر تمہیں طلاق دیتا ہوں۔ مذہب کی رو سے تین ماہ کے عرصہ میں خوب سوچ سمجھ کر طلاق دی جاتی ہے' میں تمہیں ایک سال تک اچھی طرح سمجھنے اور پرکھنے کے بعد طلاق دے چکا ہوں' کل صبح تمہیں طلاق نامہ کے ساتھ مہر کی پوری رقم مل جائے گی۔"

وہ دونوں ہاتھوں سے چہرہ کو چھپا کر رونے لگی' میں منہ پھیر کر کھڑا ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ پلنگ سے اٹھ کر کمرے سے باہر جانے لگی' دروازے کے پاس پہنچ کر اس نے کہا

"میں جا رہی ہوں' مگر میری زندگی برباد کر کے تم بھی سکون سے نہیں رہ سکو گے۔"

اس کے لہجے میں ایک چیلنج تھا' اس وقت میں نے اس چیلنج کو اہمیت نہیں دی لیکن اب' اب میں تسلیم کرتا ہوں کہ میرا سکون برباد ہو گیا ہے۔

یہ ایک سال' پورا ایک سال میں نے آج کے انتظار میں گزارا ہے۔

ہر مہینہ' ہر دن اور ہر لمحہ وہ میرے اندر بیٹھ کر بولتی رہی کہ میں آؤں گی' خنجر بکف آؤں گی۔

میری بھوک مر گئی' میری آرزوئیں اور میری خوشیاں مر گئیں' میں بیمار رہنے لگا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا میرے دل کی دھڑکنیں بے قابو ہوتی گئیں۔ مجھے اختلاج قلب کا مرض لاحق ہو گیا' ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ فکر اور پریشانیوں کو بھول جاؤ' خوش رہا کرو ورنہ.........

انہوں نے آگے کچھ نہیں کہا مگر میں جانتا ہوں کہ اس بیماری کا انجام یہی ہے کہ کسی بھی وقت حرکت قلب بند ہو جاتی ہے اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آج' صرف آج وہ نہ آئے تو مجھے تمام پریشانیوں سے نجات مل جائے گی۔ میں تسلیم کرلوں گا کہ وہ آسیب زدہ نہیں تھی میں آسیب زدہ تھا۔ میں نے کسی جن کو' کسی ہمزاد کو یا کسی بدروح کو اپنے دماغ میں بٹھا لیا تھا۔

لیکن نہیں' ایسی بات نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ آئے گی جیسے تمہیں مکمل یقین ہے کہ اس رات کے بعد صبح کی روشنی کمرے میں آئے گی اسی طرح مجھے یقین ہے کہ.........

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔

"ٹن۔ ٹن۔ ٹن۔ ٹن" دیوار گھڑی چار کے ہتھوڑے برسا رہی تھی۔

یک بیک زور سے بجلی کوندی' بہت قریب سے بجلی کوندی۔ اس کی کڑک دار آواز سے در و دیوار لرز گئے' کھڑکیوں کے شیشے تڑخ گئے اور دروازہ ایک جھٹکے سے کھل گیا۔

وہ خنجر بکف کھڑی تھی۔

راحیل نے اسے دیکھا تو اس کا اوپر کا سانس اوپر ہی رہ گیا' دیدے پھیل گئے اور وہ ایک دم سے ساکت ہو گیا۔

قاسم نے پریشان ہو کر دروازے کی جانب دیکھا پھر اس کی جانب بڑھتے ہوئے بولا

"یہ کیا حرکت ہے، تمہیں ایک دہشت زدہ انسان کے سامنے اس طرح نہیں آنا چاہئے۔"

"آپ ہٹ جائیے سامنے سے۔" وہ جھلا کر بولی۔ "یہ کمبخت مجھے یہاں بھی بدنام کرنے چلا آیا ہے۔ اب میں خود ہی اس کے ہاتھ میں خنجر دے کر کہتی ہوں کہ یہ میرے ٹکڑے کردے تاکہ یہ قصہ ہی ختم ہو جائے۔"

قاسم نے اس کے ہاتھ سے خنجر لے لیا اور راحیل کی جانب بڑھتے ہوئے بولا

"میرے دوست، میں تمہاری آپ بیتی کے جواب ٹھوس ثبوت کے ساتھ دینا چاہتا تھا اپنی بیوی سے تمہیں ملا کر۔ اب یہ خود ہی آگئی ہیں تو انہیں اچھی طرح پہچان لو، یہ تمہاری نئی بھابی ہے۔ راحیل اٹھو، ایسے چپ کیوں ہو گئے ہو؟"

اس نے راحیل کے شانے کو ہلایا تو اس کا جسم ایک طرف ڈھلک گیا۔

☆======☆======☆

جانور

ان لوگوں کی کہانی جو اپنے بھیانک چہروں پر
خوشنمائی کا نقاب چڑھائے پھرتے ہیں۔
خوشنما نقابوں کے پیچھے چھپے مکروہ چہرے اب
کی نقاب کشائی کی کہانی۔
انسان کے اندر چھپی ہوئی درندگی کی دہشت ناک کہانی۔

شازیہ نے پھر وہی بھیانک سا اور گھناؤنا سا خواب دیکھا۔ اس کے سامنے راجہ کی لاش خون میں نہائی پڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا خنجر تھا جس سے راجہ جی کا لہو ٹپک رہا تھا اور اب وہ اس لاش کی بوٹیاں کاٹ کاٹ کر اپنے دانتوں سے اس کا کچا گوشت چبا رہی تھی۔

ایک نارمل انسانی دماغ ایسے خواب نہیں دکھا سکتا۔ شازیہ بالکل نارمل تھی۔ وہ ایسے خواب دیکھتی رہی تھی لیکن جب اس منظر میں ایسا وقت آتا جب وہ کچا گوشت چباتی تو ایک دم سے اسے ابکائی آنے لگتی تھی اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھ کھل جایا کرتی تھی۔

ایک زمانے میں اس بات کا بڑا چرچا رہا تھا کہ ہندوستان میں چند اگھوری پکڑے گئے ہیں جو انسان کا گوشت کھاتے تھے انہیں سزائے موت دی گئی۔ افریقہ وغیرہ کے انتہائی گھنے اور غیر آباد علاقوں میں ایسے حبشی پائے گئے ہیں جو انسان کا گوشت کھاتے ہیں یعنی یہ دنیا اتنی مہذب ہونے اور سائنسی ترقی کرنے کے باوجود اب بھی اپنے اندر ایسے آدم زاد رکھتی ہے جو دوسرے آدم زادوں کا گوشت کھانے میں ذرا بھی کراہیت محسوس نہیں کرتے اور اسے غیر انسانی فعل نہیں سمجھتے۔

شازیہ ایسی نہیں تھی۔ وہ بے حد مہذب تھی۔ اچھی تعلیم یافتہ' بہت ہی اسمارٹ اور حسین بھی تھی۔ اتنی حسین کہ امیر حسن اس کے عشق میں دیوانہ ہو گیا تھا اور اسے ہر حال میں ہر شرط پر حاصل کر لینا چاہتا تھا۔

ایک امیر حسن کی ہی بات نہیں تھی۔ اس کے چاہنے والے بے شمار تھے۔ بے شمار لوگ اس کے طلبگار تھے۔ امیر حسن کی بات اس لئے قابل ذکر ہے کہ شازیہ بھی اسے پسند کرتی تھی لیکن اس کی ایک شرط تھی۔ بڑی ہی کڑی شرط۔

امیر حسن نے کہا۔ "میں تمہاری ہر شرط ماننے کو تیار ہوں۔ مجھ سے شادی کر لو۔"

اس نے جواب دیا۔ "ابھی نہیں۔ ابھی میں تمہیں آزماؤں گی کہ تمہاری محبت میں

کتنی شدت ہے۔ تم کتنی دیوانگی سے مجھے طلب کرتے ہو۔ جب تم آزمائش پر پورے اترو گے تب میں اپنی شرط پیش کروں گی۔"

امیر حسن نے پوچھا۔ "تم مجھے کس طرح آزمانا چاہتی ہو؟"

"میں رفتہ رفتہ دیکھوں گی کہ تم میرے لئے کیا کیا کر سکتے ہو۔"

"میں کیا کر سکتا ہوں۔ تم جانتی ہو کہ میں اپنے دیس کی فلائنگ کمپنی میں اسٹیورڈ ہوں۔ میری ماہانہ تنخواہ یوں تو دو ہزار روپے ہے لیکن جب بیرون ملک کی فلائٹ میں میری ڈیوٹی ہوتی ہے تو اوور ٹائم اور بیرون ملک کے تمام اخراجات ملا کر تقریباً سات آٹھ ہزار تک تنخواہ مل جاتی ہے۔ اگر کسی اسمگلر سے ٹکرا گیا اور اس کا مال پار کرا دیا تو پھر تیس چالیس یا پچاس ہزار کی آمدنی چٹکی بجا کر ہو جاتی ہے۔ میرے پاس دولت کی کمی نہیں ہے۔ تم نے میری کوٹھی بھی دیکھی ہے۔ کار بھی دیکھی ہے۔ بینک بیلنس بھی تمہیں بتا دوں گا۔ عورت یہ تین چیزیں چاہتی ہے اور یہ تینوں میرے پاس ہیں۔ اب بولو اور کیا چاہئے؟"

"بتاؤں گی۔ ذرا صبر کرو۔"

شازیہ نے اسے ٹال دیا۔ دوسرے لفظوں میں اسے اپنے پیچھے لگا لیا۔ وہ جانتی تھی کہ اپنی اہمیت کس طرح جتائی جا سکتی ہے اور اپنی قدر کس طرح بڑھائی جا سکتی ہے۔ جب تک وہ شجرِ ممنوعہ بنی رہے گی۔ تب تک امیر حسن کے دل و دماغ میں ایک دریا بن کر اچھل مچاتی رہے گی۔ امیر حسن دیوانہ بنا رہے گا اور اس دیوانگی میں وہ اس کے لئے سب کچھ کر گزرے گا۔ کچھ عرصے بعد دیوانے نے پھر التجا کی۔ "دیکھو جان' تم مجھے بہت چاہتی ہو میں بھی تمہیں دیوانہ وار چاہتا ہوں' یہ بات ہم دونوں سے چھپی ہوئی نہیں ہے پھر بھی میں محسوس کرتا ہوں کہ تم خواہ مخواہ شادی کے مسئلے کو ٹال رہی ہو۔ آخر تم میری کیوں نہیں بن جاتیں؟"

"میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ تم میرے لئے کیسی قربانیاں دے سکتے ہو؟"

"جیسی تم کہو گی۔"

"کیا تم میری خاطر اپنی عادتوں کو چھوڑ سکتے ہو؟"

"چھوڑ سکتا ہوں۔"

"کیا اپنے اصولوں کو توڑ سکتے ہو؟"

وہ ذرا ہچکچایا۔ پھر بولا۔ "ہاں تمہارے لئے یہ بھی کر سکتا ہوں۔"

آخر شازیہ نے بڑے ہی ٹھہرے ہوئے انداز میں پوچھا۔ "کیا تم میرے لئے کسی کو قتل کر سکتے ہو؟"

"ایں؟" وہ بوکھلا گیا۔ پھر ہنستے ہوئے بولا۔ "یہ کیا مذاق کر رہی ہو۔ بھلا ہماری شادی کا تعلق کسی کے قتل سے کیا ہو سکتا ہے۔ ہم لوگ مہذب ہیں۔ تعلیم یافتہ ہیں اور نارمل ذہن رکھتے ہیں۔ قتل' غارت گری' تباہی و بربادی کی باتیں ایسے لوگ سوچتے ہیں جن کا دماغ خراب ہوتا ہے۔ وہ نارمل نہیں ہوتے۔"

"تم یہی سمجھ لو کہ میں نارمل نہیں ہوں اور جو کچھ کہہ رہی ہوں بڑی سنجیدگی سے کہہ رہی ہوں۔"

وہ پریشان ہو کر شازیہ کو دیکھنے لگا۔ وہ طنزیہ انداز میں مسکرا کر بولی۔ "بس گھبرا گئے؟ دم نکل گیا؟ دل سے' دماغ سے عشق کا بخار اتر گیا؟"

وہ اپنے سر کو سہلاتے ہوئے بولا۔ "یہ بات نہیں ہے شازیہ میں تمہارے لئے اپنی جان بھی دے سکتا ہوں اور عشق میں یہی ہوتا ہے اپنی جان کی بازی لگائی جاتی ہے۔ دوسرے کی زندگی سے نہیں کھیلا جاتا۔ اب تک مجھے یقین نہیں آ رہا کہ تمہاری جیسی تعلیم یافتہ' سمجھ دار لڑکی ایسی باتیں کر سکتی ہے۔"

"وہ کہتے ہیں نا کہ عشق کے امتحاں اور بھی ہیں۔ تو عشق کا امتحان صرف یہ نہیں ہوتا کہ اپنی جان کی بازی لگائی جائے' اپنے عشق کی سچائی' اپنی طلب کی شدت کو ثابت کرنے کے لئے عاشق اپنی محبوبہ کے سامنے دوسروں کا سر کاٹ کر لے آتا ہے' کیا ہم انسانوں کی تاریخ میں ایسے واقعات نہیں ہوئے ہیں۔"

امیر حسن اس کے بے پناہ حسن کو دیکھ کر سوچنے لگا کہ یہ حسین عورتیں سنگدل کیوں ہوتی ہیں؟ سنا ہے کہ قلوپطرہ بھی ایسی ہی تھی۔ شازیہ نے اسے اپنی طرف غور سے دیکھتے ہوئے پا کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "تم سوچ رہے ہو گے کہ میں اتنی حسین ہوں۔ قدرت نے میرے حسن و جمال میں' میرے سراپے میں کہیں بھی کوئی نقص نہیں رکھا۔ میں ایک مکمل حسن ہوں لیکن آج ایک قتل کی بات کرتے ہوئے سنگدل نظر آ رہی ہوں' اوپر سے جتنی حسین ہوں' اندر سے اتنی ہی چڑیل محسوس ہو رہی ہوں۔"

"شازیہ تم اس قدر سمجھ دار ہو کہ اپنے متعلق بھی ایسا تجزیہ کر سکتی ہو حسین

عورت جب کسی کی جان لینے کی بات کرتی ہے تو اندر سے بالکل چڑیل لگتی ہے۔ پھر بھی تم قتل کرنے کی باتیں کر رہی ہو۔"

"میری اپنی انتقامی مجبوری ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ میرا وہ دشمن میرے سامنے تڑپ تڑپ کر جان دے۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ "تم بظاہر نارمل ہو مگر نہیں ہو۔ تمہاری شرط تسلیم کرنے کے لئے مجھے بہت کچھ سوچنا ہو گا اپنے آپ کو تولنا ہو گا کہ میرے دل میں اور دماغ میں تمہاری طلب کتنی ہے؟ میں تمہارے لئے درندہ بن سکتا ہوں؟ بہرحال مجھے سوچنے کا موقع دو۔"

وہ شازیہ سے رخصت ہو کر اپنی کوٹھی میں آ گیا۔ راستے بھر وہ حیران اور پریشان رہا۔ شازیہ نے اسی شہر میں ایک چھوٹا سا ٹیوشن سنٹر کھول رکھا تھا۔ جہاں بچوں کو پڑھاتی تھی۔ بچوں کو پڑھانے والی معلمہ اتنی سنگدل ہوتی ہے۔ یہ یقین نہیں آ رہا تھا۔ دوسرے دن امیر حسن کو لندن ایک فلائٹ میں جانا تھا۔ اسے اپنی ڈیوٹی کے دوران چھ دنوں تک اپنے دیس سے باہر رہنا تھا اور شازیہ سے بھی دور رہنا تھا۔ یہ خود کو آزمانے کا اچھا موقعہ تھا کہ وہ شازیہ کے بغیر رہ سکتا ہے یا نہیں؟ وہ اسے دماغ سے نکالنے کی کوشش کر سکتا تھا۔

یہ محض اس کی خوش فہمی تھی کہ وہ حسینہ اس کے دماغ سے نکل جائے گی۔ اس سے پہلے بھی اس نے بے شمار حسین لڑکیاں دیکھی تھیں کتنی ہی حسین عورتوں سے ملاقاتیں بھی رہیں۔ دوستی بھی رہی لیکن کسی نے بھی اس قدر متاثر نہیں کیا تھا۔ چھ دن کے دوران اس نے اپنے دیس سے لے کر لندن تک کتنی ہی عورتوں سے مسکرا مسکرا کر دوستی کی۔ لندن میں قیام کے دوران وہ ایک حسین لڑکی سے ملتا رہا۔ اس کے ساتھ وقت گزارتا رہا لیکن جب بھی وہ لڑکی اس کے ساتھ ہوتی تھی تو اس کے ساتھ شازیہ کی یادیں بھی ہوتی تھیں کہ وہ ہوتی تو یہ سماں کچھ اور ہوتا۔ یہ جذبے کچھ اور ہوتے۔ یہ دنیا ہی بدلی ہوئی ہوتی۔ ابھی تو خود کو بہلانے والی مشقیں جاری تھیں اور اگر شازیہ موجود ہوتی تو وہ بہلاوا نہ ہوتا۔ حقیقی محبت ہوتی۔

شادی سے پہلے عورت کی طلب کو محبت' عشق اور دیوانگی اور پتہ نہیں کیا کچھ کہا جاتا ہے لیکن دانشمند کہتے ہیں کہ شادی سے پہلے عورت کی جو طلب ہوتی ہے وہ دراصل

خطرے کی گھنٹی کی طرح دماغ میں محبت بن کر بجتی رہتی ہے۔ جو عورت شادی سے پہلے مرد کی کمائی کا حساب کرے' اس کے مزاج کو بدلنے کی کوشش کرے' اس کے اصولوں کو توڑنے کی ضد کرے۔ حتیٰ کہ اسے انسان سے درندہ بننے پر مجبور کرے ایسی عورت شادی کے بعد کیا گل کھلائے گی' یہ بات امیر حسن جیسے جوانوں کی سمجھ میں نہیں آسکتی تھی۔

چھ دنوں کے بعد جب وہ واپس آیا تو شازیہ کی طلب اور شدید ہو گئی تھی۔ اندر ہی اندر دیوانگی اور بڑھ گئی تھی۔ اس کی ایک ایک ادا' اس کے مسکرانے کا انداز' اس کی گفتگو کی مٹھاس' اس کے لہجے کی چاشنی سب کچھ ایسا تھا کہ ان کے متعلق سوچ سوچ کر طلب بڑھتی جاتی تھی۔ واپس آنے کے بعد اس نے سوچا کہ ایک دن اور شازیہ سے لاقات نہیں کرے گا۔ ایک دن اور اپنے آپ کو سمجھائے گا۔ سمجھانے کے لئے اس نے نشے کا سہارا لیا۔ دوستوں کی محفل میں خوب جم کر پیتا رہا۔ اس کے دوست جانتے تھے کہ وہ شازیہ کی محبت میں گرفتار ہے اور شازیہ اسے لفٹ نہیں دے رہی ہے۔ پینے کے دوران ایک دوست نے مذاق اڑانے کے انداز میں کہا۔ "بھئی اگر وہ تمہیں گھاس نہیں ڈال رہی تو کسی دوسری جگہ گھاس کھالو۔"

وہ یہ طعنہ برداشت نہ کر سکا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ ایک الٹا ہاتھ اس کے منہ پر رسید کر دیا۔ یہ بات مہذب سوسائٹی کے خلاف تھی۔ سب لوگوں نے حیرانی سے دیکھا لیکن جس نے مار کھائی تھی۔ وہ خاموش نہیں رہ سکتا تھا۔ اس نے بھی تہذیب کو بالائے طاق رکھ کر جوابی حملہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ ذرا سی دیر میں امیر حسن اس پر غالب آگیا۔ اس کا گلا گھونٹنے لگا اور وہ مار کھانے والا شخص اپنے ہاتھ پاؤں جھٹک کر خود کو آزاد کرانے کی کوشش کرنے لگا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا دم نکل رہا ہو۔ وہاں موجود تمام لوگوں نے امیر حسن کو پکڑ کر کسی طرح اس سے الگ کیا۔ بات کچھ بھی نہ تھی اور بات بڑھ گئی تھی۔

دوستوں نے ان دونوں کو سمجھایا۔ زبردستی انہیں مصافحہ کرنے اور گلے لگنے کے لئے کہا۔ تھوڑی دیر بعد دونوں پھر ایک ساتھ بیٹھ کر پی رہے تھے اور اپنی غلطی پر ہنس رہے تھے لیکن ہنسنے کے دوران امیر حسن کے دماغ میں کچھ اور کھچڑی پک رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ شازیہ کے متعلق ذرا سی بات سن کر وہ اس قدر جوش میں آگیا تھا کہ اپنے دوست کا گلا گھونٹنے لگا تھا۔ دوسرے دوستوں نے بچا لیا ورنہ وہ اب تک قاتل بن چکا

ہوتا۔ کچھ بھی ہو' اس واقعہ سے یہ ثابت ہو گیا تھا کہ وہ اپنی شازیہ کی خاطر قاتل بن سکتا ہے۔

☆======☆======☆

دوسرے دن اس نے شازیہ کے سامنے پہنچ کر ہتھیار ڈال دیئے۔ وہ اپنی محبوبہ کے لئے لندن سے خوشبوؤں اور مختلف سنگھار کے تحائف لے کر آیا تھا۔ انہیں پیش کرتے ہوئے اس نے کہا۔ "میری جان' میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں نے ان سات دنوں میں اپنے آپ کو اچھی طرح آزمایا ہے۔ ہر پہلو سے غور کیا ہے اور اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ میں تمہاری خاطر تمہارے دشمن کو ٹھکانے لگا سکتا ہوں۔ مجھے بتاؤ۔ وہ کون ہے اور تم اس سے کس بات کا انتقام لینا چاہتی ہو؟"

"مجھے کہیں باہر لے چلو۔ پھر بتاؤں گی۔"

وہ دونوں کار میں بیٹھ گئے۔ امیر حسن نے کار اسٹارٹ کی پھر اسے ڈرائیو کرتے ہوئے کسی تفریح گاہ کی طرف جانے لگا۔ شازیہ نے کہا۔ "میں پہلے تمہیں بتا چکی ہوں کہ میرا بچپن اور جوانی کا ابتدائی حصہ ریاست جام نگر میں گزرا ہے۔"

امیر حسن نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ہاں یہ جانتا ہوں۔ تم نے بی اے تک وہیں تعلیم حاصل کی ہے۔ اس کے بعد میں کچھ نہیں جانتا۔"

"اس کے بعد میرے پاس کچھ نہیں رہا کہ کوئی میرے متعلق جان سکے۔ میرے ماں باپ کے مرنے کے بعد جام نگر کے راجہ صاحب نے مجھے اپنے ایک ملازم کے حوالے کر دیا تاکہ وہ میری پرورش کرے۔ میری پرورش کے اخراجات راجہ صاحب کے خزانے سے ملتے تھے۔ میں بڑی ہوئی تو تعلیم کا انتظام کیا گیا۔ حتیٰ کہ مجھے کالج تک تعلیم دلائی گئی جیسے جیسے میں سن بلوغ کو پہنچتی گئی۔ دنیا کو سمجھتی گئی' یہ بات میری سمجھ میں آگئی کہ شاید میرا کوئی باپ نہیں تھا۔ میری ماں راجہ صاحب کے محل میں ملازمہ تھی اور شاید اسی محل میں رہ کر راجہ صاحب کی مہربانیوں سے مجھے جنم دیا تھا۔"

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ امیر حسن چپ چاپ کار ڈرائیو کرتا رہا۔ پھر شازیہ نے کہا۔ "میں اپنی زندگی کی کوئی بات تم سے نہیں چھپاؤں گی۔ اسی لئے بتائے دیتی ہوں۔ میں کوئی خاندانی لڑکی نہیں ہوں۔ میرے پاس کسی خاندان کا شجرہ نہیں ہے۔ میں اپنے باپ کا نام نہیں لے سکتی۔ ویسے حقیقتاً دیکھا جائے تو میں راجہ جام نگر کی بیٹی ہوں۔ میری

کوئی قانونی حیثیت نہیں ہے۔ اس بات کو تم بھی سمجھ لو شادی کے بعد یہ شکایت نہ کرنا کہ میں نے تم سے اپنی پیدائش کا اور اپنے خاندان کا کوئی راز چھپایا تھا۔"

امیر حسن نے کہا۔ "یہ ٹھیک ہے۔ ہمیں شادی سے پہلے ایک دوسرے کے سامنے آئینے کی طرح صاف ہونا چاہئے تاکہ ہم ایک دوسرے کے اندر دور تک جھانک کر سب کچھ دیکھ سکیں۔ میں تمہاری اس بات سے بہت خوش ہوں۔"

وہ ذرا چپ رہی پھر بولی۔ "راجہ صاحب کا ایک بھتیجا تھا۔ وہ شہر میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ اس کا نام راجہ محمود جہانگیر تھا۔ وہ جب ریاست میں واپس آیا تو مجھ پر نظر پڑتے ہی یوں درندے کی طرح دیکھنے لگا جیسے ابھی چیر پھاڑ کر کھا جائے گا۔ میں نے پہلی ہی ملاقات میں اس کی نیت کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ دوسرے ہی دن اس نے اس ملازم کے پاس اپنے خاص آدمی بھیجے جس کے ہاں میں پرورش پا رہی تھی۔ راجہ محمود جہانگیر کے خاص آدمی نے میرے بابا سے کہا کہ مجھے ریاست کے ڈاک بنگلے میں آج رات پہنچا دیا جائے۔

میرے بابا نے سن کر کہا۔ "میں ایسا نہیں کر سکتا کیونکہ میں راجہ صاحب کے حکم کا تابع ہوں۔ وہ حکم دیں گے تو میں شازیہ کو جہنم میں بھی پہنچا دوں گا۔"

اس کا انکار سن کر وہ لوگ چلے گئے۔ یقیناً راجہ محمود جہانگیر کو اس انکار پر غصہ آیا ہو گا لیکن وہ بھی راجہ صاحب سے ڈرتا تھا۔

ایک روز راجہ صاحب شیر کا شکار کرنے گئے تو واپسی میں ان کی لاش آئی۔ ان کے ساتھ جانے والے شکاریوں نے بیان دیا کہ کہیں سے ایک گولی آئی اور راجہ صاحب کو چاٹ گئی ان شکاریوں نے دور دور تک اس گولی چلانے والے کو تلاش کیا مگر کچھ پتہ نہیں چلا۔ یہ بات ایسی تھی کہ سب کا شبہ راجہ محمود جہانگیر کی طرف جاتا تھا۔ راجہ صاحب کے خاندان میں وہی اکلوتا وارث تھا اور ان کے بعد ساری ریاست اسے ملنے والی تھی۔

شبہ تو یقینی تھا لیکن کوئی اسے قاتل نہیں کہہ سکتا تھا کیونکہ جب ان کا قتل ہوا تو وہ ریاست میں موجود تھا اور اس کے سب ہی عینی شاہد تھے۔ یہ بات دوسری ہے کہ اس نے کرائے کے قاتلوں کو راجہ صاحب کے پیچھے لگا رکھا ہو لیکن یہ کوئی ثابت نہیں کر سکتا تھا۔

بہرحال چالیس دنوں تک راجہ صاحب کا سوگ منایا گیا۔ اس کے بعد راجہ محمود

جہانگیر' اس ریاست کا راجہ بن گیا۔ راجہ بنتے ہی سب سے پہلے اس نے مجھے اپنے محل میں طلب کیا۔ میں جانا نہیں چاہتی تھی لیکن جس ملازم نے مجھے پالا پوسا تھا' اس نے کہا کہ وہ حاکم وقت کا وفادار ہے۔ پہلے جس راجہ نے مجھے اس کے حوالے کیا تھا اس کے حکم کے مطابق اس نے میری پرورش کی تھی۔ اب بدلے ہوئے راجہ کا حکم تھا کہ مجھے اس کی خوابگاہ میں پہنچایا جائے۔ وہ ملازم حکم کا بندہ تھا۔ اس نے مجھے فوراً خوابگاہ میں پہنچا دیا' میں چیختی رہی چلاتی رہی۔ مجھے اس سے نفرت تھی لیکن میں اس کا کچھ نہ بگاڑ سکی کیونکہ وہ حاکم وقت تھا۔"

شازیہ نے یہاں تک اپنی داستان سنا کر ایک سرد آہ بھری اسے اپنے لٹنے کا افسوس آج بھی تھا۔ پھر اس نے کن اکھیوں سے امیر حسن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم سن رہے ہو نا؟ آج میں نے تم پر یہ بات بھی کھول دی کہ میں دوشیزہ نہیں ہوں۔ یہ بات یاد رکھنا۔ ایسا نہ ہو کہ شادی کے بعد طعنے دو۔"

امیر حسن نے بھی سرد آہ بھرنے کے انداز میں ایک گہری سانس لی۔ پھر کہا۔ "مجھے افسوس ہے کہ تم پر ایسا وقت آیا۔ وہ تمہاری مجبوری تھی۔ میں اس سلسلے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ بہرحال آگے بولو۔"

"آگے کیا بولوں۔ میں لٹ گئی تھی' میں فریاد نہیں کر سکتی تھی۔ جس کے پاس فریاد کرنے جاتی وہی لٹیرا تھا۔ میں نے اپنے حالات پر صبر کر لیا اور سوچنے لگی کہ اس ریاست سے نکل کر کہیں دور چلی جاؤں گی۔ پھر کبھی وہاں واپس نہیں جاؤں گی لیکن اس ہوس کے درندے کی بھوک ابھی نہیں مٹی تھی۔ اس لئے اس نے مجھ پر بڑا سخت پہرہ بٹھا رکھا تھا۔

میں مجبور رہی اور میرے دن بے بسی سے گزرتے رہے۔ حتیٰ کہ ایک ایسا وقت آیا جب میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہی' جانتے ہو کیا ہوا تھا؟" شازیہ نے امیر حسن کی طرف دیکھا۔

امیر حسن نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا ہوا تھا؟"

"میں ماں بننے والی تھی۔"

امیر حسن کے ہاتھوں میں اسٹیئرنگ ذرا سا بہک گیا۔ کار اِدھر اُدھر ڈگمگائی۔ پھر اس نے گاڑی کو سڑک کے دوسرے کنارے ایک جگہ روکتے ہوئے کہا۔ "کہیں ایک جگہ

رک کر مجھے تمہاری داستان سننی چاہئے ورنہ ڈر ہے کہ ہم کسی حادثے کا شکار ہو جائیں گے۔"

وہ بولی۔ "اس سے بڑا حادثہ کیا ہو گا کہ ایک مجبور لڑکی سہاگن نہ بنے اور ماں بن جائے۔ اس سے بڑا حادثہ تمہارے لئے بھی کیا ہو گا کہ تم نے مجھے کنواری دوشیزہ سمجھ کر محبت کی۔ پتہ نہیں کیسے کیسے سپنے دیکھے۔ آج میں تم پر جو انکشاف کر رہی ہوں وہ تمہارے لئے بھی کسی زبردست حادثے سے کم نہیں ہے۔ آج کے بعد سے تمہارے عشق کا نشہ اترنے لگے گا۔"

وہ ذرا چپ رہا۔ اپنی دو انگلیاں اسٹیئرنگ پر بجاتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔ "ابھی تمہاری کسی بات کا جواب نہیں دوں گا۔ تم نے صاف اور کھری باتیں کی ہیں۔ مجھے اپنی زندگی کا اتنا گہرا راز بتا دیا۔ ورنہ کوئی لڑکی اپنے ماضی کے ایسے سیاہ حالات پر سے پردہ نہیں اٹھاتی۔ چلو آگے بولو۔"

وہ بولنے لگی۔ "ماں بننے کے دوران میرے اندر عجیب سی تبدیلی آنے لگی۔ میرے اندر جو ہستی پرورش پا رہی تھی' اس کے لئے محبت اور ممتا دن بدن بڑھتی گئی اور میں سوچتی رہی کیا میرے ہونے والے بچے کی قسمت بھی میری طرح ہو گی۔ کیا میری اولاد بھی راجہ کے رحم و کرم پر پروان چڑھے گی اور کبھی اپنے باپ کا نام معلوم نہیں کر سکے گی۔

یہ بات میرے لئے تکلیف دہ تھی اور ناقابل برداشت بھی۔ میں نے کئی بار راجہ جی کے پاس پیغام بھیجا کہ میں ان سے ملنا چاہتی ہوں۔ ان دنوں راجہ محمود جہانگیر کو سبھی راجہ جی کہا کرتے تھے۔ میں بھی راجہ جی کہہ کر ہی مخاطب کرتی تھی لیکن اب انہیں مخاطب کئے ہوئے تقریباً چھ ماہ گزر گئے تھے۔ میرے زچگی کے دن قریب آتے جا رہے تھے۔ میں چاہتی تھی کہ زچگی سے پہلے اس بچے کا تصفیہ کروں' اس کے لئے حقوق طلب کروں لیکن مجھے وہاں محل میں جانے کی اجازت نہیں ملتی تھی۔ آخر ایک دن میں ماں بن گئی۔ میں نے ایک بہت ہی خوبصورت سے بیٹے کو جنم دیا۔ اپنے بچے کے لئے دل میں ایسی محبت امڈ رہی تھی کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔ مجھ سے رہا نہ گیا۔ ایک دن میں اپنے بچے کو بازوؤں میں چھپا کر کسی طرح محل میں پہنچ گئی۔ کچھ پہریداروں کو رشوتیں دیں کسی کو اپنے بچے اور اپنی ممتا کا واسطہ دیا۔ جن لوگوں نے مجھے وہاں جانے کی اجازت دی وہ یہ تاکید کرتے گئے کہ میں محل میں ہر جگہ جاؤں لیکن راجہ جی کی خوابگاہ میں نہ جاؤں مگر میں خوابگاہ میں پہنچ گئی۔

اس وقت راجہ جی نشے میں دھت ہو رہے تھے۔ اس خوابگاہ میں میری جگہ کوئی دوسری تھی۔ اسی وقت بچے نے رونا شروع کیا تو وہ ایک دم سے بگڑتے ہوئے خوابگاہ سے باہر نکلے اور غصے سے چیخ کر بولے۔ "یہ کیا بیہودگی ہے۔ بچہ یہاں کیسے آیا تمہیں کس نے آنے کی اجازت دی۔ یہ کس کا بچہ ہے؟"

میں نے کہا۔ "یہ آپ ہی کا ہے۔ آپ اپنے خون کو پہچان سکتے ہیں۔ دیکھئے اس کا چہرہ آپ سے کتنی مشابہت رکھتا ہے۔"

اس نے اچانک ہی ایک زور دار تھپڑ میرے منہ پر رسید کیا۔ میں اس کے لئے تیار نہیں تھی۔ مار کھاتے ہی لڑکھڑاتے ہوئے پیچھے گئی۔ اس نے مجھے گالی دی۔ "کم ذات' پتہ نہیں کہاں کہاں منہ کالا کرتی رہی ہے ناجائز بچے کو پیدا کر کے اسے میرے نام سے منسوب کر رہی ہے۔ میں تجھے کتوں سے نچوا دوں گا۔ اگر اپنی زندگی چاہتی ہے تو چپ چاپ یہاں سے چلی جا۔"

میں نے بڑے عزم سے کہا۔ "نہیں جاؤں گی۔ میں نے آج تک آپ کے سوا کسی دوسرے مرد کا منہ نہیں دیکھا ہے۔ یہ آپ کا بیٹا ہے اسے اپنے سینے سے لگا کر اپنے دل کی دھڑکنوں سے سمجھنے کی کوشش کیجئے شاید آپ کو پتہ چلے کہ خون کی کشش کیا ہوتی ہے۔ میں اپنے بیٹے کا حق مانگنے آئی ہوں۔ اس کے سارے حقوق آپ کو دینے چاہئیں۔ یہ آپ کا ہے۔"

"اچھا' تو تم اس بچے کو میرا وارث بنا کر لائی ہو اور یہ ثابت کرنا چاہتی ہو کہ یہ میرا ہے۔ لاؤ۔ ذرا میں بھی تو دیکھوں کہ یہ میرا بیٹا ہے یا نہیں؟"

وہ نشے میں لڑکھڑاتا ہوا میرے قریب آیا۔ میں سمجھی شاید محبت جوش مار رہی ہے۔ میں نے اپنے بازوؤں کو آگے بڑھایا۔ اپنے بیٹے کو اس کے سامنے کیا۔ تب ہی اس نے میرے بچے کی گردن اپنے ہاتھ میں دبوچ کر ایک جھٹکے سے اوپر اٹھا لیا۔ بچے کے حلق سے آواز بھی نہ نکل سکی۔ وہ ہاتھ پاؤں جھٹک رہا تھا۔ تڑپ رہا تھا۔ میں ایک دم سے تڑپ گئی اور اس ظالم کو گھونسے مارنے لگی۔ اس کے بدن کے کپڑوں کو پھاڑنے لگی۔ "میرے بچے کو چھوڑ دو۔ چھوڑ دو میرے بچے کو۔"

اور وہ دانت پیستے ہوئے اور کبھی ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "سالا میرا وارث بنے گا۔ ایک دن ریاست کا حاکم بننے کے لئے مجھے قتل کرے گا۔ آج اس کا قصہ تمام ہوتا

چاہئے۔"

شازیہ اس کے بعد اپنی داستان نہ سنا سکی۔ یک بیک پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ امیر حسن خاموشی سے سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا۔ کار کے شیشے چڑھے ہوئے تھے۔ اندر گہری خاموشی میں صرف ایک ماں کے رونے کی آواز سنائی دے رہی تھی جو کنواری نظر آتی تھی۔ بن بیاہی دکھائی دیتی تھی۔ جو حسین تھی۔ پُرشباب تھی لیکن حقیقتاً صرف ایک ماں تھی جو اپنے بچے کے لئے اب بھی تڑپ رہی تھی۔

امیر حسن نے اس سے یہ نہیں پوچھا کہ اب اس کا بچہ کہاں ہے۔ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ بچہ ہوتا تو شازیہ اسے اپنے سینے سے لگائے پھرتی۔ اپنے بچے کو کبھی کسی دوسرے کی حفاظت میں نہ چھوڑتی۔ بچہ اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ یہ شازیہ کے آنسو بتا رہے تھے اس کی سسکیاں اس کی آہیں فریاد کر رہی تھیں۔ وہ دونوں اپنی اپنی جگہ خاموش رہے۔ ایک روتی رہی۔ دوسرا سنتا رہا۔

بہت دیر بعد وہ اپنی آہوں اور سسکیوں پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ "میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ وہ کتوں کی موت مرے گا۔"

وہ دانت پیسنے لگی۔ امیر حسن خاموش بیٹھا رہا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ جتنا بولنا چاہتی ہے بولتی رہے' تاکہ اس کے اندر کا غبار نکل جائے۔ پھر وہ بولنے لگی۔ "میرا بچہ اب بھی میری کوکھ مین روتا ہوا لگتا ہے۔ مجھ سے فریاد کرتا ہے۔ میں سوچتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے عورت کیوں بنا دیا۔ اگر میں مرد ہوتی تو اسی طرح اس کی بھی گردن دبوچ لیتی لیکن میرے ہاتھ نازک ہیں۔ میں خود اس سے انتقام نہیں لے سکتی۔ پھر میں سوچتی ہوں کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی ناشکری نہیں کرنی چاہئے۔ یہ بھی شکر کا مقام ہے کہ اس نے مجھے حسن دیا ہے۔ میرے اندر اتنی کشش پیدا کی کہ میرے لئے کوئی بھی جان کی بازی لگا سکتا ہے۔ میری خاطر میرے دشمن کو قتل کر سکتا ہے اور اب میں یہی آزما رہی ہوں۔"

امیر حسن نے گاڑی کو اسٹارٹ کیا۔ پھر اسے واپس موڑ کر گھر کی طرف ڈرائیو کرنے لگا۔ وہ کہنے لگی۔ "اب مجھے پتہ چلا' جنون کسے کہتے ہیں؟ اسے کہتے ہیں کہ کوئی ایک بات دماغ میں ایسے سما جائے کہ اس بات کے سوا کوئی دوسری بات سمجھ میں نہ آئے۔ جیسے میرے دماغ میں انتقام سمایا ہوا ہے۔ میں سوتے جاگتے' کھاتے پیتے اور دوسروں سے باتیں کرتے ہوئے ہمیشہ راجہ جی کو اپنی نگاہوں کے سامنے دیکھتی ہوں۔ اسے خیال ہی خیال

میں قتل کرتی ہوں' غصے اور نفرت سے اس کی بوٹیاں چبانے لگتی ہوں۔ کئی بار میں نے خواب میں بھی یہی دیکھا۔ یہ میرا جنون ہے اور میں جب تک اس سے انتقام نہیں لوں گی۔ میرا یہ جنون ختم نہیں ہو گا۔"

امیر حسن نے کہا۔ "تمہارے ساتھ جو کچھ بھی ہوا وہ ناقابل برداشت ہے ان حالات میں ایک ماں یا تو پاگل ہو جاتی ہے یا مرجاتی ہے یا پھر انتقام کے جنون میں زندہ رہتی ہے۔ میں تمہارے دکھ کو اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔"

اس نے شازیہ کے مکان کے سامنے گاڑی روک دی۔ وہ چار کمروں کا ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ اس کے ایک کمرے میں شازیہ رہتی تھی۔ باقی تین کمروں کو اس نے کلاس روم بنا رکھا تھا۔ جہاں مختلف عمر کے بچے اس کے پاس تعلیم حاصل کرنے آتے تھے۔ اس نے اپنی کوکھ میں جنم لینے والے ایک بچے کو کھو کر دوسرے تمام بچوں کا سہارا لے لیا تھا۔ انہیں پڑھاتی تھی۔ ان سے باتیں کرتی تھی اور ان کی صورتیں دیکھ دیکھ کر کہیں دور گم ہو جاتی۔ اس کے اندر کی ممتا کو کسی قدر سکون ملتا تھا اور جب وہ بچے اپنے اپنے گھر چلے جاتے تھے تو پھر وہی ممتا جنون میں مبتلا ہو جاتی تھی۔ اس کے دماغ میں ایک ہی بات کی رٹ لگی رہتی تھی' اور وہ یہ کہ راجہ جی کی تڑپتی ہوئی لاش اس کی نگاہوں کے سامنے ہو۔

وہ کار کا دروازہ کھول کر اترنے سے پہلے بولی۔ "امیر' ابھی تم نے میری الم ناک داستان سن کر ہمدردی ظاہر کی اور یہ بھی کہا کہ تم میرے دکھ کو اچھی طرح سمجھ رہے ہو۔ میں دنیا کے کسی بھی آدمی کو اپنی یہ داستان سناتی تو وہ بھی یہی کہتا۔ سارے لوگ یہی کہتے۔ سارے لوگ ہمدردی جتاتے۔ مگر مجھے کسی کی ہمدردی نہیں چاہئے۔ میں نے جو کچھ تمہیں سنایا ہے وہ ہمدردی حاصل کرنے کے لئے نہیں بلکہ انتقام لینے کے لئے سنایا ہے اور تم انتقام کے موضوع سے کترا رہے ہو۔ شاید تم ہچکچا رہے ہو۔ میں تمہیں مجبور نہیں کروں گی۔ جب تمہارا دل چاہے کہ مجھے حاصل کرو اور میری شرط پوری کرو تو میرے پاس آجانا ورنہ یہ راستہ بھول جانا۔ خدا حافظ۔"

یہ کہہ کر وہ کار سے باہر نکلی۔ ایک جھٹکے سے دروازے کو بند کیا۔ پھر تیزی سے چلتے ہوئے اپنے مکان کے اندر داخل ہو گئی۔ امیر حسن اسے دیکھتا رہا۔ اس کے گھر کا دروازہ بند ہو چکا تھا۔ اس وقت تک اس کی سمجھ میں یہ نہیں آیا تھا کہ وہ شازیہ کو انتقام کے سلسلے میں کیا جواب دے۔ اس کی داستان نے اسے کئی جگہ سے الجھا دیا تھا۔ پہلا دھماکا تو

یہی تھا کہ وہ کنواری نہیں تھی۔ دوسرا دھماکہ یہ تھا کہ وہ ایک بچے کی ماں بھی تھی۔ کاش کہ وہ اپنی داستان کو اتنی سچائی سے نہ سناتی۔ ذرا جھوٹ بول کر کنواری بنی رہتی۔

وہ سوچ رہا تھا۔ "کتنا اچھا ہوتا کہ میں دھوکہ کھاتا رہتا۔ ساری عمر یہی سمجھتا کہ میں نے ایک دوشیزہ کو حاصل کیا ہے۔ حقیقت ظاہر نہ ہوتی تو کیا فرق پڑ جاتا۔ آہ' دنیا والے ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ سچائی زہر لگتی ہے اور یہ سچائی ابھی مجھے زہر لگ رہی ہے۔ میں کیا فیصلہ کروں کیا ایک بچے کی ماں کے لئے کسی کو قتل کروں۔ یعنی اس کو قتل کروں جو میرا اپنا دشمن نہیں ہے۔"

ایسا سوچتے وقت شازیہ نگاہوں کے سامنے گھومنے لگی۔ اس کا سراپا نظر آ رہا تھا۔ سر سے پاؤں تک وہ ہیرے کی کنی تھی۔ ایسا بے عیب حسن تھا کہ نگاہیں جم جاتی تھیں۔ امیر حسن کا دل اسی پر جما ہوا تھا۔ اس کی زبان سے سن لینے کے بعد بھی یقین کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ ایک بچے کی ماں بن چکی تھی۔

اس نے کار اسٹارٹ کی۔ پھر ڈرائیو کرتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ اس کی کوئی منزل نہیں تھی۔ وہ یونہی ڈرائیو کرتے ہوئے وقت گزارتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچنا چاہتا تھا کہ وہ کیا چاہتا ہے؟ ایک محبت وہ ہوتی ہے جو عورت کے کردار سے ہوتی ہے' عورت کے من' مزاج سے ہوتی ہے۔ دوسری محبت وہ ہوتی ہے جو صرف صورت اور شباب سے ہوتی ہے۔ اگر صورت اور شباب سے محبت تھی تو وہ پرانی ہو چکی تھی۔ اس کے خوابوں کو اور اس کے رومانی خیالوں کو پاش پاش کر رہی تھی اور اگر اس کے حالات سے ہمدردی تھی تو انصافاً یہ بات سمجھ میں آتی تھی کہ جو کچھ ہوا اس میں اس کا قصور نہیں تھا۔ بلکہ اس پر سراسر ظلم ہوتا رہا ہے۔ وہ اوپر سے جتنی حسین ہے' اندر سے بھی اتنی ہی خوبصورت ہے بشرطیکہ انسان اندر کی خوب صورتی کو دیکھ سکے۔

اندر کا حال کون دیکھتا ہے۔ یہ شازیہ کی ذہانت تھی کہ خود کو ایک نایاب کھلونا بنا رکھا تھا اور جو کھلونا حاصل نہ ہو سکے اس کے لئے آدمی ہر عمر میں تڑپتا ہے۔ مچلتا ہے۔ اس کے لئے ضد کرتا ہے۔ جب کوئی راستہ نہیں ملتا تب وہ ہر شرط ماننے پر تیار ہو جاتا ہے۔ شکست تسلیم کر لیتا ہے۔

☆=====☆======☆

امیر حسن نے دو ہی دن میں شکست تسلیم کر لی۔ اس کے پاس آ کر بولا۔ "میں

تمہیں ہر حال میں اپنانا چاہتا ہوں۔ تم میری شریک حیات بنو گی۔ مجھے راجہ جی کے بارے میں بتاؤ۔ ہم دونوں سر جوڑ کر سوچیں گے کہ اس ظالم سے کس طرح انتقام لیا جا سکتا ہے۔"

شازیہ خوش ہو گئی۔ اسے محبت اور احسان مندی سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "تم نے میرا دل جیت لیا ہے۔ یقین کرو۔ آج سے میں صرف تمہاری ہوں اور تمہاری امانت بنی رہوں گی۔ تم جلد سے جلد انتقام لینے کے منصوبے بناؤ۔"

وہ بولا۔ "میں کوئی عادی مجرم نہیں ہوں۔ مجھے بہت سوچ سمجھ کر قتل کا منصوبہ بنانا ہو گا۔ ہر پہلو پر غور کرنا ہو گا۔ کوئی ایسی غلطی نہ ہو جس کی وجہ سے میں قانون کی گرفت مین آ جاؤں۔"

"بیشک تمہیں ہر پہلو سے غور کرنا چاہئے اور میں تمہیں یہ مشورہ ہرگز نہیں دوں گی کہ تم اس سے انتقام لینے کے لئے جام نگر جاؤ۔ وہاں جانا ضروری نہیں ہے۔ وہ اکثر شہر میں رہتا ہے اور گرمیوں کے موسم میں سوئٹزرلینڈ وغیرہ جاتا ہے اور یہ گرمیوں کا موسم ہے ہمیں سب سے پہلے یہ معلومات حاصل کرنی چاہئیں کہ وہ کون سی ائیر کمپنی کے ذریعے یہاں سے جائے گا۔"

"میں ابھی جاتا ہوں اور مختلف ایجنٹوں کے ذریعے ان مسافروں کی فہرست دیکھتا رہوں گا جو اِدھر چند دنوں میں سوئٹزرلینڈ جانے والے ہیں۔"

وہ جانے لگا۔ شازیہ نے آواز دی۔ "سنو۔"

وہ دروازے کے پاس سے پلٹ گیا۔ شازیہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اس کے پاس آئی۔ "تم یہ نہ سوچنا کہ میں خود غرض ہوں اور اپنے مطلب سے تمہارے قریب آ رہی ہوں۔ دیکھو کچھ تو قدرت نے عورت کو کمزور بنایا ہے۔ کچھ مردوں نے عورت کے دماغ میں ایسی باتیں ڈال دی ہیں کہ وہ اپنے آپ کو اور زیادہ نازک سمجھنے لگتی ہیں۔ اگر وہ نازک بن ہی گئی ہیں تو انہیں مضبوط بازوؤں والے مرد کو تلاش کرنا پڑتا ہے۔ اگر میں نے تمہارے بازوؤں کا سہارا لیا ہے تو اس میں کوئی خود غرضی نہیں ہے بلکہ یہ میرا انتخاب ہے اور اس انتخاب پر میں فخر کرتی ہوں۔"

امیر حسن نے اسے مسکرا کر دیکھا۔ دونوں ایک دوسرے کے لئے مسکراتے رہے اور ایک دوسرے کی آنکھوں میں ڈوبتے رہے۔ پھر امیر حسن وہاں سے رخصت ہو گیا۔ شہر

میں کتنے ہی ایئرویز ایجنٹ تھے اس نے ان کے دفتروں سے رابطہ قائم کیا۔ ہر ایک سے معلومات حاصل کیں۔ پتہ چلا کہ اِدھر پندرہ دنوں کے اندر راجہ محمود جہانگیر کے نام سے ریزرویشن نہیں ہوا ہے۔

وہ اپنے گھر واپس آنے کے بعد رات کو تنہائی میں سوچنے لگا۔ اس سے بڑی زبردست بھول ہوئی ہے۔ اس نے خود ہی ایئرویز ایجنٹوں کے پاس پہنچ کر یا ٹیلیفون کے ذریعے رابطہ قائم کر کے محمود جہانگیر کے متعلق معلومات حاصل کی تھیں۔ اب اگر راجہ جی کسی جہاز میں سفر کریں گے اور ملک سے باہر جا کر ان کا قتل ہو گا تو لامحالہ اس پر بھی شبہ کیا جائے گا۔

دوسرے دن اس نے شازیہ کے پاس پہنچ کر کہا۔ ''میں نے تم سے کہا تھا کہ میں کوئی عادی مجرم نہیں ہوں ایک اناڑی ہوں اور اب مجھ سے یہ اناڑی پن سرزد ہوا ہے کہ خود ہی راجہ محمود جہانگیر کے بارے میں معلومات حاصل کرتا پھر رہا ہوں۔ اگر وہ مارا گیا تو مجھ سے بھی جواب طلبی ہو گی۔ پولیس والوں کو مجھ پر شبہ ہو سکتا ہے۔''

شازیہ نے تسلی دی۔ ''تم ناحق پریشان ہوتے ہو۔ تمہارے دل میں ایک دہشت سی ہے۔ ایک گھبراہٹ سی ہے کہ جانے قتل کے بعد کیا ہو گا۔ اسی گھبراہٹ کی وجہ سے تم ایسا سوچتے ہو۔ ورنہ کوئی شبہ کیوں کرے گا؟''

''تم یقین کرو۔ میں شبہے سے بالا تر نہیں رہوں گا۔ پولیس والے بہت چالاک ہوتے ہیں۔ وہ اس نکتے پر ضرور غور کریں گے کہ راجہ جی کے ملک سے باہر جانے کے سلسلے میں کون زیادہ دلچسپی لے رہا تھا۔ یا کون معلومات حاصل کر رہا تھا۔''

شازیہ نے ناراض ہو کر کہا۔ ''تم خوفزدہ ہو۔ خوفزدہ رہو گے تو پھر قتل نہیں کر سکو گے۔ انتقام نہیں لے سکو گے۔ میں تمہارا ہاتھ اس کے خون سے تر دیکھنا چاہتی ہوں۔ اس کی لاش دیکھنا چاہتی ہوں‘ لیکن نہیں۔ تم ابھی سے اس قدر کمزور پڑ گئے ہو کہ میں اپنی خواہشوں کی تکمیل ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔''

''شازیہ مجھے طعنے نہ دو میں کمزور نہیں ہوں۔ بلکہ سوچ سمجھ کر قدم اٹھا رہا ہوں۔ ایسی کوئی غلطی نہیں کرنا چاہتا جس کے نتیجے میں وہ دشمن تو بچ جائے اور ہم دونوں سلاخوں کے پیچھے پہنچ جائیں۔''

''اسی کو ڈر اور بزدلی کہتے ہیں۔ جو لوگ کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ بے باکی سے کر

گزرتے ہیں۔''

''اور جو لوگ بے باکی سے کر گزرتے ہیں وہی قانون کی گرفت میں آ جاتے ہیں۔ شازیہ‘ ایسے مجرموں کی تعداد بہت زیادہ ہے جو جرم کرتے ہیں۔ لوگوں کی جانیں لیتے ہیں وہ ان کی لاشوں پر بڑے بڑے محل تعمیر کرتے ہیں۔ عیش و عشرت کی زندگی گزارتے ہیں لیکن قانون کبھی انہیں گرفت میں نہیں لے سکتا۔ میں بھی اتنی ہی چالاکی سے کام کروں گا کہ قانون میرے قریب بھی نہ پھٹک سکے گا۔''

''یہ خوش فہمی ہے۔ اگر تمہاری اسی احتیاط کے دوران بے احتیاطی ہو جائے تو کیا تمہیں پتہ چلے گا؟ کیا قانون تمہیں گرفت میں نہیں لے گا؟ تم یہ سمجھ لو کہ یہ اپنے آپ کو داؤ پر لگا کر مجھے حاصل کرنے والی بات ہے۔''

''میں جانتا ہوں‘ میں اپنی زندگی کو اپنی عزت کو‘ اپنی شہرت کو داؤ پر لگا کر تمہیں اپنانا چاہتا ہوں لیکن اس قدر سوچ سمجھ کر قدم اٹھاؤں گا کہ کسی وجہ سے اگر قانون کی گرفت میں آیا تو میرے خلاف سزا سناتے وقت قانون کو بھی پسینہ آ جائے گا۔''

''یہ ہوئی مردوں جیسی بات۔'' وہ خوش ہو گئی اور خوش ہو کر اسے بھی خوش کرنے لگی۔ امیر حسن تو اس کا پہلے ہی دیوانہ تھا۔ اس کی دیوانگی اب اور بڑھتی جا رہی تھی لیکن اس سے دور ہونے کے بعد اسے یوں محسوس ہوتا جیسا اپنے دماغ کے پیچھے ایک اور دماغ ہے اور وہ دماغ اسے آنے والے خطرات سے آگاہ کر رہا ہے۔ اسے سمجھا رہا ہے کہ شازیہ کے پاس وہ جو کچھ پاتا ہے اس سے زیادہ وہ کھونے والا ہے اپنی زندگی‘ اپنی عزت‘ اپنا سب کچھ سلاخوں کے پیچھے۔

وہ شازیہ سے دور ہونے کے بعد دماغی طور پر الجھا رہتا تھا۔ ڈیوٹی کے دوران اکثر اس کا دماغ غیر حاضر رہتا تھا۔ ڈیوٹی نہ ہو تو وہ کار میں بیٹھ کر سڑکوں پر آوارہ گردی کرتا تھا اکثر اس کوٹھی کی طرف سے گزرتا تھا جہاں راجہ محمود جہانگیر کا قیام ہوا کرتا تھا۔ ایک موہوم سی امید تھی کہ ادھر کا چکر لگاتے رہنے سے شاید کوئی کام کی بات معلوم ہو سکے۔

دو دن کے بعد ہی جب وہ اس کوٹھی کے سامنے پہنچا تو اس نے شہر کے بہت ہی مشہور اور مہنگے ڈاکٹر کو دیکھا جو کوٹھی سے نکل کر اپنی کار میں بیٹھ رہا تھا۔ اس نے سوچا یقیناً محمود جہانگیر بیمار ہو گا۔ ورنہ اتنا مہنگا ڈاکٹر نہ آتا۔ وہ پھر اس سوچ میں پڑ گیا کہ وہ کس حد تک بیمار ہے؟ کہیں اس حد تک بیمار نہ ہو کہ موت اسے آ کر دبوچ لے اور شازیہ کے دل میں

انتقام کی آگ بھڑکتی ہی رہ جائے۔ وہ راجہ محمود جہانگیر کی طبعی موت سے مطمئن نہیں ہو گی۔ وہ اسے قتل کرنا چاہتی ہے۔ اسے تڑپا تڑپا کر مارنا چاہتی تھی اور اس کی خون آلود لاش کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتی تھی۔

جب ڈاکٹر کی گاڑی ذرا آگے نکل گئی تو اس نے بھی اپنی گاڑی آگے بڑھائی اور اس کا تعاقب کرتا ہوا اس کے کلینک تک پہنچ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ڈاکٹر کے کلینک میں موجود تھا۔ ڈاکٹر نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

"ہیلو مسٹر' مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں پہلے بھی آپ کو دیکھ چکا ہوں۔"

اس نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "جی ہاں' آپ ڈاکٹر ایک بار ہماری فلائٹ میں لندن گئے تھے۔ میں اس فلائٹ کا اسٹیورڈ تھا اور آج بھی اسٹیورڈ ہوں۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "کمال ہے۔ ہم دوبارہ ایسے وقت مل رہے ہیں جب میں پھر ایک بار لندن تک سفر کرنے والا ہوں لیکن اس بار راجہ محمود جہانگیر کے ساتھ۔"

امیر حسن نے چونک کر پوچھا۔ "راجہ صاحب کے ساتھ آپ لندن جا رہے ہیں کیا بات ہے۔ خیریت تو ہے؟"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "ڈاکٹر کسی کے ساتھ نظر آئے تو سمجھو اس بے چارے کی خیریت نہیں ہے۔ راجہ صاحب کو بہت بری بیماری لگی ہوئی ہے۔ میں انہیں لندن لے جا رہا ہوں۔ حالانکہ میرے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا لیکن وہ میرے لئے لاکھوں روپے خرچ کر رہا ہے۔ مجھے میری مصروفیات سے الگ کر کے زبردستی اپنے ساتھ لے جا رہا ہے۔"

امیر حسن نے دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔ "آپ کس ایئرویز سے جائیں گے؟"

"ہم اپنے ہی ملک کے جہاز میں سفر کریں گے۔"

امیر حسن نے تعجب سے کہا۔ "یہ راجے' مہاراجے اور بڑے بڑے سرمایہ دار تو غیر ملکی جہازوں میں سفر کرنا پسند کرتے ہیں۔ ہمارے ملک کی جہاز کمپنی بہت غریب ہے۔ اتنی آسائشیں مہیا نہیں کرتی پھر یہ کہ انہیں شراب پینے کی اجازت بھی نہیں دیتی۔"

ڈاکٹر نے سر ہلا کر کہا۔ "یہی وجہ ہے کہ میں راجہ محمود جہانگیر کو اپنے ملک کے طیارے میں لے جاؤں گا تاکہ انہیں شراب پینے کی اجازت نہ ملے۔ شراب نے تو انہیں ڈبو دیا ہے۔ میں ان کی نگرانی کرتا ہوا جاؤں گا۔ انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ شراب کو ہاتھ نہیں لگائیں گے۔ پھر بھی میں احتیاطاً انہیں اپنے ملک کے طیارے میں لے جاؤں

گا۔"

امیر حسن نے خوش ہو کر کہا۔ "پندرہ تاریخ کی فلائٹ میں میری ڈیوٹی ہے۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "ہم بھی پندرہ تاریخ کی فلائٹ سے ہی جا رہے ہیں۔ بائی دی وے اس وقت تم کس لئے آئے ہو؟"

وہ ذرا ہچکچایا پھر جلدی سے بات بناتے ہوئے بولا۔ "دراصل میری ایک کزن میرے ساتھ پندرہ تاریخ کی فلائٹ سے لندن جانا چاہتی ہیں لیکن ان کے لئے اتنا ارجنٹ ٹکٹ نہیں ملے گا۔ ریزرویشن پہلے سے ہو جاتا ہے۔ چند سیٹیں اس لئے چھوڑ دی جاتی ہیں کہ کسی بہت ہی ضروری مسافر کو وہ سیٹ دی جا سکے۔ کیا آپ اس سلسلے میں میری مدد کر سکتے ہیں۔"

ڈاکٹر نے انجان بن کر پوچھا۔ "میں بھلا کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "ڈاکٹر صاحب آپ سب جانتے ہیں آپ کے پاس ایسے لوگ تو آتے ہوں گے جو جعلی سرٹیفکیٹ حاصل کرتے ہیں۔ میری وہ کزن مجھے بہت عزیز ہے اور میں لندن اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ بس آپ کی مہربانی ہو گی اور آپ ایک بیماری کا سرٹیفکیٹ اسے عنایت کر دیں گے تو صحت یابی کی غرض سے مجھے ایک سیٹ اس فلائٹ میں ضرور مل جائے گی۔"

"تم مجھے ایسا کام کرنے کے لئے کہہ رہے ہو جو میں نے کبھی نہیں کیا۔"

"آپ دولت کمانے کے لالچ میں ایسا کبھی نہیں کرتے لیکن کسی کے کام آنے کے لئے تو کر سکتے ہیں۔ دیکھئے ڈاکٹر صاحب ہو سکتا ہے کہ سفر کے دوران میں بھی آپ کے کسی کام آ جاؤں۔"

ڈاکٹر نے اسے غور سے دیکھا پھر تائید میں سر ہلا کر بولا۔ "ہاں میرے ساتھ ایک مریض ہو گا سفر کے دوران شاید آپ کی مجھے ضرورت پڑے۔ ویسے بھی دانشوروں نے کہا ہے کہ حجام سے اور ناخدا سے دشمنی نہ کرو۔ حجام سے اس لئے کہ اس کا استرا ہمیشہ تمہاری گردن کے قریب ہوتا ہے اور ناخدا سے اس لئے کہ چپو اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ کشتی اس کے اشارے پر چلتی ہے للٰذا میں دوستانہ انداز میں تمہاری کزن کے لئے ایک سرٹیفکیٹ لکھ دیتا ہوں جس کی رو سے اسے لندن جا کر علاج کرانا ضروری قرار دیا جا سکتا ہے۔"

امیر حسن نے اس کا بہت بہت شکریہ ادا کیا پھر اس سے وہ سفارشی خط لے کر وہاں سے سیدھا اپنے دفتر گیا۔ ایئر کمپنی کے ملازم یوں بھی ہیرا پھیری کر کے اپنے لئے جہاز میں ایک آدھ سیٹ مخصوص کروا لیتے ہیں لیکن بعض حالات میں ایسا نہیں ہوتا۔ اسی لئے امیر حسن نے احتیاطاً ڈاکٹر سے وہ خط لے لیا تھا۔

بہرحال بکنگ کاؤنٹر پر شازیہ کے نام ایک سیٹ لکھ دی گئی لیکن اس کا ٹکٹ حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ شازیہ کے پاسپورٹ نمبر کا حوالہ دیا جاتا۔ لہٰذا وہ شازیہ کے پاس پہنچا۔ اسے یہ خوشخبری سنائی کہ دشمن ملک سے باہر جا رہا ہے اور جس فلائٹ سے باہر جا رہا ہے اسی فلائٹ میں امیر حسن کی ڈیوٹی بھی ہے اور شازیہ کی سیٹ ریزرو کرائی جا رہی ہے۔ صرف پاسپورٹ کا نمبر حوالے کے لئے دینا ضروری ہے۔ یہ سن کر شازیہ نے کہا کہ اس کے پاس پاسپورٹ تو ہے لیکن وہ بین الاقوامی پاسپورٹ نہیں ہے۔"

"اگر تمہارا بین الاقوامی پاسپورٹ دو دن کے اندر تیار نہ ہوا اور تم نہ جا سکیں تو پھر اپنے دشمن کی لاش کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکو گی۔ میرا کام اسے ختم کرنا ہے۔ میں ختم کر کے آجاؤں گا لیکن تم؟"

وہ بولی۔ "میں دو دن کے اندر ضرور وہ پاسپورٹ حاصل کروں گی۔ تم اس سلسلے میں بہت کچھ کر سکتے ہو۔ پاسپورٹ بنانے والے ایجنٹوں کو پکڑو۔ انہیں منہ مانگی رقم دو اور میرا پاسپورٹ تیار کروا دو۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔"

امیر حسن کو یہ بھی کرنا پڑا۔ کوئی بھی بڑے سے بڑا کام ہو، سب پیسوں سے ہو جاتا ہے۔ جہاں رقم خرچ کرو۔ کوئی بات ناممکن نہیں رہتی لیکن رقم خرچ کرنے کے باوجود امیر حسن کو بڑے پاپڑ بیلنے پڑے۔ اس نے سوچا۔ پتہ نہیں فرہاد نے شیریں کے لئے کس طرح دودھ کی نہر نکالی ہو گی۔ یہاں تو دودھ کی نہر نکالنے سے زیادہ مشکل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

آخر وہ پاسپورٹ بن گیا اور پندرہ تاریخ بھی آگئی۔ دوپہر کے وقت اس فلائٹ کو وہاں سے روانہ ہونا تھا۔ اس سے پہلے ہی صبح یہ معلوم ہوا کہ ایک غیر ملکی طیارہ جو ہانگ کانگ سے انگلینڈ کی طرف جا رہا تھا۔ اس میں اچانک کچھ خرابی پیدا ہو گئی ہے۔ اس کے تمام مسافر اتار لئے گئے تھے۔ اب ان مسافروں کو اسی طیارے سے روانہ کرنے کے انتظامات کئے جا رہے تھے۔ جس طیارے میں شازیہ اپنے دشمن کے ساتھ سفر کرنے والی تھی۔

غیر ملکی طیارے کے تمام مسافروں کو اس ملکی طیارے میں جگہ نہیں مل سکتی تھی لیکن وی' آئی' پی مسافروں کے لئے اسپیشل کلاس میں جگہ نکالی گئی۔ دنیا کی نہایت ہی اہم شخصیتیں اس طیارے سے پرواز کرنے والی تھیں۔ ان میں ایک بہت بڑے ملک کا وزیر خارجہ تھا۔ ایک دوسرے ملک کی فوج کا کمانڈر انچیف تھا۔ ایک اور بڑے ملک کی دو شخصیتیں تھیں۔ ایک سائنس دان تھا۔ جو ان دنوں ایک نئی قسم کا سیارہ خلا میں چھوڑنے کے امکانات پر کام کر رہا تھا۔ ایسی اہم شخصیتوں کے باعث اس ملکی طیارے کی پرواز بہت اہم ہو گئی تھی۔

طیارے نے ٹھیک چار بج کر پانچ منٹ پر پرواز شروع کی۔ جب وہ فضا میں کچھ بلندی پر پہنچا تو جہاز کے کپتان کی آواز سپیکر کے ذریعے سنائی دی۔ "معزز مسافروں کو سلام عرض کرتا ہوں۔ میں جہاز کا کپتان خالد احمد آپ سے مخاطب ہوں۔ ہمارا ملک ایک غریب ملک ہے۔ ہماری آزادی کو تھوڑا عرصہ ہوا ہے اس طرح ہم دنیا کے نقشے میں ابھی نوزائیدہ ہیں۔ ہماری جہاز کمپنی بھی اس قابل نہیں ہے کہ معزز مسافروں کو خصوصاً اس دنیا کی اہم شخصیتوں کو ان کے شایان شان آرام و آسائش پہنچا سکیں۔ پھر بھی ہم انتہائی کوشش کریں گے کہ انہیں کسی کمی کا احساس نہ ہو اور ہماری ذات سے انہیں کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ اگر کوئی شکایت ہو تو ہمیں فوراً اطلاع دی جائے۔ ہم شکایات کو دور کرنے کی کوششیں کریں گے۔ یہاں چار ایئر ہوسٹس اور دو اسٹیورڈ آپ کی خدمات کے لئے حاضر ہو رہے ہیں۔ شکریہ۔"

چاروں ایئر ہوسٹس مسافروں کی خدمات کے لئے حاضر ہو گئی تھیں۔ ان کے ساتھ امیر حسن بھی موجود تھا۔ وہ لوگ ہر مسافر سے ان کی ضروریات دریافت کر رہے تھے۔ امیر حسن شازیہ کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ شازیہ بھی جواباً مسکرائی۔ پھر راجہ محمود جہانگیر کی طرف دیکھنے لگی۔ اتفاق سے شازیہ اور راجہ جی کو ایسی سیٹیں ملی تھیں کہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ تھے لیکن ان کے درمیان سے ایک راستہ گزرتا تھا۔ یعنی ایک قطار کے کنارے والی سیٹ پر شازیہ تھی اور دوسری قطار کے کنارے والی سیٹ پر راجہ جی بیٹھا ہوا ڈاکٹر سے باتیں کر رہا تھا اور کبھی کبھی کن اکھیوں سے شازیہ کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ اس نے جہاز میں سوار ہونے کے چند منٹ بعد ہی شازیہ کو اپنے قریب محسوس کیا تھا اور تب سے جانے کیوں رہ رہ کر اسے دیکھنے لگتا تھا۔ یوں جیسے خطرہ محسوس کر رہا ہو۔

ایک ظالم شخص بظاہر سنگدل ہوتا ہے لیکن اندر ہی اندر وہ اپنے ظلم کے باعث ڈرتا بھی ہے کہ جانے کب کوئی مظلوم اسے نقصان پہنچا دے۔ اس نے شازیہ پر جو ظلم کئے تھے وہ اسے یاد تھے اور یہ بات وہ جانتا تھا کہ ایک معمولی چیونٹی بھی پاؤں کے نیچے دب کر کاٹتی ضرور ہے' اگر اسے پاؤں تلے مسل دیا جائے تو پھر اس کے کاٹنے کا اندیشہ نہیں رہتا۔ راجہ جی سے یہی بھول ہوئی تھی کہ اس نے اسے مسلا نہیں تھا چھوڑ دیا تھا۔

☆======☆======☆

امیر حسن ان کے درمیان آ کر کھڑا ہو گیا۔ کیونکہ گزرنے کے لئے ان کے درمیان وہی ایک راستہ تھا۔ اس نے جھک کر پہلے شازیہ کو مخاطب کیا۔ "ہیلو مس کیا آپ کچھ پینا پسند کریں گی؟"

شازیہ نے تلخی سے مسکرا کر راجہ جی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہاں' میں خون پینا چاہتی ہوں۔ کیا اس جہاز میں دستیاب ہو سکتا ہے؟"

امیر حسن نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ہم ایسی چیزیں یہاں نہیں رکھتے ویسے آپ کی خواہش نے شدت اختیار کی تو ہم سنجیدگی سے سوچیں گے کہ کس کا خون آپ کے لئے مناسب ہو سکتا ہے۔"

پھر اس نے راجہ جی کی طرف پلٹ کر پوچھا۔ "اور جناب' آپ کیا پسند کریں گے؟"

"میں جو پینا چاہتا ہوں وہ اس جہاز میں دستیاب نہیں ہے۔ تمہارے ہاں شراب منع ہے۔"

"جی ہاں' اس کے لئے سخت ممانعت ہے۔ ہم کسی مسافر کو شراب پینے کی اجازت نہیں دیتے۔"

راجہ جی نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "آگے وی' آئی' پی کلاس میں جو اہم شخصیتیں ہیں۔ کیا ان کے لئے بھی شراب مہیا نہیں کی جائے گی۔"

"جی نہیں' بالکل نہیں۔"

"میں ریاست جام نگر کا راجہ ہوں۔ میں بھی اہم شخص ہوں۔ میں ہمیشہ وی' آئی' پی کلاس میں سفر کرتا ہوں۔ اس بار بھی میں نے وہیں ایک سیٹ ریزرو کروائی تھی لیکن مجھے یہاں بھیج دیا گیا۔ یہ سراسر ناانصافی ہے۔"

امیر حسن نے کہا۔ "ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ وہ اہم شخصیتیں ہمارے لئے بھی بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ آپ ٹھہرے جام نگر کے راجہ' اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ریاستیں ختم ہو رہی ہیں۔ آپ کا دور بھی اب ختم ہو چلا ہے۔"

شازیہ نے آگے کی طرف جھک کر کہا۔ "ہو سکتا ہے زندگی ہی ختم ہو چلی ہو۔"

راجہ جی نے گھور کر کہا۔ "تم بہت اسمارٹ بننے کی کوشش کر رہی ہو۔ یہ نہ بھولو کہ تمہاری حیثیت میرے سامنے کیا ہے۔ میں اب بھی تمہیں کچل کر رکھ دوں گا۔"

امیر حسن نے بڑے ادب سے کہا۔ "نہیں جناب' آپ عورتوں سے ذرا مہذب انداز میں گفتگو کریں۔ یہ طیارہ ہے اور ہم آپ لوگوں کے خادم ہیں۔ اس لئے آپ لوگوں کو سمجھانا اور آداب سکھانا ہمارا فرض ہے۔"

راجہ جی کے پاس والی سیٹ پر ڈاکٹر کھڑکی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

امیر حسن نے جلدی سے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب کوئی خاص بات نہیں ہے۔ ان سے ملئے یہ مس شازیہ میری کزن ہیں۔ ان کا تعارف تو میں غائبانہ کرا چکا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ مس شازیہ اور راجہ جی کی پرانی جان پہچان ہے اور کچھ بے تکلفی بھی ہے۔ اس لئے ان کے درمیان نوک جھوک چل رہی ہے۔"

ڈاکٹر نے ذرا جھک کر اخلاقاً مسکراتے ہوئے شازیہ کو دیکھا' شازیہ بھی جواباً مسکرائی۔ راجہ جی نے ناگواری سے کہا۔ "مسٹر اسٹیورڈ تم ضرورت سے زیادہ نہ بولو۔ کوئی معمولی حیثیت کی عورت مجھ سے بے تکلف نہیں ہو سکتی اور نہ ہی میں اسے لفٹ دے سکتا ہوں۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "راجہ صاحب' اگر آپ سے مس شازیہ کی بے تکلفی نہیں ہے تو کوئی بات نہیں۔ آپ خوش اخلاقی سے مسکرا دیجئے۔ میں نے آپ کو سمجھایا ہے کہ آپ کے لئے ہمیشہ ہنسنا بولنا زیادہ مفید رہے گا۔ کیونکہ خوش اخلاقی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ ایسی چیزیں ہیں کہ یہ بڑی حد تک دوا کا کام کرتی ہیں۔"

امیر حسن ان کے آرڈر نوٹ کر کے وہاں سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد ڈاکٹر نے آہستگی سے کہا۔ "راجہ صاحب' معلوم تو یہی ہوتا ہے کہ آپ مس شازیہ کو پہلے سے جانتے ہیں۔"

اس نے ناگواری سے منہ بنا کر کہا۔ "آپ جس عورت کو مس کہتے ہیں۔ یہ فاحشہ ہے۔ بدکار عورت ہے میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ پہلے یہ میرے محل میں ایک معمولی ملازمہ تھی۔ میں نے اسے وہاں سے نکال دیا تھا۔ کیونکہ میں بدکار عورتوں کو پسند نہیں کرتا۔"

ڈاکٹر نے بڑی آہستگی سے سنتے ہوئے کہا۔ "کمال ہے آپ دائی سے پیٹ چھپا رہے ہیں۔ کیا میں نہیں جانتا کہ آپ بدکار عورتوں کو پسند کرتے ہیں۔"

اس نے پہلی بار مسکراتے ہوئے کہا۔ "جی ہاں' آپ تو دیکھ ہی رہے ہیں کہ یہ کمبخت کتنی حسین ہے۔ اس نے مجھے پھنسایا تھا اور میں اس کے دام میں آگیا تھا۔ بس ایک غلطی کر بیٹھا کہ ایک کم حیثیت عورت کو اپنے برابر جگہ دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ پھر مجھ سے بے تکلف ہونا چاہتی ہے۔"

ڈاکٹر نے شازیہ کی طرف دیکھ کر ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "بیشک اس نے غضب کا حسن پایا ہے۔ مجھ جیسے بوڑھے اسے دیکھ کر دوبارہ جوانی کی دعا مانگتے ہوں گے۔ تعجب ہے کہ آپ نے اسے پا کر کھو دیا۔"

وہ بڑے غرور سے بولا۔ "جو ایک کو کھو کر ہزاروں کو پا لیتے ہیں وہ ایک نقصان کی پرواہ کبھی نہیں کرتے۔"

شازیہ کن اکھیوں سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے ڈاکٹر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب معلوم ہوتا ہے کہ میرے متعلق گفتگو ہو رہی ہے۔"

راجہ جی نے نفرت سے کہا۔ "تمہیں اپنے بارے میں بڑی خوش فہمی ہے۔"

وہ بڑے فخر سے بولی۔ "جس کے قدموں میں ایک ریاست کا راجہ جھکا ہو۔ کیا اسے خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہنا چاہئے۔"

"اور جسے راجہ نے ٹھوکر مار دی ہو تو؟"

"تو اس راجہ کو اپنی کم ظرفی پر شرم سے مرجانا چاہئے۔"

ڈاکٹر نے پریشان ہو کر کہا۔ "بھئی آپ دونوں تو آگ اور پانی ہو رہے ہیں۔ ایک جگہ نہیں رہ سکتے۔ راجہ صاحب آپ میری سیٹ پر آ جائیں۔ میں آپ کی سیٹ پر چلا جاتا ہوں۔"

راجہ جی نے غصے سے سر جھٹک کر کہا۔ "کیا میں ایک عورت سے شکست کھا کر اپنی

جگہ بدل دوں۔ میں ایسے لوگوں میں سے نہیں ہوں۔ میں اس عورت کی زبان بند کر کے رہوں گا۔"

وہ طنزیہ انداز میں بولی۔ "یہ تمہارا راج محل نہیں ہے کہ جب چاہو میری زبان بند کر دو۔ یہ ہوائی جہاز کا سفر ہے۔ مجھ جیسی کم حیثیت عورت بھی تمہارے ساتھ بیٹھی ہوئی ہے۔ اگر ہمت ہے تو مجھے یہاں سے اٹھا دو۔"

ڈاکٹر نے بے چینی سے اپنی سیٹ پر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں آپ دونوں کو کس طرح خاموش رہنے کے لئے کہوں۔"

اسی وقت امیر حسن ایک ٹرے لے کر وہاں پہنچ گیا۔ اس نے کہا۔ "میں بتاتا ہوں یہ کس طرح خاموش رہ سکتے ہیں۔ اس طرح کہ راجہ صاحب اپنے آرڈر کے مطابق جوس پئیں اور شازیہ یہ لو۔ تمہارے لئے کافی حاضر ہے۔"

شازیہ نے کافی کی پیالی اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے پوچھا۔ "امیر حسن کیا تم بتا سکتے ہو کہ جہاز اس وقت کتنی بلندی پر پرواز کر رہا ہے؟"

امیر حسن نے سر ہلا کر کہا۔ "تقریباً تیس ہزار فٹ کی بلندی پر ہے۔"

وہ بولی۔ "اگر اس جہاز کو دور سے دیکھا جائے تو یہ کیسا لگے گا۔ ایسا کہ نہ زمین پر ہے نہ آسمان پر بیچ میں معلق ہے۔ کیوں ایسا ہی نا؟"

"ہاں' ایسا تو نظر ہی آتا ہے۔"

"میرا بچہ بھی ایسا ہی تھا۔ نہ زمین پر تھا نہ آسمان پر تھا۔ ایک ظالم نے اس کی گردن پکڑی ہوئی تھی اور وہ ہوا میں معلق تھا۔ آج وہ ظالم بھی نہ زمین پر ہے نہ آسمان پر ہے اور پتہ نہیں اگلی چند گھڑیوں میں اس کی بدنصیبی اس کے متعلق کیا فیصلہ سنانے والی ہے۔"

راجہ محمود جہانگیر اپنی سیٹ پر بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ اس قدر غصے میں تھا کہ اس سے کچھ بولا نہیں جا رہا تھا۔ امیر حسن نے پریشان ہو کر شازیہ کو دیکھا۔ پھر اس کے ہاتھ سے کافی کی پیالی واپس لے کر ٹرے پر رکھتے ہوئے آہستگی سے جھک کر بولا۔

"شازیہ فوراً اسٹیورڈ روم کی طرف آؤ۔ میں بہت ضروری بات کہنا چاہتا ہوں۔"

یہ کہتے ہی وہ سیدھا اس طرف گیا جہاں مسافروں کے لئے باتھ روم' اسٹیورڈ روم وغیرہ بنے ہوئے تھے۔ شازیہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پیچھے چلی آئی تھی' اسٹیورڈ روم کے سامنے پہنچ کر وہ پلٹ گیا۔ پھر اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ "یہ تم کیا حماقت کر رہی ہو۔ رہ

رہ کر راجہ جی کو چھیڑ رہی ہو اور ایسی باتیں کر رہی ہو جسے سن کر دشمن ہوشیار ہو سکتا ہے۔"

وہ بولی۔ "وہ اتنا چالاک نہیں ہے کہ میری باتوں کی تہہ تک پہنچ جائے۔"

"وہ چالاک ہو یا نہ ہو۔ ڈاکٹر تمہاری باتیں سن رہا ہے۔ اگر اسے قتل کیا گیا تو بعد میں تمہاری باتوں کی روشنی میں بہت کچھ سوچا جا سکتا ہے۔ کیا تم یہ باتیں نہیں سمجھ سکتی ہو؟"

وہ تھوڑی دیر چپ رہی پھر پریشان ہو کر بولی۔ "امیر حسن میں کیا کروں؟ میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اس راجہ کے بچے کو دیکھتے ہی میں بے قابو ہو جاتی ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ اس کا منہ نوچ لوں۔ اس کی بوٹیاں کاٹ کاٹ کر چبا جاؤں لیکن میں صبر کرتی ہوں اور صرف زبان کو استعمال کرتی ہوں۔"

"پلیز' اپنی زبان اپنے قابو میں رکھو۔ اگر اب تم نے راجہ جی کو چھیڑا یا کوئی ایسی بات کی جس سے ہماری پلاننگ میں رکاوٹ پیدا ہو تو میں ابھی سے تمہیں کہہ دیتا ہوں کہ قتل کی ذمہ داری نہیں لوں گا۔"

وہ نرم پڑ گئی۔ پھر بولی۔ "اچھی بات ہے میں کوشش کروں گی اور اب اس کی طرف رخ بھی نہیں کروں گی۔ میری کافی مجھے دو۔"

"تم اپنی سیٹ پر جاؤ' میں کافی پہنچا دوں گا۔"

وہ اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئی۔ اس نے راجہ جی کی طرف نہیں دیکھا۔ اپنے پاس بیٹھی ہوئی معمر عورت سے گفتگو کرنے لگی۔ امیر حسن نے کافی کی پیالی اسے لا کر دے دی۔ پھر راجہ جی کی طرف مسکرا کر دیکھا اور آگے بڑھ گیا۔

راجہ جی نے امیر حسن کو غور سے جاتے ہوئے دیکھا پھر آہستگی سے کہا۔ "ڈاکٹر پتہ نہیں اس اسٹیورڈ نے شازیہ کو کیا سمجھا دیا ہے اب دیکھئے وہ کس طرح خاموش بیٹھی ہے۔ ادھر دیکھ نہیں رہی ہے۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "چلئے اسٹیورڈ نے جو کچھ بھی سمجھایا ہو ہمارے بھلے کے لئے سمجھایا ہے۔ اچھا ہے کہ اب وہ نہ ادھر دیکھے گی نہ کچھ بولے گی۔"

وہ پریشان ہو کر بولا۔ "ڈاکٹر مجھے یوں لگتا ہے جیسے یہ عورت میری جان کی دشمن بن کر میرا پیچھا کر رہی ہو۔"

ڈاکٹر نے بیزار ہو کر کہا۔ "راجہ صاحب آپ کو تو کسی کل چین نہیں ہے۔ پہلے وہ بول رہی تھی' چھیڑ رہی تھی تو آپ غصہ کھا رہے تھے۔ اب وہ خاموش ہے تو بھی اسے دشمن سمجھ رہے ہیں۔ آخر وہ آپ کی جان کی دشمن کیوں بنے گی؟ کیا اس لئے کہ کبھی آپ نے اس کو کھیل سمجھ کر کھیلا تھا؟"

"ہاں' یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ عورت اپنے اس واقعہ کو کبھی نہیں بھولتی کہ کس نے اسے سب سے پہلے تباہ کیا تھا۔"

"شکر ہے کہ آپ بے اختیار اس بات کا اعتراف کر رہے ہیں کہ آپ نے اسے تباہ کیا ہے۔"

وہ ایک دم سنبھل کر بولا۔ "نہیں' میرا مقصد یہ نہیں تھا۔ عورت کی زندگی میں جب پہلی بار کوئی مرد آتا ہے اور اسے چھوڑ کر چلا جاتا ہے تو وہ اسے اپنی تباہی سمجھتی ہے۔"

ڈاکٹر نے سر ہلا کر کہا۔ "میں کب انکار کر رہا ہوں۔ خواہ تباہی کسی صورت میں ہو۔ مگر تباہی تو ہوتی ہے نا؟"

"جو کچھ بھی ہو ڈاکٹر' مجھے اس عورت سے ہوشیار رہنا چاہئے۔"

"آخر آپ کو خطرہ کس بات کا ہے۔ کیا یہ آپ کی جان لے لے گی؟ اور اگر لینا چاہے گی تو کیا اتنے سارے لوگ اندھے' بہرے ہیں کہ اس کا کوئی نوٹس نہیں لیں گے؟"

"آپ اس کی چالاکی نہیں سمجھ سکتے۔ دیکھئے نا کہ اس نے کس طرح اسٹیورڈ کو اپنا دیوانہ بنا رکھا ہے۔ اس کے ذریعے یہ میرے کھانے پینے کی چیز میں زہر ملا سکتی ہے۔"

"راجہ صاحب' بیماری نے آپ کو کچھ چڑچڑا بنا دیا ہے اور اس قابل نہیں رکھا کہ آپ کسی بھی بات کو مثبت انداز میں سوچ سکیں۔ آپ نے ماضی میں جو کھیل کھیلا' اب اس سے خوفزدہ ہیں اور اپنی سزا آپ ہی تجویز کر رہے ہیں۔ کوئی آپ کو ہلاک کرے یا نہ کرے مگر آپ تصور میں یہی دیکھتے ہیں۔"

"ہاں' میں تصور میں دیکھتا ہوں اور دشمنوں کو اچھی طرح پہچانتا ہوں۔"

"چلئے' آپ کو اگر اتنا ہی خطرہ محسوس ہو رہا ہے تو آپ کے کھانے پینے کی جو بھی چیز آئے گی۔ پہلے میں اسے چکھ لیا کروں گا۔ اس کے بعد آپ کھایا کریں گے۔ بس ٹھیک ہے نا؟"

"تھینک یو ڈاکٹر' آپ ہی میری حفاظت کر سکتے ہیں۔"

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "ہم ڈاکٹر لوگ مریض اور موت کے درمیان ڈھال بنے رہتے ہیں۔ آپ اطمینان رکھیں۔"

اس کے بعد وہ لوگ خاموش ہو گئے۔ شازیہ بھی اپنی جگہ خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ وقت گزر رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ بے اختیار کن اکھیوں سے راجہ جی کی طرف دیکھ لیتی تھی اور ایسے میں بھی اپنی طرف دیکھتے ہوئے پاکر نفرت سے منہ پھیر لیتی تھی۔ اس کی نفرت کا یہ انداز راجہ جی کو غصے میں مبتلا کر دیتا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ "شراب اور شباب ہمیشہ آپ کی کمزوری رہی ہے۔ شراب نے آپ کو اندر سے کھوکھلا کر دیا ہے اور میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ جو سامنے شباب ہے' وہ بھی آپ کو ڈبو رہا ہے۔ اسے دیکھ کر آپ غصے سے بھر جاتے ہیں۔"

وہ بولا۔ "مجھے شازیہ سے شدید نفرت ہے۔ میرا بس چلے تو میں اس کا گلا گھونٹ دوں۔"

"راجہ جی' ایک بات بتائیے۔ اب تک پتہ نہیں کتنی عورتیں آپ کے پاس آئیں اور گئیں۔ کیا شازیہ کے علاوہ کسی اور نے بھی اسی طرح آپ کو چھیڑا ہے یا کسی نے کسی طرح اپنے حقوق کا مطالبہ کیا ہے؟"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں' کس کی مجال ہے کہ کوئی آکر مجھے چھیڑے یا اپنے حقوق کا مطالبہ کرے۔ میں انہیں اتنی رقم دے دیتا ہوں کہ پھر وہ پلٹ کر نہیں آتیں۔"

"میں ایک لڑکی کو دیکھ رہا ہوں کہ اس وقت یہ آئی ہوئی ہے۔ کیا آپ بتانا پسند کریں گے کہ یہ آپ کے پیچھے کیوں پڑ گئی ہے۔ کچھ تو بات ہے کہ جس کا حوصلہ شازیہ کو مل رہا ہے اور وہ آپ کو پریشان کر رہی ہے۔ ایسا تو ہو نہیں سکتا کہ آپ خواہ مخواہ ایک عورت سے پریشان ہو جائیں۔"

راجہ محمود جہانگیر چپ رہا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ڈاکٹر تھوڑی دیر تک انتظار کرتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔ "ٹھیک ہے' آپ کی مرضی' آپ جواب نہ دیں۔ میں تو اس لئے پوچھ رہا ہوں کہ ایک ڈاکٹر کو اپنے مریض کی پوری ہسٹری شیٹ معلوم ہونی چاہئے۔ میں آپ کا صرف جسمانی ہی نہیں دماغی علاج بھی کر رہا ہوں۔ آپ مناسب سمجھیں تو مجھے بتا دیں۔ ورنہ میں اصرار نہیں کروں گا۔"

وہ خاموش رہا۔ وہ اپنے ڈاکٹر کو اپنے خفیہ امراض بھی بتا سکتا تھا۔ مگر خفیہ جرم نہیں بتا سکتا تھا۔ اس نے اپنے چچا کو کس طرح قتل کرنے کے بعد ریاست کی گدی پر قبضہ کیا تھا اور کس طرح شازیہ کے معصوم بچے کو ہلاک کیا تھا۔ وہ ایسا نادان نہیں تھا کہ ڈاکٹر کو اپنی ہسٹری شیٹ بتانے کے دوران اپنے جرم کا اقرار بھی کر لیتا۔ اس لئے وہ خاموش رہا۔

☆======☆======☆

وہ سفر خاموشی سے جاری رہا۔ پانچ بجے جب تمام مسافروں کو ناشتہ دیا جانے لگا۔ ایک ایئرہوسٹس اس کے اور ڈاکٹر کی پسند کے مطابق ناشتہ لے آئی۔ جب ایئرہوسٹس چلی گئی تو ڈاکٹر نے کہا۔ "راجہ صاحب اب آپ ایسا کریں کہ اپنے ناشتے کی ٹرے مجھے دے دیں اور میرے ناشتے کی ٹرے آپ لے لیں۔ اس طرح آپ کے دل میں یہ خدشہ نہیں رہے گا کہ آپ زہر آلود ناشتہ کر رہے ہیں۔"

یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر نے ٹرے کو بدل دیا۔ شازیہ کن اکھیوں سے دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ بھی ناشتے میں مصروف ہو گئی۔ ساڑھے پانچ بجے وہ طیارہ تہران کے ہوائی اڈے پر پہنچا۔ وہاں ایک گھنٹے تک ٹھہرنے اور مزید ایندھن حاصل کرنے کے بعد اس طیارے نے دوبارہ پرواز شروع کی۔ اب اس کی دوسری منزل استنبول کا ہوائی اڈہ تھی لیکن ایک گھنٹے کے بعد جہاز کے پائلٹ کو وارننگ دی گئی کہ جہاز کو استنبول کی طرف نہ لایا جائے کیونکہ وہاں کا موسم بہت ہی خراب ہو گیا ہے۔ طوفان کے آثار ہیں۔ ہوا کے تیز جھکڑ چل رہے ہیں۔ ایسی صورت میں طیارے کو استنبول کے ہوائی اڈے پر نہیں اتارا جا سکے گا۔ لہٰذا اسے واپس لے جائے یا اس کا رخ رومانیہ کی طرف موڑ دیں۔

پائلٹ نے پرواز کا رخ بدل دیا۔ پھر اس نے تہران کے کنٹرول ٹاور سے رابطہ قائم کر کے اپنی پوزیشن بتائی۔ وہاں سے جواب ملا کہ ہوائی اڈے پر کئی ملکی اور غیر ملکی طیارے موجود ہیں اور دو گھنٹے سے پہلے ان کا رن وے خالی نہیں ہو گا۔ لہٰذا وہ تہران کی طرف واپس نہ آئے۔

پائلٹ نے مجبوراً رومانیہ کا رخ کیا طیارے کے اندر مسافروں کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ باہر کیا ہو رہا ہے اور ان کا طیارہ کس مصیبت میں پھنس گیا ہے اور مزید کس مصیبت میں پھنسنے والا ہے۔ جہاز کا پائلٹ اور عملہ بالکل ہی اناڑی نہیں تھے۔ انہیں خاصا تجربہ تھا لیکن ایسی صورتِ حال پہلے کبھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ انہوں نے مشق کے دوران

ایسی صورت حال سے نمٹنے کا سبق سیکھا تھا لیکن وہ سبق عملی نہیں تھا۔ اب جبکہ عمل کا وقت آیا تو وہ کسی قدر گھبرا گئے۔ ایک تو رات کا وقت تھا۔ دوسرے ایک طرف سے طوفان کی آمد کی پیش گوئی کی گئی تھی۔ دوسری طرف سے انہیں واپس آ کر تہران کے ہوائی اڈے پر اترنے سے روک دیا گیا تھا۔ اب تیسری طرف وہ رومانیہ کی طرف بڑھے تو وہاں کے کنٹرول ٹاور سے پوچھا گیا۔ "یہاں کیوں آ رہے ہو؟ یہاں تو پہلے ہی برف کا طوفان آیا ہوا ہے۔"

اچانک ہی وہ جہاز ڈگمگایا۔ پھر کئی سو فٹ نیچے جا کر دوبارہ ایک جھٹکے سے بحال ہو کر پرواز کرنے لگا۔ مسافروں میں کھلبلی سی مچ گئی۔ عورتیں چیخنے لگیں۔ بوڑھے کراہنے لگے۔ نوجوان گم صم بیٹھے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد اسپیکر سے آواز آنے لگی۔ "معزز مسافروں سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ اپنے سیفٹی بیلٹ باندھ لیں۔ ہمارا طیارہ جس علاقے سے گزر رہا ہے وہاں کا موسم موافق نہیں ہے اسی لئے جہاز میں کبھی کبھی ڈگمگاہٹ ہو گی۔ مسافروں کو اس سے پریشان نہیں ہونا چاہئے۔ پرواز کے دوران کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے۔ آپ لوگ اطمینان سے مشروبات وغیرہ سے شغل کریں۔ ہم انشاء جلد ہی استنبول کے ہوائی اڈے پر پہنچ جائیں گے۔"

مسافروں کو جھوٹی تسلیاں دی جا رہی تھیں۔ انہیں ہراساں کرنا مقصود نہیں تھا۔ اسی لئے وہ جھوٹ بول رہے تھے۔ حالانکہ استنبول کا ہوائی اڈہ اب ان سے دور رہ گیا تھا۔ اب وہ رومانیہ کی فضا میں پرواز کر رہے تھے یا کسی اور ملک کے آسمان تلے تھے۔ اس بات کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ قطب نما سمت بتا رہا تھا مگر ملک نہیں بتا سکتا تھا۔ زمین نہیں بتا سکتا تھا کہ وہ کس زمین کی بلندی پر اس وقت پرواز کر رہے ہیں۔

اگرچہ مسافروں کو اطمینان دلایا جا چکا تھا۔ تاہم وہ سب پریشان تھے۔ صرف ایک شازیہ ایسی تھی جس کا چہرہ خوشی سے کھلا ہوا تھا۔ وہ سیفٹی بیلٹ باندھتے ہوئے راجہ جی کے سامنے ذرا سا جھکتے ہوئے بولی۔ "وہ معصوم بچہ تمہاری مٹھی سے نکل کر فرش پر گر پڑا تھا۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ سیفٹی بیلٹ باندھنے کے بعد زمین پر نہیں گرو گے؟"

وہ ایک دم سے ہسٹریائی انداز میں چیخ پڑا۔ "میں تمہیں قتل کر دوں گا۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" اس نے چیختے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھنا چاہا لیکن اٹھ نہ سکا کیونکہ سیفٹی بیلٹ بندھا ہوا تھا۔ وہ اس بیلٹ کو کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ ایک تو غصے سے

کھولا نہیں جا رہا تھا۔ دوسرے یہ کہ ڈاکٹر نے ہاتھ پکڑ لیا تھا اور سمجھا رہا تھا۔ "خدا کے لئے خاموش ہو جائیے یہ کیا پاگل پن ہے۔ تمام مسافر ہماری طرف دیکھ رہے ہیں۔"

راجہ جی نے غصے سے چیخ چیخ کر کہا۔ "ہاں' دیکھ رہے ہیں دیکھنے دو۔ میں پاگل نہیں ہوں۔ پاگل یہ مسافر ہیں جو اس سازش کو نہیں سمجھ رہے ہیں۔ یہ شازیہ نامی عورت اس اسٹیورڈ امیر حسن سے مل کر اس جہاز کو نیچے گرانا چاہتی ہے۔"

ایک طرف سے آواز آئی۔ "کیا یہ پاگل ہے؟"

دوسری طرف سے کسی نے کہا۔ "یقیناً پاگل ہے۔ یہ پاگل شخص اتنا نہیں جانتا کہ اگر کوئی عورت اسٹیورڈ سے مل کر اس جہاز کو گرائے گی تو خود بھی مر جائے گی۔"

ایک عورت نے رونے کے انداز میں کہا۔ "یہ جہاز کبھی ڈگمگاتا ہے کبھی ایک جھٹکے سے نیچے چلا جاتا ہے۔ ایسی حالت میں یہ کیسی منحوس باتیں کی جا رہی ہیں۔ تم سب خدا کو کیوں نہیں یاد کرتے؟"

اس کی باتیں سن کر سب کو چپ لگ گئی۔ تمام مذہب کے لوگ اپنی اپنی زبان اور اپنے اپنے انداز میں دعائیں پڑھنے لگے۔ راجہ محمود جہانگیر جس نے کبھی خدا کو یاد نہیں کیا تھا۔ آج وہ بھی پہلی بار موت کو سامنے دیکھ کر زیر لب کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ رہا تھا۔ دبی زبان سے توبہ کر رہا تھا۔ پھر اس نے شازیہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں بھول گیا تھا کہ میرے ساتھ تم بھی مرو گی اور میں بھول گیا تھا کہ غصہ آدمی کو پاگل بنا دیتا ہے۔ میں سچ مچ پاگلوں کی طرح سوچ رہا تھا کہ تم اور وہ اسٹیورڈ اس جہاز کو گرانا چاہتے ہو۔ اب میں کوئی پاگل پن نہیں کروں گا۔"

شازیہ نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔ "کیا واقعی۔ ذرا میں آزما کر دیکھوں کہ تم پاگل بنتے ہو یا نہیں۔"

یہ کہتے ہی اس نے چیخ کر کہا۔ "معزز مسافرو! دیکھو یہ پاگل پھر مجھے چھیڑ رہا ہے۔ مجھے پریشان کر رہا ہے۔ میں کیا کروں۔ کہاں جاؤں؟"

وہ چیخ کر بولا۔ "میں پاگل نہیں ہوں۔ میں جام نگر کا راجہ ہوں۔"

ایک طرف سے کہا گیا۔ "تم پاگل خانے کے راجہ ہو سکتے ہو۔"

دوسری طرف سے پوچھا گیا۔ "یہ راجہ کیا ہوتا ہے؟"

پوچھنے والا کوئی انگریز تھا۔ اس کے پاس بیٹھے ہوئے کسی شخص نے اسے سمجھایا کہ

راجہ اس پاگل کو کہتے ہیں جو خواہ مخواہ کسی حسین عورت کو چھیڑتا ہے۔ لفٹ نہیں ملتی تو پاگل پن کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اس جہاز میں جتنے لوگ تھے اتنی ہی بولیاں بول رہے تھے اور سب راجہ جی کے بارے میں اپنی اپنی رائے پیش کر رہے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ راجہ جہانگیر جھنجلاہٹ میں مبتلا ہوتا گیا۔ ڈاکٹر نے پریشان ہو کر کہا۔ "یہ مصیبت آپ خود مول لیتے ہیں۔ میں نے آپ کو سمجھایا تھا کہ صبر سے اور اطمینان سے بیٹھیں۔ شازیہ کی طرف دھیان نہ دیں لیکن آپ میری بات نہیں مانتے۔ دیکھ لیجئے کیا نتیجہ ظاہر ہو رہا ہے۔ یہ عورت واقعی چالاک ہے اور آپ کو کتنی کامیابی سے شکست دے رہی ہے۔ اس کا اندازہ آپ کو نہیں ہو رہا۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی اسپیکر سے آواز سنائی دی۔ "معزز مسافر پورے اطمینان اور اعتماد سے بیٹھے رہیں ہم کسی لمحے بھی استنبول کے ہوائی اڈے پر اترنے والے ہیں۔ آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ استنبول کے شہر کی ساری بجلی فیل ہو چکی ہے۔ پھر بھی ہم رن وے پر اترنے کی کوشش کریں گے۔ ہمیں آپ کے اعتماد اور تعاون کی ضرورت ہے' ہمیں امید ہے کہ آپ مایوس نہیں کریں گے اور پورے سکون سے بیٹھے رہیں گے۔ شکریہ۔"

شازیہ نے یہاں سے وہاں تک دیکھا۔ اسے امیر حسن نظر نہیں آیا۔ کوئی ایئر ہوسٹس بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ سب کے سب اسٹیورڈ روم میں چلے گئے تھے۔ کیونکہ ایسے وقت میں انہیں بھی سیفٹی بیلٹ باندھنے کی ضرورت پڑتی تھی۔

وہ بڑے صبر آزما لمحات تھے۔ طیارہ کبھی ایک طرف جھک جاتا تھا کبھی دوسری طرف اور کبھی سیدھی طرف پرواز کرتا تھا۔ کبھی کبھی اس طیارے کو جھٹکے سے لگتے تھے اور تمام مسافروں کے منہ سے چیخیں نکل جاتی تھیں۔

پھر ایک بار یوں لگا جیسے طیارہ زمین کو چھو کر گزر رہا ہو۔ دوسرے لمحے وہ پھر پرواز کر رہا تھا۔ اس کے بعد اچانک ہی جیسے طیارے کے اندر زلزلہ آ گیا۔ بہت بری طرح ڈگمگاہٹ ہو رہی تھی۔ مسافر مرد اور عورتیں چیخ رہے تھے اور اپنی اپنی سیٹوں کے ہتھوں کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھے سب کو اپنی آنکھوں کے سامنے موت نظر آ رہی تھی۔ طیارہ زمین سے لگ کر گھسیٹتا ہوا دور تک جا رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی چیز سے ٹکرا رہا ہو۔ قیامت کا شور بپا تھا۔ جانے قیامت کی وہ گھڑیاں کتنی طویل تھیں کہ اچانک

ہی طیارہ ایک جھٹکے سے رک گیا۔ ایک جھٹکے سے خاموشی چھا گئی۔ تمام چیخنے والوں کے منہ بند ہو گئے بلکہ منہ کھلے رہے آواز بند ہو گئی۔ دیدے پھیل گئے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے سب کو موت نے دبوچ لیا ہو۔ ایسا ہی موت کا سناٹا طیارے کے اندر چھا گیا تھا۔ پھر جیسے زندگی کا احساس ہوا۔ سب کو رفتہ رفتہ محسوس ہوا کہ وہ سانس لے رہے ہیں۔ ان کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں اور وہ جہاز کا اندرونی منظر دیکھ رہے ہیں۔ کہیں کہیں سے کراہنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ پھر دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ سب سے پہلے امیر حسن دوڑتا ہوا شازیہ کے پاس آیا تھا۔ وہ اسے جھنجھوڑ رہا تھا۔ شازیہ کا سر آگے کی طرف جھکا ہوا تھا۔ جھنجھوڑنے پر اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ پھر دونوں ہاتھ بڑھا کر امیر حسن کو تھام لیا۔ وہ بولا۔ "شکر ہے کہ تم سلامت ہو۔"

شازیہ سر گھما کر راجہ جی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "مجھے بھی خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ دشمن ابھی زندہ ہے اور میں اس کے تڑپ تڑپ کر مرنے کا منظر دیکھوں گی۔"

امیر حسن نے پریشان ہو کر کہا۔ "اوہ شازیہ خدا کے لئے چپ ہو جاؤ۔ اس وقت سارے مسافر زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ یہاں قیامت آئی ہوئی ہے اور تم پر ابھی تک انتقام کا جنون سوار ہے۔ پلیز خاموش بیٹھی رہو۔ میں ذرا دوسرے مسافروں کی خبر لیتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ دوسری طرف چلا گیا۔ اس وقت تک دوسرا اسٹیورڈ اور ایئر ہوسٹس وغیرہ آ گئی تھیں اور مسافروں کو دیکھتی پھر رہی تھیں۔ اتنی دیر میں رونے' کراہنے کا شور کچھ زیادہ ہی بلند ہو گیا تھا۔ کچھ کمزور دل مسافر دہشت سے مر گئے تھے اور ان کے پاس بیٹھنے والے ان کے عزیز رشتہ دار ان کا ماتم کر رہے تھے۔

دو ایئر ہوسٹس امیر حسن کے ساتھ وی' آئی' پی کلاس میں آ گئیں وہاں کا منظر بھی ایسا ہی تھا۔ کتنی ہی اہم شخصیتیں کراہ رہی تھیں۔ وہاں دس اہم مسافروں کی لاشیں نظر آئیں۔ کسی کے سیفٹی بیلٹ ٹوٹ گئے تھے۔ کوئی اپنی جگہ سے اچھل کر دوسری جگہ چاروں شانے چت پڑا ہوا تھا۔ دونوں ایئر ہوسٹس زندہ رہنے والے مسافروں کو تسلیاں دینے لگیں۔ امیر حسن دوڑتا ہوا پائلٹ کیبن کا دروازہ کھول کر اندر جانا چاہتا تھا لیکن دروازہ نہیں کھل رہا تھا۔ بڑی مشکل سے اس نے دروازے کو پیٹ پیٹ کر اور دھکے مار کر کھول دیا۔ پھر اندر پہنچ کر دیکھا تو وہاں کا منظر بڑا ہی دلخراش تھا۔ پائلٹ اور جہاز کا

کیپٹن مردہ پڑے ہوئے تھے۔ سامنے کی مشینیں ٹوٹ گئی تھیں۔ کنٹرول ٹاور سے رابطہ قائم کرنے والے وائرلیس کا تمام سامان بکھر گیا تھا۔ ان کے پرزے پرزے ہو گئے تھے۔ طیارے کے اگلے حصے کو زبردست نقصان پہنچا تھا۔ اس کے دونوں بازوؤں پر جو دو ہیڈ لائٹس تھیں وہ محفوظ تھیں اور ان کی روشنی میں نظر آ رہا تھا کہ وہ کسی برفانی علاقے میں ہیں اور وہ جہاز نیچی پرواز کے دوران برف کی سطح میں دھنس گیا تھا۔

وہ دونوں لاشوں کو کسی طرح کھینچ کر کیبن کے باہر لے آیا۔ پھر کیبن میں واپس پہنچ کر اس نے وائرلیس اور ریڈیو کنٹرول کے آلات کو چیک کرنا شروع کیا۔ سب کے سب اس قدر ٹوٹ پھوٹ گئے تھے کہ ان سے دوبارہ رابطے کا کام نہیں لیا جا سکتا تھا۔ اگر وہاں کوئی ماہر انجینئر ہوتا تو شاید انہیں رابطے کے قابل بنا سکتا تھا۔

دوسری طرف تمام مسافروں کے اعصاب بری طرح متاثر ہوئے تھے۔ کوئی ایک دوسرے سے بولنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ سب اپنی اپنی جگہ گم صم تھے۔ صرف وہ لوگ رونے دھونے کے قابل تھے جن کے عزیز اس حادثے کا شکار ہو گئے تھے۔ ان کی موت نے انہیں بے اختیار رونے پر مجبور کیا تھا اور ان کے اپنے دکھوں کو بھلا دیا تھا۔

ڈاکٹر بھی تھوڑی دیر تک ساکت رہا تھا۔ پھر اس نے سر کو جھٹک کر اپنے پاس بیٹھے ہوئے راجہ محمود جہانگیر کو دیکھا۔ وہ گہری گہری سانسیں لے رہا تھا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے جہاز کے اندرونی ماحول کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "راجہ صاحب حوصلہ کریں۔ ہم زندہ ہیں۔ میں اعصاب کو کنٹرول کرنے کی ایک خوراک دیتا ہوں۔ آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنے بیگ کو کھولا اور اس میں سے کوئی دوا نکال کر ایک خوراک راجہ جی کو پینے کے لئے دی۔ پھر وہاں سے اٹھ کر دوسرے مسافروں کو اٹینڈ کرنے کے لئے چلا گیا۔ وہ ایک فرض شناس ڈاکٹر تھا۔ دوسروں کے دکھ درد کا اسے بہت احساس تھا۔

اس کے جانے کے بعد شازیہ نے طنزیہ نظروں سے راجہ جی کو دیکھا پھر اس کی طرف جھک کر آہستگی سے ہنستے ہوئے بولی۔ "یہ جہاز بھی میرے معصوم بچے کی طرح عرش سے فرش پر آ گیا۔"

وہ ایک دم سے تلملا گیا۔ شازیہ نے کہا۔ "کیوں تلملاتے ہو۔ چیخ چیخ کر جہاز کے مسافروں سے پھر ایک بار کہہ دو کہ میں نے اور اسٹیورڈ امیر حسن نے تمہیں مارنے کے

لئے جہاز کو آسمان سے زمین تک پہنچا دیا ہے اور اب زمین سے تمہیں قبر تک پہنچا دیں گے۔"

اس نے دانت پیستے ہوئے شازیہ کو دیکھا پھر اچانک ہی ذرا نرم پڑتے ہوئے بولا۔ "کیا تمہیں اپنی موت کا ڈر نہیں ہے؟ کیا تم حالات کو نہیں سمجھ رہی ہو؟ یہاں تو اچھے اچھوں کے اعصاب متاثر ہو گئے ہیں۔ سب ہی سہمے ہوئے ہیں۔ مگر تم کیسی زہریلی باتیں کر رہی ہو۔ مجھے مارنے کی بجائے اپنی موت کے متعلق سوچو۔"

"راجہ جی میں تو اسی دن مر گئی تھی جس دن پہلی بار میری عزت آپ کے ہاتھوں لٹ گئی۔ دوسری موت میری اس وقت ہوئی جب میرا بچہ تمہاری مٹھی میں مر گیا۔ اب میں زندہ کہاں ہوں۔ یہ تو ایک لاش ہے جسے تم دیکھ رہے ہو۔ میں تو ایک بد روح ہوں جو تمہیں کھانے کے لئے اب تک بھٹکتی رہی اور اب میں تمہیں کچا چبا جاؤں گی۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی دور سے امیر حسن کی آواز سنائی دی۔ وہ عوامی اور وی' آئی' پی کلاسوں کے درمیانی راستے کا دروازہ کھولے کھڑا تھا اور کبھی اِدھر اور کبھی اُدھر دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"معزز مسافروں کو میں ایک المناک حادثے کی اطلاع دے رہا ہوں۔ یہ جہاز کسی بھی ملک کے رن وے پر نہیں ہے۔ ایندھن کی کمی کے باعث بہت مجبور ہو کر اسے ایک برفانی علاقہ میں اتارا گیا ہے اور اتارنے کے دوران اس جہاز کے پائلٹ جان بحق ہو گئے ہیں۔ جہاز کی مشینوں کو اس قدر نقصان پہنچا ہے کہ یہ اس ویران علاقہ میں قابل مرمت نہیں رہا۔"

اس کی باتیں سن کر سب سناٹے میں آ گئے تھے اور ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ وی' آئی' پی کلاس سے ایک شخص نے کہا۔ "تم وقت ضائع کیوں کر رہے ہو۔ یہی اطلاع کسی بھی قریبی ملک کے کنٹرول ٹاور تک پہنچاؤ۔ ہم لوگوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ ہم کہاں ہیں اور دوسروں کو بھی پتہ چلنا چاہئے کہ وہ ہمیں کس طرح کسی آبادی تک پہنچا سکتے ہیں۔"

اس شخص کی تائید میں تمام مسافر یہاں سے وہاں تک چیخنے چلانے لگے۔ امیر حسن نے ہاتھ اٹھا کر لوگوں کو خاموش کرتے ہوئے کہا۔ "آپ لوگوں کے کہنے سے پہلے ہی میں ایسی کوششیں کر چکا ہوں۔ افسوس کہ رابطہ کے تمام ذرائع ختم ہو چکے ہیں۔ میں پہلے ہی

کہہ چکا ہوں کہ مشینیں ٹوٹ پھوٹ گئی ہیں۔ اگر یہاں کوئی ماہر انجینئر ہے اور وہ رابطہ قائم کرنے کے آلات کو درست کر سکتا ہے تو میں اسے خوش آمدید کہتا ہوں۔"

تمام لوگوں کو چپ لگ گئی۔ سب لوگ ادھر سے اُدھر دیکھ رہے تھے کہ شاید کوئی ان کے درمیان ماہر انجینئر نکل آئے۔ آخر ایک نوجوان اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے کہا۔ "میں اپنے آپ کو ماہر تو نہیں کہتا مگر ہاں پچھلے سال ہی میں نے انجینئرنگ کا ڈپلومہ حاصل کیا ہے۔ چلئے کوشش کر کے دیکھ لیتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھتے ہوئے امیر حسن کے پاس پہنچا۔ امیر حسن نے ایک طرف ہٹ کر اسے کیبن کی طرف جانے کا اشارہ کیا۔ اس کے بعد بلند آواز سے کہنے لگا۔ "مجھے اس حادثے میں مرنے والے معزز مسافروں کا افسوس ہے اور ان کے عزیزوں اور رشتہ داروں سے دلی ہمدردی ہے لیکن یہاں جتنی بھی لاشیں ہیں وہ زیادہ دیر لوگوں کے درمیان میں نہیں رکھی جا سکتیں۔ یہاں پہلے ہی مسافروں کے اعصاب کمزور ہو چکے ہیں اور اکثریت ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جو لاش کے قریب رہنا پسند نہیں کرتے۔ اتفاق سے ہم برفانی علاقے میں ہیں۔ ہم ان لاشوں کو برف میں لے جا کر دبا دیں گے تاکہ وہ محفوظ رہیں۔ جب آپ لوگوں کو کسی آبادی تک پہنچانے کی کوئی صورت نکل آئے گی تو ان لاشوں کو بھی ان کے ورثا کے ساتھ یہاں سے بھیجا جا سکے گا۔ میں چند نوجوان دوستوں کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ میرے ساتھ آئیں اور اس جہاز سے نکل کر یہاں کے آس پاس کے علاقے کا معائنہ کریں اور دیکھیں کہ ہم کس ماحول میں ہیں۔"

وہاں سے کچھ لوگ اٹھ کر امیر حسن کے ساتھ دوسری طرف چلے گئے۔ ڈاکٹر واپس آ کر اپنی جگہ بیٹھ گیا پھر راجہ محمود جہانگیر سے بولا۔ "ہم کہاں آ پھنسے ہیں؟ لگتا ہے جیسے اپنے اپنے گناہوں کی سزا پانے والے ہیں۔"

راجہ جی نے چونک کر ڈاکٹر کو دیکھا۔ پھر کہا۔ "آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ گناہوں کی سزا پانے سے کیا مراد ہے۔ کیا یہاں جتنے بھی مسافر ہیں سب گنہگار ہیں؟"

"کون کسی کے اندر جھانک کر دیکھ سکا ہے۔ جو لوگ اوپر سے اجلے نظر آتے ہیں اندر سے کتنے کالے ہوتے ہیں۔ یہ ہم اور آپ نہیں کہہ سکتے۔ لگتا ہے یہ جہاز گنہگاروں سے بھرا ہوا ہے اور ہمیں اپنے کیے کی سزا ملنے والی ہے۔"

"ڈاکٹر آپ نے کون سا گناہ کیا ہے؟"

"کچھ تو کیا ہے۔ جس کی وجہ سے یہ زبان بول رہی ہے"

"تو پھر اس زبان کو بولنے دیجیے۔ میں سننا چاہتا ہوں۔"

ڈاکٹر نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "جی نہیں' میں نے آپ سے شازیہ کے متعلق پوچھا تھا۔ آپ نے بتانے سے انکار کر دیا۔ پھر میں اپنے گناہ کی داستان کیسے سنا سکتا ہوں۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ کوئی اپنی کمزوری بیان نہیں کرتا۔ ہمیں خاموش ہی رہنا چاہیے۔"

وہ بڑی دیر تک خاموش رہے۔ شازیہ کبھی کبھی ان کی طرف دیکھ لیتی تھی لیکن وہ بھی خاموش ہی رہتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ باہر والے جوان اندر آئے۔ امیر حسن نے کہا۔ "میں ڈاکٹر سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ مرنے والوں کی تصدیق کریں اور ان کی موت کا سرٹیفکیٹ لکھ دیں۔ ہم انہیں برف میں دفن کرنے کے لئے جا رہے ہیں۔"

کچھ عورتیں یہ سنتے ہی رونے لگیں۔ کیونکہ ان کے عزیزوں کو دفن کرنے کا مرحلہ آ گیا تھا۔ ڈاکٹر اپنی جگہ سے اٹھ کر' اس مرحلے سے گزرنے کے لئے امیر حسن کے پاس پہنچ گیا۔ ایک مسافر نے کہا۔ "یہ کفن دفن کا مرحلہ اتنا ضروری نہیں ہے۔ پہلے ہمیں کوشش کرنی چاہئے کہ کسی نہ کسی طرح قریبی آبادی سے رابطہ قائم ہو جائے۔"

امیر حسن نے کہا۔ "یہ کوششیں جاری ہیں۔ آپ نے دیکھا ہے کہ ایک نوعمر انجینئر اپنے کام میں مصروف ہے۔ تھوڑی دیر بعد ہمیں اس کی طرف سے کوئی خوشخبری ملے گی۔ رابطہ ضرور قائم ہو گا۔"

بہرحال مسافروں کو سمجھانے کے بعد امیر حسن ایک گھنٹے تک وہ سرٹیفکیٹ تیار کرانے اور لاشوں کو باہر بھیجنے کے انتظامات میں مصروف رہا۔ اس دوران پھر کسی نے کہا۔ "ہمیں بھوک لگ رہی ہے۔ کچھ کھانے کا انتظام ہونا چاہئے۔"

ایک ائیر ہوسٹس نے جواب دیا۔ "ہم لاشوں کو اسی لئے باہر لے جا رہے ہیں۔ کیا آپ لوگ لاشوں کی موجودگی میں کھانا پسند کریں گے؟"

اس کی بات سن کر سب کو چپ لگ گئی۔ ایک گھنٹے کے بعد نوجوان انجینئر نے آ کر مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "مجھے افسوس ہے ہم کسی بھی قریبی آبادی سے رابطہ قائم نہیں کر سکیں گے۔ وہ آلات اس قدر ٹوٹ گئے ہیں کہ انہیں جوڑنے کا سامان نہیں ہے

اور فاضل آلات بھی موجود نہیں ہیں۔ میں مجبور ہوں کہ انہیں کام کے قابل نہیں بنا سکتا۔"

ایک شخص نے غصے سے پوچھا۔ "تو پھر تم کس کام کے انجینئر ہو۔ دفع ہو جاؤ۔"

نوجوان انجینئر نے غصے سے کہا۔ "مسٹر اپنی زبان سنبھالو۔ اگر میں تمہارے ہاتھ توڑ دوں تو کوئی ڈاکٹر آلات کے بغیر انہیں نہیں جوڑ سکے گا؟ ہرگز نہیں۔ اسی طرح میں آلات کے بغیر ریڈیو اور وائرلیس سیٹ کو کام کے قابل نہیں بنا سکتا۔"

کسی نے پوچھا۔ "اب کیا ہو گا۔ ہمیں کیسے معلوم ہو گا کہ ہم کہاں ہیں اور قریبی آبادی یہاں سے کتنی دور ہے؟"

دوسرے اسٹیورڈ نے کہا۔ "مجبوری ہے۔ ہماری سمجھ میں یہی آتا ہے کہ ہم مہم جو نوجوانوں کی ایک ٹیم بنائیں اور انہیں یہاں سے روانہ کریں تاکہ وہ دور دور تک جا کر کسی قریبی آبادی کو تلاش کریں۔"

ایک طرف سے کہا گیا۔ "سنا ہے یہاں چاروں طرف برف ہی برف ہے۔ تو سب ہی جان کی بازی لگا کر کسی قریبی آبادی میں پہنچنے کی کوشش کریں گے یاد رکھئے یہاں بوڑھے مرد اور عورتیں ہیں کچھ بچے بھی ہیں اور یہ ایسا نہیں کر سکیں گے۔ ان کی خاطر چند نوجوانوں کو یہ مہم سر کرنی ہو گی۔"

سب لوگ اپنی جگہ بیٹھے رہے۔ کوئی اس مہم پر جانے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اسٹیورڈ نے سوالیہ نظروں سے دور تک دیکھا ایک عورت نے کہا۔ "کہیں جانا ضروری نہیں ہے۔ جب اس جہاز کا پتہ نہیں ملے گا اور یہاں سے وائرلیس کے ذریعہ رابطہ قائم نہیں ہو گا تو اس کی تلاش یقیناً ہو گی۔ آج کل ایسے جدید آلات اور ایسے تیز رفتار طیارے ہیں کہ بہت جلد ہمارا سراغ لگا لیا جائے گا۔ ہم یہاں بہت زیادہ دیر تک نہیں رہیں گے۔"

کسی نے دوسری طرف سے کہا۔ "ہاں یہ درست ہے۔ ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ صبح تک ہمارے لئے دوسرا امدادی طیارہ آ جائے گا۔ ابھی تو ہمارے کھانے کا انتظام کیا جائے۔"

کئی طرف سے آوازیں آنے لگیں۔ "آدھی رات ہو چلی ہے کھانا تقسیم کیا جائے۔"

ان کی باتیں سن کر امیر حسن وہاں آیا اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر سب کو خاموش رہنے کے لئے کہا۔ "لیڈیز اینڈ جنٹلمین! ہماری دعا ہے کہ صبح تک کوئی طیارہ یہاں پہنچ جائے۔ اگر نہ پہنچ سکا تو ہم پہلے سے بتا دیں کہ ہمارے پاس صرف چار دن کا راشن ہے۔ اس طیارے میں ایک سو ستر مسافر سوار ہوئے تھے۔ جہاز کا عملہ نو افراد پر مشتمل تھا۔ پچیس افراد مر چکے ہیں۔ اس وقت طیارے میں ایک سو چون مسافر ہیں۔ ان ایک سو چون مسافروں میں خوب سوچ سمجھ کر کھانا تقسیم کرنا ہو گا چار وقت کا کھانا آٹھ وقت تک جاری رکھنے کے لئے آپ لوگوں کے سامنے آدھی خوراک پیش کی جائے گی۔ اسے کھانے کے بعد دوسری بار کھانے کا مطالبہ نہ کریں۔"

کچھ لوگوں نے اعتراضات کئے مگر اکثریت نے تائید کی۔ احتیاطی تدابیر ضروری تھیں۔ بہرحال تھوڑی دیر بعد تمام مسافروں میں کھانا تقسیم ہونے لگا۔ جتنی خوراک دی جاتی تھی اس کا نصف سب کو دیا گیا۔ جب راجہ محمود جہانگیر اپنی پلیٹ لے کر کھانے لگا تو شازیہ نے اس کی طرف دیکھ کر زہریلے انداز میں کہا۔ "ایسا بھی وقت' راجہ' مہاراجہ لوگوں پر آتا ہے کہ وہ آدھا پیٹ کھاتے ہیں۔ تم اپنی ساری دولت دے کر بھی پوری ایک پلیٹ حاصل نہیں کر سکو گے۔ بھیک مانگو گے تب بھی پیٹ بھر کر کھانے کو نہیں ملے گا۔ تم ایسے گئے گزرے ہو کہ تمہیں بھیک بھی نہیں ملے گی۔"

راجہ جی نے غصے سے کہا۔ "ڈاکٹر' اس عورت کو سمجھا دو۔ ورنہ میں اسے قتل کر دوں گا۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "میں آپ کو سمجھاتا ہوں۔ جو کچھ کھانے کو ملا ہے۔ اسے چبا چبا کر' ٹھہر ٹھہر کر کھائیں تاکہ زیادہ دیر تک کھاتے رہنے سے زیادہ کھانے کا احساس ہوتا رہے گا۔ اگر آپ غصے میں تلملا کر کھاتے رہیں گے تو پتہ بھی نہیں چلے گا کہ کیا کھایا ہے۔"

"کیا آپ میری خاطر اس عورت کو بھونکنے سے منع نہیں کر سکتے؟"

"سوری' آپ کے پیچھے کوئی کتا بھونکتا رہے تو میں اسے روک نہیں سکتا اسے پتھر مار کر بھگا سکتا ہوں اور یہاں سے اس عورت کو بھگایا نہیں جا سکتا۔ ایک ہی صورت ہے کہ آپ اپنی جگہ چھوڑ کر میری سیٹ پر آ جائیں۔"

وہ جھنجلا کر بولا۔ "میں ایک عورت سے شکست تسلیم نہیں کر سکتا۔" یہ کہہ کر اس نے سیٹ پر پہلو بدلتے ہوئے شازیہ کی طرف سے منہ پھیر لیا اور کھانے لگا۔ شازیہ نے

کہا۔ "منہ پھیرنا میدان جنگ میں پیٹھ پھیرنے کے برابر ہوتا ہے۔"

وہ اپنے منہ میں لقمہ ڈال رہا تھا۔ اس کا لقمہ حلق میں پھنس گیا۔ پھر ایسا ٹھسکا لگا کہ وہ کھانسنے لگا۔ ڈاکٹر نے جلدی سے اس کی پلیٹ سنبھال لی۔ "یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ اگر اس پلیٹ کا کھانا گر گیا تو آپ کو دوسری پلیٹ نہیں ملے گی۔"

وی' آئی' پی کلاس سے کسی نے چیخ کر پوچھا۔ "دوسری پلیٹ کیوں نہیں ملے گی۔ یہ خوراک میرے لئے کافی نہیں ہے۔"

وہاں امیر حسن کھڑا تھا۔ اس نے کہا۔ "میں مانتا ہوں کہ آپ کی شخصیت بہت اہم ہے لیکن ہمارے لئے جہاز کے ایک معمولی مسافر کی زندگی بھی آپ کی زندگی کے برابر ہے۔ جتنا اسے ملے گا اتنا ہی آپ کو بھی کھانا ملے گا۔ ہم آپ کی عزت کرتے ہیں آپ بھی ہماری منصفانہ خدمت گزاری کی قدر کریں۔"

تھوڑی دیر بعد کچھ اور لوگوں نے شکایت کی لیکن انہیں بھی سمجھا کر خاموش کر دیا گیا۔ سب لوگ کھانے کے بعد کمبل اوڑھ کر سونے کی کوششیں کرنے لگے۔ سردی زیادہ تھی لیکن اتنی بھی نہیں تھی۔ باہر برف گر رہی تھی۔ اس کی وجہ سے حبس ہو گیا تھا۔ گرم ممالک سے آنے والے مسافر بھی اتنی سردی برداشت کر سکتے تھے۔

راجہ محمود جہانگیر نے اچھی طرح اپنے اطراف کمبل لپیٹ کر شازیہ کی طرف دیکھا۔ وہ شاید سو گئی تھی۔ کیونکہ بالکل ساکت تھی اور اسے چھیڑ بھی نہیں رہی تھی۔ اس نے ڈاکٹر کی طرف پلٹ کر کہا۔ "معلوم ہوتا ہے یہ سو گئی ہے۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "آپ کو کسی کل چین نہیں ہے۔ آپ ہر لمحہ اس کے متعلق سوچتے رہتے ہیں۔ یہ آپ کے حواس پر چھا گئی ہے۔ ارے بھئی' سوتی ہے تو سونے دیجئے۔ آپ خود سونے کی کوشش کریں۔"

"مجھے ان حالات میں نیند نہیں آئے گی۔ میں آرام دہ بستر پر سونے کا عادی ہوں اور میرے سونے کے لئے ایک خاص موڈ ہوتا ہے کچھ پینے پلانے کی چیزیں ہوتی ہیں۔ کچھ موسیقی ہوتی ہے اور ...."

ڈاکٹر نے سر ہلا کر کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ اور کیا ہوتا ہو گا .... بائی دی وے' نیند نہیں آ رہی ہے تو میں ایک بار پھر کہوں گا کہ اپنے گناہ کی کوئی داستان سنا دیں۔ نہیں نہیں' میں پھر غلط بات پوچھ رہا ہوں۔ اپنے گناہ کا ذکر کوئی نہیں کرتا اور پھر ایسا گناہ جس

میں جرم بھی شامل ہو تو زبان بند ہی رہتی ہے اور بند ہی رہنا چاہئے۔"

"ڈاکٹر' آپ خواہ مخواہ میرے متعلق کریدنا چاہتے ہیں۔ کیا آپ پولیس کے آدمی ہیں؟"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "میں کچھ بھی ہوں آپ ایک عرصے سے جانتے ہیں۔ چلئے' گناہ اور جرائم کی داستان نہ سہی۔ اتنا ہی بتا دیجئے کہ یہ شازیہ کون ہے اور آپ اسے کب سے جانتے ہیں؟"

راجہ محمود جہانگیر نے سر گھما کر نفرت سے شازیہ کی طرف دیکھا۔ پھر ڈاکٹر کی طرف جھکتے ہوئے حقارت سے بولا۔ "یہ ناجائز اولاد ہے۔ ہمارے محل کے ایک ملازم کے ہاں پرورش پاتی رہی ہے۔ میں اسے بچپن سے جانتا ہوں۔"

ڈاکٹر نے پوچھا۔ "اچھا تو یہ محل کے کسی ملازم کی اولاد ہے؟"

وہ آہستگی سے ہنستے ہوئے بولا۔ "ڈاکٹر آپ بہت بھولے ہیں۔ ملازم کی نہیں بلکہ راجہ کی اولاد ہے۔"

ڈاکٹر نے تعجب سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "راجہ کی اولاد کیسے ہوئی؟"

"ایسے کہ اس کی ماں بھی بہت خوبصورت تھی۔ محل میں ملازم تھی میرے چچا جو مجھ سے پہلے راجہ تھے۔ ان کی نیت اس پر آ گئی۔ پھر یہ شازیہ پیدا ہو گئی۔"

ڈاکٹر کا چہرہ کسی اندرونی جذبے سے تمتمانے لگا۔ اس نے ایک طرف ذرا جھک کر غور سے شازیہ کو دیکھا۔ پھر پوچھا۔ "اچھا تو یہ بڑے راجہ جی کی بیٹی ہے۔"

اس نے حقارت سے کہا۔ "اونہہ' ایسی اولاد کو اولاد نہیں' نالی کا کیڑا کہا جاتا ہے۔"

اس کی بات سن کر ڈاکٹر نے اچانک ہی مٹھیاں بھینچ لی تھیں اس کی آنکھوں سے جیسے خون ابلنے لگا تھا۔ وہ ایک دم سے گھور کر راجہ محمود جہانگیر کو دیکھ رہا تھا۔ اس وقت وہ کمبل کو درست کرتے ہوئے اپنے اطراف اچھی طرح لپیٹنے میں مصروف تھا۔ اس لئے ڈاکٹر کے رد عمل کو نہ پڑھ سکا۔ جب تک وہ ڈاکٹر کو دیکھتا۔ اس وقت تک اس نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ پھر بھی اس کے چہرے پر کچھ تاثرات تھے۔ راجہ محمود جہانگیر نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔ "کیا بات ہے۔ آپ کچھ مضطرب سے نظر آ رہے ہیں؟"

"نہیں کوئی بات نہیں۔ بس یونہی۔ سمجھ لیجئے کہ آپ کی باتیں سن کر پھر بھوک لگنے لگی ہے۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”آپ سونے کی کوشش کریں۔ صبح سے پہلے یہ لوگ کھانا نہیں دیں گے۔“

ڈاکٹر نے اپنی سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ پھر دل ہی دل میں کہا۔ ”بھوک ایسی بھی ہوتی ہے۔ جو کھانے سے نہیں‘ پینے سے مٹتی ہے۔ اسی لئے آدمی خون کے گھونٹ پیتا رہتا ہے۔“

☆=====☆=====☆

صبح ہو گئی۔ کچھ مسافر سوتے رہے۔ مگر اکثریت ایسوں کی تھی جو صبح جلدی نہ اٹھنے کی عادت کے باوجود جلدی بیدار ہو گئے تھے۔ پچھلی رات انہیں پیٹ بھر کر کھانا نہیں ملا تھا۔ بھوک لگ رہی تھی۔ ان میں سے کچھ مسافر ٹوائلٹ کی طرف رخ کرنے لگے وہاں ایک ہوسٹس اور ایک اسٹیورڈ کھڑا ہوا تھا۔ انہوں نے راستہ روکتے ہوئے کہا۔ ”سوری‘ اسے استعمال کرنے کی کسی کو اجازت نہیں ہے۔ کیونکہ جہاز برف میں دھنسا ہوا ہے۔ نکاسی کا کوئی راستہ نہیں ہے لہٰذا آپ لوگ باہر کا رخ کریں۔“

پھر ایک بار مسافروں میں کھلبلی مچ گئی۔ وی‘ آئی‘ پی کلاس کے مسافر سب سے زیادہ شور مچا رہے تھے۔ کیونکہ وہ آرام طلب تھے اور اس برفانی علاقے میں جہاز سے باہر نہیں جانا چاہتے تھے لیکن دو اسٹیورڈ اور چار ایئر ہوسٹس نے انہیں باہر جانے پر مجبور کر دیا۔ راجہ محمود جہانگیر کو بھی اس غرض سے باہر جانا پڑا۔

سب لوگ باجماعت نہیں جا رہے تھے۔ کبھی دو چار کی ٹولی میں عورتیں جاتی تھیں۔ کبھی مرد جاتے تھے۔ جب راجہ محمود جہانگیر باہر کی طرف گیا تو شازیہ اپنی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ امیر حسن نے اسے اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ وہ اپنی جگہ چھوڑ کر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کی طرف آئی۔ امیر حسن نے کہا۔ ”یہ اچھا موقع ہے۔ تم بھی اسی بہانے باہر جاؤ۔ میں باہر کہیں موقع دیکھ کر اس پر حملہ کر دوں گا اور تمہیں اس کے تڑپ تڑپ کر مرنے کا تماشا دکھاؤں گا۔“

وہ خوش ہو کر باہر آ گئی۔ باہر دور دور تک میدان نظر آ رہا تھا۔ جہاں تک نظر جاتی تھی۔ وہاں تک وہ میدان برف سے ڈھکا ہوا تھا۔ چاروں طرف برف کے سوا کوئی دوسرا نظارہ نہ تھا کہیں کہیں درخت نظر آ رہے تھے۔ ان پر بھی برف جم رہی تھی۔ مسافروں کو ایک دوسرے سے چھپنے کے لئے وہاں اونچے نیچے ٹیلے تھے۔ وہ ٹیلے اطمینان بخش پردے کا کام دینے لگے۔

شازیہ نے دیکھا۔ راجہ محمود جہانگیر ایک طرف تنہا چلا جا رہا تھا۔ وہ ذرا فاصلہ رکھ کر اس کے پیچھے جانے لگی۔ پیچھے پلٹ پلٹ کر بھی دیکھنے لگی کہ امیر حسن آتا ہے یا نہیں۔ اچانک ہی راجہ محمود جہانگیر نے گھوم کر دیکھا۔ پھر شازیہ کو اپنی طرف آتے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ اس نے للکار کر پوچھا۔ ”اے تم میرے پیچھے کیوں آ رہی ہو؟“

وہ بھی رک گئی تھی۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ دور طیارے کی طرف سے امیر حسن آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ حوصلہ کر کے بولی۔ ”میں تمہارا پیچھا کر رہی ہوں۔ میرا جی چاہتا ہے۔ تمہارا گلا اسی طرح دبوچ لوں جس طرح تم نے میرے معصوم بچے کا گلا دبا دیا تھا۔“

اس کی بات ختم ہوتے ہی راجہ محمود جہانگیر نے اپنی پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک چھوٹا سا پستول نکال لیا۔ پھر اس کا نشانہ لیتے ہوئے بولا۔ ”میں کوئی بچہ نہیں ہوں۔ ہمیشہ ایسے کھلونے رکھتا ہوں جو میری حفاظت کر سکیں۔ اگر تم نے اس اسٹیورڈ کا سہارا لیا ہے تو میں دونوں کی لاشیں گرا دوں گا۔ اپنی خیریت چاہتی ہو تو آئندہ میرا پیچھا نہ کرنا۔“

وہ الٹے پاؤں چند قدم چلی۔ پھر پلٹ کر امیر حسن کی طرف بھاگنے لگی۔ امیر حسن اسے اپنی طرف آتے دیکھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ جب وہ قریب آئی تو اس نے پوچھا۔ ”تم اس طرح کیوں بھاگی آ رہی ہو؟“

وہ ہانپتے ہوئے بولی۔ ”تم اُس کے قریب نہ جانا۔ ہم نے یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ سفر کے دوران وہ پستول لے کر چلے گا۔ وہ تو ٹھائیں سے گولی چلا کر تمہیں مار دے گا اور تم کچھ نہیں کر سکو گے۔ اس کے لئے تمہیں کوئی دوسری تدبیر سوچنی ہو گی۔ چلو واپس چلو۔“

امیر حسن نے دور کھڑے ہوئے راجہ جی کو گھور کر دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں بدستور پستول تھا۔ امیر حسن نے شازیہ کا ہاتھ پکڑ کر طیارے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ ”یہ بہت برا ہوا۔ تم اپنے آپ کو قابو نہیں رکھتی تھیں۔ وہاں سفر کے دوران تم نے بارہا ایسی باتیں کیں۔ جس سے اسے شبہ ہو گیا۔ اب تو یہ شبہ یقین میں بدل گیا ہو گا کہ ہم اسے ہلاک کرنا چاہتے ہیں۔ اسی لئے اس نے پستول دکھا کر تمہیں بھاگنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اب وہ بہت زیادہ محتاط رہے گا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسے محتاط آدمی کو کسی طرح ہلاک کرنا چاہئے۔“

”تم تو ذرا ذرا سی بات پر ہمت ہار جاتے ہو۔ کوئی نہ کوئی موقع ضرور ملے گا۔“

وہ آدھے گھنٹے کے بعد طیارے میں واپس آ گئے۔ وہاں چیخ و پکار جاری تھی۔ ان مسافروں کو ناشتے کے طور پر دو سلائس اور مکھن کی آدھی ٹکیہ دی گئی تھی۔ ایک انڈا دیا گیا تھا جس پر وہ اعتراض کر رہے تھے۔ کیونکہ رات کو بھی آدھا پیٹ کھایا تھا۔ اب پیٹ بھر کر کھانا مانگ رہے تھے۔ ایئر ہوسٹس اور اسٹیورڈ انہیں سمجھانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ امیر حسن بھی انہیں سمجھانے لگا۔ چند نوجوان مشتعل ہو کر اپنی جگہ سے اٹھ گئے۔ ایک نے دھمکی دی۔ ”اگر پیٹ بھر کر کھانا نہ دیا گیا تو ہم اسٹیورڈ پر دھاوا بول دیں گے جو کچھ ہاتھ لگے گا۔ سب کے سب بانٹ کر کھا لیں گے۔“

امیر حسن نے کہا۔ ”آپ لوگوں کو ایسا کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ یہاں جو کچھ ہے وہ سب آپ لوگوں کے لئے ہے اور ہم یہاں آپ کی خدمت کے لئے ہیں۔ سب سے ایک بار پوچھتے ہیں۔ کیا آپ ہماری تقسیم کے مطابق کھانا چاہتے ہیں یا ایک ہی وقت پیٹ بھر لینا چاہتے ہیں؟“

ستر فیصد مسافروں کے ہاتھ اس بات کے لئے اٹھ گئے کہ وہ پیٹ بھر کے کھانا چاہتے ہیں۔ پہلے کھائیں گے تو اس کے بعد سوچیں گے۔ امیر حسن نے کہا۔ ”ٹھیک ہے' آپ لوگ خوش ہو جائیں ابھی پیٹ بھر کے کھانا دیا جائے گا۔“

تھوڑی دیر بعد امیر حسن نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ ایئر ہوسٹس اور اسٹیورڈ نے تمام مسافروں تک اتنا کھانا پہنچا دیا کہ وہ پیٹ بھر کر کھا سکیں۔ بہت سا کھانا بچ گیا۔ امیر حسن نے اعلان کیا۔ ”جو کھانا آپ لوگوں نے بچایا ہے وہ دوپہر کے لئے کافی ہے لیکن شام کے لئے ناکافی ہو گا۔ شام کو شاید ناشتہ کے برابر کھانا ملے۔ میں ایک بار پھر سمجھاتا ہوں کہ ہم لوگوں کو جوانوں کی ایسی ٹیم بنانا چاہئے جو یہاں سے کسی آبادی کی تلاش میں جائے اور ہمارے لئے کوئی خوشخبری لے کر آئے۔“

کسی نے پوچھا۔ ”تمہارے ملک کی ایئر لائن والے اب تک کیا کر رہے ہیں؟ ہماری تلاش میں کیوں نہیں آئے؟“

امیر حسن نے جواب دیا۔ ”ہمارے ذرائع اتنے وسیع نہیں ہیں کہ ہم کسی بھی گمشدہ طیارے کو تلاش کرنے کے لئے کوئی فاضل طیارہ یا ہیلی کاپٹر روانہ کر سکیں۔ ویسے ہمیں یقین ہے کہ ہماری دوستانہ خارجہ پالیسی کام آئے گی۔ ہمارا کوئی دوست ملک اپنے

طیارے ہماری تلاش کے لئے روانہ کرے گا۔ ہمیں اس کے لئے انتظار کرنا ہو گا لیکن کب تک انتظار کرنا ہو گا یہ ہم میں سے کوئی نہیں جانتا۔ میں احتیاطاً آپ لوگوں کو سمجھاتا آ رہا ہوں کہ کھانے کے معاملے میں بچت کریں لیکن آپ لوگ میری بات نہیں سن رہے ہیں۔"

پھر کسی طرف سے کہا گیا۔ "مسٹر! آپ باتیں بنانے کی کوشش نہ کریں اگر آپ کو ہم سے ہمدردی ہے یا آپ کو اپنی ایئرلائن کی نیک نامی عزیز ہے تو آپ یہاں سے کسی آبادی کی تلاش میں کیوں نہیں جاتے۔ آپ جائیں۔ ہم یہاں آپ کی واپسی کا انتظار کریں گے۔"

امیر حسن نے جواب دیا۔ "جب ہم اپنے ملک سے پرواز کرتے ہیں تو اس جہاز کی تمام ذمہ داریاں ہم پر ہوتی ہیں۔ جب تک ہم اس جہاز کے آخری مسافر کو کسی آبادی تک نہیں پہنچائیں گے اس وقت تک اس جہاز کو چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔"

وہ بہت دیر تک ایک دوسرے سے بحث کرتے رہے لیکن کوئی شخص کسی نتیجے پر نہیں پہنچا۔ کوئی وہاں سے کسی آبادی کی تلاش میں نہیں جانا چاہتا تھا۔ سب یہی سوچ رہے تھے کہ اس برفانی علاقے میں کہاں بھٹکتے پھریں گے لیکن اتنا ضرور تھا کہ لوگ کبھی کبھار باہر نکل جاتے تھے وہ اپنے ہاتھوں میں کپڑے کے بڑے بڑے ٹکڑے پکڑے رہتے تھے تاکہ کوئی طیارہ وہاں سے گزرے تو جھنڈے کی طرح لہرا کر اپنی طرف متوجہ کر سکیں۔

دوپہر کے وقت تو صبح کا بچا ہوا کھانا کام آیا۔ اس وقت بھی لوگوں نے پیٹ بھر کر کھایا۔ دوسرے وقت کی پروا نہیں کی۔ وہاں بھوکے رہنے والے بہت کم تھے۔ وہ خود کو اس خیال سے بہلا رہے تھے کہ امدادی طیارہ صبح نہیں آیا ہے تو شام تک ضرور آ جائے گا۔

شام بھی ہو گئی۔ دن کی روشنی میں کوئی طیارہ وہاں سے نہیں گزرا۔ ایسا لگتا تھا جیسے دنیا والوں نے انہیں فراموش کر دیا ہو۔ جب اندھیرا ہونے لگا تو سب فکر مند ہو گئے کہ کل بھی کوئی طیارہ نہ آیا تو کیا ہو گا؟

"ہو گا کیا؟" امیر حسن نے کہا۔ "آپ لوگ یہی چاہتے تھے کہ کھانا ختم ہو جائے اور یہ ختم ہو گیا۔ میں پھر ایک بار آپ لوگوں کو سمجھاتا ہوں کہ نوجوانوں کی ایک ٹیم بنائیں۔ ہم صبح انہیں یہاں سے روانہ کر دیں۔ آپ لوگوں کے سوچنے کے لئے ابھی پوری رات

پڑی ہے۔"

سوچنے کے لئے تمام رات پڑی تھی لیکن وہ رات گزاری نہیں جا رہی تھی۔ کیونکہ بھوک لگ رہی تھی اور بھوک کی وجہ سے دماغ کام نہیں کر رہا تھا۔ ان کے آگے بچا ہوا آخری کھانا تقسیم کر دیا گیا تھا اور ان سے کہہ دیا گیا تھا کہ یہ آخری خوراک ہے اسے ابھی کھا لیں یا صبح کے لئے بچا کر رکھ لیں۔

سب لوگ اپنے اپنے حصے کا کھانا لئے بیٹھے ہوئے تھے۔ جو مائیں تھیں وہ اپنی ممتا سے مجبور ہو کر بچوں کو کھلا رہی تھیں اور اپنے حصے کا کھانا ان کے لئے بچا کر رکھ رہی تھیں۔ جو بوڑھے تھے وہ تھوڑے سے کھانے کو حسرت سے دیکھ رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ بڑھاپے میں انسان ندیدہ کیوں ہو جاتا ہے اور نوجوانوں کا خیال تھا کہ بھوک جوانی میں زیادہ لگتی ہے۔ مشکل یہ تھی کہ وہاں کسی عمر کی مناسبت سے کھانا نہیں تھا۔ کچھ لوگوں نے کھا لیا۔ کچھ لوگوں نے بچا لیا اور کسی طرح سوتے جاگتے ہوئے مصیبت کی وہ دوسری رات بھی گزار دی۔ صبح ہوئی تو لوگ باہر جانے لگے۔ جن لوگوں نے کھانا بچا لیا تھا ان کے لئے اطمینان کے لمحات تھے وہ پیٹ بھر رہے تھے۔ تھوڑا ہی سہی لیکن انہیں تسلی ہو گئی تھی مگر جو لوگ رات کو کھا چکے تھے اب وہ خالی پیٹ تھے جس کے نتیجے میں اکثریت نے یہ فیصلہ سنایا کہ اب ایک ٹیم آبادی کی تلاش میں جائے گی۔ سوال یہ پیدا ہوا کہ جو لوگ یہاں سے جائیں گے وہ راستہ کس طرح یاد رکھیں گے دور تک برف کا میدان تھا۔ میلوں دور جا کر واپسی کا راستہ سمجھ میں نہیں آ سکتا تھا۔

امیر حسن نے کہا۔ "پائلٹ کے کیبن میں ایک قطب نما رکھا ہوا ہے۔ اس ٹیم کو وہ قطب نما دیا جائے گا۔ پھر یہ کہ وہ ٹیم اپنے ساتھ ڈھیر سارے کپڑے لے کر جائے گی۔ دور دور تک جو درخت نظر آ رہے ہیں ان پر کپڑوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے نشانی کے طور پر باندھتی چلی جائے گی۔ وہ درخت اسی طرح شناخت کا سبب بن جائیں گے۔ واپسی میں وہ ایسے ہی درختوں کو دیکھ کر راستے کا تعین کریں گے۔ جن پر ان کا باندھا ہوا کپڑا موجود ہو گا۔"

صبح دس بجے تک بیس آدمی جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ ان میں صرف نوجوان ہی نہیں بلکہ ادھیڑ عمر کے لوگ بھی تھے۔ وہ اس لئے جانا چاہتے تھے کہ جہاز میں اب کھانا ملنے کی امید نہیں رہی تھی۔ جلد از جلد کسی آبادی میں پہنچ کر کھانا ملنے کی توقع تھی۔ بیس

آدمیوں کو دیکھ کر امیر حسن نے کہا۔ "یہ بڑی اچھی بات ہے کہ لوگ اتنی تعداد میں تیار ہو گئے ہیں۔ اب پانچ پانچ کی تعداد میں چار ٹولیاں چاروں سمت جائیں گی اور قطب نما کا سہارا لینے کی بجائے کپڑوں کے چیتھڑوں کا سہارا لیں گی اور انہیں مختلف درختوں پر باندھتے ہوئے چلی جائیں گی۔ ہر ٹیم کے لئے یہی طریقہ کار معقول اور مناسب ہو گا۔"

ایسے طریقہ کار کے لئے ایک ٹیم نے سرخ رنگ کے کپڑے لئے' دوسری ٹیم نے سفید رنگ کے' تیسری نے نیلے اور چوتھی نے پیلے رنگ کے کپڑے اپنی اپنی شناخت کے لئے رکھ لئے۔ وہاں سے وہ ٹیمیں چار مختلف سمتوں میں روانہ ہو گئیں۔ سب لوگ دعائیں مانگ رہے تھے کہ وہ جلدی جائیں۔ زیادہ سے زیادہ دوپہر کا فاقہ ہو اور شام تک انہیں کھانا مل جائے اور وہ کسی آبادی میں پہنچ کر گرم بستروں پر آرام سے سو سکیں۔

دوپہر کا وقت آیا اور گزر گیا۔ لوگ اتنے کمزور بھی نہیں ہوئے تھے کہ ایک وقت کا فاقہ برداشت نہ کر سکیں۔ دیکھا جائے تو صبح سے فاقے ہو رہے تھے کیونکہ بہت سے لوگوں نے پچھلی رات کھانا کھا لیا تھا اور صبح کے لئے نہیں بچایا تھا۔ شام تک ان کی حالت خراب ہونے لگی۔ سب لوگ بھوک سے پریشان تھے۔ وہ بار بار گزرتے ہوئے ایئر ہوسٹس اور اسٹیورڈ کو دیکھتے تھے کہ شاید وہ کہیں سے کھانا مہیا کریں گے۔

شام کو دونوں اسٹیورڈ جہاز سے باہر گئے۔ آدھے گھنٹے کے بعد امیر حسن تیزی سے چلتا ہوا واپس آیا۔ پھر اس نے ڈاکٹر سے کہا۔ "ڈاکٹر آپ ذرا اپنا بیگ لے کر میرے ساتھ باہر چلیں۔ میرا ساتھی چلنے کے قابل نہیں ہے۔ وہ اچانک ہی گر پڑا تھا۔ شاید اس کے پاؤں پر فالج کا اثر ہے۔"

ڈاکٹر اپنا بیگ لے کر اٹھ گیا اور اس کے ساتھ جانے لگا۔ دوسرے لوگوں کو کسی فالج زدہ اسٹیورڈ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ سب کے پیٹ خالی تھے۔ سب اپنی اپنی پریشانی میں مبتلا تھے۔ کوئی ان کے ساتھ باہر نہیں گیا۔

کافی وقت گزرنے کے بعد ڈاکٹر اور امیر حسن اس دوسرے اسٹیورڈ کو دونوں طرف سے سہارا دے کر جہاز کے اندر لے آئے۔ وہ آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ ڈاکٹر اسے سمجھا رہا تھا۔ "گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ تھوڑی سی مالش ہوتی رہے گی تو بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔ میں نے انجکشن دیا ہے۔ ابھی خاطر خواہ اثر ہو گا۔"

ایک مسافر نے اس اسٹیورڈ کی طرف دیکھ کر برا سامنہ بناتے ہوئے کہا۔ "اس جہاز

میں بوڑھے اور بیمار لوگ نہ ہوتے تو ہمارا بہت سا کھانا بچا رہتا جو اس وقت ہمارے کام آتا۔ کاش کہ ہم اتنی تعداد میں یہاں نہ ہوتے۔"

دوسری طرف سے ایک مسافر نے کہا۔ "کاش کہ تم ہمارے درمیان نہ ہوتے' تمہارا کھانا بچ جاتا تو وہ ہمارے کام آتا۔"

ایک ایئر ہوسٹس نے ہاتھ اٹھا کر انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "آپ لوگ آپس میں جھگڑا نہ کریں۔ میں آپ لوگوں کو ایک خوشخبری سناتی ہوں۔ ہمارے پاس کافی ذخیرہ ہے اور بسکٹ کے ڈبے ہیں۔ ابھی آپ لوگوں کی خدمت میں دو دو بسکٹ اور ایک ایک کپ کافی پیش کی جائے گی۔"

سب کے چہرے خوشی سے کھل گئے۔ ایک کپ کافی اور دو دو بسکٹ ڈوبنے والوں کے لئے تنکے کی طرح سہارا بن گئے تھے۔ اس سہارے پر وہ تیسری رات بھی گزر گئی۔ چوتھی صبح ہوئی تو ایک عورت نے ہسٹریائی انداز میں چیختے ہوئے اپنے کپڑے پھاڑ لئے۔ سر کے بال نوچنے لگی اور چیخ چیخ کر کہنے لگی۔ "میں یہاں نہیں رہوں گی۔ میں مر جاؤں گی۔ کیا مصیبت ہے نہ کھانے کو ملتا ہے نہ آرام سے سونا نصیب ہوتا ہے۔ ہم تین راتوں سے اور تین دنوں سے اس سیٹ پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہمارا کیا بنے گا۔ یہ دنیا والے ہماری خبر کیوں نہیں لیتے؟"

اسے اس انداز میں چیختے اور پاگلوں کی طرح کپڑے پھاڑتے دیکھ کر بہت سی عورتیں رونے لگیں۔ بچے بھی سہم کر اپنی اپنی ماؤں کی گود میں دبک گئے۔ ان عورتوں کو بڑی مشکل سے سمجھا منا کر خاموش کرایا گیا۔ کچھ لوگ باہر چلے گئے۔ ان کے ہاتھوں میں فاضل کپڑے تھے اور وہ کسی گزرنے والے طیارے کو متوجہ کرنا چاہتے تھے۔ بس اسی ایک امید پر وہ لوگ اپنی موت سے لڑ رہے تھے اور زندہ رہنے کی کوشش میں مصروف تھے۔

طیارے کے اندر دو ایئر ہوسٹس نے وہاں بیٹھے ہوئے آٹھ بچوں کو اپنے پاس بلایا۔ پھر انہیں لے کر اسٹیورڈ روم میں چلی گئیں۔ جب وہ بچے آدھے گھنٹے کے بعد اپنی ماؤں کے پاس واپس آئے تو بہت خوش تھے کیونکہ انہیں کھانے کے لئے بسکٹ اور پینے کیلئے دودھ مل گیا تھا۔ یہ دیکھتے ہی راجہ محمود جہانگیر اپنی جگہ سے اچھل کھڑا ہو گیا۔ پھر اسٹیورڈ روم کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "یہ کیا بات ہے؟ ان بچوں کو تو کھانا یہاں سے

مل رہا ہے؟"

امیر حسن نے دونوں ہاتھ پھیلا کر اس کا راستہ روکتے ہوئے کہا۔ "رُک جائیے۔ آپ ہمارے کمرے کی طرف نہیں جا سکتے۔"

وہ بولا۔ "جو کھانا ان بچوں کو مل رہا ہے وہ ہمیں بھی ملنا چاہئے۔"

"نہیں مل سکتا۔ تھوڑا سا کھانا صرف معصوم بچوں کے لئے ہے۔ بڑے بھوک برداشت کر سکتے ہیں۔ بچے ایسا نہیں کر سکتے۔ آپ بچے والے ہیں تو اس بات کو سمجھنے کی کوشش کریں اور چپ چاپ جا کر اپنی سیٹ پر بیٹھ جائیں۔"

راجہ محمود جہانگیر نے اپنی پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کر پستول نکالتے ہوئے کہا۔ "میرے سامنے سے ہٹ جاؤ۔ میں بھوکا ہوں اور بھوک کے سامنے کسی کا لحاظ نہیں کروں گا۔"

امیر حسن نے اسے غور سے دیکھا۔ دشمن کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے' بھوک اور پاگل پن میں کر گزرے گا۔ اس لئے وہ چپ چاپ ایک طرف ہٹ گیا۔ اس کے اشارے پر ائیر ہوسٹل بھی راستے سے ہٹ گئیں۔ وہ آگے بڑھنے لگا تو اچانک۔ وی' آئی پی' روم کے دروازے سے ایک فوجی آفیسر نے للکارتے ہوئے کہا۔ "مسٹر رک جاؤ' اس وقت تم میرے نشانے پر ہو۔ ذرا بھی حرکت کرو گے تو میں گولی مار دوں گا۔"

راجہ محمود جہانگیر نے غصے سے چیختے ہوئے کہا۔ "چلا دو گولی لیکن یاد رکھو میں مرنے سے پہلے ایک آدھ کو مار کر مروں گا۔ میرے پستول سے بھی گولیاں نکلیں گی اور میں نہیں جانتا کہ کون کون اس کا نشانہ بنے گا۔"

یہ کہتے ہوئے وہ فوجی افسر کی طرح پلٹ گیا۔ اب دونوں ایک دوسرے کے روبرو کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان کافی فاصلہ تھا۔ لیکن وہ ایک دوسرے پر گولی نہیں چلا سکتے تھے۔ فوجی افسر نے امیر حسن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "پہلے کئی بار مجھے اس اسٹیورڈ پر غصہ آیا کیونکہ یہ یہاں ڈکٹیٹر بنا ہوا تھا۔ اپنی مرضی سے کھانا تقسیم کرنا چاہتا تھا اور اپنے احکامات صادر کر رہا تھا کہ کچھ لوگوں کو بستی کی تلاش میں جانا چاہئے لیکن اب میں سمجھ گیا ہوں۔ جو کچھ یہ کر رہا ہے بالکل درست کر رہا ہے۔ خصوصاً بچوں کے لئے کھانا محفوظ رہنا چاہئے۔ بڑی عمر کے لوگ صبر کریں۔ ہم کل تک بھوک برداشت کر سکتے ہیں۔ مسٹر' آپ اپنا پستول جیب میں رکھ لیں۔"

راجہ محمود جہانگیر کچھ کہنا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے ہی امیر حسن نے کہا۔ "آفیسر آپ نے میری تعریف کی۔ بہت بہت شکریہ۔ میں آپ کو اور جہاز کے تمام مسافروں کو یہ خوشخبری سنانا چاہتا ہوں کہ ہم آپ لوگوں کو بھوکا ضرور رکھیں گے لیکن بھوک سے مرنے نہیں دیں گے۔"

فوجی افسر نے حیرانی سے پوچھا۔ "اس کا کیا مطلب ہوا؟ بھوکا بھی رکھو گے اور بھوک سے مرنے بھی نہیں دو گے؟"

"ابھی دوپہر کو ہم پھر دو دو بسکٹ اور ایک ایک کپ کافی سپلائی کریں گے۔"

کتنے ہی لوگ بے چینی سے اٹھ کھڑے ہو گئے۔ "دوپہر کو کیوں؟ ابھی کیوں نہیں دیا جائے گا؟ ہمیں بھوک لگ رہی ہے۔ ہم بھوک برداشت نہیں کر سکتے۔" کتنی ہی طرف سے کتنی ہی قسم کی آوازیں آنے لگیں۔

فوجی افسر نے گرج کر کہا۔ "آپ تمام لوگ خاموش رہیں۔ میں بھی آپ کی طرح مسافر ہوں' اس لئے آپ لوگوں کی طرف سے باتیں کروں گا۔ آپ لوگ خاموشی سے سنیں۔"

اس نے امیر حسن کو مخاطب کیا۔ "کیوں مسٹر ہمارے اسٹور میں بسکٹ اور کافی وغیرہ کا کتنا ذخیرہ ہے؟ تمہاری باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ تم اسی طرح تھوڑا تھوڑا کھانا دے کر ہمیں بھوکا بھی رکھو گے اور بھوک سے مرنے بھی نہیں دو گے۔ کیا یہی تمہاری پلاننگ ہے؟"

"جناب' ہماری پلاننگ تو بہت کچھ ہے۔ ہم نے ایشیائی کھانوں کے علاوہ انگریزی کھانے بھی کھلائے پھر ہم نے کھانے میں گوشت کی سپلائی بند کر دی آپ لوگوں کو صرف ڈبل روٹی کے سلائس اور انڈے کھانے کے لئے دیتے رہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم جان بوجھ کر گوشت کے تمام ڈبوں کو چھپا کر رکھتے رہے۔ اب بھی بے شمار ڈبوں میں وہ گوشت آپ کے لئے محفوظ ہے۔"

"کیا؟" سب کے سب پھر ایک بار اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور طرح طرح کے سوالات کرنے لگے۔ وہ گوشت کے ڈبے ہم سے کیوں چھپا کر رکھے گئے؟ کس لئے چھپا کر رکھے گئے؟ وہ ہمیں کب کھانے کے لئے دیئے جائیں گے؟"

امیر حسن نے دونوں ہاتھ اٹھا کر سب لوگوں کو خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے

کہا۔ "آپ لوگ تحمل سے میری بات سن لیجئے۔ جو ڈبے ہم نے چھپا کر رکھے ہیں ان کا گوشت صرف دو دن کے لئے تھا۔ جہاز کے حادثہ میں پچیس آدمی مارے گئے ہیں۔ میں اس انتظار میں تھا کہ کچھ اور لوگ کم ہو جائیں۔ اب بیس آدمی کسی آبادی کی طرف روانہ ہو چکے ہیں۔ اس وقت ہمارے جہاز میں ایک سو چونتیس افراد ہیں۔ اس حساب سے جو گوشت دو دنوں کے لئے تھا۔ اب ہم اسے تین دنوں تک کھا سکتے ہیں۔ اپنی خوراک ذرا کم کردیں تو چار دنوں تک بھی جا سکتا ہے۔"

اس کی بات سن کر سب لوگ خوشی سے اچھلنے لگے' نعرے لگانے لگے اور امیر حسن کی تعریفیں کرنے لگے۔ راجہ محمود جہانگیر نے پستول کو اپنی جیب میں واپس رکھتے ہوئے کہا۔ "میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ہمارے ملک کی ایئر لائنز میں ایسے ذہین لوگ کام کرتے ہوں گے۔ چلو ٹھیک ہے۔ اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میں بھوکا نہیں مروں گا۔"

یہ کہتا ہوا وہ اپنی سیٹ پر جا کر بیٹھ گیا۔ فوجی افسروی' آئی پی کلاس کے دروازے سے چلتا ہوا امیر حسن کی طرف بڑھنے لگا۔ پھر اچانک ہی اس نے رک کر اپنے ریوالور کی نال راجہ محمود جہانگیر کی کنپٹی پر رکھ دی اور سخت لہجے میں بولا۔ "اگر تم نے ذرا بھی حرکت کی تو میں گولی چلا دوں گا اور ایک سو چونتیس آدمیوں میں سے ایک کم ہو جائے گا۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا دوسرا ہاتھ اس کی پتلون کی جیب کی طرف بڑھایا پھر اس میں سے پستول نکالتے ہوئے کہا۔ "تمہارے جیسے پاگل اور بددماغ آدمی کے پاس ایسے ہتھیار نہیں ہونے چاہئیں۔"

راجہ محمود جہانگیر نے کہا۔ "آفیسر' آپ مجھ پر زیادتی کر رہے ہیں۔ میرے پاس اس پستول کا لائسنس ہے۔"

"وہ لائسنس تمہارے ملک کی حدود تک ہے اور اس وقت تم اپنے ملک میں نہیں ہو۔"

یہ کہہ کر وہ امیر حسن کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "ہاں' تو مسٹر کیا نام ہے تمہارا؟"

"امیر حسن۔"

"مسٹر امیر حسن تم نے واقعی بڑی ذہانت کا ثبوت دیا ہے۔ اب یہ بتا دو کہ جب ایک سو چونتیس آدمیوں کے لئے تقریباً چار دنوں کا راشن موجود ہے تو پھر کھانا کیوں

روک رہے ہو؟"

"اگر میں ان ڈبوں کا گوشت سپلائی کرنا شروع کر دیتا تو وہ بیس آدمی کبھی یہاں سے نہ جاتے۔ وہ لوگ بھوک سے مجبور ہو کر گئے ہیں۔ اب میں دوپہر سے یہ کھانا تقسیم کروں گا۔"

آفیسر نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔ "واقعی تم نے بڑی مصلحت اندیشی سے کام لیا ہے۔ بہرحال اب تمہارا اسٹور روم میرے قبضے میں ہو گا اور میری مرضی کے مطابق راشن سپلائی ہو گا۔"

"نہیں آفیسر' اس جہاز کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک کی ذمہ داری ہم پر ہے۔ اسٹور روم ہمارے ہی قبضے میں رہے گا۔ رہ گئی یہ بات کہ آپ اسٹور پر جبراً قبضہ کریں گے تو بے شک کر لیں لیکن راشن آپ کو نہیں ملے گا۔ ہم جانتے تھے کہ ہم پر ایسا وقت آ سکتا ہے' جب تمام مسافر ہمارے خلاف دھاوا بول دیں گے اور ہمیں اپنی مرضی سے کھانا تقسیم نہیں کرنے دیں گے۔ یہی سوچ کر ہم نے پہلی رات کو ہی وہ تمام کھانے کے ڈبے اس جہاز سے باہر لے جا کر ایسی جگہ چھپا دیئے جہاں تک آپ کے فرشتے بھی نہیں پہنچ سکتے۔ وہاں تک صرف ہم دو اسٹیورڈ ہی جا سکتے ہیں۔"

آفیسر نے اپنے ریوالور کو سیدھا کیا۔ پھر امیر حسن کا نشانہ لیتے ہوئے بولا۔ "تیسرا شخص میں ہوں۔ میں اس راشن تک پہنچوں گا اور اسے اپنے طور پر تقسیم کروں گا۔"

"نہیں آفیسر' آپ گولی چلا دیں۔ مجھے مار ڈالیں۔ اس کے بعد میرے ساتھی اسٹیورڈ کو بھی مار ڈالیں۔ ہمارے بعد ایک سو بتیس افراد یہاں رہ جائیں گے اور پھر بھوکے مرتے مرتے ایک فرد بھی زندہ نہیں رہے گا۔ ہمیں پورا یقین ہے کہ ہمارے بعد کوئی اس راشن تک نہیں پہنچ سکے گا۔ یقین نہ ہو تو.......... پہنچ کر دکھا دیجئے۔"

وہ افسر اسے گھور کر دیکھنے لگا۔ اسی وقت ایک عورت نے روتے ہوئے کہا۔ "یہ کیسی انسانیت ہے۔ میرا شوہر دل کا مریض تھا وہ اس سفر میں مر گیا اور تم لوگ یہ سوچ کر خوش ہوتے ہو کہ آدمی کم ہو گئے۔"

امیر حسن نے کہا۔ "مادام! ہمیں آپ کے شوہر کی موت پر بے حد افسوس ہے اور ہمیں دوسروں سے بھی اتنی ہی ہمدردی ہے جن کے عزیز رشتہ دار مارے جا چکے ہیں۔ ہم پہلے بھی وعدہ کر چکے ہیں اور اب بھی اس وعدے پر قائم ہیں کہ جب امدادی طیارہ آئے گا

تو زندہ انسانوں کے بعد وہ پچیس لاشیں بھی آبادی تک پہنچائی جائیں گی تاکہ انہیں عزت و احترام سے دفن کیا جاسکے۔ فی الحال تو یہ مسئلہ زیر بحث ہے کہ راشن پر کس کا قبضہ ہونا چاہئے اور کون راشن تقسیم کرنے کا حق دار ہے؟"

اس کی بات سن کر فوجی افسر نے ریوالور کو اپنے ہولسٹر میں رکھ لیا پھر کہا۔ "ٹھیک ہے تم راشن تقسیم کرنے کے حقدار ہو۔ میں اپنی سیٹ پر جاتا ہوں۔ تم اپنا کام انجام دو۔"

امیر حسن نے کہا۔ "ٹھہرئیے۔ آپ تمام لوگوں کو یہ بھی بتا دوں کہ ہمارے پاس ایندھن بہت کم ہے۔ یعنی یہاں چولہا جلا کر بچوں کے لئے دودھ اور بڑوں کے لئے کافی تیار کرنے کے لئے گیس بہت کم رہ گئی ہے۔ ہم اس گیس کے ذریعے چولہا جلا کر ڈبے کے ادھ کچے گوشت کو فرائی نہیں کر سکتے۔ اس کے لئے ہمیں دوسرے ایندھن کی ضرورت ہو گی۔ ہمارے پاس کلہاڑی نہیں ہے کہ ہم باہر جاکر درخت کی لکڑیاں کاٹ کر لائیں اور ان گیلی لکڑیوں کو سلگائیں۔ ہمارے سامنے اب ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ ہم سامان والے کیبن میں جائیں۔ تمام مسافر اپنا جو سامان خوشی سے ہمیں دے سکتے ہیں۔ ہم اس سامان کو ایندھن کے طور پر استعمال کریں گے۔ مثلاً کپڑے' پلاسٹک کا سامان اور لکڑی کے صندوق وغیرہ ہمارے کام آسکتے ہیں۔ اس کے ذریعے ہم کھانا تیار کر کے آپ لوگوں تک پہنچا سکتے ہیں۔"

کچھ لوگوں نے اپنا سامان دینے سے اعتراض کیا۔ کچھ لوگ بھوک مٹانے کی خاطر ہر طرح کی قربانی دینے کے لئے تیار تھے۔ اس پر امیر حسن نے کہا۔ "اگر ہمیں سامان نہ ملا تو آپ کو کھانا نہیں ملے گا۔ جن کے سامان سے کھانا تیار کیا جائے گا انہیں پیٹ بھر کر کھانے کے لئے دیا جائے گا۔ جو لوگ ایسی قربانیوں سے گریز کریں گے انہیں آدھا کھانا سپلائی کیا جائے گا۔ راشن بچانے کا ایک طریقہ یہ بھی ہو گا۔"

اکثر لوگوں کو اپنی چیزیں عزیز ہوتی ہیں۔ اس لئے کہ وہ ایک ملک سے دوسرے ملک جا کر انہیں خریدتے ہیں لہٰذا وہ انہیں برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتے۔ ایسے کچھ لوگوں نے آدھا پیٹ کھانا منظور کر لیا لیکن اپنا سامان دینے کے لئے تیار نہ ہوئے۔ بہرحال کھانا تیار کرنے کے لئے کچھ سامان ایندھن کے طور پر مل گیا۔ کوشش یہ کی گئی کہ ایسا سامان لیا جائے کہ سامان دینے والے کو بہت زیادہ نقصان میں نہ رہنا پڑے۔

دونوں اسٹیورڈ نے ڈاکٹر سے درخواست کی کہ وہ کھانا تیار کرنے میں ان کی مدد کے

لئے باہر چلیں۔ ڈاکٹر ان کے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہو گیا۔ فوجی افسر نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "جب ڈاکٹر تمہارے ساتھ جا سکتا ہے تو میں بھی تمہاری مدد کے لئے آ سکتا ہوں۔"

امیر حسن نے کہا۔ "سوری آفیسر' میں صرف ڈاکٹر کو یہاں سے لے جاؤں گا۔ آپ کے پاس مہلک ہتھیار ہے۔ اگر آپ کو راشن والی جگہ معلوم ہو جائے گی تو آپ ہتھیار کے بل پر وہاں قابض ہو جائیں گے۔ لہٰذا آپ یہاں آرام سے بیٹھے رہیں۔ تھوڑی دیر بعد کھانا مل جائے گا۔"

یہ کہہ کر وہ دونوں اسٹیورڈ ڈاکٹر کے ساتھ باہر چلے گئے۔ جہاز کے اندر بڑی بے چینی سے انتظار ہونے لگا۔ ان کے پاس کوئی ایسا مشغلہ بھی نہیں تھا کہ وقت گزارا جاتا۔ سب لوگ اتنے دنوں سے اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ کبھی اٹھ کر جہاز کے اندر ٹہلنے لگتے تھے یا باہر چلے جاتے تھے۔ باہر سے پھر اندر آجاتے تھے.......... لیکن وقت تھا کہ گزرتا نہیں تھا۔ بس عورتیں فائدے میں تھیں وہ بولتی تھیں اور بولتے بولتے قیامت کا وقت گزار لیتی تھیں۔

☆======☆======☆

باہر جہاز سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر اونچے نیچے ٹیلے سے پرے ایک درخت کے نیچے دونوں اسٹیورڈ اور ڈاکٹر نے گوشت بھوننے کا انتظام کیا تھا۔ وہاں آگ سلگائی تھی۔ مصروفیات کے دوران ڈاکٹر نے کہا۔ "مسٹر امیر حسن تمہیں مسافروں کے سامنے خصوصاً اس فوجی افسر کے سامنے یہ نہیں کہنا چاہئے تھا کہ یہاں جو پچیس آدمی مارے گئے ہیں' ان تمام لاشوں کو آخر میں کسی آبادی تک پہنچایا جائے گا۔ اگر وہ تمام لاشیں نہ پہنچیں تو کیا ہو گا؟"

امیر حسن نے جواب دیا۔ "آپ نے یہاں تین راتوں میں کبھی کبھی جانوروں کی آواز سنی ہو گی جیسے ہمارے ہاں جنگلوں یا دیہاتوں کے قریب گیدڑ بولتے ہیں ایسے جانور لاشوں کو نوچ کر کھا جاتے ہیں۔ جب حساب کرنے کی باری آئے گی تو معلوم ہو گا کہ کتنی لاشیں محفوظ ہیں اور کتنی لاشوں کو برفانی گیدڑ نوچ کر لے گئے۔"

دوسرے اسٹیورڈ نے کہا۔ "ان پچیس آدمیوں میں ایسے مسافر بھی مارے گئے ہیں جو بالکل تنہا سفر کر رہے تھے۔ ان کا کوئی شناسا ہم سفر نہیں تھا۔ جب کسی آبادی میں پہنچ کر

ان کے رشتہ داروں کو خبر ملے گی اور وہ ان کے متعلق دریافت کریں گے تو انہیں بتا دیا جائے گا کہ حادثہ پیش آیا تھا اور کس طرح ان کے عزیز و اقارب کی لاشیں جنگلی جانوروں کی خوراک بن گئی ہیں۔"

ڈاکٹر نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "بھوک میں انسان کیسا پاگل' چڑچڑا اور بدتمیز ہو جاتا ہے۔ جہاز کے اندر تمام مسافر ایسے ہی ہو رہے ہیں۔ ایک دوسرے کو کاٹنے کے لئے دوڑتے ہیں۔"

"ہاں بھوک بہت بری بلا ہے۔ آدمی کو جانور بنا دیتی ہے۔"

جب کھانا تیار ہو گیا تو امیر حسن نے مختلف پلیٹوں میں رکھ کر پھر ان پلیٹوں کو ایک بڑی سی ٹرے میں رکھ کر لے جانے سے پہلے پوچھا۔ "ڈاکٹر! آپ کو اسی لئے اپنے ساتھ شامل کیا گیا ہے کہ آپ اچھی اور مضر خوراک کی تمیز کر سکتے ہیں۔"

چار راتیں اور تین دن گزر گئے۔ کوئی امدادی طیارہ اس طرف نہیں آیا تھا اور نہ ہی کسی ملک کا کوئی طیارہ اس طرف سے گزرتا ہوا نظر آیا۔ ایسا لگتا تھا کہ ادھر سے کبھی کوئی طیارہ یا ہیلی کاپٹر گزرتا ہی نہیں ہے۔

پانچویں رات کو اعلان کیا گیا کہ چھپائے ہوئے گوشت کا اسٹاک آہستہ آہستہ ختم ہو رہا ہے۔ لہٰذا مسافروں کو کم سے کم کھانا چاہئے مسافروں کے لئے یہ بات ناقابل برداشت ہو گئی تھی کہ وہ سرد برفانی علاقے میں کبھی بھوکے رہ کر اور کبھی آدھا پیٹ کھا کر اپنے دن گزاریں۔ ہر لمحہ کسی امدادی طیارے کی امید ہوتی تھی۔ اگلے لمحے وہ امید دم توڑ کر پھر زندہ ہو جاتی تھی۔ عجب تذبذب' بے چینی اور اضطراب کے عالم میں وہ سب زندگی گزار رہے تھے۔

صبح کے وقت مسافر مرد عورتیں اور بچے بدستور دو دو چار چار کی ٹولیاں بنا کر باہر جایا کرتے تھے۔ صبح دس بجے راجہ محمود جہانگیر طیارے سے نکل کر ایک طرف جانے لگا۔ وہ طیارے سے دور ہوتا جا رہا تھا ایک ٹیلہ عبور کرنے کے بعد وہ دوسرے ٹیلے کی طرف جا رہا تھا دل میں اندیشہ تھا کہ شازیہ کہیں امیر حسن کے ساتھ اس کا پیچھا نہ کرتی ہو۔ یہ خوف ہمیشہ اس کے دل میں رہتا تھا۔ پندرہ منٹ کے بعد جب وہ واپس طیارے کی طرف آنے لگا تو اچانک ہی کچھ فاصلے پر شازیہ اور امیر حسن کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ اس نے گھبرا کر پوچھا۔ "کیا بات ہے۔ تم لوگ کیا چاہتے ہو؟"

شازیہ نے نفرت سے کہا۔ "میں چاہتی ہوں کہ تمہاری زبان ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائے۔ تم کبھی اپنے سے چھوٹوں کو گالی نہ دے سکو۔ تمہاری آنکھیں بند ہو جائیں۔ تم کبھی کسی عورت کو میلی نظر سے نہ دیکھ سکو اور تمہاری سانسیں رک جائیں تاکہ تم صرف موت کو سونگھ سکو۔"

وہ بولتی جا رہی تھی اور امیر حسن آگے بڑھتا جا رہا تھا اچانک ہی راجہ محمود جہانگیر نے ایک چھلانگ لگا کر امیر حسن کے سینے پر لات ماری۔ وہ لڑکھڑایا۔ برف کی سطح بھربھری تھی۔ وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا۔ گر پڑا۔ راجہ محمود جہانگیر اس کے گرتے ہی جہاز کی طرف بھاگنے لگا لیکن زیادہ دور نہ جا سکا۔ شازیہ اس کے قدموں سے لپٹ گئی' اس طرح وہ دوڑتے ہوئے اوندھے منہ برف پر گر پڑا۔

اس وقت تک امیر حسن نے آ کر اسے دبوچ لیا۔ شازیہ ان سے الگ ہو کر اس انداز میں کھڑی ہو گئی کہ دشمن دوبارہ طیارے کی طرف نہ بھاگ سکے۔ بھاگنا چاہے تو وہ اس سے لپٹ کر پھر اسے گرا دے۔ دوسری طرف وہ دونوں گتھم گتھا ہو گئے تھے۔ برف کی سطح ملائم تھی اس لئے اِدھر اُدھر لڑھکنے کے دوران وہ لوگ دھنس جاتے تھے۔ ہاتھ پاؤں چلاتے وقت دور تک برف اڑنے لگتی تھی۔ اس بات کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ لڑائی کا فیصلہ کیا ہو گا۔ کون سبقت لے جائے گا۔ کون زندہ رہے گا اور شازیہ کس کی موت کا تماشہ دیکھ سکے گی؟

امیر حسن اس طبقے سے تعلق رکھتا تھا جہاں لوگ لڑنا جھگڑنا نہیں جانتے.......... صرف اپنے کام سے کام رکھتے ہیں لیکن یہ عشق پاگل بنا دیتا ہے۔ پاگل بنا دے تو کوئی بات نہیں' چور اور قاتل بنا دے تو اس سے بڑی دکھ کی اور کوئی بات نہیں ہو سکتی۔ شازیہ کے عشق نے اسے ایسا ہی بنا دیا تھا اور وہ لڑنے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوئے بھی راجہ سے لپٹا ہوا تھا۔ کسی طرح اسے زیر کر کے ختم کرنا چاہتا تھا۔

دوسری طرف راجہ محمود جہانگیر نے ایک دنیا دیکھی تھی۔ وہ اپنی دولت سے کتنے ہی غنڈوں' بدمعاشوں کی پرورش کر چکا تھا۔ خود اس نے اپنے ہاتھ سے گولی چلا کر پچھلے راجہ جی کو ہلاک کیا تھا۔ وہ جینا بھی جانتا تھا اور موت سے لڑنا بھی جانتا تھا اس لئے امیر حسن کی ایسی کی تیسی کر رہا تھا۔ اسے اس بری طرح پیٹ رہا تھا کہ بیچارے کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچ رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد امیر حسن کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑنے لگے۔ دشمن نے خود کو چھڑایا پھر جہاز کی طرف بھاگنا شروع کیا۔ شازیہ پہلے ہی راستے میں کھڑی ہوئی تھی۔ اسے بھاگنے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔ دوڑتے ہوئے آ کر' اس سے لپٹنے کی کوشش کی تو راجہ محمود جہانگیر نے ایک الٹا ہاتھ اس کے منہ پر رسید کیا وہ چیخ مار کر برف کی سطح پر بیٹھ گئی۔ راجہ وہاں سے بھاگتا ہوا طیارے کی طرف جانے لگا۔ اب اسے کوئی روکنے والا نہیں تھا۔ اسی وقت شازیہ نے حیرانی سے ایسی بات دیکھی جس کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ بھاگنے والا دوڑتے دوڑتے پھر اوندھے منہ گر پڑا تھا۔

کوئی اپنے آپ نہیں گرتا۔ ٹھوکر کھاتا ہے یا کوئی ٹھوکر مارتا ہے۔ ڈاکٹر نے اسے ٹھوکر ماری تھی۔ اب وہ دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے تھے اور برف پر لڑھک رہے تھے۔

شازیہ دوڑتے ہوئے امیر حسن کے پاس آئی۔ اسے جھنجھوڑ کر اٹھایا۔ "اٹھو۔ کیا پڑے ہوئے ہو۔ سانسیں بعد میں درست کر لینا وہ دیکھو۔ ڈاکٹر نے راجہ جی کا راستہ روک لیا ہے۔ یہ اچھا موقع ہے۔ شاید ڈاکٹر ہماری مدد کرنا چاہتا ہے۔ دوڑو جلدی جا کر اسے دبوچ لو۔"

امیر حسن نے دوڑتے ہوئے جا کر اسے دبوچ لیا۔ اس وقت ڈاکٹر نے راجہ جی کی دونوں بغل میں ہاتھ ڈال کر گردن میں قینچی ڈالی ہوئی تھی۔ یعنی راجہ محمود جہانگیر برف پر اوندھے منہ پڑا ہوا تھا اور ڈاکٹر اسی طرح اسے برف میں دھنسا دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب امیر حسن کی مدد حاصل ہوئی تو یہ بات آسان ہو گئی۔ دشمن کا سر گردن تک دھنستا ہی جا رہا تھا۔ وہ بڑی تیزی اور قوت سے تڑپ رہا تھا لیکن نجات نہیں مل رہی تھی۔

شازیہ کے دیدے پھیل گئے تھے۔ وہ وحشت زدہ سی ہو کر دشمن کو دیکھ رہی تھی جیسے اپنی آنکھوں کے سامنے ننھے سے بچے کو تڑپتے ہوئے دیکھ رہی ہو۔ وہ بچہ اپنے ننھے ننھے ہاتھ پاؤں کو جھٹک رہا تھا۔ تڑپ رہا تھا اسے چیخنے کی مہلت نہیں مل رہی تھی۔ پھر اس بچے کا جسم ساکت ہو گیا تھا۔

ڈاکٹر اور امیر حسن اسے گھسیٹتے ہوئے دو قدم کے فاصلے تک لے گئے۔ ڈاکٹر نے اسے سیدھا کیا۔ پھر اس کے ناک کے نتھنوں میں گھسی ہوئی برف کو انگلی سے نکالا۔ اس کے بعد وہ اس کی کلائی تھام کر سینے پر کان رکھ کر تھوڑی دیر تک خاموش رہا۔ پھر مطمئن

ہو کر اس کی کلائی چھوڑ دی۔ شازیہ کو جیسے سارے جہان کا خزانہ مل گیا ہو۔ وہ یکبارگی خوشی سے چلائی۔ زور زور سے قہقہہ لگایا۔ دونوں ہاتھوں سے برف کو سمیٹ کر اٹھایا اور اسے پھولوں کی طرح لٹانے لگی۔ چیخ چیخ کر کہنے لگی۔ "میرے بچے' میرے لال' آج تیرا انتقام پورا ہو گیا۔ جیسا تیرے ساتھ ہوا ویسا ہی تیرے دشمن کے ساتھ ہوا۔"

وہ خوشی سے دیوانی ہو رہی تھی۔ اسے اپنے آس پاس کا ہوش نہیں تھا۔ اچانک ہی منہ پر طمانچہ پڑا تو ہوش آ گیا۔ سامنے امیر حسن کھڑا ہوا تھا اور اسے جھنجھوڑ کر کہہ رہا تھا۔ "کیا تم پاگل ہو گئی ہو؟ کیا تم چیخ چیخ کر جہاز والوں کو یہ بتانا چاہتی ہو کہ ہم نے کسی کو قتل کیا ہے؟ کیا ہم پھانسی کے تختے پر پہنچ جائیں؟"

وہ ایک دم سے چپ ہو گئی تھی۔ اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا لیکن غلطی تو ہو چکی تھی۔ اس کے خاموش ہوتے ہی دوسری طرف سے فوجی افسر کی آواز سنائی دی۔ "واہ بہت اچھا ڈرامہ ہو رہا ہے۔ ادھر دیکھو۔"

ان لوگوں نے ادھر دیکھا۔ اس کی گردن میں ایک کیمرہ لٹک رہا تھا اور وہ کیمرے کو تھپتھپا کر کہہ رہا تھا۔ "جو ڈرامہ یہاں پلے ہوا ہے میں اس کی کئی تصویریں اتار چکا ہوں۔"

یہ سنتے ہی ڈاکٹر اس کی طرف دوڑتے ہوئے جانے لگا۔ آفیسر نے فوراً ہی ہولسٹر سے ریوالور نکالتے ہوئے کہا۔ "خبردار آگے نہ بڑھنا ورنہ شوٹ کر دوں گا۔ قتل نہیں کروں گا۔ صرف زخمی کروں گا کیونکہ تم لوگ قانون کے ہاتھوں اپنی سزا کو پہنچنے والے ہو۔ کسی کو پھانسی ہو گی۔ کسی کو عمر قید اور کسی کو چند سالوں کی سزا۔"

ایسا کہتے وقت فوجی آفیسر نے شازیہ کی طرف بھی طنزیہ نظروں سے دیکھا۔ شازیہ نے ایک طرف تھوکتے ہوئے حقارت سے کہا۔ "اب مجھے زندہ نہیں رہنا ہے۔ تمہاری ایسی کی تیسی۔ قانون مجھے سزا دے۔ مجھے پھانسی چڑھا دے۔ مجھے کسی بات کی پرواہ نہیں ہے۔"

امیر حسن نے اس کے بازو کو زور سے ہلاتے ہوئے کہا۔ "کیا پاگل ہو گئی ہو۔ تم مرنا چاہتی ہو تو مجھے بھی اپنے ساتھ مارنا چاہتی ہو۔ ڈاکٹر نے ہمارا ساتھ دیا۔ کیا اس کی بھی پروا نہیں ہے۔ اگر یہ ساتھ نہ دیتے تو کیا تم انتقام لے سکتی تھیں۔ خود غرض نہ بنو۔"

آفیسر نے کہا۔ "میرے پاس ہتھکڑی نہیں ہے کہ تم لوگوں کو پہنا دوں۔ ویسے کوئی

اس علاقے سے بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتا۔ جو لوگ قریبی آبادی کی تلاش میں گئے تھے ان میں سے کوئی بھی واپس نہیں آ سکا۔ یہ عبرت کا مقام ہے مجھے امید ہے تم لوگ بھی عبرت حاصل کرو گے اور یہاں سے کہیں نہیں جا سکو گے۔"

امیر حسن نے ایک قدم آگے بڑھ کر کہا۔ "آفیسر' آپ درست کہتے ہیں لیکن یہ بھی تو سن لیجئے کہ اس شخص کو کیوں قتل کیا گیا ہے۔ یہ خود قاتل' زانی' دنیا بھر کا فریبی' مکار اور بدمعاشوں کا بدمعاش ہے۔"

آفیسر نے کہا۔ "یہ سب کچھ ہے۔ یہ قانون کا مجرم ہے لیکن تم لوگوں کو قانون ہاتھ میں لینے کا کوئی حق نہیں تھا اب میرا فرض ہے کہ میں تم لوگوں کو قانون کے حوالے کروں۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "آفیسر ہمارے درمیان کوئی سمجھوتہ ہونا چاہئے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ میں ایک ڈاکٹر ہوں اور یہ لوگ بھی کسی جرائم پیشہ جماعت سے تعلق نہیں رکھتے ہیں۔ شریفانہ زندگی گزارتے رہے ہیں۔"

"میں سب سمجھتا ہوں۔ شریفانہ زندگی گزارنے والے اور معزز کہلانے والے بھی قاتل اور بدمعاش ہوتے ہیں۔ بہرحال اب تم لوگ مجھے کھانے کے اس ذخیرے کی طرف لے جاؤ گے جسے تم لوگوں نے چھپا رکھا ہے اب ذخیرے پر میں قبضہ کروں گا اور اپنے طور پر جہاز والوں کو راشن تقسیم کروں گا۔"

امیر حسن نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "نہیں آفیسر تمہارے پاس ریوالور ہے تو ہمارے پاس راشن ہے۔ دونوں ہی ہتھیار اپنی جگہ اہم ہیں۔ تم یہ ریوالور چلا کر گولی نہیں مار سکتے۔ اس لئے کہ ہم تمہیں کھانا دیتے ہیں۔ ہم کھانا دینے سے انکار کریں تو تمام مسافر ہمیں نوچ کھسوٹ کر مار ڈالیں گے۔ دانشمندی یہی ہے کہ موجودہ حالات پر غور کرو۔ کیا ہمیں آپس میں سمجھوتہ نہیں کرنا چاہئے؟"

فوجی آفیسر نے سوچتی ہوئی نظروں سے انہیں دیکھا۔ پھر ریوالور کی نال کو نیچے کرتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ میں دوپہر تک تمہیں سوچ کر جواب دوں گا لیکن یاد رکھو جب ہمارے درمیان سمجھوتہ ہو جائے گا تو پھر تم لوگ مجھے اپنے راشن کے ذخیرے تک لے جاؤ گے۔"

امیر حسن نے کہا۔ "ایک شرط پر' تم اپنا ریوالور اور پستول ہمیں دے دو گے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں اپنا ہتھیار تمہیں نہیں دے سکتا۔"

"تو پھر ہم بھی اپنا ہتھیار تمہیں نہیں دکھا سکتے۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "مسٹر امیر حسن کیا نادان بچوں جیسی باتیں کر رہے ہو ہمیں ریوالور اور پستول سے کیا لینا ہے۔ سمجھوتے کی شرط صرف ایک ہو گی اور وہ یہ کہ اس کیمرے کے اندر جو فلم ہے وہ ہمیں واپس دی جائے۔ ہم اسے ابھی یہاں ضائع کر دیں گے۔"

امیر حسن نے چونک کر کیمرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "اوہو' میں تو یہ بھول ہی گیا تھا۔ اصل چیز تو یہ فلم ہے۔ ٹھیک ہے آفیسر تم ہمیں یہ فلم دے دو۔"

وہ انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "اگر میں نہ دوں تو؟"

"پھر وہی بچوں جیسی باتیں۔ نہیں دو گے تو تم اور تمام مسافر بھوکے مرو گے یا ہمیں مار ڈالو گے۔ مگر راشن تک نہیں پہنچ سکو گے۔"

وہ تھوڑی دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ "اچھی بات ہے مجھے دوپہر تک سوچنے کی مہلت دو۔ میں سمجھوتے پر راضی ہو گیا تو یہ فلم تمہارے حوالے کر دوں گا۔"

"دوپہر تک فلم بدل سکتے ہو۔"

"میرے پاس یہی ایک فلم کا رول ہے جو اس کیمرے کے اندر ہے اور کوئی دوسرا رول نہیں ہے۔ اگر یقین نہ ہو تو تمہاری یہ عورت میرے پاس آ کر میری تلاشی لے سکتی ہے۔ پھر طیارے میں جا کر میرے سامان کی تلاشی بھی لی جا سکتی ہے۔"

ڈاکٹر اور امیر حسن نے اسے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھا پھر کہا۔ "ہم تم پر بھروسہ کرتے ہیں۔ طیارے میں جا کر تلاشی لیں گے تو خواہ مخواہ مسافروں کو شبہ ہو گا اور طرح طرح کی باتیں بنانی پڑیں گی۔ بہتر یہی ہے کہ ہم تم پر اعتماد کریں۔"

وہ ریوالور دکھا کر پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔ "چونکہ ابھی ہم ایک دوسرے پر اعتماد نہیں کر سکتے اس لئے میں یہ ریوالور کا سہارا لیتے ہوئے تم لوگوں سے دور جا رہا ہوں۔ دوپہر کے بعد ہم ایک ہو جائیں گے۔"

یہ کہتا ہوا وہ دور جاتا رہا۔ جب اتنی دور ہو گیا کہ اسے ان کی طرف سے کوئی خطرہ نہ رہا تو اس نے ریوالور کو ہولسٹر میں رکھا۔ پھر تیزی سے چلتا ہوا طیارے کی طرف جانے لگا۔ طیارہ وہاں سے نظر نہیں آ رہا تھا لیکن اندازہ تھا کہ وہ طیارے کے قریب پہنچ گیا ہو گا۔

☆======☆======☆

ایک گھنٹہ گزر گیا۔

شازیہ طیارے میں واپس آکر اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی تھی۔ ڈاکٹر اور امیر حسن کھانے کی تیاری کے لئے دوسری جگہ چلے گئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ایک مسافر گھبرائے ہوئے انداز میں بولا۔ "ہمارے اس طیارے کے ایک مسافر کی لاش ادھر برف پر پڑی ہے۔ وہ مر چکا ہے۔"

یہ اطلاع سن کر سب لوگ آپس میں کچھ نہ کچھ بولنے لگے پھر کسی نے کہا۔ "ڈاکٹر کو اس لاش کے پاس بھیجنا چاہئے پھر یہ معلوم ہو سکے گا کہ وہ کیسے مر گیا؟"

جب ڈاکٹر آدھے گھنٹے کے بعد اسٹیورڈ کے ساتھ کھانے کی پلیٹیں لے کر آیا تو اسے یہ بات بتائی گئی۔ دونوں اسٹیورڈ کھانا تقسیم کرنے لگے۔ ڈاکٹر اس لاش کو دیکھنے کے لئے چلا گیا دیکھنا کیا تھا۔ وہ تو دیکھی دکھائی تھی۔ صرف مسافروں کو چکر دینے کے لئے اس طیارے سے باہر جانا پڑا تھا۔

اس نے تھوڑی دیر بعد واپس آکر تصدیق کر دی۔ مسافروں کو بتایا کہ حرکت قلب بند ہونے کے باعث اس کی موت واقع ہوئی ہے۔ وہ پچھلے دو برس سے اس کے زیر علاج رہا تھا اور دل کا مریض تھا۔ بیچارہ جانبر نہ ہو سکا۔

لنچ کے بعد کچھ لوگ ڈاکٹر کے ساتھ وہاں گئے۔ پھر راجہ محمود جہانگیر کو سب نے مل کر برف میں دفن کر دیا۔ وہاں قبر کا نشان بنا دیا۔ واپسی میں ڈاکٹر فوجی افسر کے ساتھ باتیں کرتا ہوا دوسری طرف نکل گیا۔ پھر دور جا کر بولا۔ "آپ نے کیا فیصلہ کیا؟"

وہ سر ہلا کر بولا۔ "میں نے خوب غور کیا ہے۔ ہمارے طیارے میں اس دنیا کے بہت اہم افراد سوار ہیں۔ انہیں بخیریت کسی آبادی تک پہنچانا میرا اور تم لوگوں کا فرض ہے۔ لہٰذا میں سمجھوتے کے لئے تیار ہوں۔"

اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر فلم کا وہ رول نکالا۔ پھر ڈاکٹر کے حوالے کرتے ہوئے بولا۔ "میں سمجھوتے کی شرط پوری کر رہا ہوں۔"

اسی وقت شازیہ اور امیر حسن بھی آ گئے۔ ڈاکٹر نے وہ رول انہیں دکھاتے ہوئے کہا۔ "یہ دیکھو، ہمیں یہ واپس مل گیا ہے۔ میں اسے تم لوگوں کے سامنے کھولتا ہوں۔"

وہ اس رول کو کھولنے لگا۔ نیگیٹو ایسا ہوتا ہے کہ ڈیویلپنگ سے پہلے کھولا جائے تو

روشنی آتے ہی سیاہ ہونے لگتا ہے۔ جیسے جیسے ڈاکٹر کھولتا گیا۔ فلم سیاہ ہوتی گئی۔ ہلکی سی جھلک نظر آتی رہی کہ تصویریں اتاری گئی ہیں لیکن نیگیٹو کو دیکھ کر جلد ہی اس بات کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا کہ کس کی تصویریں اتاری گئی ہیں اور کہاں اتاری گئی ہیں۔ جب تک سمجھنا چاہو اس وقت تک نیگیٹو سیاہ ہو جاتا ہے۔ وہ پورا رول سیاہ پڑ گیا۔ ڈاکٹر نے اسے ایک طرف پھینک دیا۔

آفیسر نے پوچھا۔ "اب تم لوگ بتاؤ کہ اس راجہ سے کیا دشمنی تھی؟"

"ڈاکٹر نے شازیہ کی طرف دیکھا۔ شازیہ نے نظریں جھکا لیں۔ امیر حسن نے کہا۔ ڈاکٹر یہ میری ہونے والی بیوی ہے لیکن بیوی بننے سے پہلے یہ ایک بچے کی ماں بن چکی تھی اور اس بچے کا باپ وہی ظالم راجہ تھا۔ اس نے زبردستی شازیہ کی عزت لوٹی تھی۔ اسے ایک بچے کی ماں بنایا اور جب وہ بچہ لے کر اس کے پاس فریاد کرنے آئی تو اس نے بڑی بیدردی سے اس بچے کا بھی گلا گھونٹ کر مار ڈالا۔"

شازیہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "میرا بچہ میرے اندر ابھی تک تڑپتا ہے مگر صبح سے مجھے بہت سکون محسوس ہو رہا ہے۔ ایسا لگتا جیسے میرے بچے کی روح پُر سکون ہو گئی ہے۔ اب وہ بے قرار نہیں ہے۔ آفیسر بہت سے ظالم' بہت سے قاتل ایسے ہوتے ہیں جو قانون کی نظر میں نہیں آتے جن کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ قانون انہیں کوئی سزا نہیں دیتا۔ ان حالات میں مجبور ہو کر ہمیں قانون اپنے ہاتھ میں لینا پڑتا ہے۔ بیشک یہ ہم سے جرم ہوا لیکن ہم اس کے لئے مجبور تھے۔"

آفیسر نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "تم نے ہم کا استعمال کیا ہے تو میں یہ سوال کروں گا کہ تمہارے ساتھ ڈاکٹر کیوں شریک ہوا کیونکہ ظلم تو تم پر ہوا تھا۔"

امیر حسن نے کہا۔ "ہاں مجھے بھی حیرانی ہے کہ ڈاکٹر نے ہمارا ساتھ کیوں دیا؟ میں نے یہ سوال ڈاکٹر سے کیا تھا۔ انہوں نے ٹال دیا۔ اب میں پھر پوچھتا ہوں؟"

ڈاکٹر نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "میں اس ریاست کی تاریخ سے اچھی طرح واقف ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ یہ ریاست کے راجے مہاراجے کیا کرتے آئے ہیں۔ راجہ محمود جہانگیر سے پہلے جو اس کا چچا راجہ بنا ہوا تھا اس نے بھی اپنی زندگی میں بڑے مظالم ڈھائے۔ حسین عورتیں اس کے چنگل سے نہیں بچ سکتی تھیں۔ اب سے تقریباً بتیس برس پہلے اس راجہ نے اپنی ایک خوبصورت ملازمہ پر ظلم کیا۔ اس کی جوانی سے کھیلتا رہا۔

جب وہ بچے کی ماں بننے لگی تو اسے لات مار کر محل سے نکال دیا کیونکہ وہ اپنے بچے کا حق مانگ رہی تھی۔ وہ عورت روتی پیٹتی اس محل سے نکل گئی۔ پھر اس ریاست سے بھی نکل گئی لیکن وہ بہت پختہ عزم والی عورت تھی۔ اس نے محنت مزدوری کی اور جب اس کا بیٹا پیدا ہوا تو اس بیٹے کی پرورش اچھی طرح کرنے لگی۔ اسے تعلیم دلانے لگی۔ اس کی خاطر وہ دن رات سلائی کا کام کرتی تھی اور سوچتی تھی کہ اپنے بچے کو بہت بڑا آدمی بنائے گی۔ پھر وہ بچہ بڑا ہو کر راجہ سے انتقام لے لے گا۔"

انتا کہہ کر ڈاکٹر تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہوا۔ پھر سر جھکا کر بولا۔ "یہ انتقام انسانوں کے دل میں آپ ہی آپ پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے پیچھے بہت سی باتیں ایسی تیز' تند' تلخ اور زہریلی ہوتی ہیں کہ انسان آپ ہی آپ انتقام لینے کے لئے مچلتا ہے۔ جب وہ بچہ بڑا ہوا تو ایک ماہر سرجن اور بہت ہی تجربہ کار ڈاکٹر بنا اور وہ اس وقت آپ کے سامنے موجود ہے۔"

"وہ آپ ہیں؟" امیر حسن نے حیرانی سے پوچھا۔ شازیہ بھی اسے تعجب سے دیکھ رہی تھی۔ آفیسر پتھر بنا کھڑا تھا۔

ڈاکٹر نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "ہاں' وہ میں ہی ہوں۔ جب سے میری ماں نے میری پیدائش کے سلسلے میں بتایا اور راجہ کے ظلم و ستم کی کہانی سنائی تب سے میں انتقام کے لئے تڑپ رہا تھا۔ دو سال پہلے کسی نہ کسی طرح میں راجہ محمود جہانگیر کا فیملی ڈاکٹر بن گیا۔ مجھے پتہ چلا تھا کہ راجہ محمود جہانگیر نے میرے ناجائز باپ کو قتل کر دیا تھا لیکن انتقام کی آگ بجھی نہیں وہ بھڑکتی رہی۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ ریاست کا کوئی راجہ نہیں ہو گا۔ جب تک میں زندہ رہوں گا ہر راجہ کو قتل کرتا رہوں گا۔ راجہ محمود جہانگیر میرے زیر علاج رہنے لگا۔ رفتہ رفتہ میں نے اسے یقین دلایا کہ وہ دل کا مریض ہے کسی وقت بھی اس کا ہارٹ فیل ہو سکتا ہے۔ میں اسے نفسیاتی طور پر پہلے کمزور کر کے' پریشان کر کے' تڑپا تڑپا کر مارنا چاہتا تھا۔ اس بار میں نے سوچا کہ جب ہم لندن جا رہے ہیں تو لندن میں ہی اس کا کام تمام کر دوں گا۔"

وہ بول رہا تھا۔ آفیسر' شازیہ اور امیر حسن خاموش کھڑے سن رہے تھے۔ اس نے اپنی داستان کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "اس روز طیارے میں پہلی بار راجہ جہانگیر کو شازیہ کا دشمن بنتے دیکھ کر میرے دل میں کرید پیدا ہوئی کہ آخر شازیہ سے کیا دشمنی ہے جبکہ یہ

بے حد حسین ہے اور راجہ حسین عورتوں پر ڈورے ڈالتا ہے۔ دشمنی نہیں کرتا۔ جب میں نے کریدنا شروع کیا تو اس نے بتایا کہ وہ شازیہ کی عزت سے بھی کھیل چکا ہے۔ اس نے بچے والی بات نہیں بتائی لیکن یہ ضرور بتایا کہ شازیہ اس کے چچا یعنی پچھلے راجہ کی بیٹی ہے۔ یہ سنتے ہی میرا خون کھول گیا کیونکہ اس رشتے سے شازیہ میری بہن ہے مائیں دو ہیں لیکن باپ ایک ہے۔ ایک تو میں پہلے ہی انتقام کی آگ میں جھلس رہا تھا۔ پھر میری بہن کی عزت سے کھیلنے والی بات میرے سامنے آئی۔ اس نے میرے ساتھ میری بہن کو بھی گندی نالی کا کیڑا کہا تو میں نے برداشت نہیں کیا۔ ارادہ کر لیا کہ اس ویران علاقے میں ہی اس کا کام تمام کر دوں گا اور میں نے کر دیا۔"

شازیہ نے شدید حیرانی سے ڈاکٹر کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا آپ میرے بھائی جان ہیں؟"

ڈاکٹر نے آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "ہاں' ہم ایسی اولاد ہیں کہ اپنے باپ کا نام نہیں لے سکتے۔ ہم بہت مجبور اور مظلوم ہیں۔ ہمارا رشتہ صرف اپنی ماؤں سے ہے' اور ان ماؤں کے ذریعے تم مجھے بھائی کہہ سکتی ہو اور میں تمہیں بہن کہہ سکتا ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے شازیہ کے دونوں بازوؤں کو تھام لیا۔ شازیہ آگے بڑھ کر اس کے سینے سے لگی۔ پھر یکبارگی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

☆======☆======☆

چھ دن گزر گئے۔ پھر سات راتیں بھی گزر گئیں۔ ساتویں دن صبح کے وقت کسی طیارے کی آواز سنائی دی۔ کچھ لوگ تو پہلے ہی باہر تھے آواز سن کر تمام مسافر ہڑبڑا کر باہر نکلنے لگے۔ سب لوگوں نے اپنے اپنے ہاتھ میں کپڑے پکڑ لئے تھے۔ دور دور تک دوڑتے ہوئے ان کپڑوں کو آسمان کی طرف لہرا رہے تھے۔ ایک طیارہ آتا دکھائی دے رہا تھا۔ پھر وہ طیارہ قریب آ کر ان کے چاروں طرف چکر لگانے لگا۔

دوسرے چکر میں ہوائی جہاز کے ذریعے سامان کے بڑے بڑے بنڈل پھینکے جانے لگے۔ تمام مسافر خوشی سے چیخ رہے تھے۔ اچھل رہے تھے۔ جب وہ طیارہ چار چکر لگانے کے بعد واپس چلا گیا تو وہ لوگ دوڑتے ہوئے سامان کے پاس گئے۔ دور دور تک سامان بکھرا پڑا تھا۔ سب لوگوں نے اسے کھولا۔ ہر سامان کے ساتھ ایک پرچی بندھی ہوئی تھی۔

اس پرچی پر لکھا تھا۔ "آپ لوگ بے فکر رہیں ہم مدد کے لئے پہنچ گئے ہیں۔ آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ آپ لوگ رومانیہ اور ہنگری کے درمیانی علاقے میں ہیں۔ ہماری پوری کوشش یہ ہوگی کہ شام سے پہلے آپ لوگوں کو رومانیہ یا ہنگری کے کسی شہر تک پہنچا دیا جائے۔ آپ نے بڑے حوصلے سے کام لیا ہے۔ امید ہے کہ شام تک اور حوصلہ رکھیں گے۔"

ان لوگوں نے سامان کے بڑے بڑے بنڈلوں کو کھول کر دیکھا۔ بند ڈبوں میں بہترین قسم کے کھانے تھے۔ کمبل اور گرم کپڑے بھی ان لوگوں کے لئے بھیجے گئے تھے۔ سب لوگوں کے لئے عید ہو گئی۔ عورتیں' مرد' بچے خوشی سے ناچ رہے تھے۔ کھانے کے ڈبوں کو کھول کر انہوں نے کھانا شروع کر دیا۔

دوپہر کو ہی ہنگری اور رومانیہ سے ہیلی کاپٹروں میں فوجی جوان آنے لگے۔ دس دس بیس بیس کی ٹولیوں میں مسافروں کو وہاں سے لے جانے لگے۔ آخر میں شازیہ' امیر حسن' ڈاکٹر اور وہ آفیسر رہ گئے۔ آفیسر نے جان بوجھ کر شازیہ کو بھی وہاں روک دیا تھا اور کہا تھا کہ وہ سب آخر میں جائیں گے۔ جب آخری بار جانے کی باری آئی تو اس نے کہا۔ "ڈاکٹر میں نے دھوکا دیا تھا۔ وہ فلم کا رول میرے پاس موجود ہے۔ تمہیں دوسری فلم کا رول دیا گیا تھا۔ یہ بات میں ان فوجی جوانوں کے سامنے کہہ رہا ہوں کہ تم اس راجہ محمود جہانگیر کے قاتل ہو اور اس قتل میں امیر حسن اور شازیہ نے تمہاری مدد کی ہے۔"

آفیسر نے فوجی جوانوں کو روداد سنائی۔ اس کے بعد فوجی جوانوں نے کہا۔ "بے شک ان میں سے ایک قاتل ہے اور دوسرے قاتل کے مددگار۔ لہٰذا انہیں حراست میں رکھنا چاہئے۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "ہمیں حراست میں لینے سے پہلے ان لاشوں کا حساب کیا جائے جنہیں یہاں سے لے جانا ہے اور ان کے عزیزوں تک پہنچانا ہے۔ یہاں آپ لوگوں کو وہی لاشیں ملیں گے جن کے رشتہ دار موجود تھے اور جو لوگ تنہا سفر کر رہے تھے وہ اب یہاں نہیں رہے انہیں جانوروں نے کھا لیا ہے۔"

ہیلی کاپٹر میں آنے والے ایک فوجی افسر نے کہا۔ "ان لاشوں کا حساب کرنا ہمارا کام ہے۔ ہم ابھی تم لوگوں کو حراست میں لے کر اپنے یہاں کی عدالت میں پہنچانا چاہتے ہیں۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "ہمیں کسی بھی عدالت میں پہنچانے سے پہلے ان لاشوں کا حساب ضروری ہے اور اس لئے ضروری ہے کہ............"

ڈاکٹر نے اپنی بات ادھوری چھوڑ کر شازیہ کی طرف دیکھا۔ پھر امیر حسن سے کہا۔ "مسٹر امیر حسن تم شازیہ کو ذرا ادھر لے جاؤ۔ میں ان سے ضروری باتیں کر لینا چاہتا ہوں۔"

امیر حسن شازیہ کا ہاتھ پکڑ کر ان سے بہت دور چلا گیا۔ اتنی دور کہ ان کے باتیں کرنے کی آوازیں وہاں تک نہیں آ سکتی تھیں لیکن تھوڑی دیر کے بعد ان کے چیخنے' چلانے اور آپس میں جھگڑا کرنے کی آوازیں سنائی دیں۔ جو فوجی آفیسر ہیلی کاپٹر میں آیا تھا۔ وہ طیارے کے آفیسر سے بحث کر رہا تھا اور چیخ کر کہہ رہا تھا۔ "آپ کیسے آدمی ہیں' یہ کیوں نہیں سوچتے کہ ڈاکٹر اور اس اسٹیورڈ نے ایک سو چونتیس مسافروں کی جانیں بچائی ہیں۔ ان میں دنیا کی مشہور شخصیتیں بھی تھیں۔ اگر یہ سب مر جاتے تو کیا ہوتا؟؟"

جواب میں اس آفیسر کی آواز سنائی دی جو ان پر الزام لگا رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "آپ کا کہنا درست ہے۔ میں ان کی قدر کرتا ہوں کہ ان لوگوں نے بڑی ذہانت اور خوب سوچ و بچار کے بعد مسافروں کو بھوکا نہیں رکھا اور ان کی جانیں بچائیں لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ راجہ محمود جہانگیر کو کیوں قتل کیا؟؟"

ڈاکٹر کے چیخ کر بولنے کی آواز سنائی دی۔ اس نے کہا۔ "اس لئے کہ تنہا مسافروں میں صرف راجہ محمود جہانگیر رہ گیا تھا اور وہی پانچ دن کے بعد دوسرے مسافروں کے کام آیا۔ اگر ہم ایسا نہ کرتے تو ان لوگوں کو کیا جواب دیتے جو ابھی تک کسی آبادی میں پہنچ کر اپنے مرنے والوں کی لاشوں کا انتظار کر رہے ہیں؟ تنہا سفر کرنے والوں کے عزیزوں کو اطلاع دی جائے گی کہ وہ لاشیں ناقابل شناخت ہیں۔ جانوروں نے انہیں نوچ کھسوٹ کر رکھ دیا ہے اب ان کے ڈھانچے ہی ان کے عزیزوں تک پہنچائے جا سکتے ہیں یا پھر ان کی اجازت سے یہیں برف میں انہیں دفن کر دیا جائے گا۔"

دوسری طرف امیر حسن نے کمال عیاری سے شازیہ کو محبت بھری باتوں میں الجھا لیا تھا۔ اسے اس بات کا موقع نہیں دے رہا تھا کہ وہ ان کی باتیں سن سکے۔ آدھ گھنٹے کے بعد وہ ہیلی کاپٹر میں آ کر سوار ہو گئے۔ شازیہ کو پتہ چلا کہ انہوں نے کسی سمجھوتے کے بعد ڈاکٹر' امیر حسن اور شازیہ کو رہائی دے دی ہے اور انہیں کسی عدالت میں نہیں پہنچا

جائے گا۔ شازیہ نے تعجب سے پوچھا۔ "آخر ہمیں رہائی کیسے مل گئی؟"

امیر حسن نے کہا۔ "شاید اس لئے کہ ہم نے ان سات دنوں میں تمام مسافروں کی بڑی خدمات انجام دی تھیں۔ آخر خدمات کا صلہ تو ملتا ہی ہے نا؟"

شازیہ ان باتوں سے مطمئن ہو گئی۔ تھوڑی دیر تک سوچتی رہی پھر اچانک اسے ابکائی سی آنے لگی۔ امیر حسن نے تعجب سے پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

وہ بولی۔ "میں سوچ رہی ہوں کہ ان جانوروں نے لاشوں کو کس طرح نوچ کھسوٹ کر کھایا ہو گا۔ چھی چھی۔"

امیر حسن نے ایک گہری سانس لی۔ پھر سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر بولا۔ "ہم انسان اور جانوروں میں یہی فرق ہے۔ ہم ایسا تصور بھی نہیں کر سکتے اور یہ جانور کچا ہی کھا جاتے ہیں۔"

☆======☆======☆